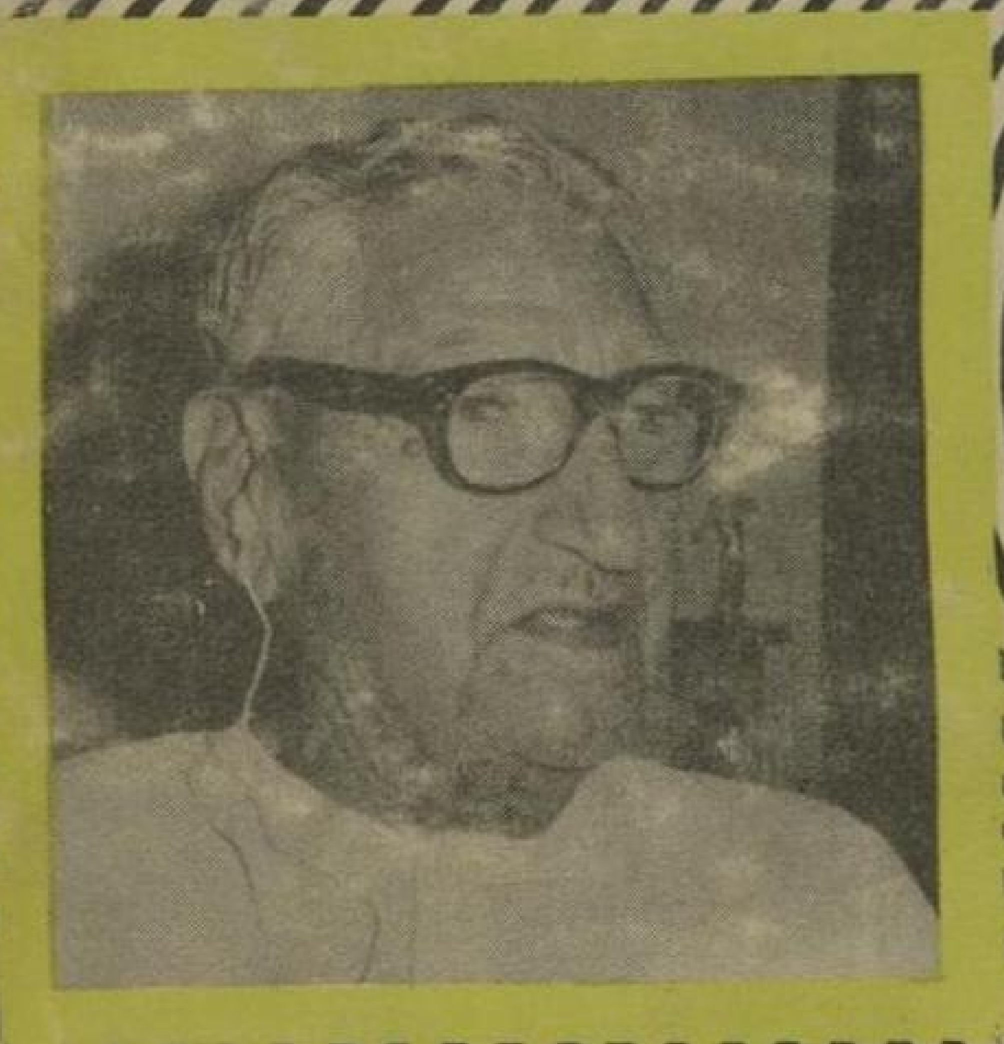
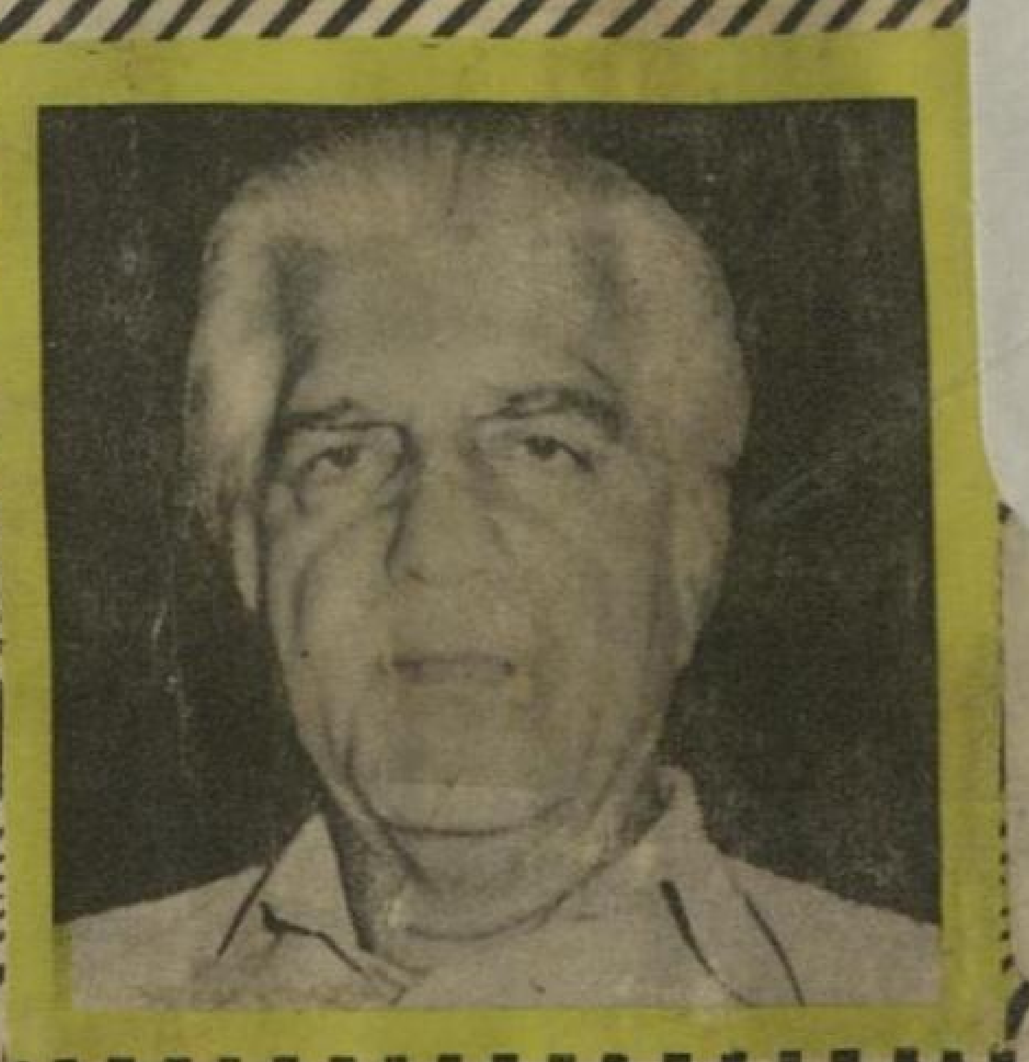
سیاسی
اُتار چڑھاؤ




منیر احمد منیر

سر کی دولتا شے محدود وغیرہ سب چیزوں کی کوششیاں ذریعہ سوائی نہیں الا مشغلہ ہے ص 203

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحمٰن الرحیم ہے

..........اُور اگر تُم نے
لگی لپٹی کہی یا سچّائی سے پہلو بچایا تو
جان رکھو کہ
جو کچھ تُم کرتے ہو اللہ کو اسکی خبر ہے (القرآن)



دی گریٹ لیڈر

ایک دفعہ کسی نے قائدِ اعظمؒ سے کہا "آپ بہت دیانتدار ہیں۔"
جواب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا "یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں، یہ تو
ہر شریف انسان کا بنیادی وصف ہے۔ البتہ یہ چیز قابلِ داد ہو سکتی ہے کہ
میں کسی کو خریدتا نہیں" ——

(بحوالہ 'دی گریٹ لیڈر'۔ زیرِ طبع)

سیاسی اُتار چڑھاؤ

منیر احمد منیر

آتش فشاں پبلیکیشنز
شبستان سینما — ایبٹ روڈ — لاہور

قیمت : ساٹھ روپے

ستمبر : ۱۹۸۵ء

پبلشرز : آتش فشاں پبلی کیشنز شبستان سینما بلڈنگ
ایبٹ روڈ لاہور۔ فون نمبر ۳۰۳۴۱۴

پرنٹرز : سلیم عطاء پرنٹرز لاہور

خطاطی : ذاکر حسین باجوہ

خالد شمس الحسن کے نام!

سیاسی اُتار چڑھاؤ

۲ / جولائی (۱۹۷۷ء) کو سارا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اخبارات میں بھی آ گیا۔ لیکن اصغر خاں کہنے لگے ، اور ڈیمانڈ کرو۔ بھٹو صاحب کارنر ہو چکے ہیں ، وہ تمہاری سب باتیں مانے گا۔ پھر ۲ کی شام دس ڈیمانڈ اور لے آئے۔ ہم ان پر بھی غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بھٹو صاحب نے جرنیلوں کو بلایا کہ قومی اتحاد والے کہتے ہیں ، حیدر آباد ٹربیونل توڑ دو۔ جنرل عبداللہ ملک اور جنرل جیلانی تو چپ بیٹھے رہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کہنے لگے کہ اگر حیدر آباد ٹربیونل ختم کیا تو ہماری . . . .

۲۴ نومبر ۱۹۷۴ء یحییٰ بختیار (تب اٹارنی جنرل آف پاکستان) کی طرف سے دیے گئے ایک ڈنر میں یحییٰ بختیار ، مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن (تب چیف جسٹس آف سپریم کورٹ) اور ذوالفقار علی بھٹو (تب وزیر اعظم پاکستان)



سیاسی اتار چڑھاؤ

یہ تو انہوں نے بعد میں دشمنی کی وجہ سے بنا لیا کہ ظفر اللہ خاں کو مونٹ بیٹن لایا۔ قائد اعظمؒ کو ان چیزوں کا نہیں تھا کہ مرزائی ہے۔ شیعہ ہے۔ اسمٰعیلی ہے۔ ان کا تو یہ تھا کہ جو شخص پاکستان کے لیے ہمدرد ہو اور پاکستان کے کام آسکتا ہو۔ وہ ٹھیک ہے۔ جب قائد اعظمؒ نے مجھے وزیر خارجہ منتخب کیا تو اس وقت کسی کو جرأت نہیں تھی کہ بات کرتا۔ جرأت کے علاوہ جب میں یونائیٹڈ نیشنز سے واپس آتا تھا تو کراچی ائرپورٹ پر تل دھرنے کے لیے جگہ نہیں ہوتی تھی اتنے لوگ مجھے ویلکم کرنے آتے تھے۔ اس وقت انہیں نہیں پتہ تھا کہ یہ مرزائی ہے۔ اب کہتے ہیں مونٹ بیٹن لایا تھا۔ یہ تو جب پرائم منسٹر شپ (خواجہ ناظم الدین) میں کمزوری آگئی تو ملاؤں کا حوصلہ بڑھا۔

۱۹۵۳ء اقوام متحدہ کے لاؤنج میں: ملک غلام محمد (تب گورنر جنرل پاکستان) چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں (وزیر خارجہ پاکستان) مسز وجے لکشمی پنڈت (تب اقوام متحدہ میں انڈیا کی مندوب) اور ڈاگ ہیمر شولڈ (تب سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ)



سیاسی اُتار چڑھاؤ

جنرل ایوب خاں اور مادرِ ملت ؒ کے درمیان جب صدارتی معرکہ ہوا تو میں مادرِ ملت ؒ کے ساتھ تھا۔ اوران کی حمایت میں میں نے بھرپور حصہ لیا۔ اتنا بھرپور کہ ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ پیر صلاح الدین مجھے کہنے لگا۔ مجھ سے یہ ضلع سنبھالا نہیں جا رہا۔ میں نے کہا حوصلہ کرو تو ڈی سی ہے۔ اس نے ایوب خاں کو لکھ دیا۔ اس وقت نواب زادہ نصر اللہ خاں اور میں اکٹھے تھے۔ بات ایوب خاں تک پہنچی تو اس نے جنرل موسیٰ خاں کو بلایا۔ میری بیٹی اور جنرل نصیر مظفر گڑھ آئے۔ محترمہ فاطمہ جناح ؒ کا ساتھ چھوڑنے اور ایوب کے لیے کام کرنے کو کہا۔ میں نے پوچھا، اگر میں محترمہ ؒ کے لیے کام کرتا ہوں تو آپ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ نصیر کا بھلا ہو۔ اس نے کہا ......

عبدالحمید دستی ، مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح ؒ اور میاں ممتاز محمد خان دولتانہ



سیاسی اتار چڑھاؤ

ہاں، ہم نے استعفا دیدیا تھا۔ بھٹو صاحب جتنی بھی ہماری منتیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کیں۔ ہم حیران ہو گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم استعفا دیں گے۔ کچھ وہ کہیں گے۔ کچھ ہم کہیں گے۔ اور پھر ہم آجائیں گے۔ لیکن ان کے تو ہوش و حواس ہی اڑ گئے۔ کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا ہو گیا؟ میں آپ کو کبھی نہیں جانے دوں گا پلیز۔ عینکیں ان کے سامنے پڑی تھیں۔ ڈھونڈھنے لگے کہ میری عینکیں کہاں گئیں؟.....


جناح پارک پشاور میں ایک جلسۂ عام کے دوران (۱) یوسف خٹک (تب سیکرٹری جنرل پاکستان مسلم لیگ) (۲) پیر صاحب مانکی شریف (۳) نواب زادہ لیاقت علی خاں (وزیراعظم پاکستان)، خان عبدالقیوم خاں (تب وزیر اعلیٰ سرحد)



سیاسی اتار چڑھاؤ

......بلکہ (صدر) ایوب صاحب امریکہ گئے تو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، انہوں نے مسلم لیگ (کنونشن) کی ورکنگ کمیٹی میں بتایا۔ کہنے لگے، مجھ سے پوچھو تو سہی کہ وہاں میرے ساتھ ہوا کیا؟ پھر انہوں نے خود ہی بیان کرنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے میں گیا، جا کے بیٹھا ہی تھا کہ (امریکی) صدر جانسن نے خود ہی بات شروع کر دی۔ اس نے مسٹر پریذیڈنٹ بھی نہیں کہا۔ کہنے لگا "جاؤ اور انڈیا سے معاملہ طے کرو"۔ ایوب صاحب کہتے ہیں: "میں نے جانسن سے کہا: "مہربانی فرما کر میری بات تو سُن لیں"۔ اس پر جانسن نے کہا: "میں تجھے کہہ چکا ہوں، جاؤ اور انڈیا سے معاملہ طے کر، پھر بکواس بند کرو"......

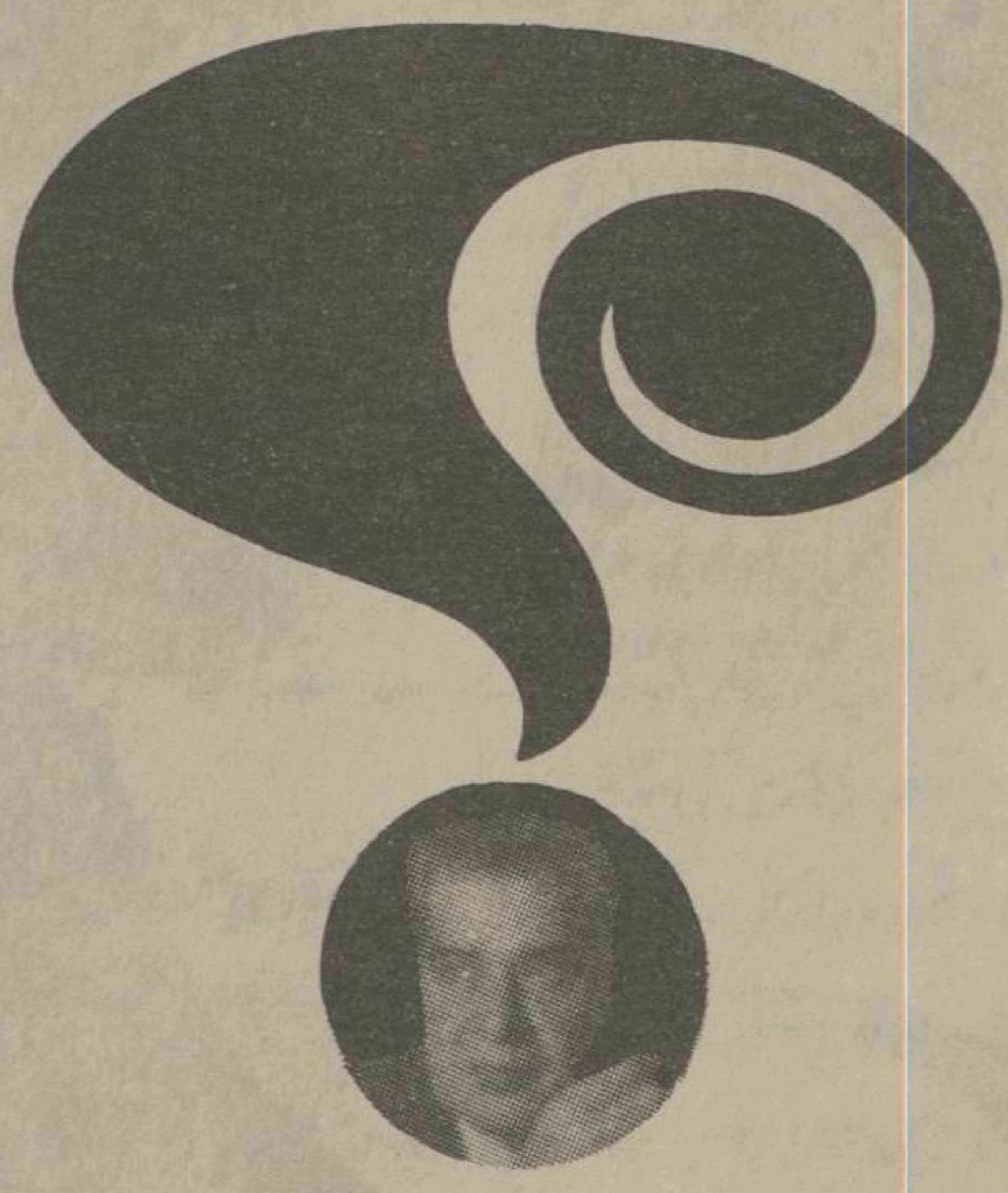
شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی سے پاکستان وفد کا شرف باریابی، عبدالجبار خاں (تب سپیکر پاکستان نیشنل اسمبلی)، بیگم زری سرفراز، مخدوم سجاد حسین قریشی، ایک چھوڑ کر، سید مرید حسین، مسٹر مجید چوہدری جلیل، انور ٹوانہ، ایک چھوڑ کر، اے ایس ایم سلیمان، مسٹر ظفر اور آخر میں سید طیب حسین (تب پاکستانی سفیر متعینہ ایران)



فہرست



مس بے نظیر بھٹو یحییٰ بختیار کے ساتھ، سپریم کورٹ میں



یحییٰ بختیار سے انٹرویو



یحییٰ بختیار اور جنرل (ریٹائرڈ) ٹکا خاں۔

سوانحی خاکہ

میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۲ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد محترم حاجی عبدالکریم بختیار وہاں چائے کے تاجر تھے۔ کوئٹہ سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں میں نے ایف سی کالج لاہور جائن کیا۔ جہاں سے ۱۹۴۶ء میں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری لی۔ اسی سال برطانیہ کی لنکنز ان میں داخلہ لیا اور جنوری ۱۹۴۹ء میں بار ایٹ لا ہوا۔ اسی سال جوڈیشل کمشنر بلوچستان کی عدالت میں اور ۱۹۵۲ء میں سندھ چیف کورٹ میں اور ۱۹۵۷ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایڈووکیٹ کے طور پر اینرول ہوا۔

۱۹۴۱ء میں، میں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت میں ایف سی کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ مجھے آج تک اس بات پر فخر ہے کہ مجھے حضرت قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں پاکستان موومنٹ میں کام کرنے کی سعادت ملی۔ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا کونسلر منتخب ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ڈپٹی پریذیڈنٹ چنا گیا۔ ان دنوں راجہ صاحب محمود آباد فیڈریشن کے صدر تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں عملی سیاست سے ریٹائر ہو گیا اور اپنی توجہ وکالت کی جانب کر لی۔

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۱ء میں مجھے بنیادی حقوق کی کمیٹی کا ممبر اپوائنٹ کیا اور وزیراعظم لیاقت علی خان نے بلوچستان ایڈوائزری کونسل کا ممبر نامزد کیا۔

دسمبر ۱۹۶۲ء میں، میں دوبارہ سیاست میں آ گیا، کونسل مسلم لیگ جائن کی، خواجہ ناظم الدین نے مجھے بلوچستان آرگنائزنگ کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا۔ ۱۹۶۳ء میں پاکستان (کونسل) مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد ہوا۔ ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء میں تین بار مغربی پاکستان مسلم لیگ (کونسل) کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہوتا رہا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے اٹارنی جنرل مقرر کیا۔ تب میں مغربی پاکستان مسلم لیگ (کونسل) کا صدر تھا۔ صدر پاکستان نے مجھے کیبنٹ منسٹر کا درجہ دیا۔ ۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو میں نے مسلم لیگ چھوڑ کر پیپلز پارٹی جائن کر لی۔

میں نے کئی انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کی۔ بھارت نے ۷۱ء سے اپنے علاقے پر سے پاکستانی جہازوں کی پرواز ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ اس سلسلے میں، میں ۱۹۷۲ء میں ہیگ میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں پاکستان کی طرف سے پیش ہوا۔ اس طرح ۱۹۷۳ء میں اسی عدالت میں ان ان پاکستانی جنگی قیدیوں کی حمایت میں پاکستان کی نمائندگی کی جن پر بھارت جنگی جرائم کے الزامات لگا کر ڈھاکہ گورنمنٹ کے حوالے کرنے والا تھا۔

مجھے فخر ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کے کیس کی پیروی کی، بھلے دنوں میں تو سبھی مونس و غمگسار بن جاتے ہیں۔ انسان وہ ہے جو مصیبت کے وقت بھی دوستی کا مقدس عہد نبھائے۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی بھی مرحلے پر میرے پاؤں نہیں ڈگمگائے۔



س :- آپ شروع دن سے مسلم لیگ میں رہے، اور ایوب خاں کے زمانے میں جب بعض بڑے بڑے مسلم لیگی کنونشن مسلم لیگ کی آڑ لیکر اقتدار سے وابستہ ہو گئے، اس وقت بھی آپ نے کونسل مسلم لیگ کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔ ایک طرح سے یہ بات آپ کی ثابت قدمی پر دال کرتی تھی، لیکن پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آتے ہی آپ نے اٹارنی جنرل کا عہدہ قبول کر لیا۔ وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے آپ کی اس طرف رغبت دلائی کہ آپ جیسے جمہوریت پسند سیاسی آدمی کو بھٹو کی شخصیت میں چارم نظر آیا؟

ج :- پہلے آل انڈیا مسلم لیگ تھی۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان مسلم لیگ بنی۔ اور آپ کو یاد ہے۔ کہ چودھری خلیق الزماں صاحب اس کے صدر بنے تو اسی وقت مسلم لیگ کا زوال شروع ہو گیا، کیونکہ وہ لیڈر شپ اس قابل نہ تھی کہ ملک میں اسے ایک منظم پارٹی بنا سکتی۔ ایک وقت آیا کہ وزیر اعظم صاحب مسلم لیگ کے بھی صدر بن گئے۔ صوبائی وزراء اعلیٰ صوبائی تنظیموں کے صدر بنے۔ اس طرح مسلم لیگ حکومت کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ مجھے یہ انداز پسند نہ آیا، چنانچہ میں نے سیاست میں ایکٹو حصہ لینا چھوڑ دیا۔ میں متنفر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے اپنا آئین بنایا، اور سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت ملی تو انہوں نے مسلم لیگ پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے مسلم لیگی زیادہ تر کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چودھری خلیق الزمان صاحب بھی ان کی طرف چلے گئے تو خواجہ ناظم الدین صاحب کو کچھ دوستوں نے کہا کہ وہ میدان میں آ جائیں۔ خواجہ صاحب تیار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں بلوچستان میں ان کا ساتھ دوں، اس خیال سے کہ خواجہ صاحب نیک انسان ہیں۔ اور اصلی مسلم لیگی ہیں، میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس زمانے میں محترمہ فاطمہ جناح سے ملنے کا شرف حاصل رہا۔ محترمہ کے الیکشن تک بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ میں تین بار مغربی پاکستان کونسل مسلم لیگ کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہوا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ہمیں شکست ہوئی، کیونکہ ہماری سوچ بالکل مختلف تھی۔ عوام کے مسائل، غریبوں کے مسائل، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل پر ہم خاص توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے لیڈر اس طرح سوچتے تھے کہ برادری یا سرداری کی بنیاد پر کون کہاں سے الیکٹ ہو سکتا ہے۔ جبکہ بھٹو صاحب نے لوگوں کو نئی سوچ دی۔ نیا شعور دیا۔ آپ اس سے پورا اتفاق

کریں یا نہ کریں حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب عوام تک پہنچ چکے تھے۔ جس طرح کہ قائداعظمؒ نے عوام تک رسائی کی تھی۔ اور عوام سے ڈائریکٹ تعلق قائم کر کے پاکستان حاصل کیا تھا۔ بھٹو صاحب بھی اسی طریقے سے ڈائریکٹ عوام تک گئے۔ انہوں نے مڈل مین یعنی وڈیرے یا زمیندار کا سہارا نہیں لیا تھا۔ نتیجتہً انہیں الیکشن میں کامیابی ہوئی۔

الیکشن کے بعد ۱۹۷۱ء میں بھٹو صاحب نے ممتاز بھٹو کو میرے پاس بھیجا کہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ بھٹو صاحب نے ایک بیان میں کہا ہے کہ شکست خوردہ سیاستدانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ سیاست پر کوئی بات کریں۔ میں بھی شکست خوردہ ہوں، اس لیے میں شامل ہوا تو وہ کہیں گے کہ کسی نوکری کے لیے، کسی عہدے کے لیے آ رہا ہے۔ اس لیے شامل نہیں ہوں گا۔ ویسے مجھے کئی چیزوں سے جو آپ کر رہے ہیں، اگرچہ اتفاق ہے۔ لیکن کئی چیزوں سے اتفاق نہیں، لیکن پارٹی تبدیل کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

کچھ عرصہ بعد بھٹو صاحب خود کوئٹہ آئے، انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں نے انہیں لنچ پر بلایا۔ میر رسول بخش تالپور اور ممتاز بھٹو ان کے ساتھ تھے۔ بھٹو صاحب نے بھی وہی بات کی، میں نے جواب دیا کہ میں پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتا۔ البتہ ممکن حد تک آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ کیونکہ ملک پر برا وقت ہے۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں انڈیا کی خاصی مداخلت شروع ہو چکی تھی۔ میں نے کہا آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ پارٹی میں شامل نہیں ہوں گا۔ وہ چلے گئے۔ اور پھر جو دسمبر ۷۱ء میں بھارت کی مداخلت ہوئی، ادھر بھی جنگ ہوئی۔ جس طریقے سے بھٹو صاحب باہر سے آئے، صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے تو اسی رات دو تین بجے کے درمیان انہوں نے مجھے فون کیا کہ آپ اٹارنی جنرل کا عہدہ سنبھال لیں، میں نے سوچا کہ پاکستان اس وقت جن حالات سے دوچار ہے، انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ اٹارنی جنرل تو بہت بڑا اعزاز تھا۔ اگر وہ کہتے کہ چپڑاسی کا کام کرو۔ تو ملک کی خاطر میں وہ بھی کرتا۔ میں نے انہیں جواب دیا، سوچوں گا۔ کہنے لگے، سوچنے کی بات نہیں، میں نے کہا، پھر ٹھیک ہے۔ میں پہلا آدمی تھا۔ جسے انہوں نے اپوائنٹ کیا۔ منسٹر بھی بعد میں اپوائنٹ ہوئے۔ کیبنٹ بھی بعد میں بنی۔ اس کے باوجود میں نے چارج نہیں لیا میں دولتانہ صاحب سے رابطہ پیدا کرتا رہا۔ وہ لاہور سے راولپنڈی گئے تھے۔ وہاں نہ ملے۔ شام کو لاہور واپس گئے۔ تو میں نے کہا، میاں صاحب! میں آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ پیشکش ہوئی ہے۔ میں آپ کی پارٹی میں ہوں، آپ لیڈر ہیں۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر تو نہیں جا سکتا۔ میاں دولتانہ کہنے لگے، ملک پر بڑا مشکل وقت ہے میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ میں نے کہا، میں مسلم لیگ کے تمام عہدوں سے ریزائن کر دوں گا۔ لیکن دو آنے کا ممبر بدستور رہوں گا۔

تو جب میں بھٹو صاحب کی حکومت میں شامل ہوا، میں مسلم لیگی ہی تھا میں بھٹو صاحب

کی داد دیتا ہوں، ان کی پارٹی میں اچھے وکیل موجود تھے۔ سب کو چھوڑ کر انہوں نے مجھے کہا کہ آپ یہ عہدہ سنبھالیں حالانکہ میں بلوچستان جیسے صوبے سے تھا۔ اس کے باوجود جب میں چارج لینے کراچی آیا تو میں چودھری محمد علی صاحب سے ملنے گیا، میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ بڑے محب وطن ہیں، اسلام دوست، پاکستان دوست انسان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا، چودھری صاحب میں چارج لے رہا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں، غلط ہے یا ٹھیک ہے۔ چودھری صاحب کہنے لگے، بالکل ٹھیک ہے۔ جو ملک پر گزر رہی ہے۔ اس کے پیش نظر آپ کو کر لینا چاہیئے۔

اس طرح دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء تک میں بھٹو صاحب کا اٹارنی جنرل اور ان کی کیبنٹ کا ممبر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگی بھی رہا۔ انہوں نے مجھے کسی بھی سٹیج پر یہ نہیں کہا کہ میری پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ انہوں نے مجھ پر پورا اعتماد کیا۔ میں سیاست میں حصّہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں مسلم لیگ کا دو آنے کا ممبر رہا۔

ولی خان بڑے لیڈر ہیں، مگر ہمارے ان سے ہمیشہ سیاسی اختلاف رہے۔ مجھے بڑا افسوس رہا کہ مسلم لیگ والوں نے اسمبلی میں انہیں اپنا لیڈر بنا لیا۔ چودھری ظہور الٰہی اور شوکت حیات نے ان کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔

ایک طرف تو یہ ہو رہا تھا، دوسری طرف بلوچستان میں اُن دنوں بڑی بُری حالت تھی۔ میں نہیں کہتا کہ غلطی نیپ کی تھی یا ہماری تھی حالات اتنے خراب تھے کہ ہماری فوج اور ہماری قوم کے لوگ آپس میں لڑ رہے تھے۔ غلط فہمی سمجھئے، غلطی کہیئے یا علیحدگی پسندی قرار دیجیئے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ فوج بھی تو ہماری تھی جو وہاں لڑ رہی تھی۔ اور یہ ہمارے مسلم لیگی لیڈر ولی خان کی قیادت میں سفارت خانوں میں گئے۔ کہ آپ بلوچستان میں مداخلت کریں۔ یہ بات وہ فارن پاورز کو کہہ رہے تھے۔

س:۔ متحدہ محاذ والوں نے سفارت خانوں میں جو یادداشت پیش کی تھی، اس میں یہ لکھا تھا کہ آپ پاکستان میں مداخلت کریں۔

ج:۔ آپ ایمبیسی میں کس لیئے جاتے ہیں۔ فارن پاورز کو کیا کہتے ہیں کہ بچاؤ ان سے۔ جبکہ یہ ہمارا اندرونی مسئلہ تھا۔ بھائیوں کا جھگڑا تھا۔ اس بارے میں آپ غیر ممالک کو دخل دینے کا کیسے کہہ سکتے تھے۔ اس پر میں نے کہا کہ اب میں مسلم لیگ میں نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ اس وقت قادیانی مسئلے کا فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے بڑا کریڈٹ مل رہا تھا۔ اسے میں استعمال کر کے آ سکتا تھا۔ لیکن میں نے کہا کہ یہ پیپلز پارٹی کا معرکہ نہیں، سب نے مل جل کر کیا ہے۔

جب مسلم لیگ والوں نے یہ حرکت کی تو مجھے افسوس ہوا کہ یہ لوگ مسلم لیگی نہیں رہے، جبکہ میں اب بھی مسلم لیگی ہوں۔ ان حالات میں میں نے ۶ اکتوبر ۷۴ء کو مسلم لیگ چھوڑنے اور پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کا بیان دے دیا۔ بھٹو صاحب اس وقت پشاور میں

تھے۔ انہیں بہت تعجب ہوا۔ کہنے لگے، آپ نے پیپلز پارٹی میں شامل ہونا تھا تو کم از کم ہمیں بتا تو دیتے، ہم آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیتے، آپ نے تو ایسے ہی کر دیا۔

س:۔ گویا آپ نے بھٹو صاحب سے مشورہ کیے بغیر اور اپنی مرضی سے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔

ج:۔ بالکل اپنے طور پر کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پریس کانفرنس بلاؤں یا کسی استقبالیے کا اہتمام کروں، جیسا کہ شوکت حیات نے کیا تھا۔

میرا یہ خیال تھا کہ اس پارٹی میں ہر قسم کے لوگ ہیں، جیسا کہ مسلم لیگ میں ہوا کرتے تھے۔ مسلم لیگ میں میاں افتخار الدین بھی تھے، وہ ایک دیانتدار اور نیک آدمی تھے۔ بائیں بازو کے نظریات رکھتے تھے۔ اسی طرح ممدوٹ تھے۔ جو دائیں بازو کے نظریات رکھتے تھے وغیرہ، تو میرا خیال تھا کہ میں پیپلز پارٹی میں جا کر انہیں آمادہ کر سکتا ہوں کہ وہ وہی پالیسی اپنائیں جو قائدِ اعظمؒ کی تھی، اور بھٹو صاحب کے بھی یہی ویوز تھے، ایک طرف جے اے رحیم، ڈاکٹر مبشر حسن اور معراج محمد خاں تھے جو بعد میں پارٹی چھوڑ گئے، دوسری طرف کوثر نیازی جیسے دائیں بازو کے تھے۔ مجھے ان سے بھی اتفاق نہیں تھا۔ میں تو درمیانی پالیسی کا حامی تھا۔ صحیح پاکستان ازم۔ وہی بات جو قائدِ اعظمؒ نے کہی تھی۔ قائدِ اعظمؒ ترقی پسندانہ اسلامی نظریات رکھتے تھے۔ ہم وہی اسلام چاہتے تھے، جو قائدِ اعظمؒ کے دماغ میں تھا۔ جو علامہ اقبالؒ کے دماغ میں تھا۔ ہم ملّاں کا اسلام نہیں چاہتے تھے۔ اسی خیال سے میں پیپلز پارٹی میں آیا۔ دوسری پارٹیوں کا حال میرے سامنے تھا۔ تین تین چار چار ممبر تھے، کوئی عہدے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کسی کو پرمٹ کی فکر، کوئی سینما بنوانے کے چکر میں ہے، پھر کہتے ہیں کہ یہ مسلم لیگ ہے۔ تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ تین حصوں میں ہی پہلے بٹی ہوئی تھی۔ یہ ایک رہ نہیں سکتی۔ جس پارٹی کو عوام کی تائید حاصل نہ ہو وہ ایک رہ نہیں سکتی۔ میرے خیال میں پیپلز پارٹی ہی ایسی پارٹی ہے جو صحیح معنوں میں غریب آدمی کی پارٹی کہی جا سکتی ہے۔

س:۔ جس طرح بھٹو صاحب نے آپ کو اٹارنی جنرل کے عہدے کی پیشکش کی۔ ایوب خاں کے زمانے میں بھی کوئی ایسی آفر آئی تھی۔

ج:۔ انہوں نے براہِ راست تو کوئی پیشکش نہیں کی، جس زمانے میں منظور قادر چیف جسٹس تھے، ۶۲ ، ۶۳ء کی بات ہے کہ جسٹس سجاد احمد جان نے مجھے کہا کہ آپ ہائی کورٹ کا جج بن جائیں، لیکن میں نے انکار کر دیا۔

س:۔ آپ سارا عرصہ ایوب خان کی مخالفت کرتے رہے کہ آپ جمہوریت پسند تھے۔ بھٹو صاحب کو آپ نے جائن کر لیا جبکہ ان کا دور نسبتاً خاصا سخت گیری کا تھا۔ بلکہ لوگوں نے تنگ آ کر انہیں فاشسٹ کہنا شروع کر دیا۔

ج :۔ بھٹو صاحب بھی جمہوریت پسند ہیں۔ بعض اقدامات ایسے تھے، جو ضروری تھے سختی بعض جگہ ضروری بھی تھی، مگر انہیں فاشسٹ کہنا بڑی غلط بات ہے۔ لیبل لگانا بڑا آسان ہوتا ہے، جن حالات میں انہوں نے حکومت سنبھالی، آپ کا پانچ ہزار مربع میل ہندو کے قبضے میں تھا۔ ہمارے نوے ہزار سے زیادہ قیدی وہاں پڑے تھے۔ سرحد میں پولیس ہڑتال۔ پنجاب میں پولیس ہڑتال۔ چھاؤنیاں آپ کی خالی پڑی ہوئیں۔ ان حالات میں اگر رپورٹیں آئیں کہ فلاں آدمی انتشار پسند ہے، تخریب کاری کر رہا ہے۔ ان میں چانس لینے بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کیا اتنے زیادہ آدمی جیلوں میں تھے، جتنے آج ہیں۔ اتنے زیادہ تو نہیں تھے، کبھی بھی نہیں تھے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ میں نے انٹرنیشنل ایمنیسٹی کو چیلنج کیا کہ ہمارے ہاں صرف ۲۳ سیاسی نظر بند ہیں۔

س :۔ یہ تعداد زیادہ سے زیادہ تھی۔

ج :۔ نہیں یہ تعداد کم سے کم تھی۔ زیادہ بھی رہے تھے۔

س :۔ قومی اتحاد کی موومنٹ میں رہے ہوں گے۔

ج :۔ اس کے علاوہ، سندھ میں لسانی فسادات کے زمانے میں، یا پھر جب متحدہ محاذ نے سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ ہمارے پاس آئین تھا۔ ہم آئین کے مطابق چل رہے تھے۔ ملٹری کورٹس کام نہیں کر رہی تھیں۔

س :۔ آئین میں عدالتوں کے اختیارات گھٹانے کے متعلق جو ترمیمیں کی گئیں، ان کے بارے میں آپ کیا صفائی پیش کریں گے۔ یہاں میں خاص طور پر دفعہ ۱۹۹ کا ذکر کروں گا، جس کا مقصد عدالتوں کے اختیارات گھٹا کر سیاسی تشدد کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس ترمیم کے بعد ڈی پی آر وغیرہ مقدمات کے ضمن میں کوئی عدالت عالیہ سے رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ اور سنا ہے کہ ایسا خاص طور چوہدری ظہور الہٰی اور حنیف رامے کی خاطر کیا گیا۔

ج :۔ چوہدری ظہور الہٰی اور حنیف رامے کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا۔ آئین کے تحت عدالتی اختیارات کم کیے جا سکتے ہیں، بڑھائے جا سکتے ہیں۔ عدالت کے پیدائشی اختیارات تو ہوتے نہیں کہ انہیں گھٹایا یا بڑھایا نہ جا سکے۔ ایک ایسی سٹیج آئی کہ یہاں غلام مصطفیٰ کھر کا الیکشن ہو رہا تھا، تو یہاں کے قائم مقام چیف جسٹس صاحب نے ہمیں جو اطلاع دی اس کے مطابق انہوں نے ایک سو بیس یا ایک سو تیس سٹے آرڈر جاری کیے کہ فلاں شخص کو کسی جرم میں قید نہیں کیا جائے گا۔ کسی آئندہ جرم میں بھی قید نہ کیا جائے، اور نہ اسے نظر بند کیا جائے۔ انتظامی نظر بندی بھی نہیں ہو سکے گی۔ اتنی زیادہ تعداد کو انہوں نے بلینک چیک دے دیا۔ چیف منسٹر صادق حسین قریشی راولپنڈی آئے۔ مجھے بلایا گیا۔ بھٹو صاحب تھے، پنجاب کے چیف سیکرٹری صاحب تھے۔ اور چیف منسٹر صاحب تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ چیف منسٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں حکومت کیسے کروں گا۔ اگر مجھے کسی آدمی پر شک ہے۔

کہ یہ تخریب پسند ہے، میں اس کو گرفتار کر سکتا ہوں۔ اس کا حق ہے کہ وہ کمرۂ عدالت میں جائے۔ جج صاحب کا حق ہے، دیکھیں کہ میرے پاس میٹریل ہے کہ نہیں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں کہ میں نے ٹھیک بند کیا کہ نہیں۔ اگر جج صاحب پہلے ہی کہہ دیں کہ کسی طریقے سے بھی اسے قید نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ جج کو بھی گولی سے مار دے۔ آپ مجھے بتائیں کہ پھر میری حکومت کیسے چلے گی یا پھر مجھے چھٹی دے دیجیے۔ قریشی صاحب کہنے لگے، ان کے پاس سٹین گن ہے۔ غنڈوں کے سٹے آرڈر ہیں۔ اگر میں غنڈے لاؤں، سٹین گن تو میں بھی دے دوں گا، سٹے آرڈر کہاں سے ملے گا۔ یہ کسی کیس میں گرفتار نہیں کیے جائیں گے۔ قریشی صاحب نے وہاں جو کچھ بتایا، کہاں تک درست تھا، تاہم آرڈر موجود تھے کہ رات کو دو دو بجے، تین تین بجے گھر جا کر لوگ سٹے آرڈر لیتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ ان حالات میں جہاں تک ضمانت کا تعلق ہے۔ ضابطہ فوجداری میں جو اختیارات موجود ہیں، کوئی آدمی جرم کرتا ہے، اسے ضمانت پر چھوڑا جاتا ہے، وہ اختیارات آئین میں استعمال نہیں ہوتے۔ آئین میں اگر پریوینٹو نظر بندی کے معاملات ہیں، اسی میں آپ کر سکتے ہیں، کس حد تک کر سکتے ہیں، اس کی انہوں نے وضاحت کر دی۔ باقی اس میں جو اختیارات ہیں، وہی استعمال ہونگے۔ یہ ایک طرح سے اختیارات کم نہیں کیے گئے تھے۔ پوزیشن واضح کی گئی تھی۔ کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا کہ جج تجاوز کر رہے ہیں۔

س:۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ حکومت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس یعقوب علی سے خوش ہوئی تو ان کی مدت بڑھانے کے لیے ترمیم کر دی۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس سردار محمد اقبال سے ناراض ہوئی تو حد مقرر کر دی گئی۔

ج:۔ یہ بات غلط ہے کہ کسی خاص جج سے ناراض ہوئے تو ترمیم کر دی یا کسی جج سے خوش ہوئے تو ترمیم کر دی۔ یہ بات عرصہ پہلے سامنے آگئی تھی کہ کمانڈر انچیف کے چار سال ہوتے ہیں۔ وزیراعظم کے پانچ سال ہوتے ہیں۔ صدر مملکت کے پانچ سال ہوتے ہیں، لیکن چیف جسٹس آٹھ سال، بارہ سال، چودہ سال تک بیٹھا رہے۔ جسٹس منیر عرصے تک چیف جسٹس رہے۔ اسی طرح کارنیلئس بھی لمبے عرصے کے لیے چیف جسٹس رہے۔ ان سے پہلے ایس اے رحمان صاحب اور جسٹس فضل اکبر صاحب کو دو دو، تین تین مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں ملا۔ جسٹس شہاب الدین تھے، انہیں بھی بہت کم وقت ملا۔ تو اس پر لوگ سوچ رہے تھے کہ یہاں بھی مدت کا تعین ہونا چاہیئے۔ چیف جسٹس ریٹائر ہو کر پھر سینئر جج بن سکتا ہے۔ امریکہ میں اور بعض دوسرے ممالک میں یہی سسٹم چل رہا ہے۔ چیف جسٹس ROTATION پر آتے ہیں۔

س:۔ جسے چاہا چیف جسٹس بنا دیا۔

ج:۔ یہ تو ہمیشہ ہے، یہ تو ہر جگہ ہے۔ انگلینڈ میں بھی ہے۔

س:۔ سینیارٹی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

ج :۔ سینیارٹی کا کہیں بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا ، انگلینڈ میں لارڈ پارکر چیف جسٹس بنے۔ ان سے پہلے لارڈ گاڈرڈ چیف جسٹس بنے تو لارڈ پارکر کو سترہ ججوں پر ترجیح دی گئی۔ یہاں بھی کب سینیارٹی چلی ہے ، جسٹس منیر کب سینئر تھے ، ایک بنگالی جج اکرم صاحب تھے ، وہ منیر صاحب سے سینئر تھے ۔ انہوں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور رضامندی دے دی ، بھارت میں بھی یہی طریقہ ہے ۔ ساری دنیا میں ایسا ہو رہا ہے ۔

س :۔ مولانا مودودی نے ایک بار اپنی ایک تقریر کے دوران میں آئین میں ترامیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکی آئین میں دو سو سال کے دوران کل پچیس ترمیمیں ہوئیں جبکہ ہمارے ہاں تین سال کے اندر اندر دس ترمیمیں ہو گئیں ۔

ج :۔ کیوں نہ ہوں ، نئی سوسائٹی ہے ، نئی گورنمنٹ ہے ، آپ نے پہلی دفعہ متفقہ آئین پاس کیا ، اگر اپوزیشن چاہے کہ اس کی مرضی کی ترمیم ہو تو پھر وہ دو تہائی اکثریت پر متفق کیوں ہو گئے تھے ، سب نے دستخط کیے تھے ۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ ان کے ہاتھ میں ویٹو ہے ، جو ترمیم چاہیں کریں ، آپ تجزیہ کر رہے ہیں ۔ اب بیٹھے بیٹھے یہ وہی صاحب کہتے ہیں ، ترمیم ہو گئی ۔ اس وقت تو پارلیمنٹ میں جاتی تھی ۔ اسمبلی میں بحث ہوتی تھی ۔ اور اپوزیشن واک آؤٹ کر جاتی تھی ۔ یہ پانچ سال میں پانچ ماہ بھی اسمبلی میں نہیں بیٹھے ۔ ہر بات پر واک آؤٹ ، یہ تو اقلیت کی لیڈر شپ چاہتے تھے ۔ حالانکہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ احتجاج کیا اور پھر واپس آ گئے ۔ یہاں تو آخر تک من مانی کرتے رہے ، اور تنخواہ بھی باقاعدہ وصول کرتے رہے ۔

س :۔ اگر یہ واک آؤٹ نہ کریں تو انہیں اسمبلی کی سیڑھیوں پر سے دھکیلا جاتا ہے ، پانچویں یا چھٹی ترمیم تھی ، جب دنیا نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اسمبلی ہال سے ایف ایس ایف مفتی محمود اور چودھری ظہور الٰہی کو دھکے دے رہی ہے ۔

ج :۔ یہ بالکل غلط بات ہے ۔ میں اسمبلی میں موجود تھا ، نہ وہاں ایف ایس ایف تھی ، اور نہ اس کا کوئی تعلق تھا ، قصوری صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے ، احمد رضا قصوری بولنے نہیں دے رہے تھے ، ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا ۔ سپیکر نے انہیں ہاؤس سے باہر نکل جانے کا آرڈر کیا ۔ ساری دنیا میں ہوتا ہے کہ جب سپیکر کہہ دے غلط ہے یا صحیح ، ڈسپلن یہی ہے کہ آپ اسے فالو کریں ، وہ کہتا ہے ، میں نہیں کروں گا ، نہ میں اسے بولنے دوں گا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپیکر نے اجلاس ملتوی کر دیا ۔ جو دیر تک ملتوی ہی رہا ، میں نے خود دیکھا کہ سپیکر صاحب کہہ رہے ہیں ، میں آرڈر کرتا ہوں کہ انہیں باہر پھینک دیا جائے ۔

س :۔ سنا ہے ، بھٹو صاحب وہاں بیٹھے یہ سب کچھ کنٹرول کر رہے تھے ۔

ج :۔ بھٹو صاحب وہاں اپنے چیمبر میں بیٹھے تھے ، میری سپیکر سے بات ہوئی ، انہوں نے کہا کہ

میں انہیں نکال رہا ہوں، اور کوئی طریقہ ممکن نہیں، ممکن ہے انہوں نے بھٹو صاحب سے بات کی ہو۔ فیڈرل سیکورٹی فورس والی بات بالکل غلط ہے۔

س:۔ آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ بھٹو صاحب جمہوریت پسند تھے۔ کیا آپ کے پاس اس دعوے کی سچائی میں کوئی دلیل ہے؟

ج:۔ مارچ ۷۷ء کے انتخابات کے فوراً بعد قومی اتحاد نے مہم چلائی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ الیکشن دوبارہ کرائے جائیں۔ بھٹو صاحب نے کہہ دیا تھا کہ وہ قومی اسمبلی کے الیکشن نہیں کرائیں گے۔ لیکن پانچ یا چھ اپریل کو میرا ٹی وی انٹرویو ریکارڈ ہوا۔ اس میں میں نے یہ بات بھی کہی کہ صوبائی اسمبلی کے الیکشن منعقد کراتے ہیں، اگر اس میں قومی اتحاد جیت جاتا ہے تو قومی اسمبلی کے الیکشن بھی کروا دیں گے۔ یہ بات بھٹو صاحب کے خیالات کے خلاف تھی۔ وزیر اطلاعات طاہر محمد خاں نے یہ انٹرویو روک دیا کہ یہ تو پارٹی فیصلے کے خلاف ہے۔ میں کراچی چلا گیا جہاں نو اپریل کو میں نے وہی بیان دے دیا۔ بھٹو صاحب نے مجھے لاہور بلایا۔ لوگ مجھے کہہ رہے تھے۔ کہ بھٹو صاحب آپ کے اس بیان پر سخت ناراض ہیں۔ میں لاہور پہنچا تو وہ ناراض نہیں ہوئے، بلکہ مجھے کہنے لگے آپ میرے کولیگ ہیں، آپ نے کہہ دیا، مجھے منظور ہے۔ میں نے کہا: لوگوں کا خیال تھا کہ آپ الیکشن سے گھبرا رہے ہیں۔ آپ نے اصولی بات کی کہ الیکشن فیئر ہوا۔ جو دھاندلی ہوئی ہے، وہ تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ کچھ ہمارے وزیروں نے بہت زیادتی کی۔ آگے بڑھ کر حرکتیں کیں، لوگوں کی نظروں میں آگئی۔ بات، یہ کہ ہر شخص کہتا ہے کہ آپ الیکشن جیت رہے تھے۔ یہ سن کر بھٹو صاحب نے مجھے کہا، کہ آپ یہ فارمولا نوابزادہ نصر اللہ خاں صاحب کو دے دیجیے۔ اگر بھٹو صاحب فاشسٹ ہوتے یا جمہوریت پسند نہ ہوتے تو میری بات کا نوٹس لیتے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

نوائے وقت نے لکھا کہ یہ بڑا اچھا فارمولا ہے۔ اس پر عمل کیا جائے۔ نوابزادہ صاحب نے کہا کہ ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کہنے لگے، تمہارا فارمولا ہے۔ تم ہمارے پاس پہنچا دو۔ میں نوابزادہ صاحب کے پاس گیا، وہ کہنے لگے کہ میں تو تیار ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں بدامنی نہ ہو۔ لیکن ہمارے دو آدمی ایسے ہیں، جو نہیں چاہتے۔

س:۔ انہوں نے کن اصحاب کا نام لیا تھا؟

ج:۔ (۱) .... (۲) .... دونوں نام آف دی ریکارڈ ہی رکھیے۔

س:۔ اخبارات میں آیا تھا کہ آپ کی نوابزادہ صاحب سے ملاقات ہوئی، لیکن نوابزادہ صاحب انکار کر گئے۔

ج:۔ انکار نہیں کیا، چپ رہے تھے۔

س:۔ نوابزادہ صاحب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

ج:۔ اچھے آدمی ہیں، نیک آدمی ہیں، میں ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہا ہوں۔ میرے ساتھ متحدہ

حزبِ اختلاف میں تھے۔ ہم نے اکٹھے کام کیا تھا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب ایسٹ پاکستان گئے، تو مجھے کہا کہ متحدہ حزبِ اختلاف میں آپ میری جگہ کام کریں گے۔ مولانا مودودی تھے۔ بھاشانی تھے، نوابزادہ صاحب تھے، محمود الحق عثمانی تھے۔ میں نے دیکھا کہ نواب زادہ صاحب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں، محبِ وطن ہیں، لوگ باتیں کرتے ہیں۔ کہ یہ پہلے احراری تھے۔ میں کہتا ہوں، جو کچھ بھی تھے، پاکستان کے ہمدرد ہیں۔ عالی ظرف آدمی ہیں، نڈر آدمی ہیں، صوبائی تعصب ان میں نہیں ۔

س:۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں چاہتے تھے کہ مذاکرات ہو جائیں۔

ج:۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو بہت پہلے معاملہ سُدھر چکا ہوتا۔

س:۔ پھر تو مارشل لا ء بھی نہ لگتا۔

ج:۔ مارشل لاء بھی نہ لگتا، خیر وہ تو انہوں نے لگانا ہی تھا۔

س:۔ بہر حال اس طرح تباہی نہ مچتی ۔

ج: تباہی نہ مچتی ۔

س:۔ ہنگاموں کے دنوں میں بھٹو صاحب نے اسمبلی تقریر میں کہا تھا کہ یہ موومنٹ اب اتحاد والوں کے ہاتھ میں نہیں رہی ، اسے کوئی اور ہی ہینڈل کر رہا ہے۔

ج:۔ صاف معلوم ہے۔ جس طرح ہمارے پروفیسر غفور صاحب، ان کی بیگم صاحبہ سوزو کپڑے پرواشن تقسیم کر رہے تھے، یہ ان کے گھروں سے تو نہیں آیا ہوا تھا۔ لاکھوں روپے کا روزانہ تقسیم ہوتا تھا۔ آج کل ہمارے لوگ جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ جان کر دُکھ ہوا کہ ان کے گھروں میں دال تک نہیں اور کوئی لے جاتا بھی نہیں۔ اگر ان کے پیچھے پیسے والے ہوتے تو انہیں اور ان کے گھر والوں کو اشیاء پہنچتی رہتیں ۔

س:۔ بھٹو صاحب نے خارجہ معاملات کی پرواہ کیے بغیر اسمبلی تقریر میں امریکی صدر جمی کارٹر پر کیوں اتنی نکتہ چینی کی؟ کیا واقعی وہ لوگ بھٹو کے خلاف تھے؟

ج: شہنشاہ ایران کے خلاف کیوں ہو گئے، وہ شاہ کو سبق سکھانا چاہتے تھے، لیکن خود سبق سیکھ گئے ہیں۔ یہاں بھی بے چینی پھیلائی، وہاں بھی۔ تو بھٹو صاحب نے ری پراسیسنگ پلانٹ کی تنصیب پر جو سٹینڈ لیا اور تیسری دنیا کو اٹھانے کا تہیہ جو کیا۔ یہ باتیں ان کے زوال کا باعث بنیں۔ انہیں تکلیف ہو رہی تھی، کہ یہ تیسری دنیا کو اٹھا رہا ہے۔ اس سے پریشر بہت بڑھ جائے گا۔ اگست ۷۶ء میں کسنجر لاہور آیا اور اس نے بھٹو صاحب پر زور دیا۔ کہ وہ ری پراسیسنگ پلانٹ کا پروگرام ملتوی کر دیں۔ لیکن بھٹو کہاں ماننے والا تھا۔

س:۔ رفیق باجوہ کا کیا قصہ ہوا؟

ج :۔ رفیق باجوہ بھٹو صاحب سے ملا تھا۔ لیکن وہ اچھی نیت سے ملا تھا۔ ایجنٹ بننے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شائد ملک کے مفاد میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ نیک آدمی

ہے، کئی لیڈر ملتے ہیں۔ بات نہیں نکلتی۔ لیکن اتحاد والے باجوہ کے تو پیچھے ہی پڑھ گئے۔ میں نے بھی بھٹو صاحب کی اجازت کے بغیر فارمولا پیش کیا تھا۔ وہ مان گئے۔ نورانی صاحب بھی سوچ سکتے تھے۔ کہ اگر باجوہ صاحب وزیر اعظم سے ملاقات کر ہی آئے ہیں۔ تو ہرج کیا ہے، لیکن وہ تو غصے میں آگئے۔

س:۔ آپ کا خیال ہے کہ اگر بھٹو صاحب کو اندازہ ہوتا کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے تو وہ الیکشن کراتے؟ جبکہ وہ الیکشن ایک سال تک ملتوی رکھ سکتے تھے۔

ج:۔ آئین میں گنجائش تھی۔ انہوں نے الیکشن کو ایک سال آگے اس لیے نہ رکھا کہ انہیں یقین تھا کہ اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ الیکشن کا ایک ریگولر پراسیس شروع ہو جائے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں الیکشن سے پہلو تہی کرتا ہوں۔ ہماری اپوزیشن میں سے بیشتر الیکشن پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن وہ تاثر یہی دیتے رہے کہ بھٹو صاحب الیکشن نہیں کروانا چاہتے۔

س:۔ سن رہے ہیں کہ ائیر مارشل اصغر خاں کا پیپلز پارٹی سے سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

ج:۔ سمجھوتہ تو نہیں ہے، باقی یہ ہے کہ وہ بھی جمہوری عمل پر یقین کریں تو بڑی اچھی بات ہے۔

س:۔ وائٹ پیپروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے؟

ج:۔ میرے خیال میں تاریخ میں ایسی مثال کہیں نہیں ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ بھٹو صاحب کی گورنمنٹ سے غلطیاں ہوئیں۔ میں نہیں کہتا کہ زیادتیاں نہیں ہوئیں۔ میں کیبنٹ میں بھی کہتا رہا، بعد میں بھی کہتا رہا ہوں کہ اتنی زیادہ دفعہ ۱۴۴ نہیں لگانی چاہیئے۔ غلط بات تھی۔ ٹھیک ہے۔ جب آرمی بھارتی قید سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس وقت اگر بہت زیادہ ایکٹوٹی کرنے دیتے تو خطرہ تھا۔ پھر بھی جب ولی خاں نے کہا تھا کہ یہاں تقریر کی آزادی نہیں ہے، تو میں نے سپریم کورٹ میں بتایا کہ انہوں نے نو مہینے میں پچاس پبلک تقریریں کی تھیں۔ اگر ہفتے میں ایک بھی کریں تو سال میں ۵۲ ہفتے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود میں کہوں گا کہ دفعہ ۱۴۴ کا بہت غلط استعمال ہوا ہے۔

س:۔ قومی اتحاد کی تحریک سے پہلے اپوزیشن لیڈر بھٹو صاحب سے ملتے رہے؟

ج:۔ لیڈر ہمیشہ ملتے رہتے ہیں، اسمبلی میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چودھری ظہور الٰہی کا آپ نے ذکر کیا تھا جس روز اسمبلی سے باہر پھینکنے کا واقعہ رونما ہوا تو اس سے اگلے روز چودھری صاحب ممتاز بھٹو کے پاس چلے گئے۔ کئی چیزوں پہ دستخط کرائے کہ بھئی یہ کرو، وہ کرو، اپوزیشن والوں کو بھی ٹائم دیا کرو۔ ایک دفعہ تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میرے بچوں نے بھٹو کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ تب ان کے ڈیمانڈ پورے نہیں ہوتے تھے۔ اب تو وہ کہتے ہیں۔ اسلام جلدی لاؤ۔ سود ختم ہو۔ کیونکہ انہوں نے حکومت سے جو قرضے لے رکھے ہیں، ان پر پچپن ساٹھ لاکھ روپیہ سود ان کے ذمے واجب الادا



میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، ذوالفقار علی بھٹو، چودہری ظہور الٰہی۔

۱۷ جنوری ۱۹۷۱ء مسٹر بھٹو صدر جنرل یحییٰ خاں کا موہنجوداڑو ائرپورٹ پر استقبال کرنے کے بعد



ہے یہ اس زمانے کے فگرز ہیں، جب میں گورنمنٹ میں تھا، جب تک چودھری صاحب جیل نہیں گئے. بھٹو صاحب سے سودے بازی کرتے رہے.

س :۔ بھٹو صاحب نہیں مان رہے تھے؟

ج :۔ مجھے نہیں پتہ کیا تھا۔ یہ اپنی طرف سے تیار تھے اور ہمیشہ ملتے رہے۔ چیمہ صاحب (جسٹس افضل چیمہ) کو سپریم کورٹ میں انہی نے بنوایا تھا۔ میں نے مخالفت کی تھی. صاف صاف بات کرتا ہوں.

س :۔ حکومت میں اس وقت جو لوگ ہیں، آپ کے خیال میں وہ اسلام نافذ کرنے میں مخلص ہیں.

ج :۔ بعض مخلص ہوں گے اور بعض یقیناً مخلص نہیں. یہ اسلام جس طریقے سے لانا چاہتے ہیں. لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں گے. اسلام کی اصل سپرٹ کے خلاف باتیں کر رہے ہیں، ڈنڈے کے زور سے اسلام نہیں آتا لا اکراہ فی الدین والی بات نہیں ہے.

س :۔ تو پھر کس طرح اسلام کا نفاذ ہونا چاہیئے.

ج :۔ اسلام لوگوں کی مرضی سے آئے گا۔ ڈیموکریسی سے آئے گا، پارلیمنٹ سے آئے گا. آپ دیکھیں کہ مسلمانوں کا حکومتی مرکز دہلی، آگرہ تھا، لیکن اسلام پھیلا، سندھ، بلوچستان، سرحد، پنجاب اور بنگال میں. اس لیے کہ وہاں اللہ والے بیٹھے تھے. جنہوں نے لوگوں سے محبت کے ساتھ باتیں کیں اور لوگ مسلمان ہو گئے. جہاں ڈنڈا موجود تھا وہاں کوئی اسلام کے نزدیک نہیں جاتا تھا.

س :۔ بھٹو صاحب نے آپ کے سامنے شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں کبھی کوئی بات کی؟

ج :۔ مجیب نے بھٹو صاحب سے کہا کہ آپ مجھے رہا کر دیں، میں بھارت نہیں جاؤں گا. میں آپ سے اچھے تعلقات رکھوں گا، کوشش کریں گے کہ پھر قریب آئیں، اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ انڈیا جاؤں اور وہاں سے ڈھاکہ جاؤں، بلکہ میں لندن جاؤں گا، وہاں سے جہاز چارٹر کر کے سیدھا ڈھاکہ جاؤں گا، پتہ نہیں بھٹو صاحب نے اس مقصد کے لیے مجیب کو کتنے ہزار یا کتنے لاکھ ڈالر دیئے. لیکن اس نے لندن جا کے اپنے بنک میں جمع کرا دیئے. اور وہاں سے بی او اے سی کے ذریعے دہلی چلا گیا اور پھر ڈھاکہ گیا.

س :۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد میں نے پاکستان میں موجود تقریباً سیاسی لیڈروں سے انٹرویو کیا ہر کوئی یہی کہتا رہا کہ مجیب محب وطن تھا، پاکستان کا بڑا بہی خواہ تھا، جبکہ بھٹو علیحدگی پسند تھا.

ج :۔ غلط بات ہے.

س:۔ بھٹو صاحب نے اُدھر تم، اِدھر ہم، کا نعرہ لگایا تھا، اس سے اس موقف کو تقویت نہیں ملتی؟

ج:۔ غلط ہے، ہم نے سپریم کورٹ میں بھی کہا ہے، جس تاریخ کو بھٹو صاحب نے بات کی۔ اس کے اگلے روز انہوں نے پریس کانفرنس میں اس کی تردید کر دی تھی، مگر پی پی آئی کے معظم علی تب تک بات کو بہت اچھال چکے تھے۔ بعد میں تردید کوئی نہیں پڑھتا۔ انہوں نے کہا تھا۔ اُدھر سے تم، اِدھر سے ہم، گرینڈ کولیشن بناتے ہیں، اگر چھ نکات کو چھوڑ دیتے ہو تو آپ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کریں، میں اپوزیشن میں بیٹھتا ہوں، اگر آپ چھ نکات نہیں چھوڑتے تو یہ بریک اپ آف پاکستان ہے۔ اس سے کنفیڈریشن بنے گی، فیڈریشن نہیں رہے گی۔ کم از کم پانچ یا ساڑھے چار نکات میں ہم آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ اگر آپ چھ نکات پر بضد ہیں، تو ہم اسمبلی میں نہیں بیٹھیں گے، کیونکہ آپ اکثریت کے بل بوتے پر ایک دم اپنی مرضی نافذ کر دیں گے، بہتر یہی ہے کہ پہلے ہم آپس میں بات چیت کریں۔ ہاں اگر آئین بنانے کے لیے ۱۲۰ دن کی حد ختم کر دی جائے تو ہم اسمبلی میں بیٹھنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ شیخ مجیب ۶ نکات پر مصر تھے۔ اس لیے بھٹو صاحب نے گرینڈ کولیشن والی بات کی۔

بھٹو اور مجیب میں کون نیک تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ جب بھٹو صاحب صدر پاکستان کی حیثیت سے ڈھاکہ گئے تو بہت بڑا استقبال ہوا۔ مجیب حکومت کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب کا ڈھاکہ میں اس طرح استقبال نہیں ہوگا، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ حالت ہو گئی ہے تو واپسی کے وقت انہوں نے ڈھاکہ میں کرفیو لگا دیا۔ کرفیو کے باوجود لوگ آ گئے، درختوں پر چڑھ گئے، مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ مسلمان جانتا ہے کہ بھٹو نے اسلام کی خدمت کی ہے، میاں طفیل محمد نے نہیں کی۔ اس صدی میں قائداعظمؒ سے بڑھ کر کسی نے بھی اسلام کی خدمت نہیں کی، کوئی مثال ہی نہیں ملتی، لیکن اب ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے میں

آپ کہہ سکتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے بھی مذمت کی، اسلامی کانفرنس کی، قادیانی مسئلہ حل کیا، آئین میں پاکستان کو اسلامی ریاست لکھا، کمیٹی میں مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر اور جے اے رحیم صاحب نہیں چاہتے تھے کہ آئین میں پاکستان کو اسلامی سٹیٹ لکھا جائے۔ میں اس وقت لاہور میں تھا۔ مجھے فون آیا، میں وہاں گیا۔ اس سے پہلے سوال یہ تھا کہ مسلمان کون ہے، ہیڈ آف دی سٹیٹ مسلمان ہونا چاہیئے، مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس میں مشکل یہ ہے کہ پہلے آپ مسلمان کو ڈیفائن کریں، آپ قادیانیوں کو اس میں سے نکالیں، آئین میں اس کی تعریف ہونی چاہیئے، کہ مسلمان کیا ہے؟ قیوم خان کہتے تھے، اس کے بعد ہر عدالت میں جھگڑا ہوگا کہ حلف نامہ داخل کرو کہ تم مسلمان ہو کہ نہیں

ہو۔ بڑا الجھاؤ پیدا ہوگا۔ اس پر میں نے کہا، بھئی معاملہ ہے صدر کا، اس کے حلف نامے میں کہہ دیجئے کہ میں مسلمان ہوں، میں ان سب باتوں پر یقین رکھتا ہوں، معاملہ صاف ہو جائے گا۔ نورانی صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے مسئلہ حل کر دیا۔

اس کے بعد دوسرا جھگڑا آگیا کہ اسلام سٹیٹ ریلیجن (سرکاری مذہب) نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے یہ نہ لکھیں، میں نے کہا کیوں نہ لکھیں، ہم مسلمان ہیں، ہمیں اس بات پر فخر ہے، میری اس بات سے بھٹو صاحب ایک دم متفق ہو گئے۔ جے اے رحیم صاحب ناراض ہو گئے۔ کہ تم ملاؤں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہو۔ میں نے کہا یہ بات نہیں۔ مجھے تو فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں، پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا۔ اس کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ آپ اس کی تصدیق نورانی صاحب سے کر سکتے ہیں، انہوں نے مجھے خود کہا کہ انہوں نے میری تعریف پبلک جلسے میں کی ہے۔ میں نے نورانی صاحب سے مذاقاً کہا تو پھر آپ مجھے گورنمنٹ سے نکلوانا چاہتے ہیں، تو یہ چیزیں ہیں، بھٹو صاحب کبھی بھی اسلام کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے۔ مسلم بلاک کے لیے انہوں نے جو خدمات انجام دیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

گزشتہ دنوں کوئٹہ میں مجھے ایک آدمی کہنے لگا، اندرا گاندھی نے بھٹو صاحب کے حق میں جو بیان دیا ہے۔ اس پر جماعت اسلامی کہتی ہے کہ اندرا بھٹو کی دوست ہے، میں نے اس شخص کو بتایا کہ اندرا گاندھی نہرو کی بیٹی ہے۔ نہرو پاکستان کے خلاف تھا، وہ بھٹو صاحب کے خلاف رہی ہے۔ کیونکہ بھٹو صاحب شملہ معاہدہ میں اسے شکست دے آئے تھے، قیدی لے آئے تھے۔ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ واپس لے لیا تھا، وہ بھٹو کی دوست کیونکر ٹھہری، بات دراصل یہ ہے کہ اُسے بھارتی مسلمانوں کے ووٹ چاہیئیں۔ بھارتی مسلمان بھٹو کی عزت کرتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہاں بعض علاقوں میں خون خرابہ ہو رہا ہے۔ جنتا پارٹی بدنام ہو رہی ہے، مسلمانوں کے دل جیتنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اس کا یہی طریقہ ہے۔ کہ بھٹو صاحب کے حق میں بیان دے دو۔ اب اس نے دس کروڑ بھارتی مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ وہ الیکشن جیتے ہی جیتے، اس لیے کہ وہاں سیاست کا بیلنس مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، بات یہ ہے جی، مسلمان جہاں بھی ہے۔ بھٹو کی عزت کرتا ہے۔ ترکی میں آپ چلے جائیں، افغانستان میں چلے جائیں، کسی بھی جگہ چلے جائیں، یہی کیفیت آپ کو ملے گی۔

میرا ایک دوست ہے۔ جو گورنمنٹ سرونٹ ہے، میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا، وہ کسی کانفرنس میں گیا تھا۔ وہاں ایک عرب لیڈر نے اسے کہا، بھٹو کی آنکھ ساری دُنیا کی سیاست کو دیکھ سکتی تھی، لیکن اس آنکھ پر آپ نے پردہ ڈال دیا ہے۔

س:۔ بھٹو صاحب جیل میں کیسے ہیں، زیادہ پریشان ہیں، بیمار ہیں، کیا صورت ہے۔

ج:۔ میں صحیح بتا رہا ہوں کہ کئی دفعہ میں کیس پر بات کرتا تھا تو وہ ملک کے بارے میں بات کرتے تھے، پھانسی کے تختے پر بھی مجھ سے ملکی مفاد کی بات کرتے رہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ میں کیس پر بات کرتا تھا۔ تو ان کی نظر انٹرنیشنل معاملات پر ہوتی۔ یہ باجپائی کیا کر رہا ہے، انہیں سمجھ نہیں آرہا۔ فلاں مسئلہ یوں ہے، اسے یوں ہونا چاہیئے تھا، اس میں حکومت نے جو موقف لیا وہ نہیں لینا چاہیئے۔ فلاں بات جو ہے یہ باتیں میں نے آپ سے کی ہیں، خارجہ معاملات کا ان سے تعلق ہے، انہیں آف دی ریکارڈ ہی رکھئے!

س:۔ اور پر آپ نے بھٹو صاحب کو جمہوریت پسند کہا، یہ کیا جمہوریت پسندی ہوئی کہ سرحد اور بلوچستان میں انہوں نے منتخب حکومتیں ہی برطرف کر دیں۔

ج:۔ دیکھیں جی، سرحد میں تو مفتی صاحب نے خود استعفا دیا تھا۔

س:۔ وہ گورنر کی برطرفی پر احتجاجاً مستعفی ہوئے تھے،

ج:۔ جیسے بھی ہو، انہیں ڈسمس تو نہیں کیا تھا، رہی بات بلوچستان کی، بلوچستان کی بیس سیٹیں تھیں، نیپ کی آٹھ، پیپلز پارٹی کی ایک، جمعیت العلمائے اسلام کی تین، اکبر بگٹی کے ساتھ دو یا تین تھے، نہیں نہیں وہ نیپ کے ساتھ ہی تھے، دو شاید مسلم لیگ کی تھیں۔ بہت چھوٹی اسمبلی تھی۔ نیپ کی میجارٹی نہیں تھی۔ جمعیت العلمائے اسلام کے ساتھ مل کر وہ گیارہ ہو گئے اور مخلوط حکومت بنالی، ایک عورت ایلیکٹ کی اور بارہ ہو گئے۔

جمعیت العلمائے اسلام اور نیپ میں بڑا فرق ہے، گورنمنٹ بنانا اور بات ہے، ایک مذہبی پارٹی تھی، دوسری اپنے آپ کو سوشلسٹ سیکولر کہتی تھی تاہم جب ان کی حکومت بن گئی۔ تو بھٹو صاحب ان کی پوری مدد کرنا چاہتے تھے۔ بعد میں عدالت میں کیس بھی آگیا۔ اس کی تفصیلات آپ دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال اختلافات پیدا ہو گئے، چھوٹی باتوں پر، بڑی باتوں پر، مرکز کو یہ حق تھا کہ صوبے کو ہدایات جاری کرے، ایمرجنسی میں یہ آئینی اختیارات تھے، وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے، ممکن ہے، انہیں یہ بات غلط لگی ہو کہ کیوں یہاں ڈائریکشن دیتے ہو، حالانکہ دخل اندازی کی بات نہیں تھی، بھٹو صاحب نے انہیں ڈویلپمنٹ کے لیے بڑا پیسہ دیا تھا، جبکہ نیپ سمجھتی تھی کہ بلوچستان میں ان کی انڈیپنڈنٹ گورنمنٹ بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ ساحل مکران کے علاقے میں، کوسٹ گارڈ کے جو آفیسر جاتے تھے، ان کی ڈیوٹی تھی، ممکن ہے۔ وہ وہاں جا کے اپنی ڈیوٹی میں تجاوز کرتے ہوں، چیف منسٹر نے کہا، یہ تو میری اجازت کے بغیر نہیں آسکتے، آپ سوچیں کہ ایک ملک ہے، وہاں فیڈرل گورنمنٹ ہے، جس کے اپنے قانون ہیں۔ کسٹم قانون ہوتا ہے مگر ان کے افسر کو وزیر اعلیٰ کی اجازت کے بغیر صوبے کے اندر جانے کی اجازت نہ ہو۔

میں ایک چھوٹی سی مثال دے رہا ہوں، وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل کا جھگڑا تھا جام صاحب لس بیلہ کے ساتھ، ان کے تعلقات مدت سے خراب چلے آرہے تھے۔ وہاں

جھگڑا ہو گیا۔ تو چیف منسٹر مینگل لشکر لے کر پہنچ گئے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ وزیر اعلیٰ صاحب لشکر کو لیڈ کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ لطف یہ کہ انہوں نے کوئٹہ میں موجود پولیس سے کہا کہ اپنے ہتھیار میرے قبیلے کو دے دو۔ اگر واقعی وزیر اعلیٰ صاحب کو کوئی پرابلم تھی تو انہیں چاہیئے تھا کہ مرکزی حکومت کو بتاتے کہ جام صاحب کے لوگ، بقول ان کے، بغاوت کر رہے ہیں، مشورہ کرتے کیا کرنا چاہیئے، وہاں فورسز موجود تھیں، آرمی بھی تھی، لیکن وہ اپنا لشکر لیکر وہاں پہنچ گئے، پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے، کھانا نہیں مل رہا تھا۔ حکومت کو جہاز پرسے کھانا پھینکنا پڑا۔ اور لوگ مرے بھی، جب یہ حالات ہو رہے تھے، ساتھ ہی چیف منسٹر صاحب کے بیانات دیکھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ کنفرنٹیشن شروع ہو گئی ہے۔

س:۔ ابھی ان دنوں مینگل صاحب نے لاہور میں یہ بیان دیا تھا کہ اگر پاکستان کو کچھ ہو گیا تو ہم بلوچستان کا نام پاکستان رکھ لیں گے۔

ج:۔ خیر، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن نیپ کے جن بیانات کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ نیپ کیس میں آپ دیکھ لیں، یہاں میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، حد تو یہ ہے کہ رابطہ کمیٹی کی میٹنگ ہوتی تھی، یہ لوگ اس میں آتے ہی نہیں تھے۔

س:۔ یہ تفصیل بتائیں گے آپ؟

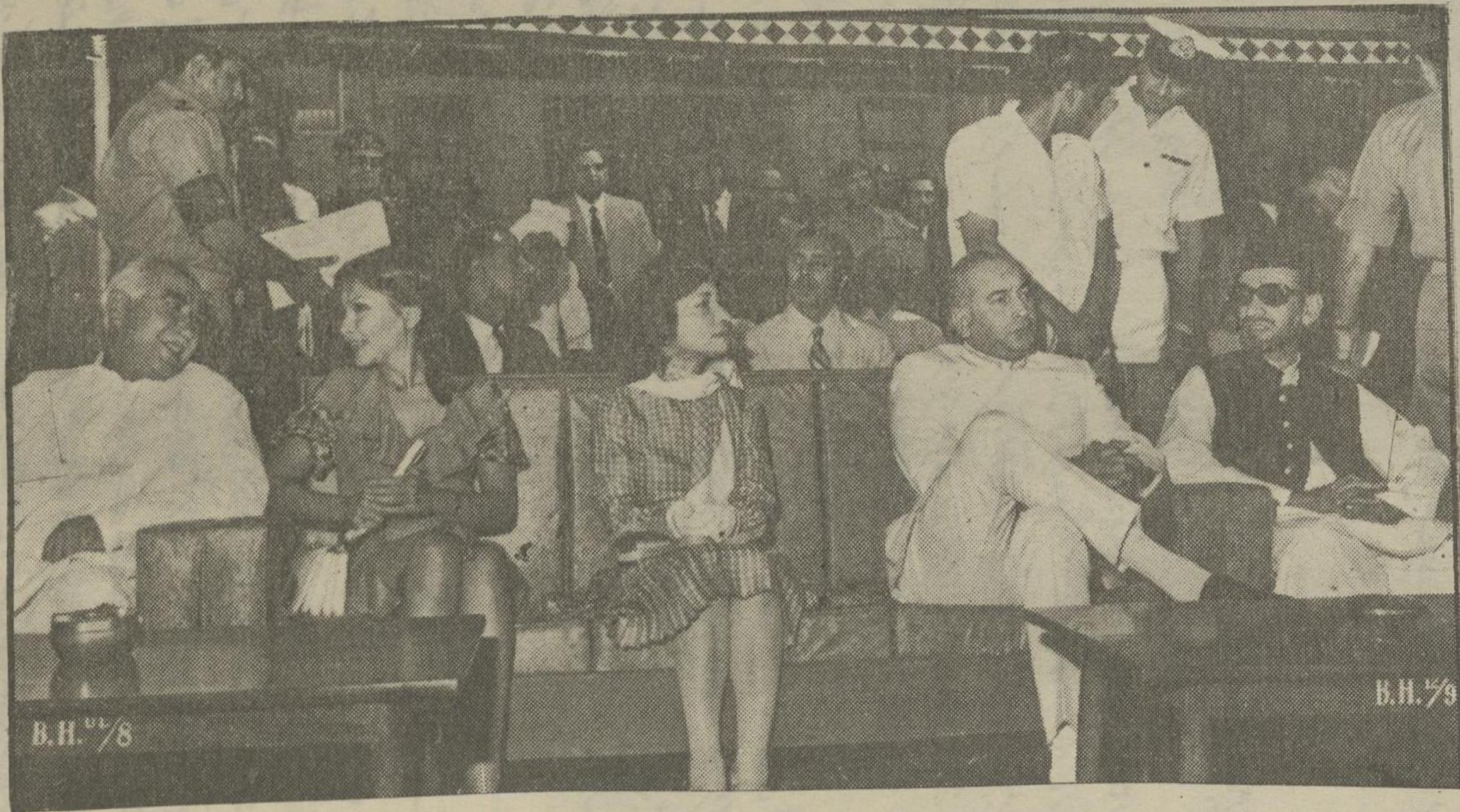
ج:۔ بہت ٹائم لگے گا اس میں۔ اس کی تفصیل سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں موجود ہے۔ جو اس نے نیپ کیس کے سلسلے میں دیا۔

س:۔ نیپ کی حکومتوں نے اردو کو صوبائی زبان قرار دے دیا۔ اس سے ان کا قومی جذبہ آشکارا نہیں ہوتا کیا؟

ج:۔ دراصل انگریزی ان کے منسٹر لکھنا نہیں جانتے تھے۔ ملاں جو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے اردو صوبے کی سرکاری زبان ہوئی تھی۔ ورنہ انہیں اردو سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ بزنجو نے مجھے قصوری کے گھر کہا تھا کہ میں صرف بلوچی کو زبان بناؤں گا، میں نے پوچھا، پشتو کا کیا ہو گا، اردو کا کیا ہو گا۔ کہنے لگا، "اس کا جو مرضی ہوتا رہے۔" وہ لوگ کہتے تھے۔ کہ آپ پٹھان فرنیٹر میں چلے جائیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اردو زبان سے کوئی مخلص نہیں تھے۔

س:۔ سرحد والوں نے آخر اردو کو کیوں اختیار کیا جبکہ وہ تو پشتو بنا سکتے تھے؟

ج:۔ پشتو لکھی نہیں جاتی، سب لوگ جانتے بھی نہیں، پنجاب اور یوپی سے آئے ہوئے سٹاف کے لیے مشکل ہو جاتا، میں نہیں کہتا کہ ان کی نیت خراب تھی کہ وہ اردو نہیں چاہتے تھے۔ مطلب یہ کہ انہیں مجبوراً اردو کا اختیار کرنا پڑا۔ اس میں کوئی جذبہ کار فرما نہیں تھا۔



سردار عطاء اللہ مینگل (تب وزیراعلیٰ بلوچستان) وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو۔ شہزادی اشرف پہلوی اور غوث بخش بزنجو (تب گورنر بلوچستان)

س :۔ اس سلسلے میں آپ کا مطالعہ، مشاہدہ کیا کہتا ہے۔ کیا یہ لوگ واقعی غدار تھے؟
ج :۔ میرے ان کے بارے میں اچھے خیالات تھے، میں نہیں کہتا کہ وہ ملک دشمن ہیں، کیونکہ مینگل صاحب کی بیک گراؤنڈ ہے، بزنجو صاحب تو شروع سے کانگرسی تھے، ان کے حالیہ بیانات بھی اس پر شاہد ہیں، البتہ مینگل صاحب، بگٹی صاحب، مری صاحب یہ کانگرسی نہیں تھے۔
س :۔ اچھا!
ج :۔ یہ تو پاکستان کے وقت ینگ آدمی تھے، حکومت کی تائید بھی کرتے رہے ہیں۔
س :۔ انہوں نے پاکستان بنتے وقت ووٹ بھی پاکستان کو دیا تھا کیا؟
ج :۔ ان کے بزرگوں نے ووٹ دیئے تھے، اُن کے ووٹوں سے بلوچستان پاکستان میں شامل ہوا۔ غلط فہمیاں انہوں نے ضرور پیدا کیں، ان کی زیادہ تر کوشش یہ تھی کہ سرداری رہے بجائے اس کے کہ ملک و قوم کے لیے کچھ کرتے، سرداریوں کے لیے لڑتے رہے، کہتے ہیں سوشلسٹ ہیں، لیکن سوشلزم اور سرداری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سڑک نہیں بننے دیتے، سکول نہیں بننے دیتے، مسجد نہیں بننے دیتے۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ ہم سوشلسٹ ہیں۔
س :۔ یہ لوگ واقعی سڑک بننے کی مخالفت کرتے ہیں؟
ج :۔ یہ تو کالاباغ کے زمانے سے شروع ہے، آرسی ڈی ہائی وے کراچی سے شروع ہوتی ہے اور ایران تک جاتی ہے، راستے میں مینگل صاحب کا علاقہ ہے، سڑک کا وہ ساٹھ میل حصہ ابھی تک نہیں بنا، انہیں خطرہ ہے، کہ سڑک بن گئی تو ہمارے لوگوں میں زندگی آ جائے گی، انہیں ہوا لگ جائے گی اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے آکسفورڈ میں داخل کراتے ہیں۔
س :۔ سرداری نظام کا خاتمہ اس سلسلے کی کڑی تو نہیں تھا؟
ج :۔ اور پھر لے آئے اس کو، ٹھیک بات ہے جی کہ بھٹو صاحب کے زمانے میں یہ لوگ جیل میں گئے۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں یہ ہوا، میں پوچھتا ہوں، آپ کے زمانے میں کیا ہوا۔ یحییٰ خاں کے زمانے میں کوڑے پڑ رہے تھے، بہت کم لوگوں کو پڑتے تھے۔ وہ بھی سیاسی بنیاد پر نہیں پڑتے تھے۔ پھر بھی بھٹو صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ہمیں پی این اے کے ہنگاموں کی وجہ سے تین شہروں میں مارشل لاء لگانا پڑا تو یہ محدود مارشل لا تھا، وہ بھی ہمارے بعض جنرل صاحبان کہتے تھے کہ لوگوں کو کوڑوں کی سزا ملے تو مومنٹ ختم ہوسکتی ہے۔ ہم نے کہا و یہ نہیں ہوگا۔
س :۔ آج آپ مارشل لا کی کیسے مخالفت کر سکتے ہیں، جبکہ آپ کے اپنے دور میں مارشل لا نافذ رہا؟
ج :۔ مارشل لا تو آئرلینڈ میں بھی لگا ہوا ہے۔ حکومت آرمی سے کہتی ہے کہ وہ آکر ہماری

مدد کرے، یہ چیز آئین میں درج ہے، ہمارا مارشل لا آئین کے تحت تھا۔ جبکہ موجودہ مارشل لا نوّے دن کے لیے آیا تھا۔

س:۔ نیپ کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے، یا پھر جس طرح سے بھٹو صاحب کہتے رہے۔ پھر سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی ہوا۔ ان ڈھیر ساری باتوں کے باوجود بھٹو صاحب نیپ کے لیڈروں کے ساتھ جیلوں میں مذاکرات کیوں کرتے رہے؟

ج:۔ بھئی دیکھیں! کابل کے ان کے دوست کہنے لگے، ہم ڈیورنڈ لائن مان لیں گے، آپ انہیں (ولی خان وغیرہ) راضی کریں اس اہم قومی معاملے کی خاطر بھٹو صاحب کیسے مذاکرات نہ کرتے، سو دفعہ بات کرتے، بھٹو صاحب نے کہا، ٹھیک ہے میں انہیں چھوڑنے کے لیے تیار ہوں، ہوتے ہوتے بات یہاں تک آ پہنچی کہ افغان گورنمنٹ نے کہا کہ پہلے آپ انہیں چھوڑیں بعد میں ہم ڈیورنڈ لائن تسلیم کرلیں گے، بھٹو صاحب نے کہا، نہیں، پہلے آپ ڈیورنڈ لائن تسلیم کریں۔ پھر ہم انہیں چھوڑیں گے، ان کے خلاف کوئی کیس نہیں ہوگا۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں باتیں بیک وقت ہوں گی۔ ایک ہی وقت میں نیپ والے رہا ہوں گے، عین اسی وقت افغان گورنمنٹ ڈیورنڈ لائن تسلیم کرنے کا اعلان کررہی ہوگی۔

اب آپ دیکھ رہے ہیں کیا ہوا۔ انہوں نے نیپ والوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن وہ (افغان حکومت) ڈیورنڈ لائن کی طرف آ ہی نہیں رہے۔

س:۔ گویا بھٹو صاحب کابل حکومت کے ساتھ باقاعدہ سودے بازی کر رہے تھے۔

ج:۔ جی ہاں! اس طرح پختونستان کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔ یہ تو جنرل صاحب بڑے جوش میں چلے گئے کہ ہم جلد فیصلہ کرا دیں گے۔ اور یہ بلوچ لیڈر بڑے خوش ہوں گے۔ بڑی اچھی بات ہے کہ انہیں چھوڑا، لیکن ڈیورنڈ لائن کا معاملہ تو وہیں کا وہیں رہ گیا۔

س:۔ ٹھیک ہے کہ بھٹو صاحب نے ڈیورنڈ لائن کی خاطر کابل سے مذاکرات کیے۔ پھر بھی اگر نیپ والے غدار تھے تو بھٹو صاحب کو انہیں کسی صورت چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جبکہ بھٹو گورنمنٹ انہیں مسلسل غدار کہتی رہی۔

ج:۔ یہ بات آپ جنرل صاحب سے پوچھیں، میں کسی کو غدار نہیں کہتا۔ سپریم کورٹ نے کہا تھا کہ یہ لوگ ملک کے تحفظ کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

س:۔ سپریم کورٹ نے بھی غدار کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

ج:۔ نہیں کیا۔

س:۔ آپ تو بھٹو صاحب کے خاصے قریب رہے۔ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے کہ وہ مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے۔

ج:۔ وہ بڑے مہربان تھے۔ میری بات سنتے تھے۔ میں نے ان کی رائے کی کئی معاملات پر مخالفت کی، وہ اس وقت اگر ناراض بھی ہوتے لیکن بعد میں کہہ دیتے کہ میں آپ سے

اتفاق کرتا ہوں ۔

س :۔ وہ اپنے فیصلے میں ترمیم کر لیتے تھے ۔

ج :۔ ترمیم کر لیتے تھے ۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ۔

س :۔ بھٹو نسنے والی بات غلط ہے ۔

ج :۔ بالکل غلط ہے ۔

س :۔ کوئی ایسا واقعہ آپ بتائیں گے ہمیں ،

ج :۔ کابینہ کی باتیں ہیں ، آفس سیکرٹ میں آگئیں ۔

س :۔ لوگ بھٹو صاحب سے خوفزدہ کیوں ہیں کہ اگر وہ اقتدار میں پھر آگئے یا بچ گئے تو تہس نہس کر دیں گے ۔

ج :۔ انہوں نے پہلے کیا کیا ہے جواب کریں گے ۔

س :۔ خواجہ رفیق ، ڈاکٹر نذیر ، دلائی کیمپ ....

ج :۔ کس آدمی کو آج گولی نہیں لگتی ۔ سیاستدان نہیں مارے جارہے ، ان کا نام تک نہیں سُنا کہ کون ہے خواجہ رفیق ۔ مولوی شمس الدین کو کس نے مارا ؟ مراد خان جمالی کو کس نے مارا ؟ دو چار مہینے کی بات ہے سندھ میں جماعت اسلامی کا ایک آدمی مرا وہ کس نے مارا ؟ شیر پاؤ کو کس نے مارا ؟

س :۔ تب سے یہی قیاس کیا جا رہا ہے کہ شیر پاؤ کو بھٹو صاحب نے ہلاک کروایا تھا ، نیپ پر پابندی لگانے کے لیے ۔

ج :۔ میں بات نہیں کرنا چاہتا ، وہ بھی ....

.... بھٹو صاحب نے ہی کروایا تھا ۔ آج (۲۲ جنوری ۷۹ء) میں نے اخبارات میں پڑھا کہ شیر پاؤ خان مزاری صاحب کا بیٹا انگلینڈ جا رہا تھا ، اسے جانے نہیں دیا گیا کہ بھٹو صاحب کے زمانے میں رُول بنا تھا ، اپوزیشن کے لیڈر اور ان کے گھر والے باہر نہیں جائیں گے ۔ حیرت ہے ، مزاری صاحب خود تو چلے جاتے ہیں ، ان پر پابندی نہیں ، ان کے بیٹے پر پابندی لگ گئی ، حرکت یہ خود کر جاتے ہیں ، بعد میں کہتے ہیں ، بھٹو کے کھاتے میں ڈال دو ، چل جائے گا ۔

اگر بھٹو صاحب نے نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی تو یہ ان کا منشور تھا ۔ لینڈ ریفارمز انہوں نے کیں ، حیرت ہے کہ چھوٹے بھٹو پر کوڑے لگتے ہیں ۔ اور چھوٹے بیدی (بشن سنگھ بیدی) پر کوڑے نہیں لگتے ، اور اروڑہ سے ہاتھ ملانے والے دندناتے پھر رہے ہیں ۔

س :۔ بھٹو صاحب نے کبھی سقوط مشرقی پاکستان میں نیازی کے رول پر بھی آپ سے گفتگو کی ۔

ج :۔ رول کا ہمیں پتہ نہیں ، البتہ یحییٰ خان نے وار کمشن میں کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو

کچھ ہوا میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ کیونکہ میں انچارج تھا، میں کمانڈر انچیف تھا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو تو پتہ نہیں، میں نے نیازی کو اختیار دے دیئے تھے۔ ایک طرف یحییٰ خاں کا اُنشن قسطوں میں چھپنے والا انٹرویو ہوگا۔ دوسری طرف وار کمشن میں جسٹس حمود الرحمٰن، مسٹر جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن، مسٹر جسٹس انوار الحق کے سامنے ان کا بیان آئے گا۔ تو پھر آپ دیکھیں گے کہ کیا پابندی تھی کہ وہ اس کمشن کے سامنے ٹھیک ٹھیک باتیں کر سکتے تھے۔

س:۔ جنرل یحییٰ خاں نے یہ بیان دیا تھا کہ میں ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔

ج:۔ میں نے انہیں اس بات پر داد دی تھی۔ بڑا جرأت مندانہ بیان تھا کہ انہوں نے ذمہ داری قبول کر لی۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المیہ مشرقی پاکستان پانچ کردار)

س:۔ وہ رپورٹ شائع کیوں نہ کی گئی۔

ج:۔ اس وقت جو لوگ جی ایچ کیو میں تھے وہ مصر تھے کہ وہ رپورٹ شائع نہ کی جائے۔ مجیب الرحمٰن نے جو الزامات لگائے تھے وار کمشن میں کس حد تک وہ ثابت ہو چکے ہیں، ہم ملک کا منہ نہیں کالا کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ بھٹو صاحب کے خلاف اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے دو دفعہ کہا کہ اس رپورٹ کے کچھ حصے شائع کر دو، باہر نا جو ہے، وہ چھوڑ دیجئے۔ ڈیفنس سٹریٹیجی چھوڑ دیجئے۔ بنگال میں جو کچھ ہوا، لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو کے بارے میں ہے، وہ چھاپ دیجئے۔ تاکہ لوگوں کو اصل بات کا پتہ چل سکے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المیہ مشرقی پاکستان پانچ کردار)

بھٹو صاحب کو گئے اٹھارہ مہینے ہو گئے، ابھی تک کیوں شائع نہیں کی، کیا پابندی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار بھٹو تھا، اتنے وائٹ پیپر آ چکے ہیں تو وہ بھی چھاپ دیتے، کیوں نہیں چھاپتے ....

....

میں ٹکا خاں کو داد دیتا ہوں، مومن آدمی ہیں، مشرقی پاکستان میں یہ گورنر تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ فلاں افسر نے غلط حرکت کی ہے۔ انہیں ساتھ ہی ساتھ سزائیں دیں۔ اور یہ نیازی، یہ اپنے افسروں سے کہتا تھا، تمہارا سکور کتنا ہے۔ کتنی عورتوں کو ریپ کیا ہے۔

(۱)۔.........(۲).........(۳).........(۴).....

.....(۵).........(۶)......... ان چھ آدمیوں کے متعلق وار کمشن نے کہا تھا کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

س:۔ بھٹو صاحب کے حوالے سے ان کے ایک قریبی ساتھی نے مجھے ایک دفعہ بتایا کہ نیازی جب عین جنگ کے زمانے میں ایک روز کے لیے اچانک مغربی پاکستان آیا تو وہاں

سے لوٹے ہوئے نوٹوں کا جہاز بھر کے لایا تھا۔
ج:۔ بھیجے ہوں گے، عزیزوں کے ذریعے۔
س:۔ حکومت کے نوٹس میں یہ باتیں آئیں کہ نیازی وغیرہ وہاں عیاشی کرتے رہے۔
ج:۔ ہاں جی! وار کمشن کی رپورٹ گواہ ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المیۂ مشرقی پاکستان پانچ کردار) بھئی! بلیک بیوٹی کی جو باتیں یحییٰ خاں کرتے ہیں۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب یہ سرنڈر کر رہے تھے، تو وہ گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس کے، جہاں کہ یہ رہتی تھی۔ پردے تبدیل کروا رہی تھی۔ (اس سانحے پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "المیۂ مشرقی پاکستان پانچ کردار")
س:۔ آپ کو پاکستان کا مستقبل کیسا دکھائی دیتا ہے۔
ج:۔ دو چیزیں آپ کی نظر میں ہیں۔ پاکستان کس لیے وجود میں آیا، کیسے آیا، مسلمان انڈیا میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا مسلمان ہونا ایک جرم تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا معاشرہ ہو، جہاں وہ اپنے نظریے کے مطابق رہیں اور آزاد رہیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک ڈیموکریٹک موومنٹ بنائی اور یہ ملک جمہوری عمل کے ذریعے وجود میں آیا۔

مجھے ایک امریکی نے پوچھا کہ ۴۳ برس ہو گئے آپ ابھی تک صحیح معنوں میں ایک قوم نہیں بن سکے۔ ٹھیک ہے آپ اپنے آپ کو پاکستانی سمجھتے ہیں۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں، لیکن آپ میں قومی یکجہتی پیدا نہیں ہو سکی، میں نے انہیں کہا، امریکہ میں دو سو سال سے آئین بنا ہے۔ آپ میں پوری طرح قومی یکجہتی کیوں پیدا نہیں ہو سکی۔ ابھی تک وہاں کوئی اپنے آپ کو آئرش کہتا ہے۔ کوئی سکاٹش کہلاتا ہے۔ کسی کو ڈنچ ہونے پہ فخر ہے۔ دراصل قومی یکجہتی پیدا ہونے میں ایک وقت لگتا ہے۔ اور ایسا جمہوری عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جمہوریت میں ایک پارٹی آتی ہے، جس میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد سبھی جگہوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں اور آپ اگر بیٹھ جائیں ایک ہی پارٹی میں، ہمارا ایک ہی پروگرام ہو، تو پھر میں کہوں گا۔ منیر صاحب! یہ میرا حصہ ہے۔ آپ کہیں گے، ہاں ٹھیک ہے۔ یہ آپ کا حق ہے۔ یہ آپ لے لیں، میں کہوں گا کہ ہمارا علاقہ زیادہ پسماندہ ہے۔ ہمیں تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے۔ پیسے زیادہ دے دیں۔ آپ کہتے ہیں، ہاں لے لیں، آپ ہمارے بھائی ہیں۔ تو یہ احساس ڈیموکریسی میں ہے۔ مل بیٹھتے ہیں نا! ایک دوسرے کے پرابلم کو سمجھتے ہیں، ہمدردی ہوتی ہے۔ ارادے بہت بلند ہوتے ہیں کہ ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ ملک کو آگے بڑھانا ہے۔ جیسا کہ میں مسلم لیگ میں تھا۔ محمد حسین چٹھہ صاحب سے میں بات کرتا تھا۔ تو وہ بلوچستان کے لیے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ میں اگر یہی باتیں بیوروکریٹ سے کہوں گا۔ وہ تو نہیں مانے گا۔ ایک بیوروکریٹ جب دوسرے سے بات کرے گا تو وہ فی صد تناسب کے لحاظ سے بات کرے گا۔ بس یہیں سے نفرتیں ابھرتی ہیں۔ جبکہ جمہوریت میں ایسا

نہیں ہوتا۔

س:۔ ہمارے ہاں جب بھی جمہوریت کا زیادہ چرچا ہوا، ملک میں افراتفری مچی اور فوج کو مارشل لاء لگانا پڑا، خاص طور پر الیکشن کے مواقع پر، تو یہ ہمارے سیاستدانوں کی نااہلی نہیں؟

ج:۔ پاکستان میں کسی بھی سٹیج پر مارشل لاء کی ضرورت نہیں تھی۔

س:۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق ۷۷ء کا مارشل لاء بالکل بہ امرِ مجبوری لگانا پڑا۔ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ جب اندرونی طور پر خلفشار بڑھ کر خوفناک صورت اختیار کرے تو ایسے میں فوج کا فرض ہوتا ہے کہ وہ مداخلت کر کے ملک کو ابتری سے بچائے، یہاں ہمیں پرسنل ہو کر نہیں سوچنا چاہیئے کہ اس سے پیپلز پارٹی یا قومی اتحاد میں سے کس کو فائدہ پہنچا۔ اور کس کو نقصان۔ اصل بات ملک کی ہے۔ اب دیکھیں مذاکرات میں آخری بار جو ڈیڈ لاک پیدا ہوا، اس سے حالات بہت بگڑ گئے تھے۔

ج:۔ ۲ جولائی کو سارا سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اخبارات میں بھی آگیا۔ لیکن اصغر خان کہنے لگے اور ڈیمانڈ کرو، بھٹو صاحب کارنر ہو چکے ہیں، وہ تمہاری سب باتیں مانے گا۔ پھر دو کی شام کو دس ڈیمانڈ اور لے آئے، ہم ان پر بھی غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بھٹو صاحب نے جنرلوں کو بلایا کہ پی این اے والے کہتے ہیں، حیدر آباد ٹربیونل توڑ دو۔ جنرل عبداللہ ملک اور جنرل جیلانی تو چپ بیٹھے رہے، جنرل ضیاء الحق صاحب کہنے لگے کہ اگر حیدر آباد ٹربیونل ختم کیا تو ہماری آرمی میں کریک پڑ جائیں گے، ہمارے اتنے لوگ بلوچستان میں مارے گئے، یہ ہوا۔ وہ ہوا۔

س:۔ بات اصل موضوع سے ہٹ رہی ہے۔

ج:۔ ہاں! تو پی این اے میں بعض لوگ ایسے تھے جو کسی کے ہاتھ میں کھیل رہے تھے کہ انہوں نے مزید مطالبات پیش کروا دیئے، ورنہ یہ بات طے ہو چکی تھی۔

س:۔ یہ اصغر خان تو نہیں تھے؟

ج:۔ میں نہیں کہتا، کون تھا۔ بہرحال مزاری صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ حیدر آباد کیس کے بارے میں بھٹو پر زور دو۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: "جو میں نے دیکھا")

خیر! جب تاریخ لکھی جائے گی تو سب کے نام سامنے آ جائیں گے۔

س:۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کو باہر سے کوئی خطرہ نہیں۔ اندر سے ہے۔ وہ بھی جمہوری عمل کے ذریعے چھٹ سکتا ہے۔

ج:۔ اور کوئی طریقہ نہیں۔

س:۔ فرض کریں بھٹو صاحب کو سزا ہو جاتی ہے اور صدر مملکت رحم کی اپیل منظور کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیتے ہیں، تو بعض لوگوں کو خدشہ ہے کہ بھٹو صاحب ملک کو نقصان پہنچائیں گے۔

ج :۔ کیسے پہنچائیں گے۔ اگر وہ غریب آدمی کا دوست ہے۔ غریب آدمی نے قربانی دی ہے۔ ملک غریبوں کا ہے۔ سرمایہ داروں کو اگر چوٹ لگتی ہے اور اس سے ملک کو فائدہ ہوتا ہے۔ تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ بلاوجہ وہ کسی کو چوٹ نہیں لگائیں گے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے خلاف یہ بڑا الزام ہے کہ جو انہیں نقصان پہنچاتا ہے، وہ اس کی بُری حالت کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ ایوب خاں نے ان کے خلاف ٹریکٹروں کا مقدمہ نہیں بنایا تھا؟ جیل میں نہیں بند رکھا تھا؟ ہتھیار نہیں لے لیے تھے؟ یحییٰ خاں نے اس پر سانگھڑ میں فائرنگ نہیں کرائی تھی؟ جس میں ان کا ڈرائیور اور ایک آدمی مارا گیا تھا۔ یحییٰ خاں کو انہوں نے کوئی تکلیف دی؟ یحییٰ خاں وار کمشن میں آئے تو انہوں نے کہا کہ جس ریسٹ ہاؤس میں مجھے رکھا گیا ہے، وہاں مجھے تکلیف ہے۔ آپ صدر صاحب سے کہیں کہ مجھے ایبٹ آباد فیملی کے ساتھ بھیج دیں۔ اس وقت بھٹو صاحب صدر تھے، تو یحییٰ خاں کے لیے ایبٹ آباد میں کرائے پر کوٹھی لی گئی۔ ایوب خاں خود ان کے پاس آئے کہ مجھے ٹیکس والے تنگ کر رہے ہیں۔

س :۔ ایوب خاں خود آئے تھے؟

ج :۔ ہاں، خود آئے تھے، یہ سب کچھ آپ کے سامنے موجود ہے۔ بھٹو صاحب ایوب خاں سے کہہ سکتے تھے کہ آپ نے مجھے مارنے کی کوشش کی، میں آپ کو بھی کچھ دن کے لیے جیل میں ڈالوں گا۔

س :۔ ایک زمانے میں بھٹو صاحب کی یحییٰ خاں کے ساتھ دوستی بھی تو بہت رہی۔

ج :۔ اگر یحییٰ خاں سے ان کے تعلقات ہوتے تو سانگھڑ کا واقعہ نہ پیش آتا۔ یحییٰ خاں کے وزیر کارنیلیئس سے جھگڑا ہوا تھا۔ وہ ان دنوں آئین بنا رہے تھے، وہ تو اس وقت بھی غریب کا دوست تھا۔ بھٹو کو پنجاب کا چودھری بے شک برداشت نہ کرے۔ پنجاب کے لوگ اسے چاہتے ہیں۔ پنجابیوں نے اس کے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا ہے۔ خود سوزی تک کر دی، وہ تو جیل میں مجھے بتاتا ہے کہ میں پنجاب کو کیسے لیڈ ڈاؤن کر سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حوصلہ ہے۔ ایک بہت بڑے زمیندار اور ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے ایک مہرے نے قائداعظمؒ سے ایک بار کہا تھا "آپ پنجاب میں نہیں آسکتے" یہ ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ قائداعظمؒ اس وقت پنجاب میں تھے۔ اور جاتے ہوئے انہوں نے بیان دیا، میں واپس آؤں گا اور تم لوگوں (جاگیرداروں، زمینداروں) کو خس و خاشاک کی طرح بہا دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ قائداعظمؒ کا براہِ راست رابطہ غریب سے تھا، یہی بھٹو کی حالت ہے۔

س :۔ لیکن بھٹو صاحب نے سکندر مرزا کو جو لکھ دیا کہ میں آپ کو قائداعظمؒ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔

ج :۔ ہوتے ہیں، زندگی میں لوگ ہر قسم کی چیزیں لکھتے ہیں، ینگ آدمی تھا، لکھ دیا۔

س :۔ بھٹو صاحب کی صحت کیسی ہے۔

ج:۔ کمزور ہیں،

س:۔ سنا ہے بھٹو کی بیماری نرا ڈرامہ ہے۔

ج:۔ یہ بھٹو کے خلاف فاشسٹ پروپیگنڈا ہے۔

س:۔ الیکشن ہوں گے؟

ج:۔ نہیں!


س:۔ کیوں؟

ج:۔ ان کی نیت نہیں۔

س:۔ ثبوت۔

ج:۔ جب انہوں نے آتے ہی نوّے دن کے اندر الیکشن کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک مرحلے پر تو بھٹو صاحب کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ الیکشن کرائیں گے۔ میں نے بھٹو صاحب سے (جیل میں) اختلاف کیا کہ یہ الیکشن نہیں کرائیں گے۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ آغا شاہی یو این او میں اس اعلان کا اعادہ کر چکے ہیں، اس لیے اب انہیں الیکشن کرانا پڑیں گے۔ میں نے بھٹو صاحب سے کہا۔ یہ اس کے باوجود الیکشن نہیں کرائیں گے، اس کی دلیل میں نے بھٹو صاحب کو یہ دی کہ یہ اپنے مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں مستقل قسم کی فرنشنگ کرا رہے ہیں جس نے نوّے روز کے بعد چلے جانا ہو۔ وہ تو اپنے دفاتر میں مستقل نوعیت کی تبدیلیاں نہیں کراتا۔

(فروری ۱۹۷۹ء)





چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں سے انٹرویو



لندن ۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء سر ظفر اللہ خاں کنگ جارج ششم کی رسم تاج پوشی کے موقع پر

سوانحی خاکہ

میں ۶ فروری ۱۸۹۳ء کو سیالکوٹ شہر کے محلہ نخاس میں پیدا ہوا۔

چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو سکول جانا شروع کر دیا۔

۱۹۰۷ء میں امریکن مشن سکول سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا۔

مزید تعلیم کے لئے اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا، جہاں سے ۱۹۱۱ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا۔ عربی کے مضمون میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہا، ایم اے کے لئے وظیفہ ملا لیکن قبول نہ کیا۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں قانون کو تعلیم کے لئے انگلستان کا رخ کیا۔

جون ۱۹۱۴ء میں لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند ملی۔

اکتوبر ۱۹۱۴ء میں کنگز کالج لندن سے ایل ایل بی کیا اور لندن یونیورسٹی میں اوّل رہا اور اس سال سیالکوٹ میں واپس آ گیا۔

دسمبر ۱۹۱۴ء میں چیف کورٹ میں ایڈووکیٹ ہو گیا۔

والد محترم چودھری نصر اللہ خاں سیالکوٹ میں دیوانی کے چوٹی کے وکیل تھے جنوری ۱۹۱۵ء میں ان کے زیر ہدایت وکالت شروع کر دی۔ جو اگست ۱۹۱۶ء تک جاری رہی۔

اگست ۱۹۱۶ء میں 'انڈین کیسز' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو کے لاہور منتقل ہو گیا۔

میں چیف کورٹ میں پہلی بار دسمبر ۱۹۱۶ء میں پٹنہ چیف کورٹ میں پیش ہوا۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۵ء تک لاہور چیف کورٹ میں پریکٹس کی۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک لا کالج لاہور میں لیکچرر رہا ہے۔

۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب ہوا۔ اس طرح ۱۹۳۵ء تک میں کونسل کا ممبر رہا۔ ہندوستان میں آئینی اصلاحات پہ ایک رائل کمشن قائم ہو رہا تھا۔ انگلستان کے عوام کے سامنے مسلمانوں کا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں میں پنجاب کونسل کے مسلمان اراکین کی طرف سے

انگلستان گیا۔

۱۹۲۸ء میں سائمن کمشن سے تبادلۂ خیال کرنے والی صوبائی کمیٹی (پنجاب) کا رکن تھا۔

۱۹۳۰ء میں مسلمان نمائندے کی حیثیت میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں دہلی سازش کیس میں سینئر وکیل سرکار تھا۔

۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کے سالانہ سیشن منعقدہ دہلی کا صدر رہا۔

۱۹۳۱ء میں مسلمان نمائندے کی حیثیت میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔

جون سے اکتوبر ۱۹۳۲ء تک سر میاں فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر رہا۔

۱۹۳۲ء میں مسلمان نمائندے کی حیثیت میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۳۳ء میں ٹورنٹو میں ہونے والی برٹش کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک وائسرائے کی کونسل کا مستقل ممبر رہا۔

۱۹۳۷ء میں بادشاہ جارج ششم کی تخت نشینی کی تقریبات میں برطانوی ہند کی نمائندگی کی۔

ایک بار ۱۹۳۷ء میں دوسری بار ۱۹۳۸ء میں اوٹاوہ ٹریڈ ایگریمنٹ کی ترمیم کے سلسلے میں بورڈ آف ٹریڈ کے ساتھ مذاکرات میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔

نومبر ۱۹۳۹ء میں لندن میں ڈومینین منسٹرز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔

۱۹۴۰ء میں پھر وائسرائے کی ایگزیکٹو کا ممبر نامزد ہوا اور وار سپلائی کا محکمہ دیا گیا۔ میرے پاس یہ رکنیت ۱۹۴۵ء تک رہی۔

ستمبر ۱۹۴۱ء سے ۱۰ جون ۱۹۴۷ء تک فیڈرل کورٹ آف انڈیا کا جج رہا۔

۱۹۴۲ء میں چار ماہ کے لئے چنگ کنگ میں انڈیا کا ایجنٹ جنرل رہا۔

۱۹۴۲ء میں پیسیفک ریلیشنز کانفرنس منعقدہ مونٹریال میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

جون ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک چیمبر آف پرنسز کے چانسلر، نواب آف بھوپال کا آئینی مشیر رہا۔

جولائی ۱۹۴۷ء میں پنجاب باونڈری کمشن میں مسلم لیگ کی طرف سے پیش ہوتا رہا۔

قائداعظمؒ کے حکم پر وسط ۱۹۴۷ء سے وسط دسمبر ۱۹۴۷ء تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔

دسمبر ۱۹۴۷ء سے نومبر ۱۹۵۴ء تک پاکستان کا وزیر خارجہ رہا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک سیکورٹی کونسل کے سامنے کشمیر کا کیس پیش کیا۔

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں عالمی عدالتِ انصاف کا جج منتخب ہوا۔ ۵ فروری ۱۹۶۱ء تک اس عہدے پر رہا۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک عالمی عدالتِ انصاف کا نائب صدر منتخب ہوا

اگست ۱۹۶۱ء سے فروری ۱۹۶۴ء تک یو این او میں پاکستان کا مستقل نمائندہ رہا۔
۶۲-۱۹۶۳ء میں یو این او کی جنرل اسمبلی کا صدر منتخب ہوا۔
۶ر فروری ۱۹۶۴ء کو دوبارہ عالمی عدالتِ انصاف کا جج منتخب ہوا۔ ۵ر فروری ۱۹۷۳ء تک اس عہدے پر رہا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک عالمی عدالتِ انصاف کا صدر رہا۔

■■

ہیگ: مئی ۱۹۶۴ء۔ چودھری ظفر اللہ خاں عالمی عدالتِ انصاف کے جج کی حیثیت میں





قیام پاکستان کے موقعہ پر انڈی پنڈنس ڈنر میں گورنر جنرل پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ، لیڈی مونٹ بیٹن، لارڈ مونٹ بیٹن مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔



س:۔ چودھری صاحب آپ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ تھے۔ اس وقت تو پتہ نہیں اس تقرری پر عوام کی سوچ کیا تھی۔ لیکن بعد کے زمانے میں آپ کے عقیدے کی وجہ سے بہت قیاس آرائیاں ہوئیں، عام طور پر یہی سمجھا گیا کہ آپ کا تقرر انگریزوں کے کہنے پر عمل میں آیا۔ ایک دفعہ بلکہ دو دفعہ مجھے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے بتایا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھٹو سے کہا کہ ساری خرابی ظفر اللہ خاں کے وزیر خارجہ بننے سے پیدا ہوئی۔ اور یہ راز راز ہی رہا کہ ظفر اللہ خاں کو کون لایا۔ بقول مولانا تھانوی بھٹو صاحب کہنے لگے میں نے اس کی تحقیق کی ہے، انڈیا آفس لائبریری سے، جس سے یہ پتہ چلا ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن نے چودھری ظفر اللہ خاں کے متعلق منوا لیا تھا کہ پاکستان کی کابینہ میں ان کا بھی ایک آدمی رہے گا۔

ج:۔ اب تو برٹش گورنمنٹ نے اپنا وہ سارا ریکارڈ عام کر دیا ہے، اگر کوئی ایسی بات ہے۔ کہ ظفر اللہ خاں کو مونٹ بیٹن پاکستان کی کابینہ میں لایا تو چھاپتے کیوں نہیں۔ اول تو یہ بات بیہودہ ہے۔ مونٹ بیٹن نے جب یہ تجویز پیش کی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل ہو جائے وہ تو جناحؒ صاحب نے مانی نہیں اور خود مونٹ بیٹن نے لکھا اور چھپا بھی کہ میں نے مسٹر جناحؒ سے کہا کہ آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ کی ایک ناں NO سے کیا نقصان ہوگا، انہوں نے (قائداعظمؒ نے) جواب دیا، ہاں میں سمجھتا ہوں بہت سارے اثاثے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ میں (مونٹ بیٹن) نے انہیں (قائداعظمؒ کو) کہا بہت سارے نہیں، سارے اثاثے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس حد تک تھا معاملہ، اور جناحؒ صاحب اس کی یہ بات مان گئے کہ ہمارے آدمی کو وزیر خارجہ بناؤ، اور جناحؒ صاحب اس طرح کسی کی بات ماننے والے تھے۔ پھر جناحؒ صاحب کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری پر اور مونٹ بیٹن کے کہنے پر ایک ایسے شخص کو لے لیا، جس کے بارے میں انہوں نے یہ بھی نہیں پرکھا تھا کہ یہ اس لائق بھی ہے کہ نہیں اور مونٹ بیٹن چاہتا تھا کہ ہمارا آدمی ہو جائے۔ قائداعظمؒ اس قسم کے آدمی نہیں تھے۔ کہ کسی کے دباؤ تلے آجائیں یا کوئی انہیں مجبور کر دے، کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ جس موقف یا جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اس پر سے انہیں ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

س:۔ اس بات کا بھی بہت چرچا کرتے ہیں بعض لوگ کہ اگر قائداعظمؒ مونٹ بیٹن کی خواہش

پر اُسے پاکستان اور بھارت کا مشترکہ گورنر جنرل مان لیتے تو بعد میں پاکستان کو جو مشکلات درپیش آئیں، وہ نہ آتیں۔

ج :۔ کیا کہتے ہیں، کیا ہوتا۔

س :۔ قتل و غارت گری نہ ہوتی۔ وسیع پیمانے پر آبادی کا انخلا نہ ہوتا۔

ج :۔ کیا کرتا مونٹ بیٹن، کروایا تو اس نے نہیں، لیکن کیا کرتا وہ۔

اگر وہ مشترکہ گورنر جنرل ہوتا تو جب کراچی میں ہوتا تو پاکستان کے معاملات کے ضمن میں وہ آئینی طور پر یہاں کی کابینہ کی ہدایات کا پابند ہوتا۔ دہلی میں ہوتا تو وہاں کی کابینہ کی ہدایات پر عمل کرنے کا پابند ہوتا، اختلاف ہو جاتا تو کیا کرتا۔ یہاں کہتا کہ میں یہ کروں گا، وہاں جا کے کچھ اور کر دیتا۔ اس کی سکیم ایک ہفتہ بھی نہ چل سکتی تھی، میں نہیں جانتا کہ قائداعظمؒ کے ذہن میں کیا تھا۔ تاہم یہ تجویز کہ مونٹ بیٹن ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل بن جائے کلیتہً ناقابل عمل تھی۔

اس کے تعلق میں ایک جناحؒ صاحب نے تجویز پیش کی جس کا ذکر کہیں نہیں آتا اور وہ بہت ہی معقول تجویز تھی۔

س :۔ کیا تھی وہ پروپوزل۔

ج :۔ انہوں نے (قائداعظمؒ نے) کہا کہ یہ تو میں نہیں مانتا کہ گورنر جنرل ایک ہو۔ ان کا اپنا ہو۔ ہمارا اپنا ہو۔ لیکن یہ میں ماننے کے لیے تیار ہوں کہ تقسیم کو عمل میں لانے کے لیے جن اختیارات کی ضرورت ہو وہ اختیارات تمہیں بادشاہ برطانیہ کا نمائندہ مقرر کر کے دے دیئے جائیں۔ اور ان معاملات میں تمہارے حکم کی دونوں حکومتیں پابند ہوں اور اس کا تم تقسیم یا جو بھی تعلق ہو اس ضمن میں نفاذ کرا سکو۔ مونٹ بیٹن نے کہا کہ ہیجسٹی گورنمنٹ (برطانوی حکومت) کو یہ تجویز پسند نہیں۔

قائداعظمؒ کی اگر وہ تجویز مان لی جاتی تو جتنے فسادات ہوئے یہ رُک جاتے۔ پھر وہ بیچارہ فیلڈ مارشل آکن لیک جو باؤنڈری فورس جو کچھ اُس کی فورس کہلاتی تھی، اس کا کمانڈر تھا۔ کانگریس گورنمنٹ سے تنگ آ کر اس نے استعفا دیدیا اور چلا گیا۔

مان لیا ہوتا مونٹ بیٹن کو گورنر جنرل تو کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ کہ جو ہمیں نقصان پہنچا، یا قتل و غارت ہوا، یہ ہوا وہ ہوا۔ اس کو وہ روک لیتا۔ کیونکہ اگر درمیان میں دخل دینا پڑتا تو اس کا اختیار کیا تھا کہ جس طرح وہ چاہے وہ ہو۔ مشترکہ گورنر جنرل ہونے کی حیثیت میں مونٹ بیٹن کو کوئی آئینی اختیارات نہ ہوتے وہ صرف مشورہ دے سکتا تھا، وہ تجویز جو قائداعظمؒ نے پیش کی تھی اس پر عمل کرنے سے مونٹ بیٹن کو اختیارات حاصل ہو جاتے۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ یہ سب باتیں اب بیٹھ کے کرنے لگے ہیں۔ پہلوں نے سب غلط کیا۔ یہ

ہوتا تو یوں ہوجاتا۔ وہ ہوتا تو ووں ہوجاتا، اچھی بات، ان باتوں کو بھی جانے دیجئے کہ بدقسمتی تھی کہ قائداعظمؒ نے غلطی کی، نہیں مانا (مسٹر کو گورنر جنرل)، جو الزام چاہیں اور جس پر چاہیں لگائیں۔ لیاقت علی پر بھی دیں، مجھ پر بھی دیں، ہم سب ایسے تھے ویسے تھے۔ لیکن جب سے یہ لوگ جو اعتراض کرتے ہیں، صاحب اختیار ہیں۔ سب کچھ ہیں، اس وقت سے کیا وجہ ہے کہ پاکستان بتدریج نیچے ہی گرتا چلا جا رہا ہے۔ کسی بلندی کی طرف نہیں جاتا۔

س:۔ اسی کمزوری کے باعث ان لوگوں کو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کا موقع مل رہا ہے، پاکستان دشمنی جن کے خمیر میں رچی بسی ہے۔

ج:۔ کیا موقع ملتا ہے۔

س:۔ یہی کہ برصغیر کی تقسیم انگریز نے اپنے مفاد کی خاطر کی۔

ج:۔ انگریز کو تقسیم سے کیا فائدہ پہنچتا۔

س:۔ انڈیا تقسیم ہوجائے گا، اس کی قوت منتشر ہوجائے گی۔ وہ تو قائداعظمؒ پر زبان درازی سے بھی نہیں چوکتے۔

ج:۔ نہیں چوکتے تو میں اس کا کیا علاج کر سکتا ہوں جس کا جس طرح جی چاہے کہتا پھرے۔ اس کی تو تحریری شہادت موجود ہے کہ انگریز پاکستان کے قیام کے سخت خلاف تھے۔ مونٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کرتے وقت یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کوشش کرو کہ کیبنٹ پلان پر عمل کرا سکو۔ اس نے جائزہ وائزہ لے کے رپورٹ کر دی کہ اس کا امکان تو مجھے نظر نہیں آتا، پھر آگے بات نہیں چلی۔

اُدھر تو یہ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انگریز کی پالیسی سارا وقت پاکستان کے خلاف رہی ہے۔ ہندوستان کے حق میں رہی ہے، کیونکہ ہندوستان، پاکستان کی نسبت کئی گنا بڑا ملک ہے، اور انگلستان چاہتا ہے کہ اس کی دوستی اسے حاصل رہے اور کسی حد تک اس بات میں صداقت بھی ہے، اُدھر یہ کہتے ہیں کہ یہ بٹ جائیں آپس میں اور ہندوستان کمزور ہو۔

پہلے جو ہوا وہ ہوگیا ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ قائداعظمؒ کو برا بھلا کہہ دیا، لیاقت علی پر گندگی اچھال دی، یا مجھے گالی دیدی، اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ نہ اس سے اصلاح پیدا ہوگی، سوائے اس کے کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں، ہمیں اس قسم کا نشانہ بنا لیں، بنا لیں، اگر اس سے کام چلتا ہے تو بیشک، مثلاً" اگر مجھے گالی دینے سے ملک کو فائدہ پہنچتا ہے، تو دل کھول کر گالی دے لیں۔ مجھے کوئی جوش نہیں آئے گا۔ فائدہ ہوتا ہو تو کریں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کریں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں، ہمارا مستقبل کن باتوں سے سنور سکتا ہے، مشرقی پاکستان الگ ہوگیا، اس کے باوجود پاکستان اپنی آبادی کے لحاظ سے اور جو اللہ تعالیٰ نے اسے ذرائع عطا فرما رکھے ہیں ان کے لحاظ سے اگر بڑے ملکوں میں اس

کا شمار نہیں ہوتا تو اوسط درجے کے ملکوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے، یا رکھ سکتا ہے۔ تو ملک کی حقیقی بہبود اور خوشحالی و ترقی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ہمارے اعلانات تو بڑے بڑے ہوتے ہیں عملاً کچھ نظر نہیں آتا۔ الا ماشاء اللہ۔ جو تھوڑا بہت ہو، اس کی قدر کرنی چاہیئے، لیکن یہ رفتار بڑی سست ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ میاں جو ہوا یا جو نہ ہوا اس کا اثر آج تم پر نہیں پڑے گا۔ آج تم جو کرو گے اس کا پھل پاؤ گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اسلام پر قائم ہیں، لاالہ الا اللہ ہمارا مذہب ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہی ہر انعام کا اور ہر نعمت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں تو پھر قرآن کریم کے اس ارشاد پر عمل شروع کر دیں۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ یعنی انسان کو وہی کچھ حاصل ہو گا جس کے لیے وہ کوشش کرے۔

اب ان باتوں سے کیا حاصل کہ مونٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل مان لیا جاتا تو اچھا تھا یا یہ کہ ظفر اللہ خاں کو مونٹ بیٹن لایا تھا، حالانکہ پاکستان بنا چودہ اگست سن سینتالیس کو میرا تقرر ہوا پچیس دسمبر سن سینتالیس کے روز۔ یہ لوگ مونٹ بیٹن کے حوالے سے جو باتیں کرتے ہیں وہ تو ابتدا تقسیم کی باتیں ہیں، اس بات کو لوگ اکثر بھول جاتے ہیں کہ اس وقت قائداعظمؒ نے مجھے ڈیلیگیشن کا سربراہ مقرر کر کے یونائیٹڈ نیشنز بھیجا ہوا تھا کہ وہاں فلسطین کے مسئلے میں عربوں کی تائید کرو اور وہاں سے واپسی پر ۲۵ دسمبر ۴۷ کو مجھے وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔

س:۔ اقوام متحدہ میں بھیجتے وقت قائداعظمؒ نے کوئی خاص لائن آپ کو دی۔

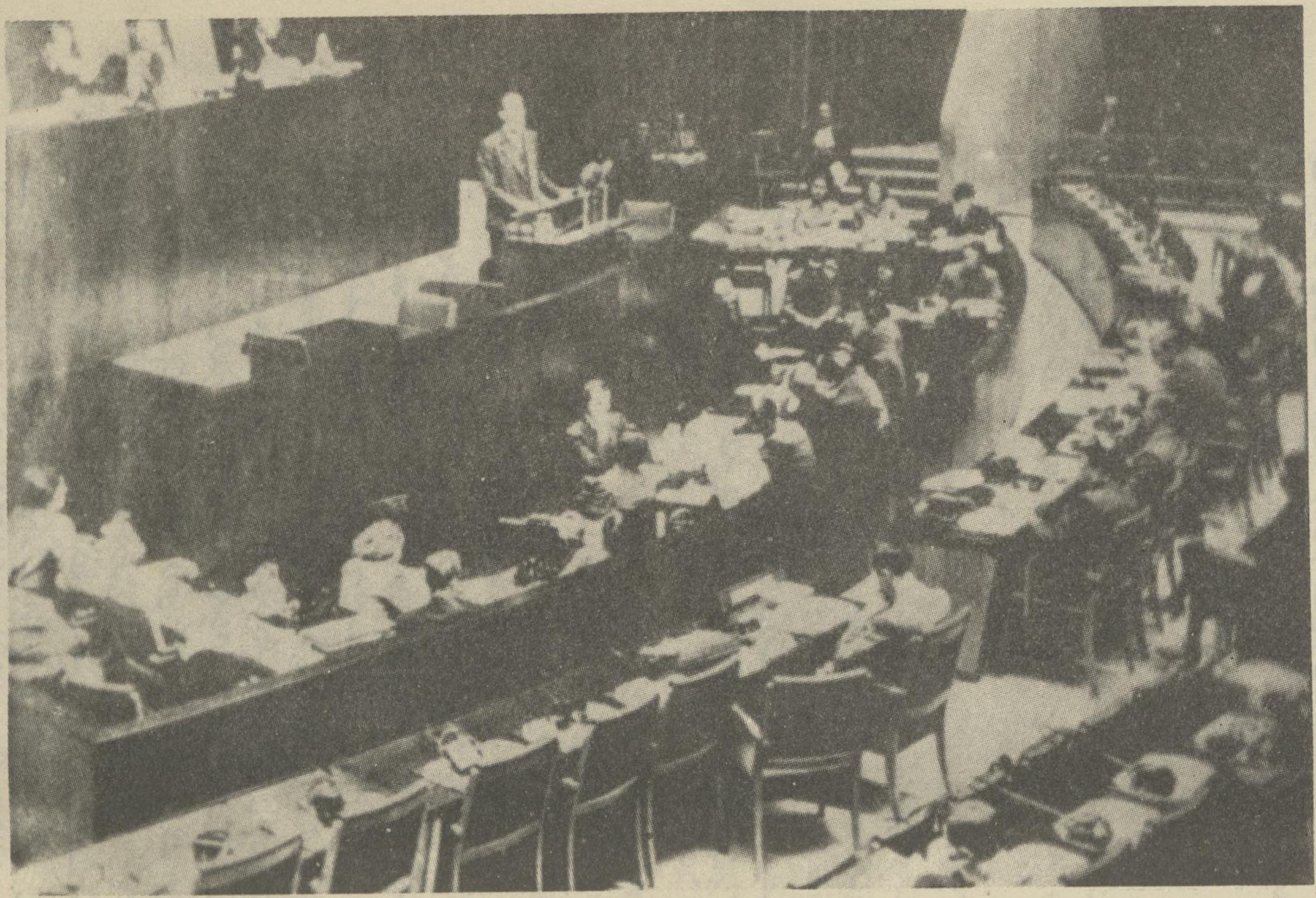
ج:۔ نہیں، اس وقت یہاں کس کو فرصت تھی۔ اُدھر مہاجرین کی مصیبت پڑی تھی۔ نئی نئی سٹیٹ قائم ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ عربوں کا معاملہ تھا جس وقت میں نے تقریر شروع کی اسوقت عربوں کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ پاکستان کیا ہے؟ مسلمان ملک ہے؟ ہماری تائید کرے گا یا ہمارے خلاف جائے گا۔ جب میں نے تقریر شروع کی تو انہوں نے کان کھڑے کر لیے۔ اچھا! یہ آدمی تو خدا تعالیٰ نے آسمان سے ہماری حمایت کے لیے بھیجا ہے۔

س:۔ چودھری صاحب ظاہر ہے ہماری خارجہ پالیسی کا پیٹرن اسی زمانے میں سیٹ ہوا تھا۔ بطور وزیر خارجہ آپ نے کن امور پر زیادہ زور دیا۔ کیا آج بھی ہمارے خارجی معاملات انہی خطوط پر چل رہے ہیں۔

ج:۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت انہی خطوط پر چل رہے ہیں کہ نہیں کیونکہ مجھے علم نہیں، البتہ اس وقت ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمان ممالک کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوں اور جو مسلمان ملک آزاد نہیں، ان کی آزادی کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ میں نے خصوصاً وہ مسلمان ممالک جو آزاد نہیں تھے۔ ان کی آزادی کے لیے کوششیں کیں۔

س:۔ اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔

ج:۔ اللہ تعالیٰ دے فضل نال خاصی کامیابی ہوئی۔



وزیرِ خارجہ پاکستان سر محمد ظفر اللہ خاں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔

س :۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وزیراعظم خان لیاقت علی خاںؒ کو روس اور امریکہ دونوں ملکوں کی طرف سے دعوت نامے ایک ہی وقت میں ملے تھے۔ وہ کیا وجوہ تھیں کہ لیاقت علی خاں نے رُوس کے مقابلے میں امریکہ کو منتخب کیا؟

ج :۔ لیاقت علی خاں زندہ ہوتے تو وہی بتا سکتے تھے۔

س :۔ آخر آپ بھی تو وزیر خارجہ تھے۔

ج :۔ میں وزیر خارجہ تھا لیکن مجھے کشمیر اور فلسطین کے مسائل کی وجہ سے بہت سارا وقت ملک سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ میری غیر حاضری میں وزیراعظم ہی وزیر خارجہ کے فرائض انجام دیتے تھے۔

س :۔ ویسے اس وقت کے حالات کی روشنی میں ان کا دورۂ امریکہ کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔

ج :۔ اِس وقت یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ اُس وقت کے حالات کے مطابق صحیح تھا یا غلط تھا۔ لیکن بہرحال اُس وقت بظاہر ہماری ضروریات وغیرہ کے پُورا ہونے کا مسئلہ تھا۔ جو روس اور امریکہ دونوں طرف سے پُوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن مقابلتہً امریکہ کی طرف سے زیادہ توقع ہو سکتی تھی۔ جیسا کہ عملاً ہوا بھی۔ میرے خیال میں اس وقت روس اس قدر امداد دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا جتنی کہ امریکہ نے ہمیں دی۔ کوئی مقابلے کی صورت تو نہ تھی لیکن وزیراعظم نے امریکہ جانا موزوں سمجھا ہوگا۔

س :۔ روس کمیونسٹ ملک تھا، امریکہ جمہوری ملک تھا، اس طرح کا نظریاتی معاملہ بھی ہوگا۔

ج :۔ ممکن ہے۔

س :۔ کہ رُوس کو ترجیح دینے سے پاکستان کا مستقلاً کمیونسٹ بلاک کی طرف جھکاؤ نہ ہو جائے۔

ج :۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ کہنا مشکل ہے۔

س :۔ روس نے افغانستان میں جو کارروائی شروع کر رکھی ہے، اس ضمن میں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے۔ کہ اس نے اپنے مسلمان علاقوں سے خوفزدہ ہو کر ایسا کیا ہے۔ کہ وہاں بھی اسلامی قومیت کا جذبہ نہ ابھر آئے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ روس میں اب کوئی مسلمان ہی نہیں۔

ج :۔ میں روس دو دفعہ گیا ہوں۔ ۱۹۱۳ء میں اور ۱۹۶۳ء میں، جب میں یو این او کی جنرل اسمبلی کا صدر تھا، گرومیکو نے دعوت دی تھی۔ میں نے وہاں دیکھا کہ روسی مسلمانوں میں دینی رنگ اتنا نہیں تھا، پُرانے لوگ نمازیں وغیرہ پڑھتے تھے۔ مفتی ضیاءالدین بابا خانوف نے بتایا کہ روسی حکومت انہیں مذہب پر عمل کرنے سے تو نہیں روکتی، لیکن تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دقت ہو رہی ہے۔ عربی میں قرآن کریم نہیں مل رہے۔ لیکن میں پچھلے ستمبر میں ہالینڈ گیا۔ ملکہ جولیانہ اس وقت تخت سے دستبردار ہو چکی تھیں۔ میں نے سوچا مجھے ان کے پاس جانا چاہیئے۔ گفتگو کے دوران ملکہ نے بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں سوویٹس (روسی ریاستوں) کے متعلق ایک کتاب پڑھی ہے۔ کتاب کی مصنفہ کہتی ہیں کہ ان کی سوویت آبادی

روسی علاقے کی آبادی سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہ مسلمان علاقے ہیں، روسیوں کو فکر ہوگئی ہے کہ آہستہ آہستہ مسلمان تعداد میں بڑھ جائیں گے

میں نے ملکہ سے ملنے کے لیے آدھ گھنٹے کا کہا تھا۔ سوا گھنٹہ لگ گیا۔ بیچ میں نے یاد کرایا کہ وقت زیادہ ہو رہا ہے۔ اس پر ملکہ نے کہا: "سر محمد اب میں پینشن پر ہوں۔"

س:۔ آپ کو روس آنے کی دعوت کس نے دی تھی؟

ج:۔ یو این او میں گرومیکو (روس وزیر خارجہ) سے میری ملاقاتیں رہیں۔ انہوں نے۔

س:۔ گرومیکو کیسے آدمی ہیں؟

ج:۔ گرومیکو کی طبیعت میں گپ مارنے کی عادت نہیں۔ بڑی سنجیدہ گفتگو کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جو بات کہیں اس پر عمل کر لینا چاہیئے۔ وہ تو انہوں نے اپنی پالیسی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

س:۔ چودھری صاحب۔ جب آپ پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ تو اس وقت کشمیر میں جو جنگ شروع ہو چکی تھی۔ پاکستان اسے زیادہ عرصے تک برداشت کر سکنے کی پوزیشن میں تھا۔

ج:۔ یہ تو ملٹری سچوایشن ہے۔ میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس وقت یہاں بھی نہیں تھا۔

لیکن جب ریزولیوشن پاس ہوگیا دونوں حکومتوں نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر جنگ جاری رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جنگ بندی تسلیم بھی کر لی جاتی اور لڑائی بھی رہتی۔ یہ تو بیہودگی ہوتی۔

س:۔ بیگم لیاقت علی پر الزام لگاتے ہیں بعض لوگ کہ ان کی وجہ سے کشمیر میں جنگ بند ہوئی اور کشمیر ہاتھ سے جاتا رہا۔

ج:۔ یہ تو لوگوں کا رجحان ہو چکا ہے کہ جس بات کا نتیجہ ان کی مرضی کے مطابق نہ نکلا۔ اس کے بارے میں اس طرح کی افواہیں پھیلا دیں حالانکہ اس وقت جو لوگ صاحبِ اختیار رہتے۔ ان کی پوزیشن کو دیکھنا چاہیئے۔ اس پوزیشن میں وہ کیا کر سکتے تھے۔ جہاں تک جنگ کا تعلق ہے۔ اس کا بند کرنا تو لازمی تھا، خواہ ہمیں فائدہ ہو رہا تھا۔ خواہ ہمیں نقصان ہو رہا تھا، یا یہ توقع تھی کہ ہم آگے بڑھ جائیں گے۔ یا یہ خوف تھا کہ وہ آگے بڑھ جائیں گے۔ اس سب کچھ کے باوجود دونوں فریق ریزولیوشن کو تسلیم کر چکے تھے۔ پہلا جو ریزولیوشن انہوں نے تسلیم کیا اس کے متعلق ہم نے کہا کہ اس میں استصواب رائے کا انتظام موجود تھا۔ جب دونوں حکومتوں نے مان لیا کہ اس طور پر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تو جنگ کا بند ہونا لازم ہو گیا۔

س:۔ کشمیر کے مسئلے پر آپ نے بہت طویل تقریریں کیں، اس کی توجیہہ اے کے بروہی نے اس طرح کی کہ یہ ایک طریقہ تھا معاملے کو لٹکائے رکھنے کا۔ اتنی طویل تقریروں کے دوران اکثر مندوب اکتاہٹ کے باعث اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ یا پھر اونگھنے لگتے تھے۔

ج:۔ بروہی صاحب کا یہ اندازہ غلط ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز میں ہندوستان کا یہ موقف

بڑا موثر ہو سکتا تھا کہ مہاراجہ کشمیر نے ان کے ساتھ الحاق کیا ہوا ہے۔ اور یہ پاکستانی خواہ مخواہ بیچ میں آن پڑے ہیں۔ ان کی گوشمالی کرنی چاہیئے۔ انہیں کہا جائے کہ یہ دخل دینا بند کر دیں۔ ایسے میں میرے لیے لازم تھا کہ قیام پاکستان کے وقت جو جو مصائب مسلمانوں پر گزرے اور جو کچھ کشمیر میں ہوا اور جو سازشیں وغیرہ ہوئیں۔ ان کی پوری حقیقت سیکورٹی کونسل کے آگے ظاہر کر دیتا۔ چنانچہ مجھے بعد میں کولمبیا کے ڈیلیگیشن نے کہا کہ ہم نے جب ہندوستان کے نمائندے کی تقریر سنی تو ہم میں سے اکثر کا خیال تھا کہ پاکستان کشمیر میں مداخلت کر کے دنیا کے امن میں خلل ڈال رہا ہے۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد محکم طور پر ہماری یہ رائے بن گئی ہے کہ زیادتی ہندوستان کی طرف سے ہو رہی ہے۔ چنانچہ میری ان تقریروں وغیرہ سے جو عملی اور مثبت نتیجہ نکلا اس کے مطابق پہلے مرحلے میں جو ریزولیوشن پیش کیا گیا وہ تمام تر ہمارے حق میں تھا۔ یہ کہ کشمیر میں غیر جانبدار حکومت قائم ہو جائے گی۔ کشمیریوں کی رائے شماری کرائی جائے۔ جس کے مطابق وہ فیصلہ کریں گے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔ اس مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر برطانیہ نے اپنے وزیر برائے دولتِ مشترکہ مسٹر فلپ نوئیل بیکر کو وہاں بھیجا ہوا تھا۔ وہ بڑی مستعدی کے ساتھ کوشش کر رہے تھے کہ کہیں نیویارک میں کوئی معاہدہ ایسا ہو جائے۔ جس کا صرف اجراء ہونا باقی رہ جائے۔ تبھی تصفیہ ہو سکے گا۔ چنانچہ جب سیکورٹی کونسل کے سات ممبر اظہارِ رائے کر چکے بلکہ اس سے بھی زیادہ، آخر تبادلۂ خیال کے بعد مذکورہ قرارداد پر رائے شماری کا مرحلہ آیا۔ اس وقت تک جتنے اراکین نے اظہارِ خیال کیا تھا۔ اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ قرارداد کو گیارہ میں سے نو کی تائید تو ضرور ہو جائے گی۔ روس کے غیر جانبدار رہنے کا امکان تھا تو ہندوستان والوں کو خدشہ ہوا کہ اب تو یہ ریزولیوشن پاس ہو کر رہے گا۔ تو ان کے مندوب نے کہا کہ انہیں اپنی حکومت سے ہدایت ملی ہے کہ مشورے کے لیے دہلی واپس آؤ۔ اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہماری واپسی تک اجلاس ملتوی رکھا جائے۔ ہندوستانی مندوب سے یہ سن کر سیکورٹی کونسل والے بڑے دِق ہوئے۔ چنانچہ ایک رکن نے صدر کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا کہ چند ہی دن ہوئے ہیں جب ہندوستان کے نمائندے نے اپنی بے صبری کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ "کشمیر جل رہا ہے اور سیکورٹی کونسل بنسری بجا رہی ہے"۔ ہندوستانی وفد کا یہ جملہ دہراتے ہوئے اس رکن نے کہا کہ "میں با ادب ہندوستان کے نمائندے سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کشمیر میں جو آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ بجھا دی گئی ہے۔ اگر نہیں تو اب کون بنسری بجا رہا ہے؟" بہر حال، ہندوستانی مندوب ہندوستان واپس چلا گیا۔

اجلاس کے التوا کی مدت بڑھتی چلی گئی تو چودھری محمد علی اور میں نے فیصلہ کیا کہ لندن جائیں اور وہاں معاملے کا کھوج لگائیں۔ چودھری صاحب کی رائے تھی کہ اس وقت معاملہ لندن اور دہلی میں زیر بحث ہے۔ لندن میں ہم نے برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون

سے ملاقات کی۔ اتفاق ایسا تھا کہ جس روز میں گیارہ بجے وزیر خارجہ سے مل رہا تھا اسی دن میری وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی سے اپوائنٹمنٹ تھی۔ وزیر خارجہ ہماری بات سُننے کے بعد کہنے لگے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے اور ہمدردی بھی لیکن ہندوستان کے معاملات میں وزیراعظم پر کرپس کا بڑا اثر ہے اور وہ اس معاملے میں وزیراعظم کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی کے متعلق مجھے یاد تھا کہ انہوں نے جب قانون آزادی ہند کا مسودہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا تو اپنی تقریر میں قائداعظمؒ کے متعلق شکوہ کیا تھا کہ انہوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل منظور نہیں کیا۔ مسٹر ایٹلی سے جب میں ملا تو پینتالیس منٹ کی اس ملاقات کے دوران انہوں نے میرے ساتھ ایک بار بھی نظر ملا کے بات نہ کی۔ کبھی اِدھر جھانکتے کبھی اُدھر جھانکتے۔ یہی کہتے رہے کہ فکر نہ کرو۔ ہندوستانی وفد جلد ہی نیویارک واپس پہنچ جائے گا۔ میری ہر دلیل ان پر رائیگاں گئی۔ بلکہ مجھے انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ تم اس قرارداد پر کیوں مصر ہو۔ اور طریقے سے بھی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں ناکام واپس لوٹا۔ اور چودھری محمد علی صاحب کو تفصیل بتا دی ادھر وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خاں کو بھی رپورٹ بھیج دی۔

اس طرح لارڈ مونٹ بیٹن جو وزیراعظم ایٹلی کا چہیتا تھا اس کے ذریعے کرپس مسٹر ایٹلی پر اثر انداز رہا۔ اور برطانیہ کا موقف اس حد تک تبدیل کرا دیا کہ اگر کوئی ریزولیوشن پاس ہو تو وہ ہندوستان کے موقف کے مطابق ہو۔ امریکی نمائندے سینیٹر وارن آسٹن بھی اس معاملے پر بڑے سرگرم رہے تھے۔ لیکن امریکہ کی یہ پرابلم تھی کہ وہ کامن ویلتھ کا معاملہ ہونے کی وجہ سے بہت حد تک برطانیہ کے مشورے پر چلتا تھا۔ سیکورٹی کونسل کے باقی آٹھ ارکان اگرچہ اپنی اپنی رائے رکھتے تھے۔ لیکن وہ برطانیہ اور امریکہ کی رائے کو محترم سمجھتے تھے۔ گیارھواں رکن روس اس وقت غیر جانبدار تھا۔ اگرچہ فلپ نوئیل بیکر نے کوششیں ترک نہ کیں۔ لیکن مسٹر ایٹلی پر مونٹ بیٹن اور سرسٹیفورڈ کرپس کا اثر نفوذ کر چکا تھا۔

۱۹۵۱ء میں یونائیٹڈ نیشنز کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ مسٹر نوئیل بیکر کا پیرس سے گزر ہوا تو وہ مجھے ملنے آئے۔ کشمیر کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے، میں نے ہندوستانی وفد کے سربراہ سرگوپالا سوامی آئینگر اور ان کے معاون سر گرجا شنکر باجپائی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ نہرو کو قرارداد منظور کرنے پر رضامند کریں۔ انہوں نے وعدہ کیا بلکہ یقین دلایا کہ ان کی کوششیں بار آور ہوں گی کہ اتنے میں مجھے ایٹلی کا وہ منحوس تار ملا جس نے سارے معاملے کو بگاڑ دیا۔ اور مجھے اس کی یہ سزا ملی کہ ایٹلی نے کامن ویلتھ کی وزارت سے ہٹا کر بجلی اور ایندھن کا وزیر بنا دیا۔ بعد میں وہاں سے بھی چلتا کیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ یو این او میں مجھے کشمیر کے حالات بیان کرنے میں بہت سارا وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کی طرف سے کوئی تفصیل نہیں

بتائی گئی تھی۔ لیکن یہ بات غلط ہے کہ بعض ممبر اس دوران سو جاتے تھے۔

س:۔ یا اٹھ کے چلے جاتے تھے۔

ج:۔ یا اٹھ کے چلے جاتے تھے۔ یہ بات غلط ہی نہیں بلکہ بردہی صاحب بھی جانتے ہیں، کہ یہ غلط ہے۔

س:۔ انہوں نے پھر یہ قصداً کہا۔

ج:۔ ہاں، ظاہر ہے، وقت کے لحاظ سے انہوں نے چلنا ہوتا ہے۔

س:۔ وہ کیسے جانتے ہیں کہ بات غلط ہے۔

ج:۔ بعد میں میرے کولیگ رہے ہیں۔ اب بھی ملتے ہیں تو منہ پر میری آسمان تک تعریف کریں گے۔ پیچھے سے یہ کہتے ہیں۔ ابھی ائر پورٹ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے۔ میری جان! اتنے عرصے سے آپ کہاں تھے؟

س:۔ سیکورٹی کونسل نے آسٹریلیا کی ہائی کورٹ کے جج سر اوون ڈکسن کو بھی یہاں استصواب رائے کے لیے بھیجا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ نہرو کوئی ایسی شرائط نہیں مانیں گے۔ جن کے باعث استصواب آزادانہ اور بے لاگ ہونا ہو۔ تو سر اوون ڈکسن نے ایک اور تجویز پر عمل کرانے کی تگ و دو شروع کی۔ اس میں بھی وہ ناکام رہے وہ تجویز کیا تھی۔ کبھی اس کی تفصیل سامنے آئی۔

ج:۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اس کی سکیم یہ تھی کہ جموں کے جن علاقوں میں غیر مسلموں کی کثرت ہے۔ ان کا تو ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو جائے۔ جو علاقے وادی کشمیر سے آگے ہیں، مغرب تک، ان کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو جائے۔ اور وادی کشمیر میں رائے شماری ہو جائے۔

س:۔ "اقوام متحدہ کا کیا فائدہ جب وہ اس قسم کے مسئلے بھی حل نہ کرا سکے"۔ یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے۔

ج:۔ یہ تو جنرل بات ہے۔ اس کے پاس طاقت تو ہے نہیں۔ اقوام متحدہ صرف آمادہ کر سکتی ہے۔ اخلاقی اثر ڈال سکتی ہے۔ سیکورٹی کونسل البتہ پابندیوں کا نفاذ کر سکتی ہے، لیکن اس میں بھی چونکہ گریٹ پاورز کے درمیان بیلنس ہے اس لیے پابندیاں عائد کرنا آسان نہیں۔ لیکن بہت حد تک انہوں نے اول تو کسی طرح کوشش و کوشش کر کرا کے بڑے پیمانے پر جنگ نہیں ہونے دی۔ پھر علاوہ عالمی امن قائم رکھنے کے اقوام متحدہ کے باقی ادارے بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ مثلاً ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن وغیرہ۔ لیکن بہرا ین او عالمی حکومت تو نہیں۔ اقوام متحدہ تو خود مختار ملکوں پر مشتمل تنظیم کا نام ہے۔

س:۔ قائد اعظمؒ نے کشمیر میں فوجیں اتارنے کا حکم دیا تھا؟

ج:۔ مجھے نہیں معلوم۔

س:۔ چوہدری صاحب، افغانستان گورنمنٹ نے بعض ایسے افغانوں کو سنگسار کر دیا تھا جو آپ کا عقیدہ اپنا چکے تھے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بطور وزیر خارجہ آپ نے افغان

گورنمنٹ کے ساتھ ایسا سلوک شروع کر دیا کہ وہ دن اور آج کا دن افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات بگڑتے ہی چلے گئے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو عرصے سے آپ پر لگایا جا رہا ہے۔

ج :۔ میں ہوا وزیر خارجہ پچیس دسمبر سن سینتالیس کو، پاکستان وجود میں آیا، چودہ اگست سن سینتالیس کو، میرے وزیر خارجہ بننے سے پہلے پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بن چکا تھا، دنیا میں جس واحد ملک نے پاکستان کی رکنیت کی مخالفت کی تھی۔ وہ افغانستان تھا، میں تو اس وقت وزیر خارجہ نہیں تھا۔

س :۔ اس طرح پختونستان کا مسئلہ آپ کی وزارت کے زمانے میں بھی سامنے آتا رہا۔

ج :۔ آتا رہا۔

س :۔ افغان گورنمنٹ واقعی اس پر سنجیدہ تھی یا نرا پروپیگنڈا تھا۔

ج :۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ نرا پروپیگنڈا تھا یا ان کی کیا نیت تھی، ایک وقت میں ان کا نمائندہ یہاں آیا تھا، میرے ساتھ اس کی گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا کہ اس میں ہماری کوئی بدنیتی نہیں، ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے ساتھ آپ کا یہ علاقہ شامل ہو جائے یا آزاد ہو جائے۔ ہم تو محض جذباتی طور پر سمجھتے ہیں کہ نارتھ ویسٹرن فرنٹیئر کیا ہوا، سندھیوں کا سندھ ہوا، بلوچوں کا بلوچستان ہوا، پختونوں کا پختونستان ہونا چاہیے، اگر آپ نام بدل دیں تو ہماری تسلی ہو جائے گی، میں نے کہا تم پختہ ہو، اس بات پر کہ اور تمہاری کوئی غرض نہیں، کہنے لگا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں بالکل نہیں، میں نے قائداعظم رح سے مشورہ کیا، افغان نمائندہ یہ کہتا ہے، انہوں نے فرمایا۔

DON'T TOUCH THE PROPOSAL WITH A PAIR OF TONGS.

مراد ان کی یہی تھی کہ اگر ان کے مطالبے پر نام رکھا تو پھر کوئی اور مطالبہ شروع کر دیں گے۔ وہ شخص افغان گورنمنٹ کا یہاں ایمبیسڈر تو نہیں تھا، وہ اسی کام کے لیے آیا تھا، پھر وہ الگ ہو کے پرنسٹن چلا گیا، وہاں میری اس کے ساتھ ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا میں واپس گیا تو میری گورنمنٹ نے بھی انکار کر دیا تھا، پھر میں نے بھی اس شخص سے کوئی سوال وغیرہ نہیں کیا۔

س :۔ آپ کے زمانے میں بس اتنی ہی بات رہی؟

ج :۔ ظاہر شاہ (افغانستان کے اس وقت کے حکمران) کے چچا شاہ ولی خاں پاکستان میں ان کے ایمبیسڈر ہو کر آئے تھے، ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے، ہم وہی سارے دلائل دیتے تھے، چائے انہیں پر تکلف پلا دیتے تھے۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ اور تینوں چچا جلاوطنی کے زمانے میں یہاں رہے تھے، پنجاب میں ہی پڑھے تھے۔ اردو اچھی جانتے تھے، ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا اگر یہ صوبہ (سرحد) الگ کر دیا جائے۔ ویسے ہم نہیں کہتے الگ کر دیا جائے، اگر کر دیا جائے۔ تو اس کی ایڈمنسٹریشن وغیرہ کا خرچ کون دے گا۔ انہوں نے کہا پاکستان دے گا، میں نے کہا اول تو پاکستان مانتا نہیں، اگر وہ مان بھی جائے تو خرچے

کی ذمہ داری تو آپ کو لینی چاہیئے۔ انہوں نے کہا ہمارے پاس تو اتنا پیسہ نہیں، خیر، اس طرح کی گفتگو کرتے تھے۔

ایک روز آئے، اور کہا چودھری صاحب مجھے تو بادشاہ نے خاص اس کام کے لیے مقرر کیا تھا، کوئی فیصلہ تو ہوتا نہیں۔ اب ہم جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے چودھری صاحب ہم جاتا ہے۔ لیکن فساد ہو گا۔ میں نے کہا شاہ ولی صاحب کون کرے گا۔ انہوں نے کہا خو ہم کرے گا۔ اور کون کرے گا۔

اس کے بعد بادشاہ (ظاہر شاہ) کے سب سے بڑے چچا سردار ہاشم خاں یہاں سے گزرے، باہر گئے ہوئے تھے، وہ باقی تینوں بھائیوں میں بڑے متین طبیعت تھے۔ انہوں نے کہلا بھیجا میں کراچی چند دن ٹھہروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کراچی جب آؤں تو اس معاملے پر گفتگو کا کوئی موقعہ ہو۔ یہ معاملہ ہماری کیبنٹ میں پیش ہوا۔ بعض کی رائے تھی، نہیں نہیں۔ میں نے کہا آخر گفتگو میں کیا ہرج ہے ہمیں جیب میں ڈال کے تھوڑا لے جائے گا۔ بات نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں، ورنہ وہ کہیں گے کہ آپ ہمارے ساتھ بات ہی نہیں کرتے۔ طے ہوا چلو پھر کر لینا۔ میں نے کہا لیکن میرے ساتھ ایک اور وزیر کو شامل کر دیں، تاکہ یہ شہادت رہے کیا بات ہوئی۔ گورمانی صاحب کو مقرر کر دیا گیا۔ سردار ہاشم خاں نے اپنی مدد کے لیے کابل سے فارن منسٹری کا ایک انڈر سیکریٹری بلا لیا تھا۔ میں پہنچا۔ دوران گفتگو میں نے کہا کہ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ آپ کونسا علاقہ پختونستان بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا میں آپ کو نقشہ بنا کے دکھا دوں گا۔ ——— نقشہ بنا کے دکھا دیا انہوں نے۔ اس میں انہوں نے دریائے سندھ کو باؤنڈری بنایا تھا۔ میں نے نقشہ دیکھا اور ذرا مسکرا کے کہا، مجھے اس پر تھوڑا سا اعتراض ہے۔ انہوں نے کہا: کیا؟ میں نے کہا، لائن کچھ زیادہ ہی مغرب کی طرف چلی گئی ہے تھوڑی سی اور مشرق کی طرف ہونی چاہیئے۔ انہوں نے کہا آپ کا مطلب ہے مغرب کی طرف۔ میں نے کہا نہیں تھوڑی سی اور مشرق کی طرف ہونی چاہیئے کراچی بھی شامل کر لو۔ کیونکہ اس طرح کراچی نہیں آرہا اس میں۔ پھر تو کوئی اعتراض نہیں رہ جاتا۔ میرا مطلب یہی تھا کہ ایسی ناقابل عمل بات آپ کرتے ہیں۔

میں چونکہ فارن منسٹر تھا۔ ان کی میزبانی کا انتظام بھی میرے ذمہ تھا۔ سٹیشن پر انہیں وداع کرنے گیا تو انہوں نے، مجھے اچھی طرح یاد ہے، دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ اور کہا، چودھری صاحب، یہ تو معاملات حکومتوں میں چلتے رہیں گے، لیکن میرے دل میں شرافت کی بڑی قدر ہے۔ میں شرافت کا بہت قائل ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا ہے۔ میں اس کو نہیں بھولوں گا۔

اگر مجھے ان کے ساتھ دشمنی ہوتی تو میں ان کے ساتھ بات بھی کیوں کرتا۔ تو یہ باتیں سیاست میں کبھی دخل نہیں دے سکتیں کہ ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ اُن سے بھی پہلے جو آج تھے۔ ان کی

اوّل تو کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ پھر یہ کہ میں نے وہ دل میں رکھا ہوا تھا کہ میں ان کی جڑ اکھاڑ دوں گا۔ میں کوئی نعوذ باللہ خدا کا مقرر کیا ہوا نہیں تھا۔ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوتی ہیں۔ امیر عبدالرحمٰن کے زمانے میں مولوی عبدالرحمٰن کو ہلاک کیا گیا، وہ صاحبزادہ عبداللطیف کے شاگرد تھے۔ پھر صاحبزادہ عبداللطیف کو امیر حبیب اللہ کے زمانے (۱۹۰۳ء) میں سنگسار کیا گیا۔ تو دوسرے ہی دن اس قدر مرگ پڑی کابل میں ہیضے کے ساتھ۔ نصراللہ خاں آگے آگے تھا، جو علماء کے پیچھے تھا، اس کی بیوی بھی مری، بڑی تباہی مچی۔ اسی طرح نعمت اللہ خاں بھی ہماری جماعت کا تھا۔ اسے ۱۹۲۴ء میں برسرِعام سنگسار کیا گیا۔ مختلف اوقات میں ہماری جماعت کے بیس افراد جو کہ افغان ہی تھے، انہیں پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا کمال، فضل اور حکمت تھی کہ ایک نے بھی انکار کر کے اپنی جان نہیں بچائی۔ اور کسی کے متعلق ہماری یہ خواہش ہرگز نہیں ہوئی۔ حتّٰی کہ باوجود اس کے جو کچھ ہمارے ساتھ مسٹر بھٹو نے سلوک کیا، ہمارے امام نے منع کیا ہوا تھا کہ کسی قسم کی بددعا نہیں کرنی، یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے، ہمارا کام نہیں۔

جس دن ہماری جماعت کے نوّے سال پورے ہوئے اس سے عین اگلے دن اس وقت ان کی ریویو پٹیشن (نظرِثانی کی درخواست) خارج ہوئی تھی۔ لندن میں ہماری جماعت کا ایک جلسہ تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ نوّے سال کل پورے ہو گئے۔ خدا تعالیٰ کا فیصلہ بھی ساتھ ساتھ شروع ہو گیا ہے۔ مگر ایک مرحلہ ابھی باقی ہے۔ رحم کا۔ جہاں تک میرے ذاتی تاثر یا رائے کا تعلق ہے، میں چاہتا ہوں کہ اگر ان کی جان بخشی ہو جائے، تو ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کے ساتھ صلح کر لے۔ میں نے انہیں بتایا کہ دیکھو، ہمارا اس میں کسی طرح بھی دخل نہیں۔ نہ ہم چاہتے تھے۔ نہ ہم ہیں، نہ ہم کسی کے خلاف ہیں، نہ ہمارا کسی سے گلہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ اس لیے تم کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جس سے یہ سمجھا جائے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ ہوا۔ میں نے کہا یہ ہمارا معاملہ نہیں اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے۔

س:۔ آپ کے ہم عقیدہ اس بات کا بہت ذکر کرتے ہیں کہ آپ کے بانیٔ سلسلہ کی اس سلسلے میں کوئی پیش گوئی ہے کہ ایک شخص آئے گا۔ وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ اور اس کا یہ حال ہو گا۔

ج:۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، بھٹو صاحب کی سپریم کورٹ سے اپیل خارج ہوئی تھی ۶ فروری ۱۹۷۹ء کو، شیخ اعجاز احمد کے چچا زاد بھائی اور علامہ اقبالؒ کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے شیخ اعجاز احمد، چودھری بشیر احمد اور مجھے ۸ فروری ۷۹ء کو دوپہر کے کھانے پر بلوایا ہوا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے خسر بھی وہاں تھے۔ بس اتنے ہی تھے۔ کھانے سے پہلے

ہم برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے کے لیے اندر چلے گئے۔ کھانا ختم ہوا۔ یہ سب لوگ باہر چلے گئے۔ تو مولوی مشتاق حسین صاحب وہیں ہاتھ دھونے لگے۔ مولوی صاحب کو بڑی فکر تھی۔ کہ اگر یہ اپیل منظور ہوگئی۔ میرے فیصلے کے خلاف۔ تو پھر میری کوئی جگہ نہیں۔ مولوی صاحب نے جب ہاتھ دھولئے تو میں نے ان سے کہا، مولوی صاحب مجھے سپریم کورٹ کے ساتھ ایک شکوہ ہے۔ انہوں نے کہا، کیا، میں نے کہا پرسوں اپیل خارج ہوئی ہے۔ اور پرسوں میرا یوم پیدائش تھا۔ ایسی منحوس بات میرے یوم پیدائش پر ہوئی۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ میں نے کہا مولوی صاحب میں ایک بات آپ سے کہتا ہوں، آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، اگر آپ کو خیال ہو کہ شائد بھول جائیں۔ تو جاکر نوٹ کر لیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے مجھے مہلت دی تو میں آئندہ سال چھ فروری کو بھی یہیں ہوں گا۔ اگر تو اس وقت بھٹو زندہ ہوا۔ آپ مجھے ٹیلی فون کر دیں کہ ظفر اللہ خاں جو بات تو نے مجھ سے کہی تھی، وہ ٹھیک نہیں نکلی اور اگر یہ مرگیا۔ تو آپ ٹیلی فون کر دیں کہ بات تو ہوگئی۔ آج شام میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ اور بتانا کہ کس بنا پر تم نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا، اچھی بات، مجھے یاد رہے گا میں نے کہا میں نہیں کہتا کہ یہ پھانسی لگے گا یا خودکشی کرے گا یا اس پر بجلی گرے گی یا بیماری سے مر جائے گا۔ لیکن اپنی عمر کے ۵۲ ویں سال کے دوران زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب اس کی ۵۱ ویں سالگرہ (۵ جنوری ۱۹۷۹ء) ہوئی تو بیگم بھٹو نے بڑے سے بڑے کیک پر مٹھائی سے جیل کی شکل بنائی تھی۔ اور ایک ٹیپ کس کے ساتھ اسے توڑا کہ اس طرح گویا ہم ان کو جیل سے نکال لیں گے۔ خیر،

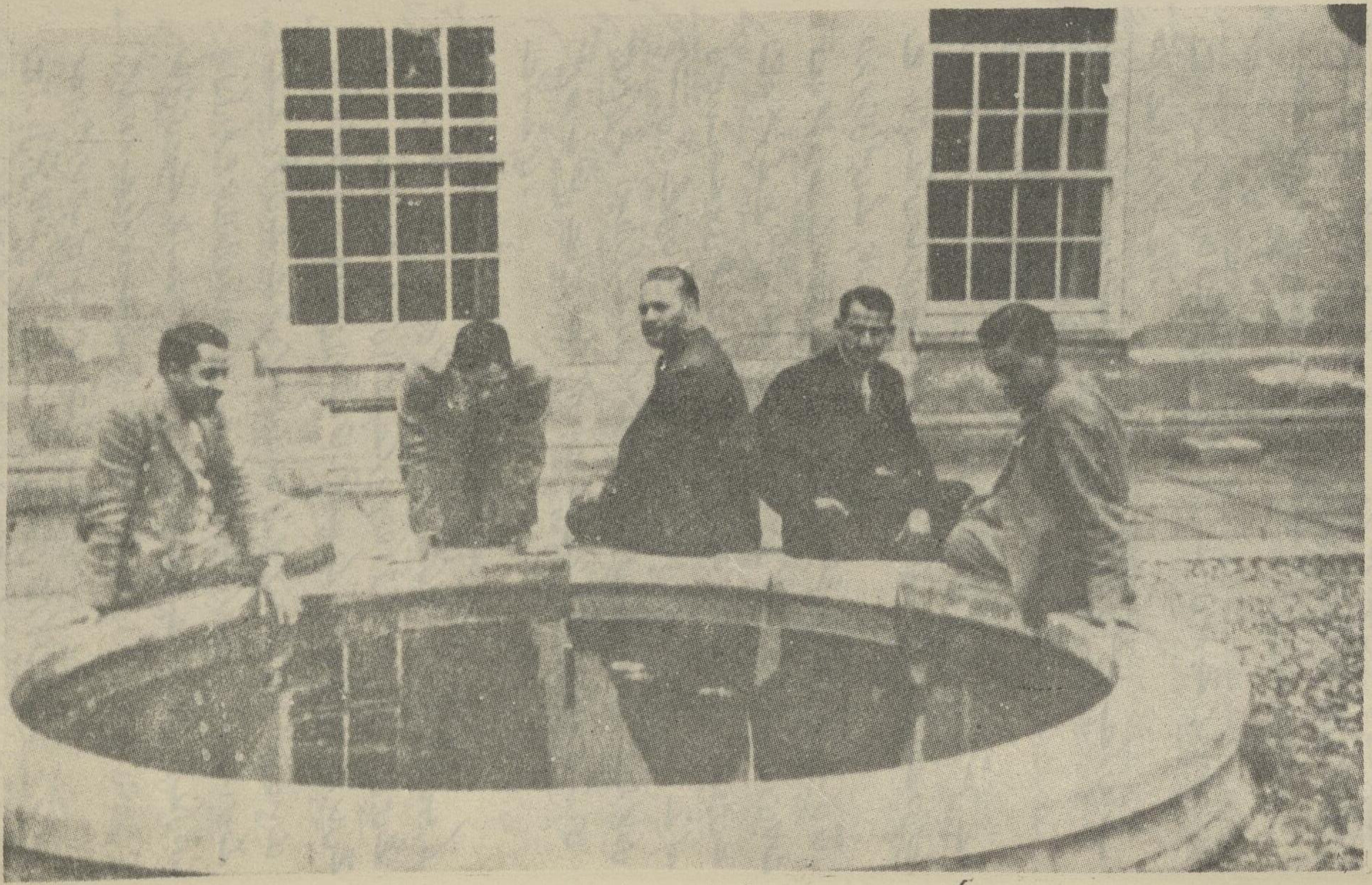
س :۔ آپ نے کہا ہے کہ "مولوی صاحب کو بڑی فکر تھی کہ اگر بھٹو صاحب کی اپیل ان کے فیصلے کے خلاف منظور ہوگئی تو ان کے لیے کوئی جگہ نہیں"۔ اگر انہوں نے فیصلہ صحیح کیا تھا۔ تو پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

ج :۔ مولوی صاحب نے بتایا قبر ایک ہے، امیدوار دو ہیں۔

س :۔ ۱۹۸۰ء میں آپ کی مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی ۔

ج :۔ ہاں جب میں دوسرے سال (۱۹۸۰ء) یہاں آیا، تو مولوی مشتاق حسین صاحب ۶ فروری سے پہلے ہی تشریف لے آئے۔ بیٹھتے ہی بولے بتاؤ وہ بات۔ میں نے کہا کھانے کے کمرے میں چلیں گے۔ آرام سے بیٹھیں گے۔ بات شروع ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ میں اول تو قرآن کریم کی دو آیات کی طرف آپ کی توجہ دلاتا ہوں کہ وہاں اس قسم کے لوگوں کا انجام ایسے طور پر درج ہے۔ بالکل اس واقعہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ سورۂ ابراہیم کی آیات کی آیات ہیں تیرہ اور چودہ۔

میں نے وہ آیات سنا کر کہا، یہ تو ہے اللہ تعالیٰ کا اصول۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس کے بعض ضمیر بالکل لفظاً اس پر چسپاں ہوتے ہیں۔ پھر میں نے انہیں وہ الہام بتایا



۳۵-۱۹۳۴ء۔آکسفورڈ۔ ایم ایم احمد، شیخ منظور الٰہی، چودھری ظفراللہ خاں، چودھری نصیر احمد اور مرزا ناصر احمد

جو ہمارے بانیٔ سلسلہ کو ہوا تھا۔ جو ۱۸۹۱ء میں چھپا بھی تھا۔ اس کے الفاظ تھے: کلبٌ یموتُ علیٰ کلب۔ کتا ہے۔ کُتّے کے نقطہ کے اعداد پر مر جائے گا۔ توک کے اعداد ہیں بیس۔ ل کے تیس، ب کے دو۔ مولوی صاحب نے کہا، یہ دونوں حوالے مجھے نکال دو۔

س:۔ بس اتنا ہی مزید کچھ نہیں۔

ج:۔ آگے اس کی وضاحت بھی آپ نے کی۔ کہ اس کے باون نقطہ بنتے ہیں۔ باون برس میں قدم رکھے گا، اور مر جائے گا۔

س:۔ کسی فرد کا نام لے کر نشاندہی نہیں کی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی تفصیل ہے کہ وہ آپ لوگوں کو اقلیت قرار دے گا، یا نقصان پہنچائے گا۔

ج:۔ نہیں، بس اتنا ہی جتنا میں کہہ چکا ہوں۔

س:۔ پھر تو آپ لوگوں کا محض یہ اندازہ ہے کہ یہ پیش گوئی بھٹو صاحب کے متعلق ہے۔

ج:۔ کراچی کے کسی اخبار میں چھپا بھی تھا کہ کم سے کم اس کو ایک سال کی مہلت دے دینی چاہیئے۔ ورنہ مرزائی کہیں گے۔ ہماری پیش گوئی پوری ہو گئی۔

س:۔ بھٹو صاحب کے ساتھ آپ لوگوں نے ۷۰ء کے الیکشن میں تعاون بھی بہت کیا تھا۔

ج:۔ بھٹو کے پہلے الیکشن (۷۰ء) میں پنجاب میں اس کی کامیابی تو خالصتاً ہماری جماعت کی سپورٹ سے ہوئی بلکہ اس نے تو کہلا بھیجا تھا حضرت صاحب کو۔ کہ اگر پنجاب میں سے چھ نشستیں بھی مجھے مل جائیں تو میں یہ سمجھوں گا کہ بڑی کامیابی ہوئی۔ حضرت صاحب نے کہا، نہیں تم ہر جگہ اُمیدوار کھڑے کرو۔ ہم جو کر سکتے ہیں۔ کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری تنظیم خدا کے فضل سے ایسی ہے کہ ہم جس بات کے پیچھے پڑ جائیں۔ وہ نہایت تندہی سے کرتے ہیں۔

س:۔ اس زمانے میں اشتہارات بھی آپ نے خوب بنائے۔

ج:۔ ہاں جو کچھ بھی تھا۔ اس میں یہ نہیں تھا۔ جیسے عام الیکشن والے کرتے ہیں، فریب کی باتیں، ہمارے ورکر تھے۔ اتفاق کی بات ہے۔ کہ یہ مولانا کوثر نیازی اس وقت جیل میں تھے۔ میرا بھتیجا حمید نصر اللہ خان کا الیکشن ایجنٹ تھا۔ انتخاب کے بعد کی بات ہے۔ مجھے یہاں ملنے آئے تھے۔ یہ تو ان کے بیٹے تھا ہم نے پوری مدد کی، بھرپور مدد کی بھٹو صاحب کی ساری پارٹی کی، بلکہ جو ہمارا اندازہ تھا اور ہم ان سے کہتے بھی رہے، کہ ہمارا یہ اندازہ ہے۔ اس کے مطابق ہی یہ جیتے۔ ہمارے ورکرز ہوتے ہیں ہر جگہ۔ ایک تو یہ ہے کہ ہمیں گپیں مارنے کی عادت نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے لوگ اچھا انتظام کرنے والے ہیں۔

س:۔ بھٹو صاحب میں آپ کو اس وقت کیا بات نظر آئی۔

ج:۔ باقی جتنی جماعتیں تھیں، سب کے منشور میں یہ اعلان تھا کہ کامیابی کی صورت میں ہمیں کافر قرار دلوائیں گی۔ تو یہ ایک ہی پارٹی (پیپلز پارٹی) تھی جس کے منشور میں یہ نہیں تھا۔

س :۔ لیکن کیا پھر انہی نے۔
ج :۔ لیکن کیا پھر انہی نے۔
س :۔ یہ کیوں اتنے مخالف ہو گئے آپ کے۔
ج :۔ ہماری مخالفت کی وجہ سے نہیں، دراصل انہوں نے یہ موقف جو اختیار کیا یہ اس لیے تھا کہ وہ آئندہ کے لیے اپنے تئیں پاکستان کا غیر متنازعہ لیڈر بننا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر میں یہ بات کر دوں تو میری واہ واہ ہوگی، علماء بھی ساتھ ہوں گے، تو اس سے مجھے پختگی ہو جائے گی۔ یہ نہیں تھا کہ ہماری کسی شکایت کی وجہ سے یا دکھ کی وجہ سے وہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے منافع کی وجہ سے ہمیں قربان کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چھوٹی سی بات ہے۔ یوں تو انہوں نے حضرت صاحب کو ایک دفعہ ملاقات کے لیے بلایا اور باتوں کے دوران ادھر اُدھر دیکھا اور کہا، کہ یہاں قرآن کریم نہیں ورنہ میں قرآن کریم ہاتھ میں لے کر قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کو مسلمان ہی سمجھتا ہوں۔
س :۔ اچھا!
ج :۔ ہاں، اس کو کیا تھا
س :۔ اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے کسی معاملے میں آپ سے رائے لی۔
ج :۔ بھٹو صاحب نے ۱۹۷۳ء کے آئین کا مسودہ یحییٰ بختیار کے ہاتھ مجھے نظر ثانی کے لیے لندن بھیجا، اتنا مجھے یاد ہے۔ کہ میں نے انہیں کہا کہ پہلے تو یہ کنونشن تھی۔ اب آپ نے لکھ دیا ہے کہ صدر، وزیر اعظم کی رائے کا پابند ہوگا، آپ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وزیر اعظم کو آرمڈ فورسز ریز کرنے کا اختیار ہوگا۔ اس طرح تو کوئی شخص جسے ذرا بھی اپنی عزت نفس کا خیال ہے، آپ کا صدر نہیں بنے گا۔ میرے کہنے پر انہوں نے مسودے میں وزیر اعظم کی بجائے صدر لکھ دیا۔
جنگی قیدیوں کے سلسلے میں یحییٰ بختیار لندن آئے اور کہا کہ بھٹو صاحب کا اصرار ہے کہ آپ اس مسئلے کو عالمی عدالت انصاف میں اٹھائیں میں نے کچھ پیش رفت کی لیکن اتنے میں ان کا اندرا کے ساتھ طے پا گیا۔
س :۔ کہا جاتا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں جب فارن منسٹر تھے تو انہوں نے فارن آفس میں اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو خوب بھرتی کیا۔ اس طرح اقربا پروری کے مرتکب ہوتے رہے۔
ج :۔ اقربا پروری تو رہی ایک طرف میں نے اپنے اختیارات کے تحت وزارت خارجہ میں کسی ایک افسر کا تقرر بھی نہ کیا۔ کیونکہ فارن سروس کا تو وجود نہیں تھا۔ اسے ہمیں خود ہی بنانا تھا۔ اس لیے ہر گریڈ کے لیے بھرتی شروع ہوئی اور جہاں جہاں سے مناسب آدمی آئے تھے۔ ہم نے انہیں لیا۔ لیکن پبلک سروس کمشن کی سفارش و تصدیق پر۔ میرا کسی کی تقرری میں ذاتی دخل نہیں ہوتا تھا۔ میرے وقت میں فارن منسٹری میں جو بھی کوئی احمدی بھرتی ہوا۔

وہ تقسیم سے عین پہلے جو امتحان ہو چکے تھے۔ ان کے انتخاب کے نتیجے میں آیا۔ میرے ذہن میں تو اس وقت ایک ہی ہے۔ یا دو ہیں۔ ایک آفتاب احمد خاں، یہ پہلے منتخب ہو چکے ہوئے تھے۔ میرا ان کی تقرری میں قطعاً کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اور نہ مجھے اس وقت پتہ تھا کہ یہ احمدی ہیں۔ تقرری کے جلد ہی بعد چار نئے افسر لیے گئے تھے۔ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ اُن میں یہ بھی تھے۔ آئے اور چلے گئے۔ اس کے بعد جُمعہ کی نماز میں مَیں نے انہیں دیکھا۔ بعد میں یہ مجھے ملنے آئے۔ میں نے پُوچھا۔ آپ ہماری مسجد میں کیسے آ گئے۔ انہوں نے کہا، میں احمدی ہوں۔ ان کے احمدی ہونے کا مجھے اس طرح پتہ چلا۔ اس کے بعد قاضی محمود شفقت ہوئے۔ وہ بھی مقابلے کے ذریعے پوسٹل سروس میں آ چکے تھے۔ پبلک سروس کمشن نے انہیں فارن منسٹری کے لیے ریکمینڈ کیا۔ کیونکہ ہم نے انہیں کہا ہوا تھا کہ ہمیں ضرورت ہے۔ جب وہ ریکمینڈ کر دیتے تو سیکرٹری مجھے اطلاع کر دیتا تھا۔ میں یہاں ہوتا تو یہاں، باہر ہوتا تو وہاں اطلاع بھیج دیتا تھا کہ یہ لوگ ریکمینڈ ہوئے ہیں۔ البتہ ایک کیس مجھے یاد ہے۔ ایک اُمیدوار مجھے ملنے آیا، کہ میری درخواست ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ میں نے کہا پبلک سروس کمشن تمہیں ریکمینڈ کرے گا۔ تو رکھ لیں گے۔ لیکن اس نے جا کے سیکرٹری سے کہا کہ میں وزیر صاحب سے ملا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ریکمینڈیشن تو جب آئے گی دیکھیں گے۔ فی الحال اس کی تقرری کر دو۔ سیکرٹری نے مجھے فون کیا۔ میں نے اسے کہا کہ اب اگر اس کی ریکمینڈیشن آ بھی جائے تو بھی اسے نہ رکھنا۔ اس لیے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ غالباً نہرو آنے تھے کہ میں ان کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی بھی لائن میں ہے۔ آغا مصطفیٰ اس وقت ہمارے پروٹوکول آفیسر تھے۔ میں نے ان سے پوچھا یہ کیسے ہو گیا۔ پتہ چلا کہ میں اس وقت ملک سے باہر تھا۔ کہ چند نام آئے۔ ان میں اس کا نام بھی آ گیا۔ کسی نے توجہ ہی نہیں دلائی۔ میرے ذہن میں تو نہیں ہوتا تھا کہ اس کو کرنا ہے۔ اس کو نہیں کرنا ہے۔ اس طرح میری مرضی کے خلاف تو ایک ہو گیا۔ لیکن میرے کہنے پر کوئی نہیں ہوا۔

س: یہ شخص آپ کا ہم عقیدہ تھا۔

ج: اگر یہ احمدی ہوتا تو میں اس کی اچھی طرح خبر لیتا۔ ایک اور بات آپ کو بتا دوں۔ ہر منسٹر کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور پرسنل اسسٹنٹ خود مقرر کرے۔ میں نے بھی اپنے اختیار کے تحت یہ دونوں اسامیاں خود پُر کیں۔ لیکن دونوں اصحاب غیر احمدی تھے۔ میں جتنی دیر وزیر خارجہ رہا۔ یہی رہے۔ سیکرٹری تھے فرحت علی اور پی اے کا نام اشتیاق حسین تھا۔ جو بعد میں فارن سروس میں چلے گئے۔ اور جب میں حج کے لیے گیا تو یہ جدہ میں ہماری ایمبیسی میں تھرڈ سیکرٹری تھے۔

س: یہ تو الٹ معاملہ نکلا۔

ج: ہاں، بتائیں۔ نام لے کے بتائیں۔ الزام جو لگاتے ہیں۔

س:۔ ۵۳ء میں آپ کی کمیونٹی کے خلاف جو موومنٹ چلی۔ اس میں آپ بھی خاص ہدف بنے رہے۔

ج:۔ اُن کی پرنسپل ڈیمانڈ تو یہی تھی کہ اسے الگ کیا جائے۔

س:۔ ظاہر میں تو اس موومنٹ کا مذہبی رنگ تھا۔

ج:۔ تعصب ہی کی بنا پر تھی۔

س:۔ کیا خیال ہے، لوگوں کے مذہبی جذبات کو کسی اور مقصد کے حصول کے لیے ایکسپلائٹ تو نہیں کیا گیا تھا۔

ج:۔ بھئی، میں آپ کے سوالوں کا جواب دینے کی کچھ نہ کچھ کوشش تو کرتا ہوں، لیکن لوگوں کے خیالات کا مجھے کیا معلوم، کیا تھے۔ جوش تھا، ہمیشہ ہوتا ہے۔ ہماری جماعت کے خلاف ہر بیس سال کے بعد ضرور اُبال اٹھتا ہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ پہلے سے زیادہ جماعت کو ترقی دے دیتا ہے۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے۔

س:۔ ۵۳ء والی موومنٹ کے بارے میں ایک یہ نقطۂ نظر بھی سامنے آیا کہ بعض سیاستدانوں نے علماء کو ایکسپلائٹ کیا۔

ج:کون سے سیاستدانوں نے۔

س:۔ کہا جاتا ہے کہ منتخب وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کرنے اور دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہ پنجاب کے وزیراعلیٰ ممتاز دولتانہ اور گورنر جنرل ملک غلام محمد کی سازش تھی۔

ج:۔ اسمبلی موقوف تو ملک غلام محمد نے کی، لیکن ملک غلام محمد اور دولتانہ کی پہلے سے کوئی سازش نہ تھی۔

س:۔ کہ اس طرح موومنٹ چلوائی جائے، اور اس کے نتیجے میں پرائم منسٹر کو برطرف کیا جائے۔

ج:۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔

س:۔ اس کے متعلق دلیل یہ دی جاتی ہے، کہ ملک غلام محمد اپنے داؤ پر تھے۔ اور دولتانہ اپنے مفادات کے چکر ہیں۔

ج:۔ دولتانہ کا بہت سارا حصہ اس موومنٹ میں تھا، یہ تو ایک واقعہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن ملک غلام محمد قطعاً اس موومنٹ کے حق میں نہیں تھے۔

س:۔ دولتانہ کی حد تک پھر یہ صحیح ہوا کہ وہ اس سے مرکز کے لیے کچھ پریشانیاں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ج:۔ مجھے یہ علم نہیں کہ وہ چاہتے کیا تھے۔ لیکن یہ بات کہ وہ اس میں شامل تھے۔ ان کی غرض میں نہیں جانتا، کیا تھی۔ میری طبیعت میں دو باتیں نہیں۔ ایک تو میں زیادہ قیاس آرائیاں

نہیں کرتا، کر نہیں سکتا، دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو میں کسی پر بدظنی نہیں کرتا۔ واقعات خود کوئی بات ثابت کردیں تو کردیں۔

س :۔ مولانا مودودی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ انہیں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے کہلا بھیجا کہ یہ موومنٹ آئین سازی کے خلاف ایک سازش ہے، تھی ایسی کوئی بات۔

ج :۔ میرے علم میں نہیں۔

س :۔ خواجہ صاحب کے بارے میں ایک بات بہت مشہور کی گئی کہ انہوں نے کہا، اگر میں انہیں اقلیت قرار دیدوں تو امریکہ گندم بند کردے گا۔

ج :۔ بالکل بیہودہ بات ہے۔

س :۔ آپ نے کہا کہ ان کی مین ڈیمانڈ یہی تھی کہ ظفر اللہ خاں کو وزارت سے الگ کرو، امن عامہ کی خاطر آپ مستعفی کیوں نہ ہوگئے۔

ج :۔ قائداعظمؒ کا انتقال ہوچکا تھا، لیاقت علی خاں بھی فوت ہوچکے تھے۔ خواجہ ناظم الدین پرائم منسٹر تھے، ان میں اتنی ہمت نہیں تھی، کہ علماء کا سامنے کرتے۔ منیر انکوائری میں انہوں نے خود بیان دیا ہے۔ کہ ظفر اللہ خاں نے تو کہا تھا کہ اگر آپ کی خلاصی میرے استعفا دینے سے ہوتی ہے، تو میں استعفا دینے کو تیار ہوں، اور ایسا یہ گل صحیح اے۔ میں نے دو تین بار خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ ظفر اللہ خاں کو الگ کردو۔ اگر میرے استعفا دینے سے آپ کی مشکل آسان ہوتی ہو تو میں استعفا دے دیتا ہوں۔ خواجہ صاحب یہی کہتے، آج آپ استعفا دیدیں، کل کسی اور منسٹر کا کہیں گے، پرسوں کسی اور کے متعلق شور مچائیں گے۔ میں پھر حکومت انہی کے ہاتھ دیدوں۔ اصولاً تو ان کا موقف صحیح تھا۔ ہمت ان میں نہیں تھی کہ مقابلہ کرتے۔ ان کا پرائم منسٹر ہونا ایک بہت بڑی کمزوری کا موجب بن گیا تھا۔ فیصلہ نہیں کرسکتے تھے، یوں آدمی بڑے نیک تھے، انہیں کوئی نہ کوئی سہارا دینے والا ہونا چاہیئے۔ اکثر وقت ان کے بھائی خواجہ شہاب الدین ان کے ساتھ تھے۔ پھر جب یہ پرائم منسٹر ہوگئے۔ تو وہ جوائنٹ پاکستان سے منسٹر تھے۔ فضل الرحمٰن، انہیں خیال ہوا کہ دونوں بھائیوں میں ایک پرائم منسٹر ہے، دوسرا ہوم منسٹر ہے، تو فضل الرحمٰن صاحب نے خواجہ ناظم الدین صاحب پر زور دینا شروع کیا کہ خواجہ شہاب الدین کو نہیں لینا چاہیئے۔ تو انہوں نے خواجہ شہاب الدین کو سرحد کا گورنر کرکے بھیج دیا۔ ان کی جگہ سہارے کے طور پر فضل الرحمٰن نے لے لی۔ گو ٹیلی فون وغیرہ پر خواجہ شہاب الدین سے بھی مشورہ وغیرہ کرتے رہتے ہوں گے۔ انہیں کسی نہ کسی پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ خود کوئی ہمت نہیں کرتے تھے۔ یوں بڑے نیک آدمی تھے، نمازی تھے۔ لیکن قوتِ فیصلہ یا مضبوطی نہیں تھی۔ ملک غلام محمد صاحب کہا کرتے تھے کہ خواجہ صاحب جو تو نہ کرنے کی باتیں ہیں۔ وہ تو نہیں کرتے، جھوٹ نہیں بولتے، رشوت نہیں لیتے، زنا نہیں کرتے۔ کوئی برائی ان میں نہیں، لیکن جو کرنے کی کوئی بات ہے، وہ نہیں کرتے۔

س :۔ پھر انہوں نے لاہور میں مارشل لاء لگانے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔

ج :۔ اس وقت چندریگر صاحب یہاں گورنر تھے۔ ان کے بار بار ٹیلی فون آتے تھے کہ لاہور میں فساد بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک روز پرائم منسٹر ہاؤس میں کابینہ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ کہ ان کا ٹیلی فون آیا۔ خواجہ صاحب ساتھ والے کمرے میں سننے گئے۔ سن کر آئے تو کہا۔ گورنر صاحب کہتے ہیں، حالت یہ ہو چکی ہے کہ اب میں ٹیلی فون بھی ان لوگوں کی اجازت سے ہی کر سکتا ہوں۔ شائد اب وہ اس کی بھی اجازت نہ دیں۔ اس لیے یہاں امن تبھی قائم ہو سکتا ہے، اگر آپ ہمیں اجازت دیں کہ ان کے مطالبات مان لیے جائیں۔ ورنہ آج شام تک لاہور جل کر رہ جائے گا۔ یہ سنا کر خواجہ صاحب نے کہا، بتایئے صاحبان اب کیا کیا جائے۔ سکندر مرزا اس وقت ڈیفنس سیکرٹری تھے۔ وہ بھی وہاں موجود تھے۔ شائد چودھری محمد علی صاحب نے ان سے کہا، وائرلیس پر لاہور کے کمانڈر سے بات کر کے معلوم کریں۔ کیا حالت ہے، کیا ایسی ہی ہے، جو گورنر صاحب کہتے ہیں، انہوں نے کہا اچھی بات، اتنے میں خواجہ صاحب اٹھ کے اندر تشریف لے گئے۔ ان کے مکان پر ہی ہو رہی تھی میٹنگ۔ سکندر مرزا بات کر کے آئے، اس وقت لاہور میں جنرل اعظم خاں کمانڈر تھے۔ اتنے میں خواجہ صاحب بھی آ گئے۔ سکندر مرزا نے بتایا کہ میں نے جنرل اعظم سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حالت تو ویسی ہی ہے۔ جیسی گورنر نے آپ کو بتائی ہے۔ تو میں نے اسے کہا کہ اگر تمہیں کہا جائے کہ امن قائم کرو تو کتنا وقت لو گے۔ وہ کہتا ہے، کہ ایک گھنٹہ۔ تو میں نے اسے کہا ہے کہ

GO AHEAD (تو پھر اٹھایئے قدم)

THAT WAS HOW MARTIAL LAW WAS IMPOSED.

خواجہ صاحب نے نہ ہاں کہی نہ ناں کہی۔ خواجہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ کوئی فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے کے کچھ کر دے، تو اچھی بات ہے کر دے، ان پر ذمہ داری نہ آئے۔ تو اس طرح یہ ہوا تھا۔

ہر جگہ جلوس نکلتے تھے۔ جہلم میں ایک جلوس میں ایک گتے پر میرا نام لکھ کے وہ گتہ ایک کتے کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ اس کو وہ آگے آگے لیتے رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں مسکرایا اور کہا یہ بات کہ انہوں نے مجھے کتا قرار دیا، مجھے اس پر ہنسی آتی ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی تو نگاہ میں کتا ہی نہیں، کتوں سے بھی بدتر ہوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں اس درگاہ کا کتا ہوں۔ جس کو اپنے کتوں کے متعلق بڑی غیرت ہے۔ باقی کلبِ علی نام رکھ لیتے ہیں۔ میں کلبُ اللہ بن گیا تو میرے لیے یہ بات عزت کی موجب ہے۔ لیکن ہونا یہ چاہیئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کا ادب ملحوظ رکھتے، اسے کتے کے گلے میں نہ باندھتے۔ خیر وہ کر لیا انہوں نے۔ اُس وقت یہ سمجھتے ہوں گے، جب بڑا شور و شغب ہوا کہ اس کو ہم وزارتِ خارجہ سے نکلوا دیں گے، تو اس کو روٹی نہیں ملے گی۔ یہ کہاں جائے گا۔ اس کو ہمارے ساتھ شامل ہونا ہو گا۔ خدا

جانے کیا ان کے ذہن میں تھا۔ یہ نہیں جانتے کہ رزق خدا دیتا ہے۔ کوئی انسان نہیں دیتا۔ میرا یہ احساس تھا کہ غیر ممالک کے جو سفراء تھے۔ ان کی طبائع پر یہی اثر تھا۔ کہ یہ ایک مذہبی تعصب کا اظہار ہے۔ اس کی پوزیشن کیبنٹ میں بھی اور پارٹی میں بھی بڑی مضبوط ہے۔ اس سے مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کمزوری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ایک سال بعد جب یہ بات رفع ہوگئی تھی۔ پارٹی کے اندر یہ شوشہ کھڑا ہوا کہ دو وزراء، نواب مشتاق احمد گورمانی اور چودہری ظفر اللہ خاں کو علیحدہ کیا جائے۔ اس وقت کے پرائم منسٹر صاحب نے، محمد علی بوگرہ تھے پرائم منسٹر۔ انہوں نے ان عناصر کو سمجھا بجھا کر، کچھ کر کے اس بات کو دبا تو دیا۔ لیکن میری طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ اب میرا وزارتِ خارجہ کے ساتھ چمٹے رہنا پاکستان کے لیے کمزوری کا موجب ہے۔ کیونکہ اب جو سفراء ہیں، باہر کے، ان کو تو ہر بات پہنچ جاتی تھی۔ آج کیبنٹ میں بات ہوئی ہے۔ تو شام تک ان کی بات پہنچ جاتی تھی وہ سمجھ لیں گے کہ اس کی پارٹی کے اندر بھی پوزیشن مضبوط نہیں تو اس سے پاکستان کو اپنے امورِ خارجہ میں کمزوری کا اندیشہ ہے۔ اس لیے مجھے اب چھوڑ دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۰/ اپریل ۱۹۵۴ء کی میٹنگ میں، جب کیبنٹ کا کام ختم ہوا تو میں نے پرائم منسٹر صاحب سے اجازت چاہی، کہ میں کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا، اچھی بات۔ میں نے بتایا کہ پچھلے سال تو یہ حال تھا۔ اس سال یہ صورتِ حال ہے۔ میں سمجھتا ہوں، مجھے چھوڑ دینا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں، تیس جون سے مجھے فارغ کر دیا جائے۔ خیر، میرے رفقاء نے اور پرائم منسٹر صاحب نے بھی کہا، نہیں تم غور کر لو۔ بڑے افسوس کی بات ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ چودھری محمد علی صاحب تو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔ یہ تھے اس وقت فنانس منسٹر، ان کی نشست بالکل میرے ساتھ تھی، انہوں نے مجھ سے کہا، بڑے افسوس کی بات ہے۔ جنوری میں یہ موقع ہوا تھا، تمہارا نام بھیج دیا جاتا، انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں ایک جج کی جگہ خالی ہوئی تھی، سر بی این راؤ ہندوستانی جج تھے۔ وہ فوت ہوئے تھے۔ اُن کی جگہ، تو وہ موقع ہم نے گنوا دیا۔ میرا اور محمد علی صاحب کا آپس میں، بڑا جوڑ تھا۔ ہم بڑا عرصہ اکٹھے کام بھی کرتے رہے۔ کشمیر کے معاملات وغیرہ میں۔ میں نے ان سے کہا، محمد علی رزق خُدا دیتا ہے، نہ کوئی حکومت دیتی ہے، نہ کوئی عدالت دیتی ہے، نہ کوئی اقوامِ متحدہ دیتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جس نے مجھے اب تک دیا، آئندہ بھی دے گا۔ مجھے تو کوئی فکر نہیں، تمہیں کیوں فکر ہے۔ آخر یہی ہوا۔ میں ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

س :۔ پھر بھی!

ج :۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہماری حکومت نے یہ اصرار کیا، ہندوستان کے ساتھ ہمارا سندھ کے پانیوں پر جو جھگڑا چل رہا تھا، اس میں ورلڈ بنک اپنے ذریعے سے کچھ سمجھوتہ کرانا چاہتا تھا۔ تو ورلڈ بنک کے ساتھ کوئی روک پیدا ہو گئی تھی۔ حکومت نے مجھے کہا کہ تم جاؤ، پہلے تو میں نے انکار کر دیا، اور کہا کہ بنک والوں کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی ہو گی، وہاں دلائل تو میں دے لوں

گا، لیکن میں کہوں گا۔ کہ میری حکومت یوں کرے گی، وُوں کرے گی۔ وہ مسکرائیں گے کہ اس کی حکومت کا اب کیا ہے، یہ تو جا رہا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ کسی اور کو بھیج دیا جائے۔ پرائم منسٹر صاحب (محمد علی بوگرہ) نے کہا کہ ہمارا اصرار ہے۔ تم ضرور جاؤ، پہلے بھی تم ہی کرتے رہے ہو۔ تو میں چلا گیا۔ اس دوران مجھے وہاں امریکن اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ نے کہا۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تم نے استعفا دیدیا ہے وہاں سے۔ کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے لیے عالمی عدالتِ انصاف کا رکن منتخب کرانے کے لیے کوشش کی جائے۔ میں نے کہا۔ ہم نے تو نام نہیں بھیجا ہوا۔ انہوں نے کہا۔ یونائیٹڈ نیشنز میں جو تمہارا مشن ہے، اسے کہو کر وہاں سے پتہ کرے۔ میں نے پتہ کیا۔ انہوں نے بتایا نام تو آپ کا ہے۔ ہمدانی صاحب تھے اس وقت ہمارے وہاں۔ میں نے کہا کیسے ہوا۔ ہم نے تو بھیجا نہیں۔ کہنے لگے۔ فہرست میں تو موجود ہے۔ خیر، اس طور پر میرا نام آگیا۔

س :۔ کس ملک نے آپ کا نام بھیجا تھا۔

ج :۔ بعض ممالک ہندوستانی امیدوار مسٹر جسٹس پال جو کلکتہ ہائی کورٹ میں جج تھے، ان سے آشفتہ تھے۔ وہ انہیں نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جاپانی وار کرائمز ٹربیونل کے رکن رہے تھے۔ اور انہوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ یہ مقدمات خود وار کرائمز (جنگی جرائم) ہیں۔ اس پر مغربی حکومتیں بڑی آشفتہ ہوئی تھیں۔ اگرچہ عام خیال یہی تھا کہ ہندوستانی جج مرا ہے، اس کی جگہ بقیہ مدت کے لیے ہندوستانی امیدوار کا انتخاب ہوگا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ کسی ملک نے میرا نام بھیج دیا۔ کیونکہ ہر حکومت تین نام دے سکتی ہے۔

س :۔ ضروری نہیں کہ امیدوار اس کے اپنے ملک کا ہو۔

ج :۔ ضروری نہیں کہ امیدوار اس کے اپنے ملک کا ہو۔

س :۔ کس ملک نے آپ کو نام بھیجا تھا۔

ج :۔ مجھے اس وقت تک کوئی علم نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرا انتخاب بھی ہو گیا۔

س :۔ کس ملک نے آپ کا نام بھیجا تھا۔

ج :۔ یہ ملک کا جانے دیجئے کہ کس نے بھیجا تھا۔ میں نے کہا نا کہ مغربی حکومتیں ہندوستانی امیدوار سے آشفتہ تھیں۔

س :۔ قیامِ پاکستان کے وقت پنجاب بونڈری کمشن مقرر ہوا جس کے ذمے بھارتی اور پاکستانی پنجاب میں حد بندی کا کام انجام دینا تھا۔ آپ مسلم لیگ کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔ ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ بونڈری کمشن نے انڈیا کے حوالے کر دی۔ کشمیر کے حوالے سے اس تحصیل کی اہمیت بعد کے مسائل نے اور واضح کر دی۔ اس سلسلے میں عام طور پر دو افراد پر الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ایک آپ۔ دوسرے نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی ریاست

بچانے کی خاطر پٹھان کوٹ کی تحصیل مشرقی پنجاب کو دلوا دی۔ اگرچہ انہیں اپنی ریاست بھی نہ ملی، لیکن پٹھان کوٹ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

ج :۔ یہ بالکل غلط ہے کہ ممدوٹ نے سودے بازی کی ہو، وہ کس سے سودے بازی کرتے اور کس حیثیت سے کرتے۔ اگر وہ کر سکنے کی پوزیشن میں ہوتے تو بھی ان میں اتنی صلاحیت نہ تھی، کہ وہ ایسا کر گزرتے۔ نواب ممدوٹ تو بہت شریف اور بھلے مانس آدمی تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ ایک کلمہ تک نہیں کہا کہ بونڈری کمشن کے سامنے کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں کرنا۔

س :۔ اور آپ؟

ج :۔ میں اس وقت انڈین فیڈرل کورٹ میں جج تھا۔ جب برطانوی وزیرِ اعظم مسٹر ایٹلی نے (۳ جون ۱۹۴۷ء) تقسیم ہند کا اعلان کیا۔ میرا ارادہ لاہور میں وکالت کرنے کا ہوا۔ اور میں نے جج شپ سے استعفا دے دیا۔ ان دنوں نواب بھوپال سر حمید اللہ خاں بھی دہلی میں تھے۔ انہوں نے مجھے کہا، کچھ عرصے کے لیے بھوپال جاؤ تاکہ اس صورتِ حال میں والیانِ ریاست کو جو مسائل درپیش آئیں، ان کے بارے میں آپ سے مشورہ کیا جا سکے۔ میں بھوپال چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد نواب صاحب نے مجھے لندن جانے کا کہا کہ انہی دنوں قائداعظمؒ نے مجھے بھوپال سے بلا کر ارشاد فرمایا۔ پنجاب بونڈری کمشن میں آپ ہمارا کیس پیش کریں۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ میں حاضر ہوں، لیکن مجھے کل پرسوں ہی نواب صاحب نے فرمایا ہے کہ انگلستان پارلیمنٹ میں قانونِ آزادیٔ ہند کا بل پیش ہونے والا ہے، آپ وہاں جائیں اور ہمارے متعلق جو کلاز ہے، اس کی مزید وضاحت ہو سکے تو کوشش کرنا۔ اس لیے میں تو وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔ قائداعظمؒ نے پوچھا تمہیں وہاں کتنا وقت لگے گا۔ میں نے کہا دو ہفتے۔ انہوں نے کہا، ٹھیک ہے ابھی تو امپائر بھی مقرر نہیں ہوا۔ خاصا وقت ہے۔ واپس آؤ گے تو لاہور کے وکلاء نے پورا کیس تیار کر لیا ہوگا۔ تمہیں صرف اپنے دلائل اور اسلوب بحث ترتیب دینا ہوں گے۔ میں ابھی لندن میں ہی تھا کہ سر سیرل ریڈ کلف کو بونڈری کمشن کا چیئرمین مقرر کرنے کا اعلان ہو گیا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا۔ کیونکہ وہ ایک بیرسٹر تھے جو بار پریکٹس کر رہے تھے۔ اور پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ ان پر کئی طرح سے اثر ڈالا جا سکتا تھا۔ انگلستان روانگی سے قبل جب قائداعظمؒ نے مجھے مسلم لیگ کی طرف سے پیش ہونے کی ہدایت کی تھی تو اس وقت میں نے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ آپ امپائر کے متعلق خیال کرنا۔ آپ پریوی کونسل میں وکالت کرتے رہے ہیں، بہتر ہوگا، لارڈز آف اپیل میں سے اگر کوئی جج امپائر مقرر ہو جائے کیونکہ وہ ایسے شخص ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے اثر کے ماتحت کوئی کام نہیں کرتے، ویسے تو غلطی ہر انسان کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح ہمیں یہ اطمینان ہوگا۔ کہ جس شخص نے آخری فیصلہ کرنا ہے وہ کوئی بیرونی اثر قبول نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا، اچھا میں ذہن میں رکھوں گا، لیکن بعد میں شائد چودھری محمد علی صاحب نے یا کسی اور نے مجھے

بتایا کہ وہ (قائداعظم ؒ) کہتے تھے۔ میں نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن جواب ملا کہ لارڈز آف اپیل بڑی عمر کے آدمی ہوتے ہیں، گرمیوں کا موسم ہے۔ وہ ہندوستان کی گرمی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس بہانے برطانوی حکومت نے ہماری بات ٹال دی ہے۔ بہرحال، میں وہیں تھا کہ ریڈ کلف کا تقرر ہو گیا۔

میں پندرہ کی بجائے چودہ دن بعد ہی لاہور پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن پر نواب ممدوٹ اور دوسرے لوگ مجھے لینے آئے تھے۔ نواب صاحب نے مجھے بتایا۔ ریڈ کلف لاہور پہنچ چکا ہے۔ اور اس نے کل گیارہ بجے صبح فریقین کے وکلاء کو بلایا ہے۔ کل ڈھائی بجے میں نے وکلاء صاحبان کو اپنی کوٹھی پر بلایا ہوا ہے۔ ہم گیارہ بجے ریڈ کلف کے روبرو پیش ہوئے، کمشن کے اراکین جسٹس دین محمد، جسٹس محمد منیر، جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ بھی موجود تھے۔ کمشن نے جو کچھ ہدایات ہمیں دینی تھیں، وہ دیں۔ ڈھائی بجے میں نواب ممدوٹ کی کوٹھی پر گیا، وہاں وکیلوں کی تو کوئی کمی نہ تھی۔ کوئی تیس چالیس تھے۔ السلام علیکم۔ وعلیکم سلام ہوئی، کہنے لگے۔ بیٹھو، میں نے کہا، آپ میں سے کون کون صاحب میرے ساتھ کیس میں کام کریں گے۔ خلیفہ شجاع الدین مرحوم نے کہا، کون سے کیس میں؟ میں نے کہا بونڈری (حد بندی) کیس میں۔ کہنے لگے، ہمیں تو پتہ ہی نہیں۔ میں نے نواب صاحب کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تو وہ مسکرا دیئے۔ ذرہ بھر کوئی کام نہیں کر رکھا تھا، حالانکہ میں نے ہدایات پنجاب مسلم لیگ کے لیڈروں سے حاصل کرنی تھیں لیکن ادھر ذرہ بھر کام نہیں ہوا تھا، نہ ممدوٹ، نہ دولتانہ، نہ شوکت حیات، کوئی نہیں، میری حالت کا آپ اندازہ کریں۔ کیا ہوئی ہوگی۔ سوموار کی شام میں لاہور پہنچا تھا۔ آج منگل تھی۔ جب کمشن نے جمعہ کا وقت مقرر کیا۔ کہ جمعہ کی دوپہر تک اپنا تحریری بیان داخل کرو۔ اور آئندہ سوموار کو کمشن بیانات سنے گا۔ لندن روانگی کے وقت قائداعظم ؒ نے مجھے فرمایا تھا۔ کیس تیار رہوگا، آپ کو صرف اپنی بحث ترتیب دینا ہوگی۔ بہت وقت ہے اور کیس کے متعلق یہاں زیر و صورت تھی۔ اس ضمن میں کسی کے ذہن میں کوئی بات نہیں تھی۔ اب ایک صورت یہ تھی، کہ میں دہلی فون کر کے قائداعظم ؒ سے ہدایات لوں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ دوسرے ان لوگوں کی شکایت ہوتی۔ میں نے یہ بھی مناسب نہ سمجھا۔

میں نے ان سے رخصت لی کہ چلتا ہوں، میں سید مراتب علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جو ڈیوس روڈ کی ایک دوسری لین میں ممدوٹ ولا کے قریب ہی تھی۔ میں سید صاحب کی کوٹھی تک واک کرتا چلا آیا۔ عصر کی نماز کا وقت تھا۔ میں نے نماز پڑھی۔ جلد ہی بعد میں نے محسوس کیا کہ خداتعالیٰ نے میری مضطربانہ دعا کے جواب میں میری بیکسی پر نگاہ کرم کی ہے۔ جب چند ہی منٹ بعد خواجہ عبدالرحیم جو اس وقت راولپنڈی میں کمشنر تھے۔ مہاجرین کے معاملے میں خاص طور پر لاہور آئے تھے۔ ان کا دفتر سید مراتب علی کی کوٹھی کے سامنے دو خیموں میں تھا، آ گئے، ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ انہوں نے کہا، چودھری صاحب میں نے اپنے

طور پر آبادیوں کے کچھ اعداد و شمار جمع کیے تھے۔ شائد آپ کے کام آجائیں اور میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ کے شکر کے اور کیا تھا کہ مجھے کچھ تو ملا۔ دو چار وکیل بھی آ گئے۔ لاہور کے ان وکلاء میں سے نہیں جو ممدوٹ ولا میں جمع تھے۔ ایک پاکپتن کے تھے سید محمد شاہ، دو منٹگمری (ساہی وال) کے تھے، صاحبزادہ نوازش علی اور شیخ نثار احمد۔ اور ایک ہوشیارپور کے تھے چودھری علی اکبر۔ وہ آ گئے کہ ہم کیا مدد کر سکتے ہیں، میں نے کہا، اچھی بات، چودھری علی اکبر کو تو میں نے بھاگ دوڑ پر لگا دیا، دوسرے تین وکیل میرے ساتھ کام کرتے رہے۔ چودھری علی اکبر کو آبادی کے اعداد و شمار اور ضروری معلومات کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔ لاہور میں جولائی کے مہینے کتنی سخت گرمی ہوتی ہے۔ جب وہ اپنی ڈیوٹی تندہی سے انجام دے کے آتے تو اپنے کام کی رپورٹ کر کے تھکاوٹ کے باعث وہیں فرش پر دراز ہو جاتے۔ لاہور کے وکلاء میں سے احمد سعید کرمانی بھی گاہے ماہے تشریف لاتے رہے۔

میں نے ان چاروں وکیلوں سے مشورہ در مشورہ کیا۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں جو ہمیں خواجہ عبدالرحیم دے گئے تھے۔ اب جو شرائط تھیں، جو ہدایات تھیں کہ مسلم آبادی سے ملحقہ اکثریتی علاقے پاکستان کی طرف آئیں گے۔ اور ہندو سکھ آبادی کے ملحقہ اکثریتی علاقے ہندوستان کی طرف جائیں گے۔ اس میں بنیادی بات یہ تھی کہ اکثریتی علاقہ قرار دینے کے لیے یونٹ کیا ہو گا۔ مثلاً گاؤں ہو تو دلی تک کئی گاؤں تھے۔ جن میں مسلمانوں کی کثرت تھی۔ دوسری طرف جہلم تک کئی گاؤں تھے جن میں ہندوؤں سکھوں کی کثرت تھی۔ گاؤں تو بونڈری یونٹ نہیں بن سکتا تھا۔ تھانوں کے ساتھ بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ باقی رہ گئے تحصیل اور اضلاع۔ اضلاع میں اس وقت عارضی تقسیم کی گئی تھی۔ اسے تسلیم کیا جاتا یا تحصیل کو۔ یہ کام تھا مسلم لیگ کا کہ وہ فیصلہ کرتی کہ کیا یونٹ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات کو بلایا، سردار شوکت حیات کی طرف سے جواب آیا کہ انہیں تو ملیریا ہے، اور ۱۰۲ ٹمپریچر ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ تشریف لے آئے۔ انہیں میں نے بتایا کہ ضلع وار یہ صورت بنتی ہے، تحصیل وار یہ صورت بنتی ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ کیا موقف اختیار کیا جائے۔ انہوں نے کہا، انکل آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔ میں نے کہا غلط بات ہے۔ میرے جاننے کا سوال نہیں۔ مجھے تو مسلم لیگ کی طرف سے ہدایات ملنی چاہئیں۔ اور آپ ہیں مسلم لیگ کے تینوں، نواب ممدوٹ، دولتانہ، شوکت حیات، نواب صاحب سے تو پوچھنے کا فائدہ نہیں، انہیں تو کسی بات کا پتہ نہیں۔ شوکت بیمار ہیں۔ آپ ہی ہیں، بتائیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

اس وقت صورت یہ بنتی تھی کہ اگر ضلع کو یونٹ قرار دیا جاتا تو ضلع امرتسر کو ترک کرنا پڑتا۔ اس سے یہ بھی اخذ کیا جاتا کہ انتظامی تقسیم میں جو علاقہ مغربی پاکستان میں شامل ہے، ہم اس سے بھی کم لینے پر تیار ہیں۔ نتیجتہً ہو سکتا تھا کہ ہمارے علاقے کو اور بھی کم کر دیا جاتا۔ تحصیل کو

یونٹ قرار دینے سے یہ ہوتا کہ ضلع فیروز پور کی دو تحصیلیں فیروز پور اور زیرہ اور ضلع جالندھر کی دو تحصیلیں نکودر اور جالندھر مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔ ان کے ساتھ مشرق کی طرف ملحقہ تحصیل دسوہہ ضلع ہوشیارپور میں تھی اس تحصیل میں نہ تو مسلمانوں کی کثرت تھی۔ نہ ہندوؤں سکھوں کی۔ فیصلہ کن کردار عیسائی آبادی ادا کر سکتی تھی۔ اس تحصیل کے عیسائیوں نے ریڈکلف کو میمورنڈم بھیجا تھا۔ کہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ چنانچہ تحصیل کو یونٹ قرار دیئے جانے سے فیروز پور، زیرہ، نکودر، جالندھر اور دسوہہ پانچوں تحصیلیں مسلمان اکثریت کے علاقے شمار ہوتیں۔ ریاست کپور تھلہ میں بھی مسلمانوں کی کثرت تھی۔ وہ بھی ان تحصیلوں سے ملحق تھی۔ ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں مسلمانوں کی اور امرتسر ہی کی ترن تارن میں غیر مسلموں کی کثرت تھی۔ لیکن اگر فیروز پور، زیرہ، نکودر، جالندھر اور کپور تھلہ پاکستان میں شامل کی جاتیں۔ تو امرتسر اور ترن تارن غیر مسلم اکثریت کے ملحق علاقے نہ رہتے۔ کیونکہ وہ چاروں طرف سے مسلم اکثریت کے علاقوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ضلع گورداسپور میں بٹالہ، گورداسپور اور شکر گڑھ تحصیلوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اور تحصیل پٹھانکوٹ میں غیر مسلموں کی، یہ تحصیل کانگڑہ اور ضلع ہوشیارپور سے ملحق بھی تھی۔ جو غیر مسلم اکثریت کے اضلاع تھے۔ پورے غور و خوض کے بعد ہم سب کا میلان اسی طرف ہوا کہ تحصیل کو یونٹ قرار دیئے جانے پر زور دیا جائے۔

خیر، اس کے مطابق ہم نے بیان تیار کیا۔ جمعرات کی رات شوکت کو فون کیا تو پھر وہی جواب آیا کہ وہ بیمار ہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ کو بلایا۔ وہ آگئے۔ میں نے کہا یہ مسودہ تیار ہے، پڑھ لو۔ پھر وہی بات کی، اجی آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک ہے۔ اس سے بہتر کیا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ناں ناں۔ آپ کو یہ بیان پڑھنا ہوگا۔ اگر آپ کو اختلاف ہو تو میں اس کے مطابق اسے تبدیل کروں گا۔ انہوں نے مسودہ پڑھا، انہوں نے کہا بہت اچھا ہے۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ بارہ بجے میں نے شیخ نثار احمد کو وہ یادداشت دی کہ اسے وہ کمشن میں داخل کرا آئیں۔ اور خود میں نماز جمعہ کے لیے چلا گیا۔

ٹیکنیکلی میں وکیل تھا۔ جو ہدایات تھیں ان کے مطابق میں نے عمل کرنا تھا۔ اس سے زیادہ میری ذمہ داری نہیں تھی۔ نمبر ۲۔ مجھے جو ہدایت دی گئی تھی۔ ٹھیک ہے میرا اپنا مشورہ بھی یہی تھا۔ وہ میں نے بیان کر دیا، لیکن میرا موکل تھا مسلم لیگ۔ ان کی ہدایت تھی کہ میں اسے تیار کروں۔ میں نے تیار کیا۔ پٹھانکوٹ کے سلسلے میں جہاں تک ہمارے دعوی کا تعلق تھا کہ یہ تحصیل ہمارے ساتھ آنی چاہیئے۔ تو ایسا ہم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی کمشن میں میں نے پٹھانکوٹ کے بارے میں بحث کی تھی کہ سیجوایشن کے حوالے سے یہ ہمارے ساتھ جانا چاہیئے۔ چونکہ تحصیل یونٹ تھی اس لیے ہمارا موقف مضبوط نہیں تھا تاہم یہ بات ہے کہ کمشن کے روبرو دوران بحث جب بھی اعداد و شمار کا جھگڑا اٹھتا تو ایک آدمی

وہ مقرر کرتے۔ ایک ہم۔ جو اعداد و شمار جا کر چیک کرتے۔ ہماری طرف سے چودھری علی اکبر ہوتے۔ ہر بار ہمارے اعداد و شمار ہی درست پاتے۔ معلوم ہوتا ہے خواجہ رحیم نے بہت محنت کی تھی۔

س:۔ میں نے تو ایک سیاسی کارکن کو ایک نجی محفل میں خواجہ رحیم پر بھی الزام تراشی کرتے سنا تھا۔

ج:۔ یہ غلط بات ہے۔ خواجہ رحیم بونڈری کمشن میں کوئی شمولیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اس وقت راولپنڈی میں کمشنر تھے لاہور میں مہاجرین پران کی ڈیوٹی لگی تھی۔ اور پوری تندہی کے ساتھ انہوں نے وہ کام کیا۔ محنتی آدمی تھے۔ اگر انہوں نے بھی وہ فگرز نہ مجھے دیئے ہوتے تو ہمارے پاس تو کچھ نہیں تھا۔

الزام لگانے والوں کا کیا ہے۔ کہتے ہیں جی پٹھانکوٹ ملنے والا تھا۔ ظفر اللہ خاں نے کہا۔ نہ وہ کتنی بیہودہ بات ہے۔ پٹھان کوٹ کس طرح مسلمانوں کے پاس آجاتا۔ کیا حق تھا۔ مسلمانوں کا جس کی وجہ سے پٹھان کوٹ اِدھر آجاتا۔

جب ۵۳ء میں فساد ہوئے اور اس پر تحقیقاتی عدالت بیٹھی جسٹس منیر نے لکھا ہے کہ ہمارے سامنے بڑا ذلت آمیز مظاہرہ کیا گیا کہ ظفر اللہ خاں نے بونڈری کمشن میں یہ کر دیا۔ وہ کر دیا۔ مجھے ان کے اصل الفاظ تو یاد نہیں۔ بہر حال خوب الزامات لگائے۔ جسٹس منیر نے کہا کہ یہ ناشکری کا اظہار ہے۔ میں بھی بونڈری کمشن کا ممبر تھا۔ جس محنت اور قابلیت کے ساتھ ظفر اللہ خاں نے مسلم لیگ کا کیس پیش کیا، اس کے لیے ہم سب کو اس کا ممنون ہونا چاہیئے۔

س:۔ چودھری صاحب اگر ضلع یونٹ بنتا تو پھر گورداسپور جس میں تحصیل پٹھانکوٹ بھی شامل تھی، اس طرف آتا۔

ج:۔ ٹھیک ہے، ضلع یونٹ بنتا تو گورداسپور کا ضلع اِدھر تھا۔ ہماری طرف لیکن بعض اور علاقے تھے۔ جو اُس طرف تھے۔

س:۔ پٹھانکوٹ اِدھر آجانے سے کشمیر کا مسئلہ تو نہ پیدا ہوتا۔

ج:۔ اُس وقت کی ہوندا یا کی نہ ہوندا دا سوال نئیں سی۔ (اس وقت کیا ہوتا یا کیا نہ ہوتا کا سوال نہیں تھا) اُس وقت کی موجودہ صورت حال کے لحاظ سے کشمیر کا سوال تو بعد میں جا کے پیدا ہوا۔ لوگ جب بات کرتے ہیں، تو سارا PERSPECTIVE (تناظر) ہی بدل دیتے ہیں۔ اُس وقت جولائی ۴۷ء میں تو کشمیر کا مسئلہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

س:۔ کہتے ہیں نا کہ اگر پٹھانکوٹ ہمارے پاس ہوتا تو.....

ج:۔ یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اگر مہاراجہ مسلمان ہوتا۔

س:۔ چودھری صاحب واقعی کشمیر کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا اگر بالغرض پٹھانکوٹ ہمارے پاس

ہوتا۔ کیونکہ اس طرح انڈیا کو کشمیر جانے کا راستہ نہ ملتا۔

ج :۔ میں ہی نہیں، کوئی بھی کیسے کہہ سکتا ہے۔ کہ کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوتا کہ نہ ہوتا۔

س :۔ یہ بھی دلیل دی جاتی ہے بلکہ الزام ہے کہ پٹھانکوٹ اس وجہ سے گیا کہ قادیان میں آپ کی کمیونٹی کے لوگوں نے اپنے آپ کو نان مسلم ظاہر کیا، جس سے ہندوؤں سکھوں کی اکثریت ہوگئی۔ اور وہ تحصیل انڈیا کا حصہ بن گئی۔

ج :۔ یہ بھی بالکل حقیقت کے الٹ بات ہے۔ حضرت صاحب نے شیخ بشیر احمد صاحب کو جو بعد میں ہائی کورٹ کے جج بھی ہوئے، اپنا نمائندہ مقرر کیا کہ وہ اس بات پر خاص طور پر زور دیں کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان میں شامل ہو۔ تحصیل کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ سارا ضلع گورداسپور انہوں نے کہا کہ شامل ہو۔ کیونکہ گورداسپور کے ضلع میں صورت یہ تھی۔ کہ اگر ہمیں نہ شمار کیا جائے۔ تو مسلمانوں کی کثرت نہیں بنتی تھی، تو حضرت صاحب نے کہا، کہ فگرز وغیرہ سب کچھ ان کو دو اور ان سے کہو کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا مرکز وہاں ہے اور میں نے اپنی طرف سے اس بات کی وکالت کی کہ گورداسپور کو پاکستان میں شامل کرنا چاہیئے۔ یہ تو لوگوں نے بعد میں باتیں بنالیں۔

س :۔ آپ کے بانی سلسلہ کی ایک پیش گوئی کا ذکر آتا ہے۔ کہ ایک بار آپ لوگ قادیان سے نکالے جائیں گے، اور پھر واپس آئیں گے۔

ج :۔ وہ ایک الہام ہے، داغِ ہجرت۔

س :۔ وہ ایسا ہی ہے۔ جیسا میں نے کہا۔

ج :۔ اس سے ممکن ہے کسی نے استدلال کیا ہو۔

س :۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ پر ملک کی سلامتی کے خلاف سازش کرنے کا الزام بھی آتا ہے۔ کہ ملک کی سرحدوں کو نقصان پہنچے گا، تبھی واپسی کا امکان ہوگا۔

ج :۔ کس کے ساتھ کون سازش کر رہا ہے اور کون سا ملک لوٹے۔

س :۔ پاکستان۔

ج :۔ یعنی پاکستان ہندوستان میں شامل ہو جائے۔

س :۔ تاکہ وہ پیش گوئی درست ثابت ہو۔

ج :۔ کون سازش کر رہا ہے کس کے ساتھ۔

س :۔ آپ کی کمیونٹی پر الزام آتا ہے۔

ج :۔ کمیونٹی تو سازش نہیں کر سکتی۔ کمیونٹی سازش کرے تو سارے جہاں کا پتہ چل جائے۔ سازش تو ایک یا چند افراد کرتے ہیں۔ یعنی ایسی سازش ہم کر رہے ہیں۔ کہ ان کو تو پتہ چل گیا باقی جہاں کو پتہ نہیں، اگر ہم سازش کر رہے ہیں۔ تو ان کو کیسے معلوم ہے، اگر معلوم ہے تو پیش کیوں نہیں کرتے۔ کہ فلاں شخص انڈیا کے پاس گیا، یہ تجویز تھی کہ حملہ کرو پاکستان پر تاکہ ہم واپس جا سکیں۔

ہماری ساری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہم کبھی کسی بات کے لیے عام جو سازش سمجھی جاتی ہے۔ نہیں کرتے۔ منصوبے بناتے ہیں ترقی کے لیے، قربانیوں کے لیے، لیکن علی الاعلان۔ ساری دنیا کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کر رہے ہیں۔ یہ حسد کرتے ہیں، یہ بغض کرتے ہیں۔ یہ مخالفت کرتے ہیں۔ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کامیاب نہ ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیں کامیاب کرتا ہے۔ باقی ہم نے کبھی اس قسم کی سازش کی ہے نہ ہماری فطرت میں ہے۔ نہ ہمارے پاس وہ وسائل ہیں۔ جن کے ذریعے سے کوئی سازش کامیاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ واہیات بات ہے۔ اگر اس کو سازش کہتے ہیں۔ کہ ہمارے بانی سلسلہ کا بڑے اوائل کا الہام ہے کہ تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔ تو دیکھ لو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو رہا ہے۔ ہمارے جلسے میں دنیا کے دوسرے کنارے تک سے لوگ آرہے ہیں۔ انہوں نے ہر کوشش کی۔ سب کچھ کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بانیٔ سلسلہ کا الہام ہے۔ وہ نعوذ باللہ مفتری تھا۔ ہم بات نہیں پوری ہونے دیں گے۔ اوروں نے زور لگایا۔ تم بھی لگاتے رہو۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ اگر سازش ہے۔ تو یہ سازش طشت از بام ہے۔

ہمیں سازش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ بغیر کوئی وسائل ہونے کے ان کے مقاصد کی تکمیل فرماتا چلا جاتا ہے۔ ان کو سازش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سازش تو کرتے ہیں۔ انسان انسانوں کے ساتھ، جو سب سے بڑا حاکم ہے۔ اور جس کے ہاتھ سب کچھ ہے، جب ہمیں پختہ ایمان ہے اور اس کے فضل سے یہ ثابت ہے۔ وہ ہماری تائید کرتا ہے، ہمیں سازش کی کیا ضرورت ہے۔

س:۔ اور وہ 'داغ ہجرت'۔

ج:۔ وہ اپنے وقت پر پورا ہو گا۔ ضرور پورا ہو گا۔

س:۔ قادیان واپسی کس صورت میں ہو گی۔

ج:۔ یہ وہ جانتا ہے۔ اگر قادیان کی جو موجودہ آبادی ہے۔ کثرت ان کی ہندو سکھ ہے۔ اگر وہ سارے کے سارے احمدی ہو جائیں۔ تو ہے کسی سازش کی ضرورت۔ تو ہماری ہجرت ختم ہو گئی۔ ہم جس وقت چاہیں قادیان جائیں آئیں۔

س:۔ بارڈر کے باوجود؟

ج:۔ بارڈر تو ہو گا۔ جو کچھ بھی ہو گا۔ لیکن بہر صورت ہمیں کسی سازش کے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

س:۔ قادیان واپسی کی بات پھر صحیح ہوئی۔

ج:۔ آپ کا خیال ہے۔ کہ ہمیشہ یہ پابندی قائم رہے گی رکہ نہیں جانا۔ اس کو خدا تعالیٰ رفع نہیں کر سکتا۔ کیا قادیان اور پاکستان ایک حکومت کے ماتحت ہوں تبھی ہم واپس جا سکتے ہیں۔ ہم الگ الگ حکومت رہ کر بھی واپس جا سکتے ہیں۔ ہم لندن جا سکتے ہیں۔ تو قادیان کیوں

نہیں جا سکتے۔

س :۔ بارڈر کی موجودگی میں اگر جانے آنے کی سہولت ملتی ہے۔ اس میں وہ چیز تو پیدا نہیں ہوتی کہ ایک دفعہ جاؤ گے پھر آؤ گے۔

ج :۔ بارڈر کی موجودگی میں سہولت تو بھئی آج کی بات ہے۔ کل کوئی معاہدہ ہو جائے دونوں ہیں۔ دونوں پاسپورٹ بھی ویزہ بھی ختم کر دیں۔ آزادانہ آئیں جائیں، پھر؟

س :۔ آپ کے بعض ہم عقیدہ یہ توجیہہ بھی کرتے ہیں کہ ہم فاتح ہو کر جائیں گے۔

ج :۔ فتح کوئی فوجی فتح کو ہی نہیں کہتے، ہر قسم کی کامیابی کو فتح کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے تو دل فتح کرنے ہیں۔ محبت کے ذریعے سے۔ اور سب سے زیادہ پاکستان میں اور یہ پاکستان کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم پاکستان کے خلاف ہیں، پاکستان کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ پاکستان کے دشمن ہیں۔ ان کے خیال میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کوئی غیر چیز ہے۔ جبکہ ہم سمجھتے ہیں۔ کہ پاکستان ہماری بنیاد ہے۔ مرکز ہمارا یہاں ہے۔ یہیں سے ہماری ترقی کے سامان پیدا ہوں گے۔ الا ماشاء اللہ پاکستان والوں نے ہی ہم میں شامل ہونا ہے۔ جن کو کل ہم نے اپنا دوست بنانا ہے۔ شامل کرنا ہے۔ ان کے خلاف ہم اس وقت یا جس ملک میں ہی ہماری بنیاد ہے، اس کے خلاف ہم سازشیں کرتے پھریں، اس کو تباہ کرتے پھریں۔ کس قدر بیوقوفی ہے۔ اتنی عقل تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہوئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارا یہ محکم یقین ہے کہ وہ یہیں کثرت سے ہماری تائید پیدا کرے گا۔ اور ہم اسی مرکز سے دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچائیں گے، اس لیے ہمیں ایک اوسط پاکستانی کی نسبت سے بہت بڑھ کر پاکستان کی خوشحالی پاکستان کی آزادی، اس کے استحکام کے لیے، میں عام طور پر فلاقی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن میں ہر روز اور کئی بار پاکستان کی خوشحالی کے لیے دعا کرتا ہوں، تو یہ رویہ ان لوگوں کا نہیں ہو سکتا۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اس بات میں، جہاں بھی کہیں عام تحریک دعا کی ہوتی ہے۔ تو پاکستان کی بہبودی کے لیے۔ اس کے استقلال کے لیے ہم دعائیں کرتے ہیں۔ ہم سے یہ مراد نہیں کہ کوئی فرد واحد مثلاً میں یا شیخ اعجاز احمد صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یا چودھری بشیر احمد صاحب یا کوئی اور، ہماری جماعت میں تو اس وقت وہ لوگ بھی موجود ہیں، جنہوں نے سن ترپن، چوّن کے فسادات میں ہمارے لوگوں کو قتل کیا تھا بعد میں احمدی ہو گئے۔ اور اب وہ نہایت مخلص احمدی ہیں۔ ممکن ہے ۷۴ والے بھی ہو گئے ہوں۔

س :۔ آپ پاکستان کی بہبود اور استقلال کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور آپ کی کمیونٹی کا جو آدمی انتقال کر جائے تو جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اسے ربوہ میں اماناً دفن کیا جاتا ہے۔

ج :۔ وہ اماناً کا لفظ تو ساتھ نہیں ہوتا۔ ربوہ میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ باقیوں کے متعلق میں نہیں جانتا۔ لیکن یہ یقینی بات ہے۔ اور یہ وصیت بھی ہے کہ ہمارے خلیفہ دوم اور آپ

کی والدہ محترمہ کو جب اللہ تعالیٰ توفیق دے گا، رستہ کھلے گا۔ تو قادیان دفن کیا جائے گا۔ یہ کوئی ضروری نہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کو ادھر سے اُدھر کر دیا جائے گا۔

س :۔ کوئی نو دس برس پہلے بعض اخبارات میں یہ چھپا تھا کہ آپ انڈیا گئے ہیں۔ اندرا گاندھی کے ساتھ سازش کرنے۔

ج :۔ میں قادیان گیا تھا فروری میں، انہیں جا کے پتہ چلا کہیں مئی میں پنجاب کا ایک سکھ منسٹر آخر وقت تک میرے ساتھ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی طرف سے وانچ کر رہا ہو کہ کیا کرنے آیا ہے۔ واپسی پر ایک لطیفہ بھی ہوا۔ ہم گئے امرتسر میں گولڈن ٹمپل دیکھنے۔ آخر میں انہوں نے وزیٹر بک دی کہ اس پر اپنے تاثرات لکھو۔ اس میں ایک کالم تھا۔ ٹائم کا۔ میں نے سکھ وزیر سے پوچھا۔ کیا وقت ہے۔ وہ کہنے لگا۔ وقت تو بارہ بجے کا ہی ہے۔ سب ہنس دیئے۔ میں نے کہا چلو۔ ساڑھے بارہ لکھ دیتے ہیں۔

س :۔ غیر سرکاری حیثیت میں انڈیا آپ کتنی بار گئے۔

ج :۔ بس یہی ایک بار۔

س :۔ اس سے پہلے۔

ج :۔ اس سے پہلے بطور وزیر خارجہ دو دفعہ تو یقیناً گیا ہوں۔

س :۔ اس وقت تو شور نہیں مچتا تھا۔

ج :۔ وہ تو انہیں پتہ ہوتا تھا کہ وزیر اعظم اور وزیر خارجہ فلاں کام کے لیے ہندوستان گئے ہیں۔

س :۔ اور جواہر لال نہرو جب پاکستان آئے تھے۔

ج :۔ بحیثیت وزیر خارجہ میں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ اس سے پہلے میں مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑا رہا۔ ہمارے پرائم منسٹر صاحب تھے۔ نہرو تھے۔ تو نہرو صاحب نے کہا "اندرا چودہری صاحب کے لیے چائے بناؤ" وہ مجھے ہمیشہ چودہری صاحب کہتے تھے۔

س :۔ اندرا سے آپ کی بس یہی ایک ملاقات ہوئی۔ اسوقت تو وہ بچی ہوگی۔

ج :۔ اس وقت اتنی بھی بچی نہیں تھی، اچھی جوان تھی۔

س :۔ جب پاکستان بنا تو آپ کو انڈیا کی طرف سے کوئی پیش کش ہوئی۔

ج :۔ نہیں۔ لیکن جن دنوں میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے یو این او میں کشمیر کے مسئلے پر بحث کر رہا تھا۔ ایک روز میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایک وقت میں تو کشمیر میں گائے ذبح کرنے پر اس قدر سختی تھی کہ موت یا عمر قید کی سزا ہوتی تھی۔ گلینسی رپورٹ کے نتیجے میں جو اصلاحات ہوئی ہیں، اس کے نتیجے میں کچھ تخفیف ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اب سات سال قید کی سزا ہے۔ میں اور ہندوستانی نمائندہ سر گوپالا سوامی آئینگر اسمبلی سے نکل رہے تھے۔ مجھے جانتے تھے، اچھی طرح میں متحدہ ہندوستان میں مرکزی وزیر تھا۔ تو کشمیر میں ان کا مہمان

تھا۔ میں نے کہا، آپ وزیر اعظم رہے ہیں، اب کیا سزا ہے، انہوں نے کہا، دس سال ہے۔ ساتھ ہی اپنا بازو میرے بازو میں ڈالتے ہوئے بولے، تم یہ بتاؤ کہ تم تقسیم پر وہاں سے چلے کیوں گئے تھے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے، کہ تم ہندوستان سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس ہوتے۔ میں نے کہا ہاں مجھے معلوم تھا کہ میں سینئر موسٹ جج تھا۔ اور میرے فیصلوں کو پسند کیا گیا تھا۔ کانگریس میرے عدالتی اختیارات کی معترف تھی۔ لیکن میں چلا اس لیے گیا تھا۔ کہ میں وہاں رہتا تو قیدی ہی ہوتا، کہنے لگے، نان سینس۔ میں نے کہا، نان سینس (بیہودہ بات) نہیں، جو وہاں ہیں ان کی حالت یہی ہے۔

س:۔ بات بونڈری کمشن کی ہو رہی تھی، چودھری صاحب جب آپ نے بونڈری کمیشن میں ابھی اپنی یادداشت داخل نہیں کی تھی۔ کہ ریڈکلف نے والٹن کے ہوائی اڈے سے پرواز کرنا چاہی، لیکن موسم کی خرابی کے باعث وہ پرواز نہ ہو سکی۔ تو جسٹس دین محمد مرحوم کے مطابق پائلٹ کو پرواز کے لیے جو ہدایات دی گئی تھیں۔ ان کے مطابق حد بندی کی لائن بحث سے پہلے ہی طے پا چکی تھی۔ کیا اس لائن کے مطابق بعد میں پنجاب کی تقسیم ہوئی۔

ج:۔ لیکن اس میں بھی فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان میں آتی تھیں۔

س:۔ ریڈکلف نے جس لائن پر فلائی کرنا تھا۔ اس میں بھی فیروز پور اور زیرہ ہمارے پاس تھیں۔

ج:۔ ہاں یہ تو ایوارڈ تیار ہو جانے کے بعد تبدیلی ہوئی۔

س:۔ وہ کیسے؟

ج:۔ ——— جینکنز جو یہاں گورنر تھا اس کی اور وائسرائے کے ملٹری سیکرٹری اسمے کی اور ایک انہوں نے میجر لندن سے بلایا ہوا تھا سکھوں کی حمایت کے واسطے۔ ان تینوں نے مل کے کچھ حصہ تبدیل کیا۔

س:۔ ہندوؤں سکھوں نے ریڈکلف کو رشوت بھی دی۔

ج:۔ رشوت سے وہ بالا تھا۔ اس نے تو وائسرائے (لارڈ مونٹ بیٹن) کے سٹاف کے زور دینے پر کیا تھا، کیونکہ جب انہوں نے شملے میں آکے بحث کی تو ہمارے دونوں کمشنر کہنے لگے کہ گورداسپور پر وہ آکے اڑتا تھا۔ اور ہم سمجھ گئے کہ گورداسپور کا اکثر حصہ وہ ہندوستان کو دے گا۔ لیکن ان دونوں تحصیلوں فیروز پور اور زیرہ کے بارے میں ریڈکلف کہتا تھا۔ کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، یہ مسلمان اکثریت کے علاقے ہیں۔ پاکستان میں جائیں گے۔ یہ تو غالباً نہرو نے محسوس کر کے کہ ستلج کا جو سسٹم تھا۔ اس کے ہیڈورکس پھر پاکستان آجائیں گے۔ دوسرے بیکانیر (ریاست) کے متعلق پوزیشن واضح نہیں تھی کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرتی ہے یا ہندوستان کے ساتھ۔ اگر ریاست بیکانیر کی نہر ادھر آجاتی میرا خیال ہے اس امکانی صورت حال کے پیش نظر نہرو نے وائسرائے (مونٹ بیٹن) کے ذریعے یہ

تبدیلی کروالی ہوگی۔

س :۔ ویسے بھی مونٹ بیٹن کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے۔

ج :۔ اس سے تعلقات اچھے تھے اور لوگ بھی یہ کہا کرتے تھے۔

Lady Mountbaten is in love
with the eyelashes of Nehru

(لیڈی مونٹ بیٹن نہرو کی پلکوں میں اسیر ہو چکی ہے) انہوں نے یہ دیکھ کے کہ اس طریقے سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں کوئی عار نہ تھی۔ جبکہ مقابلے میں قائداعظمؒ کی طبیعت میں قطعاً اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔ خوشامد کرنا یا کوئی ایسی بات۔

س :۔ وہ تو اکل کھرے انسان تھے۔ کوئی لاگ لپیٹ نہیں

ج :۔ HE WAS A MAN OF COMPLETE INTEGRITY.

(وہ ہر لحاظ سے دیانتدار انسان تھے)

اب جو انہوں نے سارا بنا لیا ہے۔ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ پاکستان تو بنا ہی اس لیے ہے کہ اسلام کی اشاعت کا انتظام ہو۔ قائداعظمؒ کا مطلب تھا کہ مسلمانوں کی کلچرل حفاظت ہونی چاہیئے۔ اگر ہم مسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہے تو انہوں نے ہمارا کچھ نہیں چھوڑنا۔ پاکستان بلکہ دونوں ملکوں کا اس وقت یہ تھا کہ جہاں تک شہری آزادیوں کا تعلق ہے۔ ان میں کسی قسم کی تمیز نہیں برتی جائے گی۔

یہ تو انہوں نے بعد میں دشمنی کی وجہ سے بنا لیا کہ ظفر اللہ خاں کو مونٹ بیٹن لایا۔ قائداعظمؒ کو ان چیزوں کا نہیں تھا کہ مرزائی ہے، شیعہ ہے، اسمٰعیلی ہے۔ ان کا تو یہ تھا کہ جو شخص پاکستان کے لیے ہمدرد ہو اور پاکستان کے کام آسکتا ہو۔ وہ ٹھیک ہے۔ جب قائداعظمؒ نے مجھے وزیر خارجہ منتخب کیا تو اس وقت کسی کو جرأت نہیں تھی کہ بات کرتا۔ جرأت کے علاوہ جب میں یونائیٹڈ نیشنز سے واپس آتا تھا تو کراچی ائرپورٹ پر تل دھرنے کے لیے جگہ نہیں ہوتی تھی۔ اتنے لوگ مجھے ویلکم کرنے آتے تھے۔ اس وقت انہیں نہیں پتہ تھا کہ یہ مرزائی ہے۔

اب کہتے ہیں، مونٹ بیٹن لایا تھا۔ یہ تو جب پرائم منسٹرشپ (خواجہ ناظم الدین) میں کمزوری آگئی تو ملاؤں کا حوصلہ بڑھا۔

س :۔ یہ جو آئے روز خالص مذہبی اور لادینی طرز حکومت کی بحث چل نکلتی ہے۔ لطف یہ کہ دونوں کے مؤید نام قائداعظمؒ کا ہی استعمال کرتے ہیں۔

ج :۔ میاں نام لیتے ہیں۔ قائداعظمؒ کا لیکن ان کا جتنا کانسیپٹ (CONCEPT) تھا۔ سارا کم کر دیا ہے۔ اس کو ایک ملاں سٹیٹ بنا دیا ہے۔ قائداعظمؒ نے کبھی اسے ملاں سٹیٹ بنانے کا عزم نہیں کیا تھا۔ وہ کہتے تھے مذہب تمہارا اپنا کام ہے۔ اس کو رکھو بحیثیت پاکستانی تم سب برابر ہو۔ کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ اب کرتے ہیں۔ مقابلہ ایک کہتا ہے کہ قائداعظمؒ

سیکولر (لادینی) سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ دوسرا بولتا ہے، نہیں قائداعظمؒ اسے ایک تھیوکریٹک (مذہبی) سٹیٹ بنانا چاہتے تھے اور یہ اسی غرض سے وجود میں آئی۔

اور بات یہ ہے کہ تھیوکریٹک اور سیکولر بالکل ایک دوسرے کی اپوزیشن نہیں ہیں، وہ بھی ایک آنکھ سے کانا ہے۔ یہ بھی ایک آنکھ سے کانا ہے۔ دونوں اس طرح ایک دوسرے کے پاس سے گزر جاتے ہیں کہ ٹاکرا نہیں ہوتا۔

س:۔ آپ انہیں کیسے ڈیفائن کریں گے۔

ج:۔ تھیوکریٹک سٹیٹ اس کو کہتے ہیں۔ جس میں PRIESTHOOD رُول کرے۔ اسلامی تھیوکریٹک سٹیٹ ہو کیسے سکتی ہے جب اسلام میں PRIESTHOOD نہیں، نہ اجازت ہے۔

س:۔ PRIESTHOOD کو ہم مُلّائیت کہیں گے؟

ج:۔ جو بھی نام آپ رکھ لیں، اور سیکولر (لادینی) کے دعویدار تھیوکریٹک کے مقابلے پر کہتے ہیں، ایک لحاظ سے اسلام میں کوئی سیکولرزم نہیں، اسلام انسان کی زندگی کے ہر پہلو کی اصلاح بھی کرتا ہے اور سٹینڈرڈز بھی مقرر کرتا ہے۔ اسلام میں دنیا دین کے تابع ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم دنیا مت کماؤ۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم دنیا کماؤ۔ لیکن مقصد تمہارا دنیا نہ ہو۔

س:۔ "لارڈ مونٹ بیٹن رِی میمبرز انڈیا" کے عنوان سے بی بی سی ٹیلی ویژن نے کچھ عرصہ پہلے ایک سیریز شروع کی تھی، اس کی تیسری قسط میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ میں نے مسٹر جناحؒ سے کہا کہ آپ صرف پنجاب کیوں نہیں لے لیتے بنگال کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ وہاں کے لوگ آسانی سے مغربی بنگال سے مل جائیں گے۔ وہ پہلے بنگالی ہیں، جناحؒ (قائداعظمؒ) نے میری بات تسلیم نہ کی اور کہا کہ ہمیں ایک قابل عمل مملکت کے دونوں حصے چاہئیں۔

ج:۔ یعنی ایک تو واقعہ کے طور پر مجھے اس کا علم نہیں اور دوسرے یہ کہ مونٹ بیٹن کا کیا اختیار تھا کہ اگر سکھ تقسیم چاہتے۔ پنجاب کی تو وہ پورا پنجاب پاکستان کو دے دیتا اور تیسرے اگر بنگال کے مسلمان چاہتے پاکستان میں آنا۔ بنگال کے مسلمانوں پر کسی نے کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ اس وقت وہ یہی چاہتے تھے کہ ہم پاکستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو قائداعظمؒ اور مونٹ بیٹن مل کر یہ کہتے، نہیں ہم تمہیں پاکستان میں نہیں لینا چاہتے۔ عملاً یہ کوئی دانائی کی بات معلوم نہیں ہوتی کہ ایسا ہوا ہو۔ میرے علم میں تو نہیں، اچھا، اگر ہو جاتا تو یہ صحیح ہے۔ میں اپنی رائے میں سمجھتا ہوں کہ ایک لحاظ سے مغربی پاکستان میں متوازن حالت پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ ایک اقلیت کی تائید حاصل کرنے کے لیے سکھوں کو WEIGHTAGE (دیتا سب سے زیادہ نمائندگی) دینا پڑتا۔ لیکن یہ بعد میں ایک مروج چل چکی ہے۔ اور بڑی مضبوط ہے کہ کسی غیر مسلم کو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ یا تو رک جاتی جو میرے خیال میں مفید ثابت ہوتی یا پھر اگر چل پڑتی تو سارا وقت فساد ہوتے رہتے۔ تو یہ بھی بعد کی باتیں ہیں کہ یوں ہو جاتا تو کیا ہوتا کیا نہ ہوتا اور یہ بڑی دانائی کی بات تھی۔ اور قائداعظمؒ نے انکار کر دیا اور یہ غلطی تھی۔

میں کہتا ہوں پچھلا سب کچھ، جو کچھ ہوا ان کی نگاہ میں غلط ہوا، تو ہو گیا۔ اگر صحیح ہوا تو ہو گیا۔ وہ بات ختم ہو گئی۔ اب بھی اگر سارے عنصر آپس میں مشورہ کریں، جوڑ کریں، ملک کو سدھارنا چاہیں۔ ایک ہی بات لیں، دو لے لیں، پہلی بات تو یہ کہ ہر انسان پر سب سے پہلے جو بات اثر کرتی ہے، وہ اس کے پیٹ کی بھوک ہے۔ تو ہمارے اقتصادی حالات ایسے ہیں کہ اگر ان میں سرمایہ کار اور مزدور اور صنعت کار کا آپس میں جوڑ ہو اور ہمت سے، اتفاق سے محنت شروع کریں، تاکہ ملک کی پیداوار بڑھے۔ بیشک یہ بات کہنے میں سادہ ہے لیکن کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ جتنی ہر بات کرنے میں مشکل ہے۔ لیکن اس رستے میں جو مشکلات ہیں، ان کا علاج آسانی سے ہو سکتا ہے۔ بیشک مزدور کو اس کی مزدوری کا جائز حق ملنا چاہیئے لیکن سرمایہ کار کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی مزدور کی، صنعت کار کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی کہ سرمایہ کار کی۔ اس میں کسی سیاسیات کی یا حکومت کے کرنے نہ کرنے کی بات نہیں، ہمیں خود بھی سوچنا چاہیئے۔ کہ کوئی انکم پیدا ہو۔ اس وقت ملک خیرات پر چل رہا ہے، اور کب تک چلے گا خیرات پر۔ دن بدن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے، کہ ہم ایک اسلامی مملکت ہیں۔ اسلامی دفعہ رائج کریں گے۔ اصلاح صرف سزاؤں کے جاری کر دینے سے نہیں ہو سکتی۔ اصلاح اخلاق کے درست کرنے سے ہوتی ہے۔ اور اخلاق درست ہوتا ہے، اگر یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے اور وہ ایک بار کہہ دینے سے نہیں ہوتا۔ بار بار نصیحت کرنے سے، بار بار نصیحت کرنے سے، بار بار نصیحت کرنے سے، مثالوں کے ساتھ سمجھانے سے، اپیل کرنے سے، تب جا کے تبدیلی ہوتی ہے۔

س :۔ اسی انٹرویو میں مونٹ بیٹن نے مزید کہا ہے کہ "میں ایک کے بعد ایک دلیل دیتا رہا مگر وہ متزلزل نہیں ہوئے، وہ ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے پاکستان کے قیام کے بارے میں متشدد تھے، اور یہ بات بھی ان کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ کہ وہ ایک ملک نہیں بنا سکتے۔ یہ دو ایسے ملک ہوں گے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہوں گے۔ میں نے جناح" (قائداعظمؒ) سے کہا کہ یہ بات قابلِ عمل نہیں ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اچھی بات پھر آپ مجھے ایک ایسی پٹی (CORRIDOR) دے دیجئے۔ جو دونوں حصوں کو ملا سکے" مونٹ بیٹن نے کہا کہ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زندگی کے حقائق کے بارے میں جناح" (قائداعظمؒ) کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ناکامی کی وجہ کیا تھی۔ میں نے جناح" (قائداعظمؒ) سے پوچھا کس قسم کی پٹی؟ زمین کی پٹی؟ ایسی پٹی جس میں غیر مسلموں کی آبادی ہو گی؟ جو قسمت کے ہاتھوں یرغمالی ہوں گے۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا باعث بن سکتے ہیں۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ دیوانگی کی بات کر رہے ہیں۔

ج :۔ اس اقتباس کی رو سے مونٹ بیٹن نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ ناقابلِ عمل چیز ہے۔ اس کا یہ

کہنا کہ جناحؒ (قائداعظمؒ) حقائق کو نہیں جانتے تھے۔ یہ بات غلط ہے۔ ویسے بھی یہی والی بات میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ میرے نزدیک یہ ایک ناقابلِ عمل بات تھی۔ اور میں کبھی یہ باور بھی نہیں کر سکتی کہ قائداعظمؒ نے کبھی ایسا کہا ہو۔

س: مونٹ بیٹن نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ میں نے اس وقت جناحؒ صاحب کو کہہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ۲۵ سال کے اندر الگ ہو جائیں گے۔

ج: ممکن ہے کہا ہو۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، میرے پاس اس خط کی لندن میں کاپی موجود ہے۔ جو میں نے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کو لکھا تھا کہ یہ کشمکش جاری ہے۔ ہمارا ان کے ساتھ نہ کلچر، نہ کھانا پینا، نہ لباس، نہ آب و ہوا، نہ زبان کوئی چیز کامن نہیں، سوائے دین کے۔ دین بیشک سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ بشرطیکہ اسے ہر بات پر ترجیح دی جائے۔ اب اس بات کی طرف توجہ نہیں رہی۔ ایسی صورت میں وہ اگر ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ کثرت میں وہ ہیں۔ اگر اس وقت دانشمندی کے ساتھ کوئی طریق اختیار کر لیا جائے۔ بیشک علیحدگی ہو جائے۔ لیکن آپس میں دوستانہ رہے۔ آپس میں تعلقات اچھے رہیں۔ تھوڑے عرصے بعد آپس میں تعاون کے کئی رستے نکل سکتے ہیں۔ لیکن اگر خون بہنا شروع ہو گیا، پھر وہ خون کی جو نہر ہوتی ہے، وہ پاٹی نہیں جا سکتی۔ اس کے معنی ہوں گے کہ دوستانہ قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی احتیاط کرنی چاہیئے۔ لیکن ہوا وہی۔

س: یہ خط آپ نے کس زمانے میں لکھا۔

ج: ۷۰ء میں کسی وقت۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المیۂ مشرقی پاکستان کے پانچ کردار)

س: پیچھے آپ نے ذکر کیا ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا اس وقت بنگال والے چاہتے تھے شامل ہونا تو انہیں کیسے روکا جا سکتا ہے۔ اس دلیل پر مونٹ بیٹن کی بات میں کیا وزن رہ جاتا ہے۔

ج: ہاں، سن چالیس کے ریزولیوشن میں خود مختار مملکتوں کا ذکر ہے۔ یہ تو مولوی اے کے فضل الحق نے بعد میں بنگال کی طرف سے درخواست کی تھی کہ ہم شامل ہونا چاہتے ہیں۔ بنگالیوں کے کہنے پر شامل کیا گیا تھا۔

س: ہم روک نہیں سکتے تھے۔

ج: روک سکنے کی بات الگ تھی۔ ممکن ہے کہا جا سکتا کہ ہم مدد نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن یہ ان کی درخواست پر کیا گیا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مغربی پاکستان کے ساتھ تعلق ہوگا۔ وہ ان کے لیے مضبوطی کا باعث ہوگا۔ اس وقت وہ اپنے ڈیفنس کا کیا انتظام کرتے۔

س: مونٹ بیٹن نے ۲۵ سال والی بات اس وقت کی جب پاکستان ٹوٹ چکا تھا کم از کم میری معلومات تو یہی ہیں۔

ج: بعد میں تو سبھی کہنے لگتے ہیں۔

س :- "اگر قائداعظمؒ کی زندگی میں پاکستان کا آئین بن جاتا تو بعد میں پیش آنے والے بہت سے مسائل پیدا نہ ہوتے"۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج :- اس وقت پاکستان کو ہر طرف سے اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ جو نسبتی اہمیت دوسرے امور کو دی جاتی ہے۔ ان عملی مشکلات کے سامنے وہ اہمیت قائم نہیں رہی تھی۔ جس چیز کا دباؤ آکر پڑتا تھا، توجہ اس طرف ہو جاتی تھی۔ لازماً ہو جاتی تھی۔ ورنہ ملک آگے چلتا ہی ناں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کانسٹی ٹیوشن (آئین) تو ایک تھیوریٹیکل (کتابی) لحاظ سے بڑی جلدی اور بڑی عمدہ بن جائے اور ملک قائم رہے یا نہ رہے۔ ملک کا قیام ضروری تھا۔ جس کے لیے آئین بننا تھا۔ ملک کے تعلق میں جو مشکلات پیش آجاتی تھیں۔ ان کا حل کرنا بہر صورت سبقت رکھتا تھا۔ اس بات کی طرف کوئی غور نہیں کرتا کہ ایسے حالات میں پاکستان قائم ہوا کہ تمام دنیا سمجھتی تھی اور ہندوستان کو یقین تھا کہ یہ چند مہینے سے آگے نہیں چل سکے گا۔ پھر ہاتھ جوڑ کے واپس آجائیں گے۔ کہ ہمیں شامل کر لو۔ ان حالات میں اس کا قائم رہنا یہ ایک بہت بڑی ہمت کا کام تھا۔ اصل میں پردے کے پیچھے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ ہی کا خاص فضل اور عنایت تھی۔ ورنہ وسائل کے اعتبار سے ہمارے پاس کیا تھا۔ اور اس وقت کتنی شخصیات تھیں ہمارے پاس۔ ایک ملک کی سیاست کے لیے۔ حکومت کے لیے۔ محکمہ جات کے لیے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل تھا کہ جب ابھی ذہن اور خواب میں بھی پاکستان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ۱۹۲۰ء کی دہائی کے شروع میں ہی یہاں قیادت سر فضل حسین کے ہاتھ میں دیدی۔ جنہوں نے اپنی وزارت (پنجاب) کے دوران میں اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی ممبر شپ کے پانچ سال کے عرصے میں۔ مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے اور ان کی حالت کو سدھارنے کے لیے وہ بنیادی کارہائے نمایاں کیے کہ جن کی یاد آج دلوں سے محو ہو گئی ہو بیشک۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ بات نہ ہوتی تو پاکستان کا وہ نظریہ سامنے ابھی جاتا، تو کہاں سے آتے لوگ، پاکستان دس دن بھی نہ چلتا۔ سر فضل حسین کو لڑائی کر کے منوانا پڑتا تھا کہ گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں چالیس فی صد مسلمانوں کو داخلہ مل جائے۔ ۵۵ فی صد آبادی تھی اور چالیس فی صد داخلے کے لیے لڑائیاں کرنا پڑتی تھیں اور دوسری طرف سے سخت رویے کا اظہار ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اور اداروں کے متعلق تو فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ضلع گجرات میں رسول ایک جگہ ہے۔ وہاں انجینئرنگ کا ایک سکول تھا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے چالیس فی صد داخلے کے لیے وزیر تعلیم (پنجاب) سر جوگندر سنگھ اڑے ہوئے تھے، تو مجھے میاں صاحب نے صبح پانچ بجے بلوایا۔ میں نے ماڈل ٹاؤن میں نئی نئی رہائش کی تھی۔ سردیوں کے دن۔ لیکن آپ کا ارشاد تھا۔ میں پہنچا۔ وہ اس سے بھی پہلے کام شروع کر دیتے تھے۔ بیمار اس وقت بھی تھے۔ سانس یوں لے رہے تھے۔ سُوں ساں۔ سُوں ساں، سُوں ساں۔ ایک ٹیبل لیمپ چھوٹا سا رکھا ہوا۔ لحاف

ہیں بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لفظ لکھتے تھے۔ میں اسے ہائڈرو گلفلکس کہا کرتا تھا۔ تو اور باتیں بھی کی ہوں گی، لیکن ایک بات ان کی جو پوری یاد ہے، جس کے لیے خاص طور پر بلایا تھا۔ انہوں نے کہا میں آج دورے پر جانے والا ہوں، دورے پر جانے سے پہلے دس بجے گورنمنٹ ہاؤس میں میری ملاقات گورنر اور سر جوگندر سنگھ سے ہوگی۔ اس وقت انہیں سر کا خطاب ملا تھا کہ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ کہنے لگے۔ وہاں رسول انجینئرنگ سکول کا معاملہ پیش ہونا ہے۔ اگر تو مسلمانوں کے لیے چالیس فی صد داخلے کا طے ہو گیا تو میں ٹیلی فون پر چودھری شہاب الدین کو مختصر طور پر بتا دوں گا۔ اور اگر میری طرف سے کوئی پیغام نہ آیا تو تم یہ سمجھ لینا کہ یہ بات طے نہیں ہوئی، تو انہوں نے مجھے ریزولیوشن دیا جو ان کا خود ڈرافٹ کیا ہوا تھا۔ فرمایا۔ اس ریزولیوشن کی دس نقلیں کروا کے پارٹی کے دس مسلمان ممبروں سے دستخط کروا کے دفتر بھجوا دینا۔ یعنی اس قدر دور تک سوچتے اور تیاری کرتے تھے۔ آج کون ہے جو اتنی محنت، اتنی توجہ اور اتنی دور بینی کے ساتھ کام کرتا ہو۔

سر فضل حسین اپنی صفات کے لحاظ سے ایک بالکل بے مثل انسان تھے۔ طبیعت میں قطعاً کسی قسم کی نہ ذاتی غرض، نہ کوئی اقربا پروری، ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں، ان کے بڑے صاحبزادے میاں نسیم حسین ایم اے پاس کر کے پراونشل سروس میں نامزد ہو کے آگئے تھے۔ ان کا میرا برادرانہ دوستانہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر تم میاں صاحب سے کہہ دو کہ وہ پولیٹیکل سیکرٹری سے کہہ کر مجھے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں منتقل کروا دیں، تو بہ نسبت عام سروس کے وہاں میرے آگے بڑھنے کے امکانات زیادہ ہوں گے، میں نے ایک روز موقع پا کر میاں صاحب سے عرض کر دیا، میاں صاحب نے مجھ سے کہا "تم سے یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، میرا خیال تھا کہ تم میری طبیعت کو جانتے ہو گے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے بیٹے کے لیے کسی سے کوئی درخواست کروں کہ وہ ایسا کر دے"! وہ اس کیریکٹر کے آدمی تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تو یہ عنایت چلی آتی ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کی پاکستان پر خاص عنایت ہے، اگر پاکستان اس عنایت کا مستحق رہتا ہے، پھر تو بچے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت کی بے قدری کرے گا ختم ہو جائے گا ختم ہو جائے گا کے معنی ہیں کہ قابلِ احترام نہ رہا، کسی گنتی یا شمار میں نہ رہا، باقی یوں تو ملک ختم ہونے کوایسی لازم بات نہیں ہوتی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، کہ اس وقت، ۱۹۲۰ء کے زمانے میں، پاکستان تو ۲۷ سال بعد جا کے بنتا ہے۔ اس وقت سے یہ بنیاد رکھی گئی کہ کم سے کم پنجاب میں ایک عنصر نوجوانوں کا ایسا پیدا ہو جائے جو اپنی تعلیم کے لحاظ سے ملک کی خدمت کر سکے۔ جو آئندہ بننے والا تھا۔

باقی میرا موقف یہی ہے کہ ان باتوں کا تاریخ کے طور پر مطالعہ کرنا اور ان سے سبق حاصل کرنا لازم ہے، جو قوم اپنی تاریخ کو بھلا دیتی ہے یا اس پر غور نہیں کرتی وہ کبھی شاہراہِ

ترقی پر قدم زن نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تنقید کر دینا کہ یوں کر دیا اور یوں کیوں نہ کیا، یہ دماغ کی بھی تضیع ہے، اور وقت کی بھی تضیع ہے۔ انسان کو اپنے تجربے، علم، مشاہدے، مطالعے اور تاریخ پر غور کے نتیجے ہی مستعدی سے عمل کرنا چاہیئے۔ اس چیز کی کمی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ بالکل نہیں ہے۔ اگر بالکل ہی نہ ہو تو ختم ہو جائے۔ بات آگے چلے ہی نہ، لیکن اس طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیئے۔

س:۔ ایوب کھوڑو کا معاملہ آپ کے زمانے میں پیش آیا۔ اس کی تفصیلات کا کچھ معلوم ہے؟

ج:۔ مجھے نہیں معلوم۔

س:۔ پنجاب میں دولتانہ ممدوٹ جو چپقلش شروع ہو گئی تھی سنا ہے، قائداعظم ؒ بڑے نالاں تھے، آپ کے علم میں ہے کچھ؟

ج:۔ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ اتنا مجھے یاد ہے، ممتاز (دولتانہ) کا ذکر آ گیا ہے۔ ممتاز کے ساتھ میرا تعلق اس کے بچپن سے تھا۔ چودھری شہاب الدین صاحب ان کے خالو تھے، اور میں "انڈین کیسز" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ پھر تو ایک دو سال بعد عملاً ایڈیٹری وغیرہ سب چودھری صاحب نے میرے سپرد کر دی۔ چودھری صاحب میرے والد صاحب کے دوست تھے۔ یوں بھی ضلع سیالکوٹ کے جاٹ ہونے کی وجہ سے بھی تعلق تھا۔ علاقہ تھا۔ مجھ پر ان کی بہت

بہت مہربانیاں ہیں، احسانات وغیرہ ہیں۔ ممتاز ابھی بچہ ہی تھا کہ اس وقت سے میرا اس کے ساتھ تعلق چلا آ رہا تھا۔ اس کے والد احمد یار دولتانہ صاحب کے ساتھ بھی میرے تعلقات تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو (ممتاز دولتانہ) دماغ بھی اچھا دیا تھا، اس کی تعلیم بہت اچھی تھی، آکسفورڈ میں پڑھا تھا، پھر اس کو موقع بھی بڑی جلدی مل گیا۔ تو میری وزارت خارجہ کے زمانے میں جب یہ کراچی آتا، اور میں وہاں ہوتا تو مجھے ملنے آتا تو میں نے اس کو بار بار کہا: ممتاز تمہاری عمر ابھی چھوٹی ہے۔ تمہارے لیے بڑا موقع ہے، اگر تم ایک بات کی اصلاح کر لو تو تم پاکستان کے وزیراعظم بنو گے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم INTRIGUE (سازش، جوڑ توڑ) کرنا چھوڑ دو۔ تو یہ مسکرا کے کہتا، نہیں انکل، مجھ کو ہمیشہ انکل ہی کہتا تھا، اب بھی ملے تو غالباً انکل ہی کہے۔ اچھا تو مجھے یہ یہی جواب دیتا۔ انکل میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ لیکن پھر وہی بات ہو جاتی تھی۔ یا تو میں جو انٹریگ کے معنی کرتا تھا، ان کے ساتھ اسے اتفاق نہیں تھا، یا یہ کہ انٹریگ اس کی زندگی کا سانس تھی۔ جس کے بغیر وہ گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ نہیں تو سیاسی لیڈر بننے کے لیے وہ تمام ضروری خوبیوں کا حامل تھا۔ یعنی کسی بات کا محتاج نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تم سیاست کے لیے آئیڈیل آدمی ہو، تمہیں یہ ضرورت نہیں کہ آج مہینے کی تنخواہ نہ آئی تو پورا مہینہ کیسے گزارا کریں گے۔ تمہارے اپنے وسائل اتنے ہیں کہ تمہیں کسی بات کی محتاجی نہیں۔ تمہاری تعلیم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اتنی ہے، تمہارا دماغ بڑا اچھا ہے۔

یوں بھی تمہیں اپنے صوبے میں تھوڑی سی نیکنامی بھی ہے، صوبے میں اپنے آپ کو مستحکم بنا کر اثباتی خدمات کر کے تم اپنا مقام قائم کرو، باقی سب لوگ جو اس وقت ہیں اقتدار وغیرہ میں، تمہارے سے کئی کئی سال بڑے ہی سہی، تمہاری باری بھی آجائے گی۔ وقت سے پہلے ہی شاید آجائے۔ تم سیاست میں پاکستان کی قیادت کرو گے۔ لیکن شائد بے صبرا تھا۔ چاہتا تھا۔ فوراً ہو جائے۔

س :۔ اور مقابلے میں ممدوٹ۔

ج :۔ سیدھا سادا۔ ۔ ات بھلا مانس۔

س :۔ سردار شوکت حیات۔

ج :۔ سردار شوکت حیات نے ایک دفعہ اسمبلی میں، آئین ساز اسمبلی کہلاتی تھی اس وقت پارلیمنٹ کا کام بھی کرتی تھی۔ ایک روز سردار شوکت حیات ہمارے لوگوں کے متعلق کہنے لگے کہ یہ تو انگریز کے خوشامدی تھے۔ ایسا تھا، ویسا تھا۔ اجلاس ابھی برخاست نہیں ہوا تھا، کسی وقت اٹھ کے ہمارے پاس بیٹھ بھی جایا کرتے تھے۔ میں نے کہا شوکت آپ کے منہ سے یہ بات جچتی نہیں۔ انہوں نے کہا، تمہاری یہ مراد ہے کہ میرا باپ میرا دادا سب سے بڑھ کر خوشامدی تھے۔ ٹھیک بات ہے۔ میں کہنے کو تیار ہوں، میں مانتا ہوں، تو یوں واہ واہ کرانے کے لیے خواہ مخواہ کوئی بات منہ سے نکال دینی۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

س :۔ قائداعظمؒ نے خطابات کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ کے پاس بھی تو سر کا خطاب تھا۔

ج :۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کس وقت یہ اعلان کیا تھا کہ خطابات واپس کر دو۔

س :۔ ۱۹۴۶ء میں۔

ج :۔ میں ان باتوں کو کوئی وقعت نہیں دیتا کہ خطاب ملے نہ ملے۔ اور اگر خطاب ہو تو چھوڑ دیا جائے۔ یا رکھ لیا جائے۔ میں آپ کو واقعہ بتاتا ہوں۔ ۳۳ء کے آخیر میں مجھے اور تین اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی شخصیات کو پریوی کونسل کا رکن بنانے کی تجویز ہوئی۔ ہز ہائی نیس سر آغا خان، سر اکبر حیدری، سر تیج بہادر سپرو، چوتھا میرا نام تھا۔ مجھے کہیں سے بھنک پڑ گئی، اس وقت سیکرٹری آف سٹیٹ سموئیل ہور تھے۔ میں نے ان سے منت کی کہ آپ میرا نام چھوڑ دیں۔ انہوں نے اس قسم کا اظہار کیا کہ جتنے بھی مذاکرات وغیرہ ہو رہے ہیں، جتنی تم نے کنٹری بیوشن کی ہے۔ کسی اور نے نہیں کی۔ میں دوسروں کو کیا بتاؤں۔ میں نے کہا، آپ کسی طور پر ان صاحبان سے عذر کر دیں۔ تو انہوں نے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کو بھی اس بات کی اطلاع کر دی ہو گی۔ انہیں یہ پس منظر معلوم تھا تو ۳۵ء میں جب میں میاں صاحب کی جگہ ایگزیکٹو کونسل کا مستقل ممبر ہوا تو وائسرائے نے کہا کہ مائی ڈیئر میں جانتا ہوں کہ آپ خطاب وطاب پسند نہیں کرتے۔ لیکن کونسل کے تمام ممبران کو ان کے تقرر پر نائٹ ہڈ دی جاتی ہے۔ میں نے آپ کی سفارش کر دی تھی۔ فہرست شائع ہونے

والی ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے ہی بتا دوں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب تو میں آپ کا نوکر ہوں۔ آپ جو چاہیں کریں۔

تو مجھے نہ خطابات کی حرص تھی۔ اور نہ میں اس کو کوئی بڑی قربانی سمجھتا ہوں کہ اگر ملا ہوا ہے۔ تو اسے واپس کر دو۔ یہ چھچھورپن کی بات ہے۔ نہ مجھے شوق ہے استعمال کرنے کا۔ لوگ میرے نام کے ساتھ استعمال کر لیتے ہیں۔ پھر جس موقع کا آپ ذکر کر رہے ہیں، کہ قائداعظمؒ نے خطابات کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس وقت میں ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کا جج تھا۔ سیاسیات میں کوئی حصّہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ خطاب رکھا جائے۔ یا نہ رکھا جائے۔

س :۔ حسین شہید سہروردیؒ کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ج :۔ میں ان کو ۱۹۳۲ء سے جانتا تھا۔ جب میاں صاحب کی جگہ عارضی طور پر مرکزی وزیر بنا تھا۔ تو اُس وقت کمیونل ایوارڈ کے سلسلے میں وہاں گیا تھا۔ اس وقت ایوارڈ شائع ہونے والا تھا۔ شہید سہروردی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اور واپسی پر میں نے وائسرائے سے بات بھی کی، کہ ہائی کورٹ کی جج شپ کے لیے شہید سہروردی بہت موزوں ہیں۔ لیکن شہید سہروردی کو سیاست مرغوب تھی۔ اس لیے بات آگے چلی نہیں۔

جب میں پاکستان کا وزیر خارجہ تھا۔ قائداعظمؒ نے مجھے حکم دیا کہ ۴ جنوری (۱۹۴۸ء) کو برما کے جشنِ آزادی پر وہاں میں پاکستان کی نمائندگی کروں۔ اس زمانے میں رنگون پہنچنے کے لیے کلکتہ میں میں چودھری بشیر احمد صاحب کے صاحبزادے انور احمد کے ہاں ٹھہرا۔ وہاں شہید سہروردی مجھے ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے بہت حد تک مسلمانوں کو قتلِ عام سے بچایا تھا۔ ٹہلتے رہے اور بات کرتے رہے۔ ساتھ ڈکار پر ڈکار مارے چلے جا رہے تھے۔ پھر بیمار پڑ جاتے تھے۔ پھر جب یہ پرائم منسٹر ہو گئے، تو ایک بار میں انہیں ملنے گیا۔ تو بیمار پڑے تھے۔ میں نے ازراہِ تفنن کہا "یہاں اپنے سامنے ایک پھٹی پر لکھوا کے لٹکا دیں، کہ اگر میں اپنی بھوک پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ تو میں ایک ملک پر حکومت کیسے کر سکتا ہوں۔

س :۔ پُرخوری کے ذکر سے یاد آیا کہ اس ضمن میں تو خواجہ ناظم الدین کا مشہور تھا کہ بہت کھاتے تھے۔

ج :۔ کھاتے وہ بھی بہت تھے۔ جب یہ بنگال (مشرقی پاکستان) میں چیف منسٹر تھے۔ تو ان کے اس وقت کے سیکرٹری نے مجھے سنایا کہ ایک دفعہ کسی نے دعوت کی تو مان لیا آٹھ بجے آئیں گے۔ دو تین دن بعد اسی دن کی دعوت کسی اور نے دیدی تو انہوں نے کہا اچھی بات سات بجے آجائیں گے۔ اور دو تین دن بعد کسی اور نے بھی اسی دن کی دعوت دے دی۔ کہا، اچھی بات۔ آپ کے ہاں نو بجے آجائیں گے۔ ایک دن میں تین دعوتیں مان لیں، سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے۔ سات بجے والی سے خوب اچھی طرح سے کھایا، وہاں سے آٹھ بجے

والی میں پہنچے، ابھی درمیان میں ہی تھے کہ طبیعت خراب ہوگئی، گھر تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر کو معلوم ہوتا تھا، وہ تیار ہو کے آتا تھا، صبح کو سیکرٹری حاضر ہوا تو اسے کہا "ارے میاں وہ ٹیلی فون کر دو تیسری جگہ"۔ سیکرٹری نے کہا، جی وہ تو رات کو ہی کر دیا تھا، طبیعت خراب ہوگئی، تشریف نہیں لا سکتے"! کہنے لگے، نہیں، نہیں وہاں سے دریافت کروا انہوں نے پکایا کیا تھا، جب سیکرٹری نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے اس پر یہ شعر عائد کیا تھا ؏

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور ان کے ہاں کھانا اتنا لذیذ ہوتا تھا میں نے کہیں اور نہیں دیکھا EXCELLENT ان کے ہاں بھی اور خواجہ شہاب الدین کے ہاں بھی۔

س :۔ ایوب خان جب صدر ہوئے تو انہوں نے اپنی صدارت کے زمانے میں ان پر الزام لگایا کہ جب میں کمانڈر انچیف تھا، تو جب بھی ان کے پاس جاتا تو یہ فائلوں کے پیچھے سو رہے ہوتے تھے۔

ج :۔ خیر، وہ الگ بات ہے، نیند کا آجانا کام کے درمیان۔

س :۔ خواجہ صاحب نے اس کا جواب دیا کہ وہ فائلیں ان کی ملازمت میں توسیع کے متعلق ہوتی تھیں۔

ج :۔ خواجہ صاحب ذاتی اور انفرادی طور پر بڑے نیک آدمی تھے۔ اور بڑے متواضع، بڑے خلیق، لیکن قوتِ فیصلہ بہت کمزور تھی۔

س :۔ گورنر جنرل ہی رہتے تو زیادہ موزوں تھا۔

ج :۔ ہاں نہایت موزوں تھے، گورنر جنرل تھے تو اپنی مرغیوں و رغیوں میں لگے رہتے تھے، کوئی دخل نہیں دیتے تھے، اور ان کے بعد جو صاحب آئے وہ طاقت برتنے کے اس قدر متمنی تھے، بلکہ ایک دفعہ پرائم منسٹر نئے نئے ہوئے تھے، خواجہ صاحب۔ کیبنٹ میٹنگ ہو رہی تھی، کہنے لگے، ارے بھائی، کیبنٹ کے فیصلوں کے کاغذات بھیج دیا کرو، گورنر جنرل صاحب کہتے ہیں کہ سب کاغذات ان کے پاس آنے چاہئیں، ہمیں تو کوئی بھیجتا نہیں تھا۔

س :۔ وہ غلطی نہیں ہوئی جو ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے۔

ج :۔ یہ اسی قسم کا سوال ہے جو پہلے میں کہہ چکا ہوں، ان باتوں میں جانے کا کیا فائدہ۔ اوّل تو ہمارے پاس تھے ہی کتنے۔

س :۔ ملک صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ گالیاں بہت دیتے تھے۔

ج :۔ ہاں! دیتے تھے، بہت دیتے تھے۔ ان کا اپنا قول ہے۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں شریفوں

کے ساتھ شریف ہوں، اور بدمعاشوں کے ساتھ ان سے بڑھ کر بدمعاش ہوں۔

س :۔ ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑی۔ مولوی تمیز الدین خاں مرحوم نے چیلنج کیا۔ سندھ چیف کورٹ سے وہ جیت گئے۔ سپریم کورٹ میں آکر وہ ہار گئے۔ جسٹس منیر پر سارا الزام آتا ہے۔

ج :۔ میں نے نہ اس مسئلے پر غور کیا ہے نہ اس فیصلے کو اچھی طرح سے پڑھا ہے۔ میری طبیعت میں یہ تاثر ہے۔ اگر وہی فیصلہ آپ کی مراد ہے۔ نظریۂ ضرورت والا تو قانونی لحاظ سے زیادہ صحیح فیصلہ ہے۔ یہ جو ہماری سپریم کورٹ کی کوشش ہے یا بعض اور عناصر کی بھی کوشش ہے کہ نظریۂ ضرورت کے معنی یہ ہیں کہ جتنی ضرورت ہے۔ اس کے مطابق جو گورنمنٹ قائم ہو چکی ہے۔ اس کے اختیارات کی حد بندی ہو سکتی ہے۔ یہ نظریہ خالص قانونی نقطہ نگاہ سے بالکل غلط ہے۔ میں اس وقت تنقید نہیں کر رہا۔ لیکن نظریۂ ضرورت یہ ہے۔ کہ جب ایک حکومت قائم ہو جائے۔ خواہ کسی طور پر قائم ہو جائے۔ وہ ذرائع آئینی ہوں یا غیر آئینی ہوں لیکن جب ایک بار قائم ہو جائے۔ تو پھر نظریۂ ضرورت یہ ہے کہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے جاری کردہ احکام وغیرہ کا نفاذ ہوگا۔ اور ان کو اختیار رہے۔ اس پر کوئی عدالت یا کوئی اور جو دعویدار ہو اس کی حد بندی کا وہ کوئی حد بندی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مثلاً اگر کوئی عدالت حد بندی کر سکتی ہو کہ ہم قرار دیتے ہیں کہ اتنے سے زائد اختیار ضروری نہیں، میں نے تو کہا ہے کہ یہ نظریہ ہے غلط، اگر وہ یہ قرار دیں تو جو اس وقت صاحب اقتدار فرد یا ادارہ ہو، وہ عدالت کو بھی منسوخ کر سکتا ہے کہ جاؤ سلام علیکم۔ نظریۂ ضرورت کی تعریف تو وہی ہے کہ جب قائم ہو جائے ایک حکومت۔ خواہ آئینی طور پر ہوئی یا غیر آئینی طور پر ہوئی۔ اس کے قیام کے بعد اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ وہ جو خود حد بندی کرے گی اس کی وہ پابند ہے، کسی اور کی حد بندی کی پابند نہیں۔

س :۔ قائد اعظمؒ کے متعلق آپ نے کہا کہ اس وقت کے گمبھیر مسائل کے باعث آئین سازی کا کام سبقت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن لیاقت علی خاں کو تو وقت مل گیا تھا۔

ج :۔ ہاں وقت بھی تھا۔ لیکن توجہ زیادہ ان امور کی طرف تھی، جن کا اثر روز کی زندگی پر پڑتا۔ کچھ عرصہ تو سب کے لیے مہاجرین کا معاملہ پیشِ نظر رہا۔ میں نے کسی غیر پاکستانی سے سنا کہ ہم قائل ہو گئے، کہ پاکستان نے اپنی ہستی کو پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ اتنے بڑے امتحان میں سے بچ نکلے ورنہ مہاجرین والا ہی اتنا بڑا معاملہ تھا کہ اس پر ہی ٹوٹ جاتا۔

س :۔ آپ کا مطلب ہے کہ حالات ہی ایسے تھے۔ آئین بنانے نہ بنانے میں کسی کی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

ج :۔ کسی کی بھی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

س :۔ تبادلہ خیال تو پھر بھی ہوتا ہوگا۔

ج :۔ ہاں، نقطۂ نظر میں کچھ اختلافات بھی سامنے آئے۔

س :۔ مثلاً۔

ج :۔ مثلاً بعض امور میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ملک غلام محمد صاحب کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہوتا تھا۔

س :۔ اختلافی نکات کیا ہوتے تھے۔

ج :۔ مولانا اسلامی نقطۂ نگاہ وغیرہ کے لحاظ سے غالباً زیادہ سیف گارڈز چاہتے تھے۔ ملک غلام محمد صاحب جو اس وقت وزیر خزانہ تھے، ان کا نقطۂ نظر زیادہ لبرل تھا۔

س :۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔

ج :۔ ہاں، ہمارے ساتھ تھے دستور ساز اسمبلی میں۔

س :۔ انہوں نے کبھی آپ کے عقیدے کو گفتگو کا موضوع بنایا؟

ج :۔ نہیں، عقیدے پر کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ عام ملاں کی طرح نہیں تھے۔ سینس ایبل (معقول) آدمی تھے۔ مولانا بھی قرارداد مقاصد والی کمیٹی میں تھے اور میں بھی تھا۔ مجھے اقبال شیدائی نے کہا کہ مولانا کہتے ہیں، جسے ہم کافر سمجھتے ہیں۔ وہ تو دین کی بات کر دیتا ہے، لیکن سب ایسے نہیں۔ دراصل ان کی ملک غلام محمد صاحب سے رہتی تھی۔ ملک صاحب سخت انٹی ملاں تھے۔ جب وہ گورنر جنرل ہوئے اور وزارت کی از سر نو تنظیم کا مرحلہ آیا تو مجھے بلایا ہوا تھا۔ چودھری محمد علی صاحب بھی تھے۔ یہ طے پا رہا تھا کہ کون ہو اور کون نہ ہو۔ میں نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا نام لیا۔ ملک صاحب نے کہا چودھری صاحب ملاں ہے ملاں۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اس پر ملک صاحب نے کہا، اچھا اگر آپ کہتے ہیں تو انہیں رہنے دیتے ہیں۔

س :۔ آپ پر ایک اعتراض اکثر ہوتا ہے کہ آپ نے قائداعظمؒ کا جنازہ نہیں پڑھا۔

ج :۔ ہاں یہ ٹھیک بات ہے۔ میں نے نہیں پڑھا، یعنی قائداعظمؒ کا جنازہ پڑھتا تو اعتراض کی بات تھی کہ یہ شخص منافق ہے، یہ تو غیر احمدی کا جنازہ نہیں پڑھتے اور اس نے تو پڑھ لیا، تب تو میرے کیریکٹر کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ منافق ہے۔ اس کا عقیدہ کچھ ہے، عمل کچھ کرتا ہے۔ اس نے ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی خاطر قائداعظمؒ کا تو پڑھ لیا تھا۔ میرے عقیدے کو وہ جانتے ہیں۔ میرے عقیدے کو انہوں نے نان مسلم قرار دیا ہے۔ تو اگر میں آئینی اور قانونی اعتبار سے نان مسلم ہوں تو ایک نان مسلم پر کیسے واجب ہے کہ مسلمان کا جنازہ پڑھے۔ ان کی اپنی کرتوت تو سامنے ہونی چاہیئے، نہ پڑھنے پر کیا اعتراض ہے۔ سارے جہان کو معلوم ہے کہ ہم نہیں پڑھتے غیر احمدی کا جنازہ۔ ورنہ ان کا اعتراض بنتا۔ ہمیشہ اعتراض کرتے اور بڑی مضبوطی سے کرتے کہ بڑا بے ایمان ہے۔ قائداعظمؒ میں کون سا فرق تھا۔ جو اس نے پڑھ لیا۔

جہاں تک احترام کا تعلق ہے میں نے پورا احترام کیا۔ میں گیا، ساتھ موجود رہا۔ میری تو بعض تصاویر بھی چھپی تھیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ میں کس قدر غم کی حالت میں بیٹھا ہوں۔

اگر میں یونہی ہوتا اس تصویر سے ظاہر ہو جاتا۔ مجھے تو نہیں پتہ تھا کہ میری تصویر لے لیں گے۔

س:۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ دوسروں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔

ج:۔ جنازہ ایک شرعی عمل ہے۔ تو جن لوگوں نے شروع سے ہی ہم پر فتویٰ لکھ کر ہمیں اسلام سے خارج کر دیا اور ہمارے پیچھے نماز پڑھنا اور ہمارے جنازے پڑھنا سب بند کر دیئے۔ اور جب شروع شروع میں ہم نے کسی غیر احمدی کا جنازہ پڑھا تو ہمارے اس آدمی کو مارا پیٹا گیا، کہ کافر ہو کر مسلمان کا جنازہ پڑھتا ہے۔ تو ان کے متعلق بانیٔ سلسلہ کا موقف یہ تھا کہ اگر یہ لوگ اعلانیہ طور پر ان لوگوں کو ملزم قرار دیں جنہوں نے ہم پر فتوے لگائے کہ وہ ایسا فتویٰ لگانے میں غلط تھے۔ اس کے بغیر ہم دوسروں کے جنازے نہیں پڑھتے۔ ہماری جماعت میں تنظیم ہے۔ ہمارا ایک امام ہے، ہم اس کی بات مانتے ہیں۔ ہمیں فرداً فرداً اجازت نہیں کہ ہر ایک اپنا اپنا فیصلہ بھی کرے اور تنظیم کے ماتحت بھی رہے۔

س:۔ اور دعائے مغفرت۔

ج:۔ وہ ہمیشہ ہم کرتے ہیں۔ اب بھی کرتے ہیں، یہ ہمیں منع نہیں۔

س:۔ قرآن خوانی۔

ج:۔ قرآن خوانی وغیرہ کو ہم رسم سمجھتے ہیں۔ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت ایسا ہوا ہو۔ اور کسی بھی بدعت میں ہم حصہ نہیں لیتے۔ لیکن یہ کہ قبر پر جانے کا اتفاق ہو تو مغفرت کے لیے دعا کریں، یہ جائز ہے۔

س:۔ قائداعظمؒ کے مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔

ج:۔ ممکن ہے ہوا ہو۔ ذہن میں نہیں آرہا۔

س:۔ وزارت کے زمانے میں ہوتا ہوگا۔

ج:۔ وہ ہوتا ہوگا لازم نہیں تھا، لیکن میرے ذہن میں ہے کہ اس طور پر ہے قبر۔ بلکہ یہ بھی کہ تھوڑے فاصلے پر لیاقت علی خاں کی قبر بھی ہے۔ گیا ہوں گا میں ضرور کسی وقت، ایک بار تو کم ازکم ضرور گیا ہوں گا۔ لیاقت علی صاحب کی شہادت کے بعد۔

س:۔ لیاقت علی کے قتل کا سراغ کیوں نہیں لگ سکا۔

ج:۔ مجھے کیا معلوم کیوں نہیں لگ سکا۔ کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ سب کچھ ہوا۔ ایک پاگل آدمی تھا۔ اس کے ذہن میں آگیا۔ کر دیا اس نے۔ کون بتائے کہ یہ ضرور یا افغانستان نے کروایا ہے یا یا انگریزوں نے کروایا ہے یا خواجہ ناظم الدین نے کروایا ہے یا خواجہ شہاب الدین نے کروایا ہے۔

س:۔ الزام لگانے والے تو دولتانہ پر بھی لگاتے ہیں۔ گورمانی اور غلام محمد کا کچھ زیادہ ہی ذکر آتا ہے۔ اس بات کا بھی تذکرہ آتا ہے کہ وہ ۱۶۔ اکتوبر (۵۱ء) والی تقریر میں جو اہم اعلان کرنے



۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء ظفراللہ خاں قائداعظمؒ کے جنازے کے موقعہ پر



وزیر خارجہ پاکستان سر محمد ظفراللہ خاں ہیتھرو ائرپورٹ (لندن) پر۔ وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کا استقبال کر رہے ہیں۔

والے تھے اس میں چودھری ظفر اللہ خاں کی برطرفی بھی تھی۔

ج:۔ اگر وہ تقریر میں اعلان کرنے والے تھے تو مجھے انہوں نے اس کی اطلاع دے دی ہوئی ہوتی ضرور کہ وہاں سے بس کرو۔ واپس آؤ۔ میں نے تمہیں الگ کر دیا ہے۔ یہ میں نے پہلی بار سُنا ہے آپ سے۔

س:۔ اُس طرح ان سے آپ کے اچھے تعلقات رہے۔

ج:۔ ہاں، آخر وقت تک، ہمیشہ اچھے تعلقات رہے۔

س:۔ ان پر کسی نے پریشر ڈالا کہ ظفر اللہ خاں کو ہٹاؤ۔

ج:۔ اس وقت تو یہ مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت تو میں واپس آیا کرتا تھا کراچی ائیرپورٹ پر تل دھرنے کے لیے جگہ نہیں ہوتی تھی۔ اتنے لوگ مجھے ویلکم کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ عوام کا کیا ہوتا ہے، آج اِدھر ہیں کل اُدھر ہیں۔

س:۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم کے متعلق آپ کی رائے؟

ج:۔ اصولی آدمی تھے۔ مثلاً دینی عقائد کے لحاظ سے وہ بالکل ہمارے مخالف تھے۔ لیکن جن دنوں وہ پنجاب کے گورنر تھے، انہوں نے ہمارے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا ناانصافی نہیں برتی۔ اس وقت ہمارا قادیان والا کالج ضلع کچہری میں ڈی اے وی کالج کی بلڈنگ میں تھا۔ علماء ایک ڈیلیگیشن لے کے گئے کہ انہیں وہ عمارت اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کی توسیع کے لیے چاہیئے۔ نشتر صاحب نے کہا اچھی بات، وہ عمارت متروکہ ہے۔ ویسی یا اس سے بہتر عمارت مجھے بتا دیں، وہ میں انہیں دے دوں گا۔ اور آپ کو وہ عمارت (ڈی اے وی کالج والی) دے دوں گا۔ یعنی نشتر صاحب کو ہمارے عقائد سے اختلاف ضرور تھا لیکن تعصب نہیں تھا۔ اگرچہ بعد میں ہم کالج کو چنیوٹ لے گئے اور پھر ربوہ۔

س:۔ سیاسی لیڈر کے طور پر وہ کیسے تھے؟

ج:۔ عبدالرب نشتر بہت مضبوط کردار کے مالک تھے۔ جب گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب نے خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت برطرف کی تو گورنر جنرل نے مجھے کہا کہ نشتر صاحب اگر پسند کریں تو انہیں سفیر بنا کے بھیج دیا جائے۔ میں انہیں ملا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ صرف اس لیے کہ اصول کا مسئلہ تھا کہ یہاں جو ان کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گزرے گی، انہیں بھی وہ حالات برداشت کرنے چاہئیں، انہیں چھوڑ کے کیسے جائیں۔ اس طرح انہوں نے سفارت قبول نہ کی لیکن ملک کے اندر رہتے ہوئے، کوئی شرارت یا فساد وغیرہ بھی نہیں کیا۔

س:۔ کہتے ہیں ان کی قوتِ فیصلہ کمزور تھی۔ اگر ان میں یہ خامی نہ ہوتی تو وہ خواجہ ناظم الدین کی جگہ وزیر اعظم ہوتے۔

ج:۔ میرے خیال میں وہ بہت مضبوط قوتِ فیصلہ کے مالک تھے۔ اس وقت مغربی پاکستان

کا پرائم منسٹر ہو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ گورنر جنرل اُدھر کا تھا۔ پھر تو شور مچ جاتا۔ خواجہ صاحب تو گورنر جنرل بھی مشرقی پاکستان کی وجہ سے ہوئے تھے۔ قائداعظمؒ کے سلسلے میں بات اور تھی۔ وہ تو بابائے قوم تھے۔ نشتر صاحب کو خداتعالیٰ نے شخصی وجاہت بھی دی ہوئی تھی۔

جن دنوں یہ بیمار تھے، میں کراچی آیا۔ شیخ اعجاز احمد صاحب نے بتایا کہ نشتر صاحب بیمار ہیں۔ میں جناح ہسپتال پہنچا۔ بتاتے رہے، کس طرح طبیعت بگڑی۔ میں اُٹھنے لگا تو میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کے کہا۔ چوہدری صاحب میرے لیے دُعا کرنا۔ چوہدری صاحب میرے لیے دُعا کرنا۔ چوہدری صاحب میرے لیے دُعا کرنا۔ مطلب یہ کہ اختلافِ عقائد کے باوجود ان کا یہ روّیہ ہوتا تھا اور وہ اپنے عقیدے پر بہت سخت تھے، عقیدے کے معاملے میں سمجھوتے والی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن متعصب نہیں تھے۔

س:۔ ایسے انسانوں میں آخر کچھ خوبیاں ہوتی ہیں کہ لوگ ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے تو دیکھا کہ لیاقت علی خاں پر لوگ اعتراض کر جاتے ہیں، غلط کرتے ہیں، یا صحیح، یہ الگ بات ہے لیکن نشتر صاحب کی بڑی عزت ہے۔

ج:۔ مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ سردار عبدالرب نشتر کی کیوں نہ عزت کی جائے، جہاں تک لیاقت علی کا تعلق ہے، ایک لحاظ سے وہ اتنے پاپولر نہیں تھے۔ جتنے کہ نشتر تھے۔ ایک بات تو یہ کہ وزیراعظم کو فرصت بہت کم ہوتی تھی۔ کام بہت تھا۔ محتاط بہت تھے۔ جلد باز نہیں تھے۔ جہاں جلد بازی کی ضرورت ہوتی وہاں بھی سوچ سمجھ کے چلتے۔ اس لیے عوام کے ساتھ ان کا رابطہ کم تھا۔ نشتر صاحب کا زیادہ تھا۔ دوسرے بیگم رعنا لیاقت علی خاں کے خلاف تعصب بہت تھا۔ پہلے ہندو خاندان کی تھیں، پھر عیسائی ہوئیں، نواب صاحب سے شادی کے وقت مسلمان ہوگئیں، علماء ان کے بہت خلاف تھے۔ لیکن لیاقت علی صاحب کی وفات کے بعد بیگم صاحبہ میں بہت تبدیلی آئی۔ انہیں میں ۳۷ء سے جانتا تھا جب ٹریڈ ڈیلیگیشن انگلستان گیا تو لیاقت علی صاحب میرے ایڈوائزر تھے، یہ بھی ساتھ تھیں میں نے اس وقت بھی ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی۔ جسے قابلِ اعتراض کہا جاسکے۔ ٹھیک ہے لباس فیشن ایبل ہوتا تھا لیکن جب لیاقت علی صاحب والا واقعۂ فاجعہ ہوا تو یہ سارا سارا دن گھر پر رہتی تھیں۔ قرآن کریم کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بچوں کو بھی قرآن کریم لے کے بیٹھیں، جس طرح غم میں ڈوب کر زندگی بسر کرنے لگیں، مجھے خدشہ ہوا، کہیں انہیں ذہنی دھچکا نہ لگے۔ چنانچہ میں نے انہیں آمادہ کیا کہ آپ ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر بن جائیں۔ اس کے بعد میں نے وزیراعظم (محمد علی بوگرہ) اور گورنر جنرل (ملک غلام محمد) سے ان کے تقرر کی منظوری لی، وہ ہالینڈ میں ڈپلومیٹک کور کی پہلی ڈین بنیں۔ ستمبر ۵۴ء سے ستمبر ۶۱ء تک وہاں رہیں۔ وہاں اس قدر تندہی اور خلوص نیت سے سفارتی خدمات انجام دیں کہ ہردلعزیزی میں ملکہ جولیانہ کے بعد ان کا نام آنے لگا۔

اسلام سے شیفتگی کا حال یہ تھا کہ ملکہ کو انہوں نے اسلام پر ایک انگریزی کتاب "انٹرپریٹیشن آف اسلام" بھی پیش کی۔ دیکھئے وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ جوان ہوئیں تو عیسائی تھیں۔ نوابزادہ صاحب سے شادی ہوئی تو مسلمان ہو گئیں۔ لیکن اسلامی غیرت کا یہ حال تھا، میں عالمی عدالت انصاف میں جج تھا، ایک دوپہر مجھے ایک مرورقہ دیا جو انگریزی میں ٹائپ تھا وہ ہیگ کے ایک روزنامے کا افتتاحیہ تھا جس میں انڈونیشیا والوں پر طنز کی گئی تھی کہ وہ ہر خامی کا الزام ہالینڈ کے سر نہ تھوپیں اصل بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ اسلام جیسے دقیانوسی مذہب سے چمٹے رہیں گے۔ تو ترقی نہیں کر سکیں گے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کہا کہ اس کا جواب کل تک تیار ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جواب اسی روزنامے میں چھپا۔ اور اس کا پرچہ بیگم رعنا لیاقت علی نے ہیگ میں موجود تمام سفیروں کو بھجوا دیا۔

ایک روز پھر مجھے ان کا فون آیا، میں پہنچا تو بڑی مضطرب تھیں۔ فرمایا: ہمارا پاکستانی ملازم جو ہمارے گھر میں پلا بڑھا، جس کی وہاں کراچی میں شادی بھی ہو چکی ہے۔ یہاں آ کے کسی عیسائی لڑکی کی زلف کا اسیر ہو چکا ہے اور اس لڑکی کی خاطر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر تیار ہے اور ایک پادری کی شاگردی میں گرجا کی رسوم وغیرہ سیکھ رہا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑی برافروختہ تھیں کہ سورج غروب ہونے سے پہلے اسے ہوائی جہاز پر بٹھا دیا جائے۔ میں نہیں برداشت کر سکتی کہ لیاقت علی کے گھر میں پلا ہوا شخص عیسائی ہو جائے۔ چنانچہ جب بیگم صاحبہ کو بتایا گیا کہ اس لڑکے کو جہاز میں سوار کر دیا گیا ہے۔ تو ان کی جان میں جان آئی۔

س :۔ آپ نے ذکر کیا کہ لیاقت علی خاں جلد باز نہیں تھے۔ سوچ سمجھ کے چلتے تھے۔ یہ تو خوبی ہوئی ؟

ج :۔ ہاں، فیصلے کرتے وقت جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ایک روز پرائم منسٹر کے گھر کوئی استقبالیہ تھا، ڈنر تھا، میں ان کی بیٹھ پیچھے کھڑا تھا۔ انہیں نہیں پتہ تھا کہ قریب ہی کھڑا ہوں، شاید میں بیگم لیاقت علی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ تو وہ کسی ایمبیسیڈر سے کہہ رہے تھے۔ وہ مجھے فارن منسٹر نہیں بلکہ مائی فارن منسٹر کہا کرتے تھے۔ تو وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ جیسا کہ میرا وزیر خارجہ کہتا ہے میں تو ایک پوسٹ آفس کی مانند ہوں، چٹھی ڈال جاؤ۔ دیر سے پہنچے جواب لیکن پہنچ جاتا ہے۔ شاید میں نے انہی سے پوچھا یا بیگم لیاقت علی سے کہ ان تک بات کیسے پہنچی کیوں کہ میں نے کہی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگیں پہنچ گئی ہو گی کسی طرح، تو لیاقت علی خاں فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرتے تھے سوچتے تھے پھر فیصلہ کرتے تھے۔

س :۔ یہ تو خوبی ہے۔

ج :۔ ہاں۔

س :۔ دیانتداری اور راست روی بہت تھی۔

ج :۔ دیانتداری کا قطعاً کوئی شک نہیں تھا اس وقت۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ ہم میں سے

SAUDI ARABIAN DELEGATION
UNITED NATIONS
NEW YORK
9 East 62 Street

May 5, 1948

His Excellency
Sir Mohammed Zafrullah Khan
Minister of Foreign Affairs
Dominion of Pakistan

My dear friend:

Al salamu alaikum wa rahmat Allah.

It is with great regret that I learned of your departure on Friday and wish to take this opportunity to express to you our heartfelt thanks for your close cooperation and the noble stand which Your Excellency has taken, not only during this meeting, but since the question of Palestine has been put before the United Nations.

Allow me to state that your high principles have created a desire on the part of all righteous persons to identify themselves with the efforts of Your Excellency, not only on behalf of all the Arabs, but Moslems all over the world as well.

In keeping with this sentiment, I wish you in your forthcoming trip, a safe journey home and may God Almighty help you in the development of your beloved Country.

Yours most sincerely,

Faisal al Saud

کسی پر بھی شک نہیں تھا کہ کوئی رشوت یا ذاتی اغراض میں گھرا ہوا ہو، مثلاً ایسٹ پاکستان سے فضل الرحمٰن تھے، کوئی اتنے قابل نہیں تھے۔ لیکن وہ دیانتداری کا مرقع تھے۔ کوئی کسی قسم کی رشوت نہیں، بڑے اختلاف ان سے ہوتے تھے۔ وہ الگ بات ہے۔ اب تو بے چارہ فوت ہو گیا ہے چودھری نذیر احمد خاں۔ لیاقت علی خاں نے ایک وزیر کی اپوائنٹمنٹ کرنی تھی تو ان کے ذہن میں کوئی پروفیسر تھا۔ میرے ساتھ انہوں نے مشورہ کیا اور شاید ملک غلام محمد سے بھی کیا یا چودھری محمد علی سے کیا۔ میرے علاوہ بھی ایک اور سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں نے کہا، نذیر احمد بہتر رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے نذیر احمد کو لے لیا۔ بعد میں نذیر احمد کے متعلق شکوے شکایات آنے لگیں تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بھی چرچل کی طرح سگار ان کے منہ میں ہوتا تھا، کہنے لگے۔ آپ ہی نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا یہ عادت ہے اس کی۔ پھر جب لیاقت علی صاحب والا واقعہ ہو گیا اور خواجہ ناظم الدین وزیراعظم ہوئے تو فضل الرحمٰن تھا کامرس منسٹر اور یہ تھا انڈسٹریز منسٹر۔ ایک دفعہ کیبنٹ میں فضل الرحمٰن کے کسی فیصلے پر کوئی نکتہ چینی ہوئی تو اس نے کہا کہ مجھے تو انڈسٹریز کے منسٹر نے کہا تھا۔ کوئی رعایت انہوں نے (نذیر احمد) کی تھی باٹا کے ساتھ۔ یہ باٹا کے لیگل ایڈوائزر رہ چکے تھے، اس وجہ سے۔ جب فضل الرحمٰن کو حقیقت معلوم ہوئی۔ بات تو چھوٹی تھی، پھر فضل الرحمٰن اُوپر سے ہیچی وڈّے، خواجہ صاحب سے کہے کہ بے ایمان ہے اسے نکالو۔ خواجہ صاحب نے اسے نکال دیا۔

س: چودھری صاحب، جن دنوں آپ اقوام متحدہ میں تھے۔ انہی دنوں شاہ فیصل سعودی عرب کی نمائندگی کے لیے وہاں تھے، آن سے ملاقات تو رہتی ہوگی۔

ج: شاہ فیصل کے ساتھ میرا بڑا دوستانہ تھا۔ غیر عربوں میں اکیلا میں ہی تھا۔ عرب ممالک کی جب کوئی میٹنگ ہوتی تھی، یونائیٹڈ نیشنز وغیرہ میں تو امیر فیصل، اس وقت تو وزیر خارجہ تھے۔ بادشاہ نہیں ہوئے تھے، اس لیے امیر فیصل کہلاتے تھے۔ تو جب کوئی یو این او میں میٹنگ ہوتی۔ تو امیر فیصل مجھے بلاتے تھے۔ ساتھ بٹھاتے تھے۔ اس طرح میرا ہاتھ پکڑ کر سہلاتے رہتے۔ مسکرا کر کہتے۔

THIS IS MY GREATEST ENEMY.

(یہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے)

مذاق سے کہتے، محبت کے اظہار میں، پھر ایک کلاک انہوں نے مجھے دیا، بڑی دیر تک یہاں رہا، تو جب یہ فارن منسٹر تھے، ہر سال ملاقات ہو جاتی تھی، یونائیٹڈ نیشنز میں، پھر جب بادشاہ ہو گئے، ملاقات کا سلسلہ بند ہو گیا، کیونکہ بادشاہ تو جاتا نہیں۔ یو این او میں ان کے نمائندے جمیل بارودی تھے، بڑا عرصہ رہے۔ وہ بھی عجیب ہستی تھے، شام کے عیسائی تھے۔ اس بات کا سوائے عربوں کے بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ وہ کوئی اظہار بھی اس بات کا نہیں کرتے تھے، ان کی شادی امریکی عورت سے ہوئی تھی، لیکن ان کی بیوی کبھی اقوام متحدہ میں نہیں آئی

تھی، میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ جب تقریر کرتے تو بالکل اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ بڑا مخلص مسلمان تقریر کر رہا ہے۔

WE HAVE A CULTURE WHICH OUR NOBLE PROPHET HAS LEFT US AS HIS LEGACY.

(ہمارا کلچر وہ ہے جو ہمارے پیغمبر میراث کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔)
امیر فیصل کے ساتھ ان کا بڑا ذاتی تعلق تھا۔ کسی نے ان سے نام پوچھا۔ تو انہوں نے کہا جمیل بارودی۔

JAMIL MEANS BEAUTIFUL. BAROOD MEANS GUNPOWDER.
SO YOU MAY CALL ME THE BEAUTIFUL SON OF A GUN.

(جمیل کے معنی ہیں، خوبصورت۔ بارود کے معنی بارود، تو میں بندوق کا خوبصورت بیٹا ہوں) یوں شکل وصورت کے لحاظ سے سادہ تھے بہرحال۔

س:۔ شاہ فیصل مرحوم کی شخصیت کے متعلق آپ کیا کہیں گے۔ خاص طور پر ۷۳ء کے حوالے سے جب وہ عالمی افق پر ایک مدبر کے طور پر ابھرتے ہیں۔

ج:۔ ان کی بادشاہ عبدالعزیز کے سارے بیٹوں میں بڑی ممتاز شخصیت تھی، ایک تو انہوں نے ساری عمر ایک شادی رکھی، بڑے اعلیٰ کیریکٹر کے تھے۔ کوئی سکینڈل نہیں تھا کسی قسم کا بھی، چال چلن بڑا اچھا تھا۔ ان کی طرف کسی قسم کی کوئی ناواجب بات کبھی منسوب نہیں ہوئی۔ ایک لمبا عرصہ فارن منسٹر رہے تھے۔ اس لیے باہر سے تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ مدبر بھی تھے، طبیعت بڑی منکسر تھی۔

س:۔ کوئی شاہانہ رعونت نہیں۔

ج:۔ ناں، یہ ان میں سے کسی میں بھی نہیں، سعودیوں میں کسی میں بھی نہیں۔ چھوٹے چپٹے کوئی نہیں۔ ابھی یہ فارن منسٹر تھے، میں نے کہا، میرا ارادہ ہے کہ میں حج کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا، حج ابھی گرمیوں کی شدت میں آتا ہے۔ ہم جو انتظام اپنے لیے کرتے ہیں۔ وہی تیرے لئے بھی کر دیں گے، ائرکنڈیشنڈ کوٹھ بھی دے دیں گے، اور ساری باتیں کریں گے۔ لیکن وہ گرمی ہمارے سے بھی برداشت نہیں ہوتی۔ چند سال رک جا، موسم ٹھیک ہو لینے دے۔ پھر بعد میں جب میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں تھا، یہ بادشاہ ہو چکے تھے۔ میں نے جمیل بارودی سے کہا، اس نے تار دیا۔ بادشاہ نے بھی بذریعہ تار جواب دیا۔ اس میں لکھا تھا۔ اسے کہو میں کون ہوں اجازت دینے والا۔ وہ فیصلہ کرے اور آجائے۔ البتہ ہمارے سفیر کو کراچی میں اطلاع کر دے تاکہ ہم اس کے مطابق انتظامات کر دیں۔

س:۔ آپ کے عقائد کا انہیں علم تھا۔

ج:۔ میرے عقائد کا کسے علم نہیں۔

س:۔ اس کے باوجود ان کا رویّہ یہ تھا۔

ج:۔ ہاں۔

س:۔ آپ کس سال حج کے لیے گئے۔

ج:۔ ۱۹۶۷ء میں، اور میں ان کا مہمان تھا۔

س:۔ ملاقات ہوئی۔

ج:۔ ہوئی۔ بلکہ جس دن منیٰ کے لیے چلنا ہوتا ہے اس سے پہلی شام بادشاہ کی طرف سے ایک شاندار عشائیہ دیا جاتا ہے۔ اس میں مجھے بھی بلایا ہوا تھا۔ چودھری بشیر احمد صاحب کا بڑا صاحبزادہ انور احمد بھی میرے ساتھ تھا۔ شاہ بانے ہیں جس جگہ مجھے بٹھایا میری کرسی بادشاہ سے دو کرسی چھوڑ کر تھی۔ وہ بھی درمیان میں دو شہزادے تھے جو وزراء بھی تھے، ان کے دائیں طرف تھی۔ جب شاہ فیصل تشریف لائے تو پہلے میرے پاس آکر مجھے خوش آمدید کہا۔ مصافحہ کیا۔ پھر اپنی نشست پر جا کے بیٹھے۔ بہت احترام کرتے تھے۔

پر جب بعد میں انہوں نے ہمارا حج بند کیا۔ اس وقت میں نے انہیں چھٹی لکھی۔ انہوں نے مجھے اس چھٹی کا جواب بھیجا —————— اور اس جواب میں انہوں نے لکھا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، پھر آخر میں والسلام بھی لکھا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ تمہاری چھٹی آئی تھی۔ میں تو مسائل زیادہ نہیں جانتا۔ میں نے وہ علماء کو پیش کر دی تھی۔ ان کے تاثرات بھیج رہا ہوں، ان کا کہنا ہے کہ تمہارے عقائد تواتر کے خلاف ہیں۔ اس پر مجھے ہنسی بھی آئی۔ یہ خود حنبلی ہیں۔ حنفیوں نے ان کا حج بھی بند کیے رکھا تھا۔ کہ ان کے عقائد تواتر کے خلاف تھے۔ خیر میں نے یہ بات تو نہ لکھی۔ بہرصورت، بڑے احترام کے ساتھ انہوں نے لکھا۔ انہیں تو یہ کہہ کے بدظن کیا گیا تھا کہ احمدی اسرائیلیوں کے جاسوس ہیں۔ اس بات پر عرب اور خاص طور پر سعودی بڑے حسّاس ہیں۔ اس وقت میرا ان سے رابطہ نہیں رہا تھا۔ ورنہ میں ان سے بات کرتا۔

س:۔ لیکن یہ بات عام ہے کہ آپ لوگ اسرائیل کے جاسوس ہیں۔

ج:۔ کوئی دلیل۔

س:۔ آپ کا وہاں مشن موجود ہے۔

ج:۔ ہاں، ہے ہمارا وہاں مشن، لیکن وہ اسرائیل کے قائم ہونے سے مدتوں پہلے سے ہے۔ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے وقت اسرائیل کی حدود کے اندر ایک خاص تعداد مسلمان اور عیسائی عربوں کی تھی، جن میں سے بعض تو اپنا وطن ترک کر کے ساتھ کے عرب ممالک میں منتقل ہو گئے اور بعض وہیں مقیم رہے۔ ہماری جماعت میں سے بھی بعض اسرائیل کی حدود سے باہر چلے گئے۔ اور بعض وہیں مقیم رہے۔ تو بجائے اس کے کہ یہ دیکھیں کہ یہ اسرائیل میں بیٹھ کر بھی اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں، عقائد میں بعض فرق سہی لیکن بہرصورت

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہی پڑھاتے ہیں ہم بھی۔ کہتے ہیں جی اسرائیل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور یہاں سے چندے کے روپے وہاں پہنچاتے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اسرائیل کی جاسوسی کرتے ہیں۔ کسی ایک کو پکڑ کر آج تک ظاہر میں نہیں لائے۔ اسرائیل کے قیام کے خلاف سب سے زیادہ موثر تقریریں کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق عطا کی تھی۔ سارا عرب مانتا ہے اس بات کو کہ فلسطین کے مسئلے پر یونائیٹڈ نیشنز میں سب سے مضبوط آواز اس شخص نے بلند کی۔ عجیب بات ہے کہ ہم ان کے ایجنٹ بھی ہیں۔ اور ان کے خلاف تقریریں بھی کرتے ہیں۔ میں اس کتاب کا نام بھول رہا ہوں۔ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے متعلق کسی یہودی نے لکھی تھی۔ اور ایک یہودی نے ہی مجھے دکھائی تھی۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ باقی سب کی دلیلوں کا ہم جواب دے لیتے تھے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کے دلائل کا ہمارے پاس جواب نہیں تھا۔

شاہ فیصل نے تحریری طور پر میری ان خدمات کو سراہا ہے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ جب سے یونائیٹڈ نیشنز میں فلسطین کا مسئلہ پیش ہوا ہے، آپ نے جس بھرپور تعاون اور خلوصِ نیت سے ہمارے موقف کی تائید کی ہے۔ اس کے لیے ہمارے دل ممنونیت کے جذبات سے بھرے پڑے ہیں۔

حسن اصفہانی امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ قائداعظمؒ کے ساتھ اس کی خط و کتابت اب تو چھپ چکی ہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انہوں نے قائداعظمؒ کو ایک خط لکھا۔ اس وقت میں یونائیٹڈ نیشنز میں فلسطین کے مسئلے پر پاکستان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اصفہانی لکھتے ہیں۔

I can briefly tell you that Pakistan Delegation to the United Nations has acquitted itsels more than well. Sir Zafarullah delivered one of the finest speeches heard, in the United Nations on the Palestine question. We are working as a perfect team and without boasting, have created an excellent impression. Pakistan is right on the map.

(میں اس بات کا مختصر ذکر کروں گا کہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد نے توقع سے بڑھ کر کارکردگی دکھائی ہے۔ فلسطین کے مسئلہ پر سر ظفر اللہ نے جو تقریر کی۔ وہ اقوام متحدہ میں اس مسئلے پر ہونے والی بہترین تقریروں میں سے ایک ہے۔ ہم باتیں بنانے کی بجائے یہاں ایک مکمل ٹیم کی طرح کام کر رہے ہیں۔ جس نے عمدہ تاثر پیدا کیا ہے۔ پاکستان نے اپنا آپ منوا لیا ہے۔)

قائداعظمؒ کے نام ایک اور خط میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اصفہانی لکھتے ہیں۔

Sir Zafarullah has made a big hit over the Palestine case and has put Pakistan in the front row. He is wanted back to represent Pakistan before the Assets and liabilities Tribunal. He shall have to leave long before the U.N. session ends. His work has just begun. We shall miss his company and his guidance.

(سر ظفراللہ نے فلسطین کے مسئلہ پر اقوام متحدہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح وہ پاکستان کو صف اوّل میں لے آئے ہیں، اثاثوں اور کفالتوں کے ٹربیونل میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے انہیں واپس بلایا جا رہا ہے۔ اس طرح انہیں اقوام متحدہ کا سیشن ختم ہونے سے بہت پہلے واپس جانا پڑے گا، جبکہ ان کا کام ابھی تو شروع ہوا ہے۔ وہ چلے گئے تو یہاں ہم ان کی رفاقت اور رہنمائی سے محروم رہ جائیں گے۔)

۲۲/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ نے ان دونوں خطوط کے جواب میں حسن اصفہانی کو لکھا:

As regards Zafrullah, we do not mean that he should leave his work so long as it is necessary for him to stay there, and I think he has already been informed to that effect, but naturally we are very short here of capable men, and especially of his calibre, and every now and then our eyes naturally turn to him for various problems that we have to solve.

(جہاں تک ظفراللہ کا تعلق ہے ہم نہیں چاہتے کہ وہ اس وقت وہاں (اقوام متحدہ) اپنا کام چھوڑ کے واپس آجائیں جب کہ ان کا وہاں قیام ضروری ہو، میرا خیال ہے کہ انہیں اس امر کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ ایک قدرتی بات ہے کہ یہاں ہمارے پاس اہل خاص طور پر ان جیسی صلاحیتوں کے حامل افراد کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مسائل کے حل کے لیے ہماری نگاہیں بار بار ان کی طرف اٹھتی ہیں۔)

میں جب ۱۹۷۳ء میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی صدارت سے ریٹائر ہوا تو بھٹو صاحب نے تار دیا، جس میں بڑی تعریف کی تھی، انہوں نے لکھا: آپ نے کئی دہائیوں تک پاکستان کے عوام اور بین الاقوامی برادری کی بے لوث خدمت کی ہے، برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن حاصل کرنے والی تحریک میں آپ نے لیڈنگ ممبر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے، اس طرح قیام پاکستان کے سلسلے میں، آپ نے اہم رول ادا کیا اور وزیر خارجہ کی حیثیت سے پاکستان کے ابتدائی سات سالوں کے دوران ملک کے لیے بہت کام کیا۔ جس سے بیرونی دنیا میں پاکستان

کے ابتدائی سات سالوں کے دوران ملک کے لیے بہت کام کیا، جس سے بیرونی دُنیا میں پاکستان کا وقار بڑھا اور بین الاقوامی فورم پر اس کی آواز میں وزن پیدا ہوا۔ آپ کی خدمات یہیں ختم نہیں ہو جاتیں آپ نے یو این او کی جنرل اسمبلی کے صدر اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج کی حیثیت سے صرف بین الاقوامی برادری کی ہی خدمت نہیں کی بلکہ پاکستان کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔"

مراکش کی آزادی کے سلسلے میں میں نے جو کچھ کیا آج تک مراکش کے شاہ حسن اس بات کے معترف ہیں۔ انہوں نے مجھے ابھی پچھلے سال (۱۹۸۰ء) اپنے ہاں مدعو کیا۔ اور فرمایا۔ مجھے آپ کا وہ رول اچھی طرح سے یاد ہے، بھلا وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔

اگر ہم اسرائیل کے لیے اپنے ملک کی جاسوسی کرتے ہیں تو اس سے ہمیں حاصل کیا ہو سکتا ہے۔

س:۔ الزام لگانے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ عالم اسلام میں رخنہ ڈالنے کے لیے۔

ج:۔ ہم ان کے کہنے پر عالم اسلام کو نقصان پہنچائیں گے تو اسرائیل والے دوسرے مسلمانوں کی جگہ ہمیں کھڑا کر دیں گے۔ یعنی ایک قدم بھی آگے نہیں سوچتے کہ یہ لوگ اگر یہاں بیٹھ کے جاسوسی کرتے ہیں تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے ہیں، پھر اس سے انہیں حاصل کیا ہو جائے گا، کیا اس سے ہماری جماعت کو ترقی ہو جائے گی، حالانکہ یہ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں سب سے زیادہ کامیابی اب تک مسلمانوں میں سے ہوئی ہے، اور مسلمانوں میں سے ہو گی۔ جو ہمارے نشانہ بنشانہ ہیں۔ اسلام کے لیے قربانی کرنے والے تو یہ لوگ ہیں یا اسرائیلی آ کے کریں گے، سوچتے نہیں جو منہ میں آیا کہہ ڈالتے ہیں۔

س:۔ دوسری تبلیغی جماعتوں کے اسرائیل میں مشن ہیں۔

ج:۔ میں نہیں جانتا۔

س:۔ اسرائیل گورنمنٹ آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔

ج:۔ نہیں۔ کوئی خاص رکاوٹ نہیں، ہم سیاست میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ وہ جانتے ہیں، کہ ہمارے لیے یہ کوئی مشکل پیدا نہیں کرتے۔

س:۔ کس حد تک وہاں کامیابی ہوئی۔ کسی یہودی کو بھی کنورٹ کیا۔

ج:۔ کامیابی اس لحاظ سے تو نہیں ہوئی، کہ یہودیوں میں سے مسلمان ہو گئے ہوں، لیکن بعض عربوں میں سے جو جو علاقے عربوں کے ان کے اندر آ گئے اور پہلے سے بھی جو عربوں کے علاقے ہیں۔ ان میں کامیابی ہوئی ہے۔ دو تین جامع الازہر (مصر) کے سند یافتہ علماء بھی احمدی ہیں، اچھی خاصی جماعت ہے جس کے افراد تمام تر عرب ہیں، تو ایک گڑھ ہمارا

اسرائیل کے سینے میں قائم ہے، اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہی کہیں گے کہ ان کا وہاں مشن ہے۔ یہ ضرور ان کے جاسوس ہیں۔

س :۔ وہ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں، کہ جب دوسرے لوگوں کو وہاں مشن قائم کرنے کی اجازت نہیں تو پھر آپ لوگوں کو کیوں خاص طور پر اس کی اجازت دی گئی، یا اجازت برقرار رکھی گئی۔

ج :۔ کون کہتا ہے کہ ان کو اجازت نہیں، کون ہے۔ جس نے کوشش کی ہو اور اسے اجازت نہ ملی ہو اور ہمیں مل گئی۔ ہم تو وہاں اسرائیل کے قیام سے پہلے تھے۔ اس لیے ہمیں تو کسی کی اجازت کی ضرورت نہ تھی، اگر ضرورت ہوتی تو وہ روکتے" تو نہیں تھے۔ اور ہمارے تمام اراکین وہاں پہلے سے بسے ہوئے عرب ہیں۔ بیشک ہمارے پاسپورٹوں پر ہوتا ہے۔ EXCEPT ISRAEL (ماسوائے اسرائیل) ہم نے کبھی اعتراض نہیں کیا کہ ہمیں کیوں نہیں جانے دیتے، نہ ہمیں کوئی خاص شوق ہے کہ ہم جائیں۔

س :۔ آپ کبھی اسرائیل گئے۔

ج :۔ میں اسرائیل قائم ہونے سے پہلے ۱۹۴۵ء میں وہاں گیا تھا۔ کبابیر بھی گیا تھا۔ جہاں ہمارا مشن ہے۔ حیفہ جو شہر ہے، اس کے اوپر پہاڑی ہے۔ اب تو کبابیر بھی حیفہ کی میونسپل حدود میں آ گیا ہے۔

س :۔ ہیں وہ بھی آپ کے ربوہ مرکز کے انڈر ہی۔

ج :۔ مرکز ربوہ کے تحت اس لحاظ سے کہ سارے جتنے افراد جماعت ہیں، ان سب نے ہمارے امام جماعت کی بیعت کی ہوئی ہے اور جو ادارے قائم ہوتے ہیں، وہ اُن کی ہدایت کے مطابق برسرِ عمل ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری طرف سے کبھی کسی قسم کی کوئی خفیہ کارروائی نہیں ہوئی۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں علی الاعلان کرتے ہیں۔ اس کا اخباروں میں چھپتا ہے اور جیسے میں نے کہا ہے، کہ اسرائیل میں ہماری جماعت کے تمام افراد عرب ہیں جو شروع سے وہیں آباد ہیں۔ ابتداء میں ہماری طرف سے وہاں مبلغ گئے اور انہی کے ذریعے سے جماعت قائم ہوئی، لیکن اسرائیل کی ریاست قائم ہو جانے کے بعد پاکستان سے یا کہیں اور جگہ سے ہماری طرف سے کوئی مبلغ وہاں نہیں گیا، وہ لوگ خود اپنا انتظام کرتے ہیں، اور جماعت کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ تو مشن سے ہماری مراد کوئی سیاسی مشن نہ کبھی تھا نہ ہے۔ ہم مشن کا لفظ جماعت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم کسی دوسرے کے ذہن میں کچھ اور ہو تو ہو ہمارے ذہن میں اس سے زیادہ اس کا مفہوم نہیں ہوتا۔

س :۔ یہ جو الزام ہے کہ "یہ پودا انگریز کا لگایا ہوا ہے"۔

ج :۔ انہیں سمجھ نہیں آتی کہ وہ شخص جس نے وفاتِ مسیحؑ کا مسئلہ قرآن کریم سے لیا۔ اور تاریخی طور پر ثابت کیا کہ حضرت مسیحؑ صلیب سے، بچ کر ایران سے اور افغانستان سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے، وہیں وفات پائی، وہیں ان کا مقبرہ ہے۔ یہ ایک ایسی ضرب تھی عیسائیت پر کہ اس پر ایک تو سینٹ پال کی شہادت ہے کہ اگر مسیحؑ صلیب پر نہیں فوت ہوئے تو ہمارا



۱۹۸۰ء — مراکش کے حکمران شاہ حسن کی دعوت پر اس کے محل میں ملاقات

عقیدہ بے معنی ہے۔ دوسرے امریکہ کے بڑے پادری ایس ڈبلیوزویمر جو ہارٹ فرٹ کنیٹی کٹ (HART FART CONNECTICUT) سٹیٹ میں پادریوں کی تعلیم و تربیت کے ادارے ہارٹ فرٹ سیمینری (CEMINARY) کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے لکھا کہ اگر حضرت مسیحؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو ہمارا دین ایک فریب ہے۔

عیسائیت کو تو ہمارے ساتھ دشمنی ہونی چاہیئے، چہ جائیکہ وہ ہماری تائید کریں۔

س :۔ اس ضمن میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ انگریز نے آپ کے عقیدے کی اس لیے تائید کی۔ اور اس کے پھلنے پھُولنے کے سامان کیے کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو۔

ج :۔ مسلمانوں میں اگر انتشار پیدا ہو جاتا اس سے انہیں کیا حاصل ہو جاتا۔ اول تو جتنا انتشار مسلمانوں میں ہے اس سے بڑھ کر مزید انتشار کی کیا ضرورت تھی۔

س :۔ بقول آپ کے آپ نے عیسائیت پر ضرب لگائی، اس وقت یہاں انگریز کی حکومت تھی، انہوں نے کبھی کوئی رکاوٹ ڈالی ؟

ج :۔ ان کے ایک گورنر پنجاب سرہربرٹ ایمرسن کو یہ خیال پیدا ہوا، خلافت ثانیہ کے دوران کہ خلیفہ ہے۔ اس کے آگے سیکرٹری ہیں یہ ہے، وہ ہے، یہ تو حکومت کے اندر ایک حکومت ہے۔ تو وہ ہمارے خلاف ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان سے دو تین میل کے فاصلے پر جو کانفرنس کی، اس کی اجازت انہوں نے ہی دی، بعد میں انہوں نے تسلیم بھی کیا کہ احرار نے اس کانفرنس کی اجازت دیئے جانے کا بے جا فائدہ اٹھایا۔ اور سوائے سلسلۂ احمدیہ کے خلاف گالی گلوچ کے کوئی اور کارروائی نہیں کی۔

س :۔ اس کانفرنس کا انتظام وغیرہ انگریز گورنمنٹ نے کیا؟

ج :۔ انتظام وغیرہ گورنمنٹ نے نہیں کیا۔ احرار نے ہی کیا۔ لیکن اس وقت گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر کوئی جلسہ وغیرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کو اجازت دیدی تھی، اُدھر ہمارے اس وقت کے امام پر نوٹس جاری کر دیا تھا۔ کہ ان دنوں میں کسی احمدی کو نہ قادیان بلایا جائے، اور اگر کوئی احمدی وہاں آجائے۔ تو اس کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام بھی نہ کیا جائے۔ کیسی بیہودہ بات ہے کہ جو ہمارا مرکز ہے، جہاں جانے کا ہمیں ہر وقت حق ہے۔ وہاں جانے سے تو ہمیں روک دیا اور ان کی کانفرنس جو ہمیں گالی دینے کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس کی اجازت دیدی گئی۔ خیر، وقت گزر گیا۔

لیکن اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق بھی دیتا ہے۔ اور اس توفیق میں برکت بھی ڈالتا ہے، میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ اس سے اندازہ کرلیں، جب ہمارے اس وقت کے امام نے کشمیریوں پر کیے جانے والے مظالم کے پیشِ نظر شملہ میں ایک میٹنگ بلائی اور ان بارہ سرکردہ مسلمانوں کو جمع کیا۔ جو تھے تو کشمیری لیکن اب ادھر رہتے تھے، مثلاً ڈاکٹر اقبال، خواجہ حسن نظامی، خواجہ رحیم بخش وغیرہ، ڈاکٹر اقبال صاحب نے کہا بھی کہ مرزا صاحب کیا کریں،

کروالیاں ریاست کے اُوپر تو حکومت برطانیہ کی چھتری ہے، ہم اس کے مقابلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں لیکن کچھ آواز تو ہماری طرف سے اٹھنی چاہیئے تاکہ مسلمانانِ کشمیر کو اتنا اطمینان تو ہو کہ ان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والا باہر بھی کوئی عنصر موجود ہے، اس سے ان کی ہمت بڑھے گی۔ علامہ اقبال نے کہا، اچھی بات۔ پھر آپ اس کمیٹی کی صدارت کریں۔ آپ کے پاس کارکن بھی ہیں، پیسہ بھی ہے۔ ہمیں تو ساری آرگنائزیشن بنانی پڑے گی حضرت صاحب نے کہا اچھی بات۔ ایک سال کے لیے میں صدر بن جاتا ہوں، اس طرح کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اور ایک سال میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کمیٹی کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ قانون کی بھی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی تھی، کہیں حکومت کا ہاتھ بھی نہیں پڑتا تھا۔ دُوسرے سال پھر علامہ اقبالؒ نے اصرار کیا کہ اچھا خاصا کام ہو رہا ہے۔ آپ ہی صدر رہیں۔ تو جب احرار نے دیکھا تو وہ بھی کود پڑے اور خلاف آئین کارروائیاں شروع کر دیں۔ بلکہ جب کشمیر کمیٹی بنی تھی۔ اس وقت حضرت صاحب نے احرار کو پیغام بھیجا تھا کہ آپ بھی اپنے دو نمائندے کشمیر کمیٹی کے اراکین کے طور پر نامزد کریں۔ انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ حضرت صاحب نے پیغام بھیجا اگر آپ اس لیے کشمیر کمیٹی میں نمائندگی نہیں چاہتے کہ میں اس کا صدر ہوں۔ تو میں صدارت سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔ لیکن مسلمانوں کا متحد ہونا ضروری ہے، احرار والوں نے کہا ہم اپنی کوشش علیحدہ کریں گے۔ اس طرح جب احرار والے درمیان میں کُود پڑے تو انہوں نے یہ پروپیگنڈا بھی کیا کہ یہ مرزائیوں نے ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔ اس طرح وہ اپنی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یوں دوسرے سال کے آخر میں حضرت صاحب نے صدارت چھوڑ دی۔ لیکن یہ کہا کہ جو مدد ممکن ہوگی وہ ہم کرتے رہیں گے، ہم پر ایک سیس لگی ہوئی تھی، مثلاً جو چندہ جماعت کے لیے دیا جاتا تھا، اس کے ساتھ زائد کچھ رقم کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں کے لیے بھی ادا کی جاتی تھی، تو حضرت صاحب نے کہا کہ ہم سے جو ہو سکی مالی مدد بھی کرتے رہیں گے۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں صاحب نے کوشش کی کہ احرار اور کشمیر کمیٹی کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے۔ حضرت صاحب کو بلایا۔ اور چودھری افضل حق صاحب کو بھی بلایا۔ اس گفتگو کے دوران چودھری صاحب نے حضرت صاحب سے کہا کہ پچھلے جو صوبائی انتخابات ہوئے ہیں۔ ان میں آپ کی جماعت نے میری مخالفت کی اور ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے، احرار نے کہ ہمارا اوّلین مقصد اب جماعت احمدیہ کی بربادی ہوگا۔ حضرت صاحب نے کہا کہ چودھری صاحب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کردہ ہے۔ اس دعویٰ میں یا ہم سچے ہیں یا ہم جھوٹے ہیں، اگر ہم اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں تو آپ کو کسی قسم کے تردد کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ہمیں تباہ کر دے گا۔ لیکن اگر ہم اس دعویٰ میں سچے ہیں تو احرار کیا چیز ہے۔ دُنیا کی ساری انجمنیں اور ساری حکومتیں مل کر بھی ہمیں تباہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ

کامیاب نہیں ہو سکتیں"۔

ہمیں تو صرف اور صرف ایک فکر ہے وہ یہ کہ ہم اپنی کسی سستی یا غفلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے اپنے تیئں محروم نہ کر دیئے جائیں۔ اس کے لیے ہم دعائیں ضرور کرتے ہیں۔ باقی ہم نہ کبھی کسی کے لیے بد دعا کرتے ہیں، اور تو اور میری والدہ کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ روحانیت بخشی ہوئی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ سیالکوٹ میں ڈسکہ کلاں ہمارا گاؤں ہے، میرے والد صاحب کی وفات کے بعد وہ اکثر میرے پاس رہتی تھیں، لیکن کچھ وقت کے لیے گاؤں بھی چلی جاتی تھیں۔ ایک روز ایک غیر احمدی نے کسی ہندو ساہوکار کا قرضہ دینا تھا۔ اس نے اس کی بچھیا قرق کر لی۔ بچوں کو جانوروں سے پیار ہوتا ہے، جب وہ (ہندو) ساہوکار وچھی لینے آیا تو (مسلمان) بچے نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ ساہوکار نے بچے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ والدہ نے یہ سین دیکھ لیا۔ حاجی جماں ہماری زمینوں کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ اسے کہا کہ ساہوکار کو بلا کر لائے۔ وہ آیا۔ والدہ نے اسے کہا کہ سود کو چھوڑ دے اور اصل روپے پر فیصلہ کر لے۔ ویسے بھی تو بچھڑی لے جائے گا۔ تو تجھے کیا حاصل ہو گا۔ ساہوکار کو پیسے دے دیئے اور اس غریب مسلمان کے بچے سے کہا بہتر باگ پکڑ کے لے جا۔ یہ اب تیری ہے۔

س:۔ پھر وہ شخص آپ کا ہم عقیدہ ہو گیا۔

ج:۔ نہیں۔ والدہ کا یہ طریق نہیں تھا کہ کسی پر احسان کر کے اسے ہم عقیدہ بنایا جائے۔ احسان کے ضمن میں وہ دشمن اور دوست کی تمیز نہیں رکھتی تھیں۔ گاؤں کا ہی واقعہ ہے کہ وہ وہاں تشریف رکھتی تھیں کہ ایک دن حاجی جماں جب گھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ یہ بچوں کے کپڑے بنا رہی ہیں۔ انہوں نے پوچھا یہ کس کے لیے ہیں۔ والدہ نے کہا۔ یہ ملاں کے پوتوں پوتیوں کے لیے ہیں۔ مولوی فرزند علی تھا۔ ان کا نام۔ حاجی جماں نے کہا۔ ملاں تو ہمارا دشمن ہے۔ دن رات ہماری دشمنی کرتا ہے۔ والدہ نے کہا میرا کوئی دشمن نہیں، جس کا خدا دوست ہو اس کا کون دشمن ہے۔ اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے گاؤں میں ہوتے ہوئے ملاں کے بچے ننگے پھریں۔ اور تمہاری یہ سزا ہے کہ میں جب یہ کپڑے بنالوں تو تم ان کے پاس لے کے جانا۔ لیکن رات کو جانا تاکہ دوسرے لوگ ان کو طعنہ نہ دیں۔ ادھر تو ان کی مخالفت کرتے ہو، پھر ان سے جو یہ دیتے ہیں لے بھی لیتے ہو۔

تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو یہ توفیق بھی عطا کی ہوئی ہے۔ یہ حوصلہ بھی دیا ہوا ہے۔

س:۔ گاؤں کے وہ مولانا صاحب آپ کی عقیدے کے اعتبار سے مخالفت بھی کرتے تھے۔

ج:۔ سخت مخالفت کرتے تھے۔

س:۔ کپڑے بھی لے لیتے تھے۔

ج:۔ ہاں ہاں، لے لیتے تھے۔ ملاں بیچاروں کا کیا ہے۔

س :۔ قومی سطح پر جو علماء آپ کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ جب ویسے ملاقات کی کوئی صورت ہوتی تو اس وقت ان کا رویہ کیا ہوتا تھا مخالفت کا یا.....

ج :۔ وہ رویہ مخالفت کا ہی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ مولوی ثناء اللہ صاحب (امرتسری) سے ملاقات یوں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔ امرتسر میں ایسا ہوا کہ ایک شخص احمدی ہو گیا۔ اس کی بیوی سے مختار نامہ لے کر مولوی ثناء اللہ صاحب نے دعویٰ کر دیا کہ میرا خاوند احمدی ہو جانے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے۔ اس لیے میرا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ قرار دیا جائے کہ میرا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ اس میں وکیل تو انہوں نے کیا ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو۔ لیکن مولوی صاحب بھی ساتھ موجود رہتے تھے۔ میری شروع شروع کی پریکٹس تھی۔ مجھے حکم ہوا۔ اس لیے میں پیروی کے لیے لاہور سے امرتسر جاتا تھا۔ مسٹر ہیمور ایک اینگلو انڈین سب جج تھے۔ اس میں ہم نے دو قسم کے گواہ پیش کیے۔ ایک تو ہمارے اپنے علماء جو یہ شہادت دیں کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ دوسرے چند غیر احمدی جن میں کوئی تعصب نہیں تھا۔ جن کی شہادت یہ تھی کہ ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ سارے احکام بجا لاتے ہیں۔ جب وہ فہرست ختم ہو گئی۔ جو ہم نے گواہوں کی دی ہوئی تھی تو جج نے کہا، اچھا اب ختم۔ اب بحث کے لیے تاریخ مقرر ہوئی۔ میں نے کہا نہیں ہمارا ایک گواہ باقی ہے۔ یوں بھی چار بج چکے تھے۔ جج نے کہا، میرے پاس جو فہرست ہے۔ اس میں تو کوئی اور نام نہیں۔ میں نے کہا آپ کے پاس نہیں، لیکن عدالت میں موجود ہے۔ پوچھا، کون؟ میں نے کہا، مولوی ثناء اللہ صاحب، مولوی صاحب نے فوراً کہا "میں!" میں نے کہا "جی آپ"۔ انہوں نے کہا، مجھے تو کوئی سمن وغیرہ نہیں گیا۔ میں نے کہا، سمن کی کیا ضرورت ہے۔ آپ موجود ہیں۔ عدالت میں۔ انہوں نے کہا، مجھے کوئی خرچ خوراک نہیں ملا۔ میں نے کہا، خرچ خوراک کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ تو عدالت میں موجود ہیں۔ خرچ خوراک تو اس کو دیا جاتا ہے جو باہر سے آئے۔ میں نے سوچا کہ جج بھی تھکا ہوا ہے۔ ویسے بھی چار بج گئے ہیں۔ میری جیب میں تین روپے تھے۔ وہ میں نے نکال کے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے، یہ لیجئے خرچ خوراک اور آیئے حلف لیجئے۔ خیر، میری جیب میں ان کے پرچہ 'اہل حدیث' کا ایک شمارہ تھا۔ وہ میں نے نکالا اور پوچھا 'اہل حدیث' کے آپ ایڈیٹر ہیں، فرمایا، "ہاں"۔ "یہ نوٹ آپ کا ہے"، فرمایا، "ہاں میرا ہے"۔ تو جب سن چودہ (۱۹۱۴ء) میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا تھا۔ اور لاہور والا سیکشن جسے ہم غیر مبائعین کہتے ہیں۔ الگ ہو گیا تھا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب (امرتسری) نے ان کے ساتھ مل کر ایک ادارہ اشاعت اسلام کے لیے قائم کیا تھا۔ تو مولوی صاحب کو کسی نے خط لکھا کہ آپ نے لاہوری مرزائیوں کے ساتھ مل کے جو یہ ادارہ قائم کیا ہے۔ اگر اس کی کوششوں کے نتیجے میں کوئی شخص مثلاً ہندو سے لاہوری مرزائی ہو جائے۔ تو آیا وہ مسلمان ہوا یا نہیں۔

اس پر مولوی صاحب نے لکھا تھا۔ مسلمان ہونا دو لحاظ سے ہے۔ ایک اُخروی نجات کے لحاظ سے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دوسرا عُرفِ عام کے لحاظ سے، عرفِ عام کے لحاظ سے جو شخص کہتا ہے کہ میں لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پر ایمان لاتا ہوں۔ ہم اس کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ واقعہ ان کے "اہل حدیث" میں چھپا تھا۔

باہر نکلے تو مولوی صاحب وہ تین روپے ہاتھ میں یوں ہلا رہے تھے۔ اور ساتھ فرما رہے تھے۔ "ہمیں کچھ نہ کچھ مرزا صاحب سے ہمیشہ مل ہی جاتا ہے"۔

یوں بعض دفعہ میں نے انہیں جلسوں میں بھی دیکھا، ۱۹۲۱ء میں قادیان میں جلسہ تھا سوائے اہل تشیع کے باقی سب علماء جمع ہو گئے تھے۔ صبح کو جلسہ شروع ہوتا تھا۔ آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔ ان دنوں ایسٹر کی تعطیلات تھیں اور مجھے حضرت صاحب نے قادیان طلب فرمالیا ہوا تھا۔ اور میری ڈیوٹی ان کے جلسے میں لگائی گئی، ہمارے باقی لوگوں کو وہاں جانے سے منع کر دیا گیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کر جوش میں آ کے کوئی تصادم ہو جائے۔ چند صحافی جاتے تھے، میں ہوتا تھا۔ تو اس وقت مولوی ثناء اللہ صاحب نے بھی تقریر کی۔ اس وقت بھی میں نے ان کے منہ سے سنا اور میں نے سنا ہے کہ اور بھی مقامات پر بانی سلسلہ احمدیہ کے اشعار قرآن کریم کی تعریف میں پڑھتے تھے۔

س: اچھا!

ج: ہاں، بڑی مشہور نظم ہے۔

س: کس کے نام سے وہ اشعار منسوب کیے۔

ج: یہ کہہ کر یہ مرزا صاحب کے ہیں۔ لوگ بھی سارے جانتے ہیں، بڑی مشہور نظم ہے۔ ؎

جمالِ و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

جس وقت خلافت کی تاریخ زوروں پر تھی، کلکتہ میں ایک جلسہ قائم کیا گیا جس کے لیے ہمارے اس وقت کے امام نے ایک تائیدی مضمون لکھا کہ گو ہم ترکی سلطان کو دینی لحاظ سے خلیفۃ المسلمین تو تسلیم نہیں کرتے لیکن ہم انہیں شوکتِ اسلام کا ایک نشان ضرور سمجھتے ہیں۔ اس لیے ترکی حکومت کی تائید اور مضبوطی کے لیے جو بھی اقدام کیا جائے، ہم اس میں پورے طور پر شریک ہونے کو تیار ہیں۔ پہلے اجلاس کے اختتام پر ہمارے چند نوجوان وہ مضمون تقسیم کر رہے تھے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے ایک نوجوان نے جس کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی، وہ مضمون مولوی ثناء اللہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ وہ مضمون امام جماعت احمدیہ کی طرف سے ہے تو انہوں نے تقسیم کرنے والے نوجوان کی طرف نگاہ کر کے اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلیاں رکھ کر اس کی ٹھوڑی کو ذرا اونچا کیا اور نہایت شفقت سے کہا "میاں

یہ چہرہ تو مرزا صاحب کو پسند نہیں تھا، جس سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کے دل میں بانی سلسلہ احمدیہ کا احترام تھا۔

مولوی ثناء اللہ صاحب میں ایک شرافت تھی۔ وہ مخالفت کرتے تھے، شدید مخالف تھے سلسلے کے۔ لیکن دلائل پر۔ ایک دفعہ انہوں نے بھی ایسی بات تھوڑی سی کی۔ انہوں نے کہا، میں تو ایک معمولی خادم اسلام ہوں، مرزا محمود احمد صاحب ایک نبی کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، میں ایک آسان طریق فیصلے کا پیش کرتا ہوں کہ ہم دونوں امرتسر سے کلکتہ میل پر سوار ہو جائیں اور کلکتے تک اکٹھے سفر کریں۔ دوران سفر جس پر پھول برسیں وہ سچا اور جس پر پتھر پڑیں وہ جھوٹا۔ اس کے جواب میں حضرت صاحب نے اعلان فرمایا کہ مولوی صاحب کو کلکتہ تک سفر کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اگر اس اعلان کے بعد ہم اکٹھے سفر کریں تو مولوی صاحب پر پھول برسیں گے۔ اور مجھ پر پتھر پڑیں گے۔ لیکن میں مولوی صاحب سے سوال کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں پھول کس پر پڑتے تھے۔ اور پتھر کس پر برستے تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے بھی ایک دفعہ اسی طرح کیا، انہیں خیال ہوگا کہ ہمارے (اس وقت کے) امام بھی پیروں کی طرح ہیں، انہوں نے خط لکھا کہ میں تو ایک بزرگ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کے مقبرے کا جاروب کش ہوں۔ اور مرزا محمودؔ آپ ایک نبی کے خلیفہ ہونے کے دعویدار ہیں۔ میں فیصلے کی ایک آسان ترکیب پیش کرتا ہوں کہ میں اور آپ دونوں قطب مینار پر چڑھتے ہیں اور وہاں سے چھلانگ لگاتے ہیں، جو بچ رہے وہ سچا، جو مر جائے وہ جھوٹا۔ حضرت صاحب نے لکھا میں تو ایسی بات پر یقین نہیں رکھتا، میں اسے خودکشی سمجھتا ہوں۔ اور خودکشی اسلام میں جائز نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح طریق ہے تو آپ اکیلے چڑھ جائیں۔ چھلانگ لگائیں۔ بچ جائیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ بڑے بزرگ ہیں، ساتھ حضرت صاحب نے لکھا کہ اسلام نے جو طریق مقرر کیا ہے۔ وہ مباہلہ ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ آپ کے لاکھوں مرید ہیں، ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ ہوں۔ اور ایک ہزار میرے ساتھ ہوں۔ میں دعویٰ (بانی سلسلہ کا) اور اس کے دلائل بیان کروں گا۔ آپ اس کی تردید کریں، اس کے بعد دونوں طرف سے جو یہ کہے کہ وہ مباہلے میں شامل نہیں ہونا چاہتا وہ چلا جائے، پھر ہم مباہلے والی دعا جو قرآن کریم میں ہے وہ کریں گے۔ ایک سال انتظار کریں گے۔ جو اللہ تعالیٰ کا فعل صادر ہو۔ ساتھ ہی حضرت صاحب نے اعلان کر دیا کہ اگر خواجہ صاحب مان گئے تو جن لوگوں نے حصہ لینا ہو وہ نام بھیج دیں۔ میں نے بھی اپنا نام بھیجا تھا۔ لیکن یہ مباہلہ نہ ہوا۔

بعد میں خواجہ صاحب کے حضرت صاحب کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ بلایا۔ دعوت بھی کی۔ ہمارے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔

س: مولانا ظفر علی خاںؒ سے تو ملاقات کے خاصے مواقع رہے ہونگے۔
ج: مولانا ظفر علی خاںؒ بڑے جذباتی آدمی تھے۔ جس وقت جو طبیعت میں آتا تھا وہ کہہ دیتے تھے۔ مثلاً احرار کے بڑے مخالف تھے تو ایک دفعہ احرار کے خلاف لکھا: تم ہو کون۔ تمہاری حیثیت کیا ہے۔ تم کرتے ہو مرزا محمود کا مقابلہ۔ تمہارے پاس کیا ہے۔ مرزا محمود کے پاس تو قرآن ہے۔ مرزا محمود کے پاس تو ایک جماعت ہے جو اس پر اپنا تن من دھن قربان کرتی ہے، تمہارے پاس کیا ہے۔

ایک دفعہ مولانا انڈین سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے۔ اور اس وقت اسمبلی میں کچھ اس قسم کی بحث چل پڑی، میں لیڈر آف دی ہاؤس تھا، تو میں نے بعض باتوں کے لیے زیادہ استدلال قرآن کریم سے کیا کہ ان باتوں پر ہمیں اتفاق ہے، باقی پر نہیں، میری تقریر ختم ہوئی تو اپنی سیٹ پر سے اٹھ کے آئے۔ "واللہ آج آپ نے تبلیغ کا پورا حق ادا کر دیا۔"

راجپال کا آپ نے سنا ہوگا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کتاب لکھی تھی۔ حکومت کی طرف سے اس پر فوجداری مقدمہ چلا، اسے قید کی سزا ہوئی لیکن ہائی کورٹ کی نگرانی کی درخواست پر جسٹس دلیپ سنگھ نے یہ قرار دے کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین قانون کی زد میں نہیں آتی، ملزم کو بری کر دیا۔ جسٹس دلیپ سنگھ کے اس فیصلے کے خلاف لاہور سے شائع ہونے والے ایک انگریزی روزنامے "مسلم آؤٹ لک" نے ایک بڑا اہم اداریہ لکھا۔ جس پر ہائی کورٹ نے اخبار کے مالک مولوی نورالحق صاحب اور پرنٹر سید دلاور شاہ صاحب کے نام توہین عدالت کے نوٹس جاری کر دیئے۔ اس پر سر میاں محمد شفیع صاحب کے دفتر میں وکلاء کو بلایا گیا کہ کون بحث کرے۔ تو سب کی رائے تھی کہ سر میاں محمد شفیع صاحب کریں۔ انھوں نے کہا کہ لیڈی شفیع سولن ہیں، مجھے اطلاع آئی ہے کہ ان کی طبیعت علیل ہے۔ تو مجھے لازماً کل سولن جانا ہے۔ پھر رائے ہوئی کہ شیخ عبدالقادر صاحب کریں۔ وہ مولوی نورالحق صاحب کو الگ لے گئے۔ اور انہیں بتایا کہ ان کا گورنر کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لیے اس کیس میں ان کا پیش ہونا مناسب نہیں ہے۔ پھر خیال ہوا کہ کون کرے تو سر محمد شفیع صاحب نے۔ وہ ہمیشہ میرا نام جب لیتے تھے تو میرے والد کا نام لیتے تھے۔ ان کو جانتے تھے۔ میرے والد بھی وکیل تھے۔ اس وقت تک فوت ہو چکے تھے، کہنے لگے، میرے دوست نصراللہ خاں اس کے لیے بہت موزوں ہیں۔ تو ساری نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ میں نے کہا۔ اچھی بات ہے، میں حاضر ہوں۔ جو کچھ ہو سکا کروں گا۔ مالک اخبار اور پرنٹر دونوں کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ معافی نہیں مانگیں گے، جیل میں انہیں چھ مہینے کے لیے بھیجنے کا اختیار ہے، بھیج دیں۔ بحث کے آخر میں میں نے عدالت سے کہا کہ آپ قرار دیں کہ اس اداریے سے اگر متعلقہ جج کی توہین ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی حفاظت

کی سعی میں اگر ہائی کورٹ کے ایک جج کی توہین لازم ہو گئی، تو یہ امر ناگزیر تھا۔ جس کی پوری ذمہ داری مسئول علیہم تسلیم کرتے ہیں۔ جب میں نے بحث ختم کی، پانچوں جج لنچ کے لیے اُٹھے۔ تو مولانا ظفر علی خاںؒ کٹہرے کو ہٹا کر میری طرف بڑھے۔ میرے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اور بلند آواز میں کہا، "آج آپ نے منہ کالا کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں قابل وکیل نہیں۔" تو وقت پر میں مسلمان بھی تھا۔ ان کی طبیعت اس طرح کی تھی۔

مولانا جب بیمار تھے۔ اس وقت میں پاکستان کا فارن منسٹر تھا۔ ان کے پوتے منصور علی خاں مجھے ملنے کے لیے آئے۔ اس وقت ان کے والد مولانا اختر علی خاں قید میں تھے۔ اور کہا میرے دادا (مولانا ظفر علی خاں) کوہ مری میں بیمار ہیں۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ میرے والد (مولانا اختر علی خاں) ان سے ملیں۔ اگر آپ گورنر سے کہہ کر اتنی اجازت لے دیں کہ وہ جا کر مل لیں۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب تھے۔ میں نے ان سے کہا انہوں نے کہا بہت اچھا۔ ان کے ساتھ اس وقت گورمانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہوم منسٹر تھے۔ تھوڑی دیر بعد ملک صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ گورمانی صاحب کہتے ہیں کہ اگر اختر علی خاں کو ایک بار جانے کی اجازت دے دی تو جب تک مولانا (ظفر علی خاں) زندہ ہیں۔ اس وقت تک آپ اختر علی کو واپس نہیں لا سکتے۔ یہ رسک لینا ہو تو کر لیجئے۔ ہوا یا نہ ہوا یہ مجھے یاد ہے کہ منصور علی پھر مجھے ملنے کے لیے آئے اور کہا۔ جب میں نے اپنے دادا سے یہ بات کہی، لیٹے ہوئے تھے۔ اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ اور کہا "مرحبا ظفر اللہ خاں، مرحبا ظفر اللہ خاں، مرحبا ظفر اللہ خاں" مجھے اس لحاظ سے بھی جانتے تھے، کہ میرے ماموں کے سسرال کا ان کے ساتھ کوئی رشتہ تھا۔

س:۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے کبھی ملاقات ہوئی۔

ج:۔ نہیں کبھی نہیں۔

س:۔ شورش کاشمیری سے۔

ج:۔ نہیں۔ انہیں جب فروغ ہوا تو میں جا چکا تھا۔

س:۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا اس روز آپ نے ایک واقعہ سنایا تھا۔

ج:۔ لیکن وہ واقعہ آپ چھاپیں گے نہیں،

س:۔ وہ تو چونکا دینے والا واقعہ ہے،

ج:۔ بیشک،

س:۔ وہ واقعہ تاریخ ہے۔ اسے ریکارڈ پر آنا چاہیئے۔

ج:۔ نہیں، نہیں۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ ہم پھر تشہیر نہیں کرتے۔

س:۔ علامہ اقبالؒ سے آپ کے تعلق کی ابتدا کب ہوئی۔

ج:۔ میں نے ۱۹۰۹ء میں ایف اے کا امتحان گورنمنٹ کالج سے پاس کیا۔ اور بی اے کی

جماعت میں داخل ہوا تو اس وقت گورنمنٹ کالج میں یہ طریق تھا کہ ایک تو انگریزی کے پروفیسر اس وقت پرنسپل صاحب بھی تھے۔ سیموئیل ہرالبن اور ہسٹری کے جو پروفیسر تھے۔ وہ بھی انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ اور فلاسفی کے پروفیسر جی ایس بریٹ علاوہ اپنے مضمون فلسفہ کے انگریزی بھی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن انہی دنوں ٹورنٹو یونیورسٹی میں پروفیسری مل جانے کے باعث وہ وہاں چلے گئے۔ اس وقت کالج میں کوئی صاحب ان کی صفات والے موجود نہیں تھے۔ جو بیک وقت فلاسفی اور انگریزی کے پروفیسر ہوتے۔ ڈاکٹر اقبال بیرسٹری کرکے اور فلسفے کی بڑی بڑی سندیں حاصل کرکے یورپ سے واپس آچکے تھے۔ ان کے ساتھ یہ انتظام ہوا کہ وہ اپنی پریکٹس جاری رکھتے ہوئے بریٹ صاحب کی جگہ فلاسفی اور انگریزی پڑھایا کریں گے۔ تو دو سال کے عرصے میں ۱۹۰۹ سے لیکر ۱۹۱۱ تک میری جو بی اے کی جماعت تھی۔ اس کو انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ فلاسفی میرا مضمون نہیں تھا۔ اس لیے فلاسفی میں مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں اس وقت کا میرا تاثر اب تک قائم ہے۔ اور بعد میں جب میں بھی بیرسٹر ہوگیا اور پریکٹس میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ جس بات کو لیتے تھے۔ آپ اس میں تیاری بڑی محنت سے کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں پڑھایا بھی بڑی خوبی کے ساتھ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شیلے کی وہ پوئم بڑی مشکل سمجھی جاتی تھی۔ غالباً ADONAIS تھی۔ وہ ہمیں پڑھائی، بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھادی۔ ہمارے لیے بڑی آسان ہوگئی۔ تو دو سال تک مجھے ڈاکٹر صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔ اس لیے اس کو ملاقات تو کہہ نہیں سکتے۔ جماعت میں میں بھی ایک طالب علم تھا۔ اس وقت ذاتی معاملات کا ان کے ساتھ کوئی موقع نہیں ہوا۔

میں پڑھائی کے لیے سن گیارہ (۱۹۱۱ء) میں انگلستان چلا گیا۔ اور چودہ (۱۹۱۴ء) میں واپس آگیا۔ اور پندرہ کے شروع میں میں نے سیالکوٹ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ پریکٹس شروع کردی۔ اور سن سولہ کے اگست کے آخر میں لاہور آگیا۔ اور آہستہ آہستہ پھر میری پریکٹس جب ہائی کورٹ میں بڑھنی شروع ہوئی۔ اس وقت تو چیف کورٹ تھا۔ اس وقت مواقع ہوتے رہے۔ پھر مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا اور مقابلے پر بھی موقع ملا۔ دونوں حیثیتوں میں میں نے دیکھا کہ وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ اور یہ میرا پختہ یقین ہے۔ اور اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر یہ اپنی پریکٹس کی طرف پوری توجہ دیں تو بہت جلد ہائی کورٹ کے جج ہوجائیں۔ لیکن ان کی طبیعت میں قناعت بہت تھی۔ منشی طاہر دین ان کے منشی تھے۔ بعد میں جنہوں نے دل روز کے نام سے ایک دوائی بنانا بھی شروع کی تھی۔ جب میری پریکٹس ورکیٹس کچھ بڑھنی شروع ہوئی تو بعض دفعہ وہ میرے پاس کیس لے آتے تھے۔ میں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب نے کیوں نہیں لیا۔ وہ بتلاتے۔ ڈاکٹر صاحب



دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء)
چودہری ظفر اللہ خاں اور علامہ اقبالؒ بکنگھم پیلس (لندن) میں ایک پارٹی میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔

کہتے ہیں۔ اس مہینے میں اور کام نہیں لوں گا۔ یعنی شروع مہینے جب کوئی تین چار مقدمات آ جاتے تو ظاہر دین سے کہتے۔ میں نے اس مہینے میں کوئی اور کام نہیں لینا۔ یہ بھی بڑی ہمت کی بات ہے ہر شخص کے لیے آسان نہیں۔ یوں تو جس کا پیشہ وکالت ہو وہ تو پیچھے بھاگتا ہے۔ کہ اس کو کہیں سے کچھ مل جائے۔

پھر بار روم میں گفتگو وغیرہ کے کئی مواقع ہوتے تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے۔ انہوں نے ایک بار کہا چودھری صاحب اب مریخ تک پہنچنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ تو مجھے بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ اگر وہاں ایسی مخلوق پائی گئی جو انسانوں جیسے اعضا اور قویٰ رکھتی ہو تو پھر ختم نبوت کا کیا ہو گا۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کر کے بھیجا تھا وہ خوب جانتا ہے کہ کہاں کہاں ضرورت ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ جو اس کے علم میں ہے۔ وہ کر دے گا۔ آپ کو اور مجھ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر والہانہ طور پر ڈاکٹر صاحب کو عقیدت اور محبت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر اکثر وہ آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ طبیعت کے بڑے خاکسار تھے۔ کوئی تفاخر وغیرہ نہیں تھا۔ اور قناعت کا میں نے ذکر کر ہی دیا۔ یہ بڑی تین خوبیاں ان میں تھیں۔ لیکن جسمانی طور پر پرلے درجے کے سست تھے۔ اگر بغیر ہلنے کے کوئی کام ہو سکے تو ذرا سی حرکت سے بھی پرہیز کریں گے۔ لباس میں بھی مجبوری سے جب باہر جانا ہوتا تو سوٹ ساٹ پہن لیتے تھے۔ گھر پر بڑا سادہ لباس رکھتے تھے۔ ایک تہبند اور ایک بنیان۔ عام طور پر اسی میں گزارا کرتے تھے۔

س :۔ پنجاب پراونشل کونسل (اسمبلی) کے ممبر بھی تھے۔

ج :۔ ہاں کونسل کے ممبر تھے تو میاں فضل حسین پانچ سال وزیر رہ کر صوبے کی حکومت میں ہی ایگزیکٹو ممبر بن چکے تھے۔ پھر بھی یونینسٹ پارٹی کے عملاً لیڈر وہی تھے۔ اگرچہ کونسل کے لحاظ سے تو سر چھوٹو رام لیڈر تھے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ میاں صاحب بھی ہر بات پر بڑی تفصیلی نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جب سن چھبیس کے الیکشن ہوئے۔ میں بھی منتخب ہو گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی ہو گئے۔ تو ہماری نشستیں میاں صاحب نے مقرر کیں تو میری نشست رکھی مولوی رحیم بخش صاحب اور علامہ ڈاکٹر اقبالؒ صاحب کے درمیان۔ اور مجھے کہا کہ ان دونوں صاحبان کی حاضری، موجودگی اور جس طور پر ووٹ دینا ہو۔ اس کے تم ذمہ دار ہو۔ مولوی سر رحیم بخش صاحب کے سلسلے میں مجھے کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ شروع میں آکر تشریف رکھتے تھے۔ صرف نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کے جاتے تھے۔ باقی سارا وقت موجود رہتے۔ ڈاکٹر صاحب اول تو آتے ہی گھنٹہ دیر سے تھے۔ وہ تو کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ وہ گھنٹہ سوال جواب کا ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کبھی آدھ گھنٹہ، کبھی گھنٹہ، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھتے تھے۔ اور کہتے۔ چودھری صاحب میری طبیعت یوں

ہے۔ میں جاتا ہوں۔ میں بعض دفعہ کہتا، ڈاکٹر صاحب اس معاملے پر بحث ختم ہونے والی ہے۔ ابھی اس پر رائے شماری ہوگی، آپ کی ضرورت ہوگی۔ فرماتے "ایک میری رائے سے کیا فرق پڑ جائے گا" چلے جاتے۔ دوسرے دن پوچھتے اُس معاملے میں کیا ہوا میں بتایا وہ تو ہو گیا، کہتے "میں نے کہا نہیں تھا کہ میری ایک رائے سے کیا فرق پڑے گا۔" اور اس کی دراصل وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو دماغ دیا ہوا تھا۔ وہ فلسفے اور شاعری کی بلندیوں کے لیے ہی موزوں تھا۔

س :۔ گول میز کانفرنس میں بھی آپ ان کے ساتھ تھے۔

ج :۔ دوسری گول میز کانفرنس میں وہ میرے ساتھ تھے۔ لندن میں ان سے ملنے کے لیے جو طالب علم آجاتے۔ جو تقریب وغیرہ وہ کرتے۔ اس میں کام وام کرتے رہے۔ لیکن کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ پھر تیسری کانفرنس میں گورنمنٹ انہیں بھیج نہیں رہی تھی۔ نہ قائداعظمؒ صاحب کو نہ انہیں۔ قائداعظمؒ پہلی دو کانفرنسوں میں شریک تھے۔ پہلی کانفرنس میں میں پنجاب سے بھیجا گیا تھا۔ قائداعظمؒ مسلمان وفد کے ممتاز رکن تھے۔ ان کے علاوہ سر آغا خان سر محمد شفیع، سر سلطان احمد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے علاوہ دوسرے صوبوں کے بھی بہت سے سرکردہ مسلمان تھے۔ اچھی بات،

تیسری گول میز کانفرنس کے لیے جب ڈاکٹر صاحب کا نام گیا تو وائسرائے نے مجھے بتایا، کہ پچھلی کانفرنس میں انہوں نے کوئی کنٹری بیوشن نہیں کی۔ نہ دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دلچسپی تو وہ اب بھی نہیں لیں گے۔ نہ میں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ وہ تقریر کریں گے۔ لارڈ ولنگڈن میرے ساتھ بے تکلف تھے۔ انہوں نے کہا۔

MY DEAR THEN WHY DO YOU INSIST.

میں نے کہا میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان طبقے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا احترام ہے۔ اگر یہ چلے جائیں تو وہ سمجھیں گے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی کام کی بات ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جو گئے ہوئے ہیں۔ میں تو اس پریسٹیج کے لیے چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تار میں لکھ دیا ہوگا۔ کیونکہ سیکرٹری آف سٹیٹ مان گئے۔ میں اس وقت میاں صاحب کی جگہ عارضی طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تھا۔ ورنہ تو میرا کوئی واسطہ ان باتوں سے نہ ہوتا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا کہ اگر طے ہو گیا ہو کہ میں نے ہی جانا ہے۔ مجھے پہلے ہی اطلاع کر دینا۔ کیونکہ مجھے بڈاپسٹ سے وہاں کی یونیورسٹی یا کسی اور ادارے کا انہوں نے نام لیا، وہاں سے تقریر کرنے کی دعوت آئی ہوئی ہے۔ تو پھر میں قبول کر لوں گا۔ وہ کام بھی کرتے چلیں گے۔ میں نے کہا اچھی بات۔ جب ان کا جانا طے ہو گیا پیشتر اس کے کہ نام شائع ہوں، میں نے سید امجد علی صاحب سے کہہ دیا، شائد میں نے خود بھی عرض کر

دیا ہو کہ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیں کہ تیار ہو جائیں اور تم ساتھ جاؤ۔ ڈاکٹر صاحب پتہ نہیں اکیلے سفر کریں کہ نہ کریں۔ تم ساتھ جاؤ اور ان کو بڈاپیسٹ بھی لے جانا۔ وہاں سے پھر لندن آجانا۔ انہوں نے کہا اچھی بات۔ چنانچہ انہوں نے انتظام بھی یہی کیا کہ وہ وینس جا کے جہاز سے اُتریں گے۔

میں جب لندن پہنچا تو سید امجد علی صاحب مجھے سٹیشن پر ملے اور کہا ابھی چلو ڈاکٹر صاحب کے پاس۔ میں نے کہا کیوں۔ جلدی کیوں ہے۔ انہوں نے کہا "ڈاکٹر صاحب کو یہاں (ناک کے اندر) ایک پھنسی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کسی ہندوستانی ڈاکٹر کا انتظام کرنا تھا۔ انہوں نے کہا وہ تو دو تین ہر وقت پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نوک نشتر سے ذرا سا چھید کر کے پٹی لگا دیں گے۔ چند گھنٹوں میں آرام آ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ نہیں نہیں چھید نہیں کرنے دوں گا۔ اور آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو بلاؤ۔ میں نے کہا۔ بھئی دیکھو میں مارسیلز سے ۲۴ گھنٹے ریل کا سفر کر کے آ رہا ہوں۔ سخت تھکا ہوا ہوں۔ میں کل صبح ہی صبح سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ انہوں نے کہا اچھی بات ہے، میں کہہ دوں گا۔

اگلی صبح میں پہنچا کوئین اینز مینشن میں ان کا اپارٹمنٹ تھا۔ کمرہ اتنا گرم رکھا ہوا کہ قریب قریب BOILING POINT (نقطۂ ابال) پر، اور خود رات کا لباس جیکٹ اور پاجامہ سوٹ پہنے ہوئے پلنگ کے اُوپر یعنی بستر کے کپڑوں کے اندر نہیں بلکہ ان کے اُوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں داخل ہوا تو کہا "چودہری صاحب آپ آ گئے ہیں۔ آیئے آیئے، میری واپسی کا انتظام کر دیں۔" میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب یہ تو کوئی ایسی بڑی مشکل کی بات نہیں، اس میں ذرا سا چھید کرا لیں۔ انہوں نے کہا، بس وہی آپ نے بات کر دی۔ یہاں مر جاؤں تو میرا تو کوئی جنازہ بھی پڑھنے والا نہیں ہو گا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ان کے پاس ایک یا دو ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ ان ڈاکٹروں نے کہا۔ انہیں یوں بھی ایک دو دن میں آرام آ جائے گا۔ لگا دی ہے پٹی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا ابھی تو آپ آئے ہیں، اس لیے آپ کی واپسی کا انتظام نہیں ہونا چاہیئے۔ اس پر فرمایا۔ اچھا پھر تار دے دیں مختار کو کہ میری بیوی کو لے کے آ جائے۔ مختار (شیخ اعجاز صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں یعنی ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہاں سے تار جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ آئیں۔ آپ کی بیوی بیچاری پردہ نشین ہے۔ اس کی طبیعت پر کیا گزرے گی۔ آپ کیوں اتنا گھبراتے ہیں۔ ایک دو دن میں آرام آ جائے گا۔ تو خیر پھر رُک گئے۔ پھر بدقسمتی سے ان کو ملیریا ہو گیا۔ ملیریا تو کئیوں کو ہو جاتا ہے۔ خیر کانفرنس کی کارروائی شروع ہونے تک یا اس کے ایک دو دن بعد آرام آ گیا۔ غالباً اسی کانفرنس سے واپسی پر مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ سپین بھی گئے تھے اور قرطبہ کی مسجد میں نماز بھی پڑھی تھی۔

س:۔ آپ کی باتوں سے۔ یہ بات صحیح ثابت ہوئی جو انہوں نے اپنے متعلق کہی تھی۔ کہ گفتار کا

غازی بن گیا۔ لیکن کردار کا غازی بن نہ سکا۔

ج:۔ یہ ان کا اپنا ESTIMATE (اندازہ) تھا۔ وہ جانیں۔

س:۔ علامہ صاحب کے نوجوانوں میں پاپولر ہونے کی کیا وجہ تھی۔

ج:۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو استعدادیں اور قابلیتیں دی ہوئی تھیں۔ بڑی اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ اور اس وقت تک ان کے کلام کی برابری ہمارے ملک میں تو پیدا نہیں ہو سکی۔ ان کے اشعار کی جہاں ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے بھی تھوڑے بہت یاد ہیں۔ وقت پر وہی کام آجاتے ہیں۔ ان کا بہترین کلام فارسی میں ہے۔ اور باقی یہ ہے کہ وہ جرأت کر لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے بھی وہ شکوہ کر لیتے تھے۔

ایسی شاعری اقبال جیسا شاعر ہی کر سکتا ہے۔ دوسرا کوئی کرتا تو کفر کے فتوے لگ جاتے دھڑا دھڑ۔

س:۔ کفر کے فتوے تو ان پر بھی لگے۔

ج:۔ ہاں۔

س:۔ اور یہ رقص و سرود اور مے نوشی۔

ج:۔ شاعروں کے استعاروں یا تشبیہوں پر تو کوئی اعتراض ہو نہیں سکتا، سارے شاعر ان سے کام لیتے ہیں۔

س:۔ عملاً۔

ج:۔ باقی عملاً۔ یہ میری مجال نہیں کہ میں ان پر تنقید کروں۔ میرے اُستاد بھی تھے۔ اور اعلیٰ پایے کے انسان تھے۔ میں کون ہوں۔

س:۔ جب وہ آپ کے ساتھ انگلستان گئے۔

ج:۔ انگلستان میں جب تھے میری موجودگی میں کوئی نہ لفظ ان کے مُنہ سے نہ کوئی حرکت ان سے سرزد ہوئی۔ جس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہو۔

س:۔ کوئی مے نوشی والی یا دوسری۔

ج:۔ ناں، کوئی نہیں۔

س:۔ آخری عمر میں بھی مُلاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ج:۔ مُلاقات کا موقعہ ہوتا ہی رہا۔ ہوتی رہتی تھیں۔

س:۔ کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔

ج:۔ میں کوئی یاد کرنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔ میں اگلے سوال کے انتظار میں ہوں۔ ہاں ایک واقعہ وہ تو خیر ان کی وفات سے کوئی پندرہ سولہ سال قبل کا ہے۔ ابھی وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں تھے۔ غالباً سن بائیس کا واقعہ ہے۔ حضرت صاحب لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ نسبت روڈ پر دیال سنگھ کالج سے متعلق کوٹھی

ہوا کرتی تھی۔ کرسی اس کی اونچی تھی۔ وہاں تو اب نئی عمارتیں بن گئی ہوں گی۔ تو حضرت صاحب کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں۔ گردے کا درد تھا۔ وہ ہوتا بڑا ظالم ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو ناک کی پھنسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی طبیعت ہی ایسی تھی۔ ڈاکٹر سے بہت گھبراتے تھے۔ حضرت صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کی عیادت کے لیے چلیں گے۔ میں نے کہا اچھی بات ہے۔ چودھری بشیر احمد جا کے پہلے پوچھ آئے تھے کہ حضرت صاحب آپ کی تیمارداری کے لیے آ رہے ہیں۔ جب ہم گئے تو ڈاکٹر صاحب بستر پر اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ حضرت صاحب بیٹھ گئے۔ مزاج پرسی کی۔ یہ بات مجھے یاد ہے۔ بار بار یہی کہتے تھے۔ مرزا صاحب میرے لیے دعا کرنا۔ مرزا صاحب میرے لیے دعا کرنا۔ مرزا صاحب میرے لیے دعا کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب تو احمدی تھے۔

س:۔ علامہ صاحب بھی کسی زمانے میں رہے؟

ج: نہیں۔

س:۔ ایک کتابچہ ان کا لکھا ہوا ہے آپ کے عقیدے کے متعلق "ٹریبیٹرز آف اسلام" انگریزی زبان میں۔

ج:۔ آخر میں ان پر زیادہ اثر ان کے حاشیہ نشینوں کا ہو گیا تھا۔ جن میں زیادہ ان کے پاس بیٹھنے والے اور انہیں ان امور پر اکسانے والے تھے۔ چودھری محمد حسین پہاڑ نگی۔ پہاڑ ننگ ضلع سیالکوٹ میں ایک گاؤں ہے وہاں کے تھے۔ بعد میں شاید پریس برانچ کے انچارج ہو گئے۔ ان کے تعلقات والوں میں سے تھے۔ وہ اس سلسلے کے بڑے سخت مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ایک دو اور آدمی بھی تھے۔ لیکن شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب کی بانی سلسلہ اور جماعت کے متعلق رائے بڑی اچھی تھی۔ شاید علی گڑھ میں تقریر کی تھی کہ اس زمانے میں اگر ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ دیکھنا ہو تو احمدیہ جماعت کو دیکھو۔ سعد اللہ لدھیانوی بانی سلسلہ کے سخت مخالف تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے نظم لکھی، اسے CONDEMN کیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کالج میں پڑھتے تھے۔

س:۔ جن سر سلطان احمد کا آپ نے پہلی گول میز کانفرنس کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ یہ وہی ہیں، چنائے۔

ج:۔ یہ وہ نہیں، سلطان چنائے تو بمبئی کے تھے۔ جبکہ سر سلطان احمد بہار کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کا سیکرٹری بتایا کرتا تھا کہ سلطان احمد صاحب کی یہ شرط ہوتی تھی۔ کہ میں کھانے پر تب بیٹھوں گا، جب میز پر ہو۔ اگر دو تین جگہیں خالی ہوتیں، تو مجھے سڑک پر جا کر کسی راہگیر کو لانا پڑتا، کہ آؤ بھئی، آپ کو کھانا کھلائیں۔ کم سے کم چالیس افراد کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔

س:۔ چودھری صاحب، آپ کی سوانح عمری پڑھ کر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نہرو اور گاندھی قلابازیاں بہت کھاتے تھے۔ جھوٹ بہت بولتے تھے۔

ح :۔ بیشک چھوٹے تھے ۔لیکن دینوی لحاظ سے ان کی عظمت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ۔ آخروہ کوئی دینی پیشوا تو نہیں تھے ۔گاندھی کلم کلاّ نے ننگم ننگا ، جیسا کہ چرچل انہیں نیم برہنہ فقیر کہا کرتے تھے ۔ اپنے زمانے کی سب سے طاقتور حکومت کا مقابلہ کرتے رہے ۔اور اس میں کامیاب ہوئے ۔یہ ٹھیک ہے جیسا کہ میں نے بتایا ہے ۔ کہ ظاہری اسباب اور ہوتے ہیں ۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی منشا بھی یہی تھی کہ آزادی کا انتظام ہوجائے ۔لیکن جہاں تک انسان کی کوشش ہے ۔ ایک ننگا فقیر اپنے وقت کی طاقتور حکومت کی مخالفت کرتا رہا اور جیت گیا ۔ اس بات سے تو انکار نہیں ہوسکتا ۔ HE WAS A GREAT MAN. باقی یہ کہ گاندھی بات اس قسم کی کرجاتے تھے ۔پلٹا جانتے تھے ۔ یہ کرتے تھے ، وہ کرتے تھے ، اور ہتھیار ان کے پاس تھا گیا ، چنانچہ ایک دفعہ ہمارے لوگوں میں سادہ لوح بڑے ہوتے ہیں ۔ ایک دفعہ گاندھی نے کہا کہ میں مسلمانوں کے سارے مطالبات ماننے کے لیے تیار ہوں ۔بشرطیکہ یہ سودیشی قلم کے ساتھ لکھ دیں ۔ راجہ شبیر محمد نے کہا جی فیصلہ ہوگیا ۔ ہم سودیشی قلم کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ۔ میں نے کہا بھلے مانس قلم سے مراد وہ قلم نہیں ، اس کا مطلب ہے ۔ وہ قلم ہو جس میں ہندوستان کے حقوق وغیرہ کا ذکر ہو ۔

میں نے سن اڑتیس (۱۹۳۸ء) کے آخر میں اپنی والدہ پر چھوٹی سی کتاب لکھی تھی "میری والدہ" مجھے سروجنی نائیڈو نے کہا ۔میں نے وہ پڑھی ہے اور مکی ماؤس (MICKEY MOUSE) کو پڑھنے کے واسطے دی تھی ، وہ گاندھی کو مکی ماؤس کہا کرتی تھیں ۔ اور کہا مکی ماؤس نے وہ بڑی پسند کی ہے ، آپ انہیں ایک کاپی بھیج دیں ۔ میں نے بھیج دی ۔ اس کا انہوں نے شکریہ کا خط لکھا ، اپنے ہاتھ سے ۔ دو چار سطریں ہی ہیں ، اردو میں ، اس وقت وہ اردو سیکھ رہے تھے ۔

اسی طرح نہرو ، وہ ایک بڑے ملک کے وزیراعظم تھے ۔کرجایا کرتے تھے ۔بات میرا ایک امریکی خاندان کے ساتھ بڑا دوستانہ ہوگیا ۔ اب تک ہے ۔ ان کی بیٹی ایمی اس وقت چھوٹی تھی ۔میں ان کے ہاں گیا ہوا تھا ۔ ایک روز اس نے کہا ، میری ایک امریکی ہم جماعت نے کہا ہے کہ تمہارے دوست ، فارن منسٹر آف پاکستان کے متعلق نہرو نے کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے ۔ ایمی کہتی ہے کہ میں نے کہا ، ہوسکتا ہے ، نہرو جھوٹ بول رہا ہو کہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے جھوٹ بولا ہے ۔

وہ بات یہ تھی کہ کشمیر پر بحث کے دوران فروری ۱۹۴۸ء میں میں نے کہا کہ ہماری ریگولر فوج وہاں نہیں لڑ رہی ، ہندوستان والوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کا اثر وغیرہ ڈلوا کے ریزولیوشن رکوالیا ۔ اور ہندوستان نے ارادہ کر رکھا تھا کہ یو این او میں تو بات روک لی ہے ، ہم کشمیر پر جتنا قبضہ کرسکتے ہیں کرلینا چاہیئے ۔ مجھے اس بات کا پختہ خیال ہوگیا کہ کشمیر کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا ، کشمیر میں ہوگا ۔ میں نے نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو تار دیا بلکہ چودھری

محمد علی صاحب بڑا ڈر رہے تھے کہ بات باہر نکل جائے گی۔ میں نے کہا بیشک نکل جائے۔ لیکن یہ موقع ایسا ہے اس پر ہمیں احتیاط کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے وہ تار دیا کہ کشمیر کے معاملہ کا اقوام متحدہ میں نہیں کشمیر میں فیصلہ ہوگا۔

اس واسطے اگر وہ فوجی تیاری کر رہے ہیں اور انہیں رو کنے کے لیے ہمیں اپنی فوج بھیجنی پڑے تو بھیج دینی چاہیئے۔ اس وقت تھا اپریل کا اخیر یا مئی کا شروع جب ہماری ریگولر فوج کشمیر کے محاذ پر چلی گئی۔ نہرو نے بعد میں کہا کہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے وہاں یونائیٹڈ نیشنز میں تو کہا تھا کہ ہماری فوج نہیں لڑ رہی اور ہمیں مئی کے شروع میں ثبوت مل گیا تھا کہ لڑ رہی ہے۔ نہرو نے بلنگڑا پایا ناں۔ میں نے تو فروری میں کہا تھا کہ ہماری فوج نہیں لڑ رہی۔ جبکہ انہوں نے مئی کے شروع کی بات کی۔ میں نے تو خود اپنے وزیر اعظم سے کہا تھا کہ ہمیں وہاں ریگولر آرمی بھیج دینی چاہیئے۔ نہرو نے یہ کہنا شروع کیا کہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے بین الاقوامی حلقوں میں میرا منہ کالا کر دیا ہے۔

میں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ان کا منہ کالا ہوا ہے تو ان کی اپنی کرتوتوں سے کالا ہوا ہے۔ انہوں نے اس امر کا تہیہ کر لیا تھا کہ کشمیر میں استصواب رائے نہیں ہونے دیں گے۔ زبانی کہے جاتے تھے۔ لیکن عملاً الٹے چلتے تھے۔ کرشنا مینن اس کے یونائیٹڈ نیشنز میں نمائندہ تھے۔ اس نے میری موجودگی میں کہا کہ میرے وزیر اعظم نے کشمیر کے تعلق میں کبھی استصواب رائے کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔

میری جواب دینے کی باری آئی تو میں نے سیکورٹی کونسل کے ریکارڈ سے دس مثالیں دیں، جس میں انہوں نے کشمیر میں استصواب رائے کی آمادگی ظاہر کی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ اس ریکارڈ کی روشنی میں ہندوستان کے فاضل نمائندہ اس بات کے قائل ہو گئے ہوں گے کہ ان کے وزیر اعظم نے کم از کم دس مرتبہ تو استصواب رائے کے الفاظ استعمال کیے ہیں، کہا تو انہوں نے اس سے بھی زیادہ تھا۔

جب میں نے یہ کہا تو کرشنا مینن نے کہا کہ میں پھر دہراتا ہوں کہ میرے پرائم منسٹر نے نہیں کہا۔

س :۔ ان کے مقابلے میں قائد اعظم رح نے تو سچائی کی دھاک بٹھا دی۔

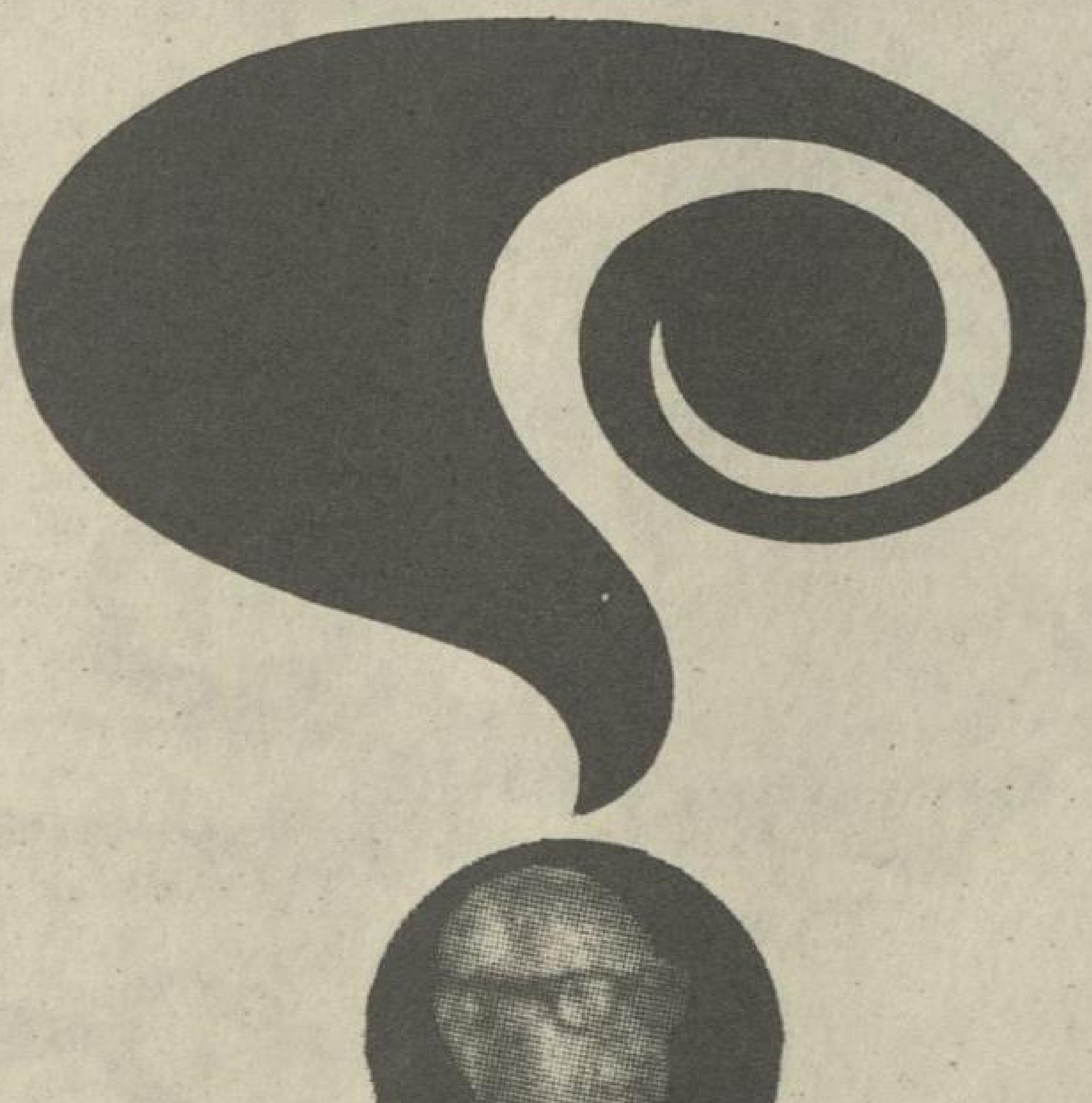
ج :۔ ہاں ٹھیک ہے۔

HE WAS A SOUL OF INTEGRITY IN EVERY INCH.

(وہ مجسم دیانت تھے)

جس چیز کو یا موقف کو وہ صحیح سمجھتے ہوں کوئی بات، کوئی لالچ کوئی حرص کوئی غرض اس پر سے انہیں ہٹا نہیں سکتی تھی۔ اس وقت کے باقی لیڈروں میں تو یہ بات نہ تھی اور یہی زیادہ ان کی کامیابی کا راز تھا۔

(مئی ۱۹۸۱ء)



سردار عبدالحمید خاں دستی سے انٹرویو



پنجاب ریڈکراس کے عہدیدار اور مجلس انتظامیہ:

۱۲ نومبر ۱۹۵۲ء

بشیر احمد، بیگم الٰہی بخش، بیگم جی اے خاں، بیگم الماس دولتانہ (نائب صدر) آئی آئی چندریگر (گورنر پنجاب) عبدالحمید خاں دستی (صدر ریڈکراس) بیگم زینت فدا حسن، میجر جنرل اعظم خاں اور مسٹر گبن۔

سوانحی خاکہ

میری تاریخ پیدائش متنازعہ ہے۔میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ پر ۱۸۹۱ کا سن ہے والد صاحب کی ڈائری میں ۱۸۹۱ء کو کاٹ کر ۱۸۹۲ء لکھا ہے۔ بائیوگرافیکل انسائیکلو پیڈیا والوں نے ۱۸۹۴ء لکھی ہے۔میں بہرحال ۱۸۹۲ء ہی گنتا ہوں۔تاریخ اور مہینہ کا کوئی مستند ریکارڈ میرے پاس نہیں۔

ہم جدی پشتی ضلع مظفر گڑھ کے موضع دستی والا کے رہنے والے ہیں۔جن دنوں میں مغربی پاکستان میں منسٹر تھا۔بلوچستان کی ریاست مکران کے والی بھائی خاں مجھے کہا کرتے تھے۔ ایک طرح سے میں آپ کی رعایا ہوں۔اور ایک طرح سے آپ میری رعایا ہیں۔میں آپ کی رعایا یوں ہوں کہ آپ منسٹر ہیں اور میں عام آدمی ہوں۔اور میری رعایا آپ اس طرح ہیں کہ میری ریاست میں ایک علاقہ دشت ہے۔اس علاقے کے رہنے والے دشتی کہلاتے ہیں۔آپ کے وڈیرے (آباؤاجداد) یقیناً وہیں سے آئے ہیں اور دشتی سے دستی ہو گئے۔

میرے والد مرحوم اللہ یار چونکہ سول سروس میں تھے۔اس لیے میری پیدائش گورداسپور میں ہوئی۔وہ ان دنوں وہاں تھے۔

بی اے میں نے ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ویسے اس دوران ایک سال میں اسلامیہ کالج میں بھی رہا۔ زیادہ عرصہ گورنمنٹ کالج میں رہا۔چودھری ظفر اللہ خاں صاحب مجھ سے سینئر تھے۔ان کے ساتھ تب سے یاد اللہ ہے

ایل ایل بی ۱۹۱۹ء میں لاء کالج لاہور سے کیا۔اور گورداسپور میں پریکٹس شروع کردی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں میں مظفر گڑھ آیا۔کیونکہ اباجی کی پنشن ہو چکی تھی۔انہوں نے فرمایا۔میں تو گورداسپور نوکری کے سلسلے میں تھا۔اور آپ نے وہاں ہستی ہی کرلی ہے۔اگر آپ نے ہستی کرنی ہے تو گھر میں کیوں نہیں کرتے۔چنانچہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے بعد میں مظفر گڑھ آگیا۔

مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر اور وائس چیئرمین منتخب ہوتا رہا۔اس دوران انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور اس کا صدر رہا۔ ڈسٹرکٹ نیشنل وار فرنٹ کا پریذیڈنٹ ہوا۔مسلم لیگ کی تحریک

شروع ہوئی تو مظفر گڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں حصہ لیا۔ میرے مخالف احرار کی طرف سے نوابزادہ نصر اللہ خاں اور پنجاب کی حکمران یونینسٹ پارٹی کی طرف سے فضل کریم قریشی امیدوار تھے۔ میں کامیاب رہا۔

پاکستان بنا۔ پنجاب کے وزیرِ اعظم نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ تھے۔ میاں افتخار الدین ان کے وزیر مہاجرین تھے۔ مجھے انہوں نے اپنا پارلیمانی سیکرٹری مقرر کیا۔ بعد میں میں ممدوٹ کابینہ میں وزیر رہا۔ میرے پاس متعدد محکمے رہے۔ حتیٰ کہ وزیرِ اعظم (پنجاب) نے لا اینڈ آرڈر کا محکمہ بھی مجھے دیدیا۔ زراعت اور صحت بھی میرے پاس تھے۔ شیخ کرامت علی مستعفی ہوئے تو تعلیم کا محکمہ بھی مجھے مل گیا۔ پھر میں دولتانہ وزارت میں تعلیم و صحت کا وزیر رہا (۵ر اپریل ۱۹۵۱ء تا ۳ر اپریل ۱۹۵۳ء)۔ ملک فیروز خاں نون پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ ہوئے تو میں ان کی کابینہ کا بھی رکن رہا۔ (۱۳ر اپریل ۱۹۵۳ء تا ۲۱ر مئی ۱۹۵۵ء) میرے پاس ایگریکلچر، پاپولیشن اور لوکل باڈیز کے محکمے تھے۔ بلکہ گزٹ آگیا کہ وزیرِ اعلیٰ کی غیر موجودگی میں میں وزیرِ اعلیٰ ہوں گا۔ نون صاحب تن آسان تھے۔ امیر آدمی جو تھے۔ امیر آدمی اور نواب لوگ بالعموم تن آسان ہوتے ہیں۔ جس وقت مسلیں اکٹھی ہو جاتیں تھیں تو کراچی چلے جاتے تھے۔ راتیں جاگ کر مجھے مسلیں نکالنا پڑتی تھیں۔

فیروز خاں نون کے بعد میں پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ رہا۔ (۲۱ مئی ۱۹۵۵ء تا ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۵ء)

ون یونٹ بنا تو مغربی پاکستان کے پہلے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ہوئے (۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء تا ۱۶ر جولائی ۱۹۵۷ء) میں ان کی کابینہ میں وزیرِ تعلیم تھا۔ ان کے بعد سردار عبدالرشید مغربی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ ہوئے میں ان کی کابینہ میں بھی وزیرِ تعلیم تھا (۱۶ جولائی ۱۹۵۷ء تا ۱۸ر مارچ ۱۹۵۸ء) ۱۸ر مارچ ۱۹۵۸ء سے مظفر علی قزلباش وزیرِ اعلیٰ ہوئے۔ میں بدستور وزیرِ تعلیم تھا کہ ۷ اور ۸ر اکتوبر ۵۸ء کی درمیانی شب کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے مارشل لاء لگا کے ملک سے سیاست کی بساط ہی لپیٹ دی۔

■■



س :۔ میرا خیال ہے، آپ اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی ایام سے شروع ہو جائیں، وہ یقیناً معلوماتی ہوں گے، اور دلچسپ بھی۔

ج :۔ میں ۱۹۲۰ء میں لاء کر کے اپنے آبائی ضلع مظفر گڑھ پہنچا تو وہاں ۲۳ وکیلوں میں سے صرف تین مسلمان تھے، حکیم محمد شریف لاہور کے رہنے والے تھے، مختار سے وکیل ہوئے تھے۔ دوسرے شیخ دوست محمد، وہ بیرسٹر تھے، تیسرے مولوی غلام محمد بی اے ایل ایل بی۔ مولوی صاحب بڑے نیک، کم گو اور قابل آدمی تھے۔

مظفر گڑھ میں اس وقت تین بڑے خاندان تھے۔ ایک تو نواب سیف اللہ خاں کا۔ نواب صاحب انتہائی نیک، انتہائی نیک دل، انتہائی شریف اور دیانتدار آدمی تھے۔ فسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ فسٹ کلاس آنریری سب جج بھی تھے۔ ان کا بڑا لڑکا نواب زادہ عبداللہ خاں سیکنڈ کلاس آنریری مجسٹریٹ تھا۔ یہ خاندان مظفر گڑھ میں نمبر وَن تھا۔ ان میں مثنوی مولانا روم سے اُوپر کوئی نہیں پڑھا تھا۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں انہی نواب سیف اللہ خاں کے صاحبزادے ہیں۔ عبداللہ خاں اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ کوٹ ادّو کی تحصیل میں گورمانیوں کا گھرانہ تھا۔ نواب مشتاق احمد گورمانی کے والد آنریری مجسٹریٹ تھے۔ وہ بھی مثنوی مولانا روم سے آگے نہیں گئے۔ خود مشتاق احمد گورمانی میٹرک فیل تھے، لیکن قابلیت اتنی تھی کہ ایم اے پاس کی تحریر کی تصحیح کرتے تھے۔ تحصیل علی پور میں خان بہادر سیّد محمد حسن تھے، وہ فسٹ کلاس مجسٹریٹ بھی تھے۔

میں ۱۹۲۰ء میں مظفر گڑھ پہنچا تو کانگریسی تھا۔ کھدر پہنتا تھا۔ مسلم لیگ اس وقت تھی بھی کہاں؟ کانگریس والوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان منڈا نیا نیا وکیل ہو کے آیا ہے۔ یہیں کا رہنے والا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت اثر بھی ہے۔ انہوں نے جھٹ سے مجھے مظفر گڑھ کانگریس کا وائس پریذیڈنٹ بنا دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے امن سدھار کمیٹی کے زیر اہتمام جلسہ رکھ دیا۔ میں ملتان میں اپیل کر کے واپس آیا، تو ایس پی کی طرف سے نوٹس ملا۔ "جیسا کہ میرے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ آپ کی قیادت میں ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ چونکہ اس سے امن کو خطرہ ہے، اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جلوس نہ نکالا جائے۔" میں وہ نوٹس کانگریس کے صدر

بابو نونہال کشن کے پاس لے گیا۔ وہ بھی وکیل تھے۔ کہنے لگے پھر جلوس نہیں نکالتے ہیں نے کہا، "فِٹے منہ تیرا۔ ڈڈوے کا نگرلیسی دا"۔

ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزوں سے عزتِ نفس سیکھ کے گئے تھے۔ یہاں ہمارے اکنامکس کے پروفیسر ہوتے تھے۔ جیٹ لے۔ انگریز تھے۔ انہوں نے عزتِ نفس ایسی سکھائی کہ کیا بات! اکنامکس کے ہم آٹھ سٹوڈنٹ تھے۔ ایک روز پروفیسر صاحب نے کہا کہ لڑکوں کا ایک وفد پرنسپل کے پاس میرے خلاف شکایت لے کے گیا ہے کہ میں ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا۔ جس سے ان کی بڑی ہتک ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب کا تکیہ کلام تھا، IDIOT (احمق، بیوقوف) کہنے لگے، آپ میں سے بھی کوئی ایڈیٹ اس وفد میں شامل تھا۔ ہم نے کہا، کوئی نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب کہنے لگے، وہ لوگ کتنے ایڈیٹ ہیں، میں انہیں نہیں جانتا۔ وہ مجھے نہیں جانتے، پھر وہ مجھے سلام کیوں کرتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایک غلام اپنے آقا کو سلام کرے۔ میں ایک غلامانہ سلام کو تسلیم نہیں کرتا۔ آخر میں ایسے سلام کیوں تسلیم کروں اور انہیں بھی ایسا سلام نہیں کرنا چاہیئے۔ پھر فرمایا۔ آپ لوگ یہ بتائیں کہ آپ میں سے کوئی ایسا ہے۔ جس نے مجھے پہلے سلام کیا ہو۔ ہم نے سوچا تو امر واقعہ یہی تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، کیونکہ پروفیسر صاحب اپنے سٹوڈنٹ کو دور سے ہی سلام کرنے میں پہل کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً میں جا رہا ہوں تو وہ کہیں گے "گڈ مارننگ عبدالحمید ایڈیٹ، آپ کیا کر رہے ہیں"۔ ہم میں ایک عبیداللہ بڑا تگڑا ہوتا تھا اس نے کہا سر! آپ ہمیں ہمیشہ ایڈیٹ (احمق) کہہ کر پکارتے ہیں، کیا آپ سے کبھی حماقت سرزد نہیں ہوئی؟ پروفیسر صاحب نے کہا، ہوئی ہوگی: اگر ایسے موقع پر آپ نے مجھے ایڈیٹ نہیں کہا تو پھر آپ سب سے بڑے ایڈیٹ ہوئے"۔ ہم اس ماحول سے ہو کے نکلے تھے۔

وٹرنری کالج (گھوڑا ہسپتال) کے ساتھ دیال سنگھ کی تین کوٹھیاں گورنمنٹ کالج والوں نے ہوسٹل کے طور پر لی ہوئی تھیں۔ ان کوٹھیوں کے ہم نے یہ نام رکھے ہوئے تھے، ایکوئلیٹی (EQUALITY) فرٹلٹی (FERTILITY) لبرٹی (LIBERTY)۔ اسی سڑک پر انگریز اے ایس پی مسٹر گرے رہتا تھا۔ ہم تین چار لڑکے جا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا، وہاں ٹرے سمیت دو تین مرد اور دو تین عورتیں جا رہی تھیں۔ ہم نے ان سے آگے بڑھنے کی غرض سے "ہیر" کھڑکائے"۔ انہوں نے نہ سنا، پھر ہم نے "گھنگورے" مارے۔ انہوں نے راہ نہ دی تو ہم دو ان کے بیچ میں سے نکل گئے۔ اس پر اے ایس پی نے کہا YOU BASTARD (حرام زادے)

ہم میں کرکٹ ٹیم کا کپتان بھی تھا، اس نے اس کی طرف منہ کر کے کہا، "شٹ اپ۔ یو باسٹرڈ"۔ ہم چلے گئے۔ اے ایس پی نے پرنسپل سے شکایت کی کہ میں تو مائنڈ نہ کرتا۔ لیکن میرے ساتھ لیڈیز بھی تھیں۔ آپ کے لڑکوں نے ہمیں نہ صرف یہ گالیاں دیں۔ بلکہ ہم پر حملہ بھی کیا۔ انگریز پرنسپل یہ سن کر بڑا سیخ پا ہوا۔ اس نے وارڈن کو بلا کر معاملہ اس کے ذمے لگا دیا۔

وارڈن نے اے ایس پی سے پوچھا کہ آپ ان لڑکوں کو پہچانتے ہیں۔ اس نے کہا، پہچانتا تو میں انہیں نہیں، انہیں ایک نظر ہی دیکھا تھا۔ رہتے وہ انہی کوٹھیوں میں ہیں۔

وارڈن کو مجھ پر کچھ اعتماد سا ہو گیا تھا۔ وہ میرے پاس آیا۔ مجھے سارا قصہ سنا کے کہنے لگا، عبدالحمید آپ اس ضمن میں میری مدد کریں۔ پتہ نہیں چل رہا۔ وہ کون لوگ تھے۔ میں نے کہا، ان میں سے ایک تو میں ہوں۔ وہ حیران ہوا "آپ! اور دوسرے کون لوگ ہیں؟" میں نے کہا، میں اپنے ساتھیوں سے بات کروں گا۔ اگر انہوں نے اجازت دیدی تو آپ کو ان کے نام بتا دوں گا۔ ورنہ نہیں۔

کہنے لگا، بات کیا ہوئی تھی۔ میں نے کہا، ہم نے ان سے آگے نکلنے کے لیے پاؤں کھڑکائے کھنگورے مارے۔ انہوں نے راہ نہ دی۔ پھر ہم مردوں میں سے گزر گئے جس پر اے ایس پی نے ہمیں گالی دیدی۔ "حرام زادے" ہم میں سے ایک نے کہا "بکواس بند کرو، حرام زادے"۔ وارڈن کہتا ہے۔ "بس یہی ہوا؟" میں نے کہا "ہاں یہی ہوا"۔ اس نے کہا، آپ پھر ایک نوٹ لکھ دیں کہ ہمارا مقصد کسی کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ ہم جلدی میں تھے۔ ہم نے راستہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی، آپ نے راستہ دینے سے انکار کر دیا جس پر ہم نے اپنا راستہ خود بنا لیا۔ آپ نے گالی دی، جواب میں آپ کو بھی گالی ملی۔ ہمیں اس بات پر افسوس ہے۔

میں نے کاغذ پکڑا۔ ابھی میں نے "سر" کا لفظ ہی لکھا تھا کہ وارڈن نے مجھ سے کاغذ کھینچ لیا۔ دوسرا کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ عبدالحمید۔ "سر" نہیں لکھو۔ ڈیئر مسٹر گرے لکھو۔ عزت نفس کا شعور ہمیں اس طرح ملا تھا۔ اس طرح ہماری تربیت ہوئی تھی۔ تو جب مظفر گڑھ میں مجھے انگریز ایس پی نے نوٹس دیا کہ آپ جلوس نہیں نکال سکتے۔ میں نے اسے جواب دیا۔

"جیسا کہ میرے علم میں یہ بات آئی ہے۔ آپ نے ایک نوٹس جاری کیا ہے۔ میں حیران ہوا ہوں۔ بلکہ مجھے افسوس ہے کہ آپ امن سدھار کمیٹی کے معنی بھی نہیں جانتے۔ امن سدھار کمیٹی کا مطلب ہے۔ ایسی کمیٹی جو امن برقرار رکھنے کے لیے قائم کی گئی ہو۔ اور آپ ہیں کہ اس کمیٹی سے امن شکنی کا خوف کھائے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہو گی۔ جلوس نکلے گا۔ اور میں اس جلوس کی قیادت کروں گا"۔

یہ جواب لکھ کے میں نے ایس پی سینٹ جارج بی ٹی کو دیدیا۔ مظفر گڑھ کے ضلع میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی ایسا کرے گا۔ جہاں بڑے بڑے زمیندار ڈپٹی کمشنر اور ایس پی کو سلام کرنے آتے تھے۔ اور ڈپٹی کمشنر یا ایس پی کے حضور اپنے سلام کی قبولیت کی خوشی میں ان کے اردلیوں کو انعام دے کے جاتے تھے۔ ایسی صورت حال میں میرے جواب پر انگریز ایس پی کا سیخ پا ہونا قدرتی امر تھا۔ ویسے بھی وہ مانا ہوا خناس تھا۔ منہ ماڑنے والا۔

جلوس نکلا۔ کوئی پولیس والا نہیں آیا۔ ویسے تو جلوس برائے نام ہی تھا۔

ایس پی، ایکس ای این اور ایک اور آفیسر، شام کے وقت یہ تینوں آفیسر ایس پی کی کوٹھی میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ چوتھا آدمی انہیں ملتا نہیں تھا، کسی نے انہیں بتایا کہ وہ جو نیا وکیل آیا ہے، مُنڈا، وہ ٹینس کھیلتا ہے۔ انھوں نے تھانیدار سے کہا کہ جا کے اسے کہو کہ وہ ہمارے ساتھ شام کو ٹینس کھیلا کرے۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ میں تو مزدور آدمی ہوں، شام کے وقت میرے موکل میرے پاس آتے ہیں، میں روٹی کماؤں یا ٹینس کھیلوں۔

ملتان کمشنری تھا اور سیشن جج کمشنری ہیڈکوارٹر میں بیٹھتا تھا۔ قتل کے اتنے کیس نہیں ہوتے تھے، وہی سیشن جج دس روز کے لیے مظفر گڑھ آ جاتا تھا۔ اپیلیں البتہ وہ ملتان میں ہی سُنتا تھا۔

ایک روز میں ملتان سے آ رہا تھا کہ کپتان (ایس پی) کوٹ ادو کی طرف سے آیا، وہ اپنی بگّی میں سوار تھا، موٹریں تو ہوتی نہیں تھیں۔ بگّی ایک طرح کی دو سیٹوں والی گاڑی ہوتی تھی، بڑی خوبصورت، اس کے پیچھے سائیس کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی، کپتان نے مجھے دیکھا تو گاڑی روک لی، کہنے لگا، چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے کہا میرا گھر تو شہر میں ہے، آپ کہاں جائیں گے، آپ کی بڑی مہربانی، کہنے لگا آپ مان جائیں تو یہ بات میرے لیے خوشی کا باعث ہوگی۔ میں نے کہا آپ کو تکلیف ہوگی، اچھا اگر آپ اتنا ہی چاہتے ہیں، تو مجھے راستے میں ڈسٹرکٹ کورٹ اُتار دینا، پھر اس نے مجھے اگلے روز آنے کو کہا۔ میں گیا، اس نے کہا، مجھے سلام کرنے کے لیے بڑے بڑے لوگ آتے ہیں، وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں، اور اس خوشی میں میرے اردلیوں کو پیسے دے کے جاتے ہیں۔ اُس روز میں نے آپ کو پیغام بھیجا میرے ساتھ ٹینس کھیلا کریں۔ آپ نہیں مانے۔ کل میں نے آپ سے کہا، کہ آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں، آپ نہیں مانے۔ اُدھر آپ کانگریس میں جا گھُسے ہیں۔ میں نے پتہ کیا ہے، آپ امیر گھرانے کے فرد نہیں، آپ کا متوسط گھرانہ ہے، آپ کو گھر والوں نے پڑھایا لکھایا ہے تو اپنی روزی کی طرف توجہ دیں، کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کے وہ اندر چلا گیا، اور مظفر گڑھ کانگریس کے صدر اور جنرل سیکرٹری کے معافی نامے لے آیا کہ یہ انہوں نے معافیاں مانگ رکھی ہیں اور تم لکھتا ہے کہ "جلوس نکل کے رہے گا، اور میں اس کی قیادت کروں گا" کانگریس کا صدر اور سیکرٹری دونوں ہندو تھے۔

میں نے اسے کہا، یہ معافی نامے تو ان کی ذاتی بات ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اگر کوئی ہندوستانی آپ سے کہے کہ وہ انگریز حکومت کا وفادار ہے، تو سمجھ لینا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ باقی آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں ٹینس کھیلنے کیوں نہیں آیا۔ ہماری گورنمنٹ کالج میں ٹینس کی تین چار کورٹس تھیں، کسی کورٹ میں اگر ہم تین ہوتے تو ہم مارکر کو بلا لیتے تھے۔ اس طرح چوتھا ہمارے ساتھ وہ ہو جاتا تھا۔ آپ نے تھانیدار کو مارکر کے لیے بھیجا تھا۔ ایسے میں عبدالحمید کیونکر آتا۔ وہ جو آپ نے کہا تھا۔ کہ میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آتا ہوں اور میں نے

انکار کر دیا تھا۔ دراصل ایسا میں نے آپ کے عہدے اور تکریم کی خاطر کیا تھا۔

ایس پی کے پاس سے اٹھ کے میں ڈپٹی کمشنر شیخ سراج دین کے پاس چلا گیا۔ شیخ صاحب کہنے لگے۔ بی ٹی سے مل آئے ہو۔ میں نے کہا ہاں مل آیا ہوں۔ "کیا باتیں ہوئیں"۔ میں نے تفصیل بتا دی۔ اس پر شیخ صاحب نے مجھے تھاپڑا (شاباش) دیا۔ کہنے لگے کل جمعہ ہے۔ نماز کے بعد آنا۔ باتیں کریں گے۔ میں گیا۔ کہنے لگے، مدرسے گئے ہو۔ میں نے کہا، نہیں۔ کہنے لگے وہاں ۱۲۵ لڑکے ہیں، ان میں سے مسلمان ۲۵ ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر پرائمری کلاسوں میں۔ اُوپر والی جماعتوں میں ہم جو ملازم لوگ ہیں۔ ان کے بچے ہیں۔ مسلمانوں کا ضلع اور تعلیم میں اس قدر پسماندہ! تجھے ملک کی پڑی ہے۔ پہلے گھر تو سنبھال۔ کھدر شدر اتار۔ پہلے یہ کام کر۔ میں نے کہا۔ میں ابھی نیا نیا آیا ہوں۔ کیا کروں؟ کیسے کروں؟ کہنے لگے۔ انجمن بنا۔ ہوسٹل قائم کرنے کے لیے پیسے اکٹھے کر، تاکہ جو غریب لڑکے باہر سے آتے ہیں، وہ وہاں قیام کر سکیں۔ انہیں کتابیں بھی دیں اور فیسیں بھی۔

اس وقت سارے ضلع میں ایک ہی ہائی سکول ہوتا تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول۔ تحصیلوں میں مڈل سکول تھے، یا پھر لیہ میں برادری ہائی سکول، ہندوؤں کا تھا جس میں مسلمان لڑکے خال خال ہی ہوتے۔

یہ حالات دیکھ کے شیخ صاحب کڑھتے ہوں گے کہ ضلع میں ۹۵ فیصد مسلمان آبادی، کیا ڈسٹرکٹ بورڈ کیا میونسپل کمیٹی، کہیں بھی کوئی مسلمان کلرک تک نہیں ملتا۔ زیادہ اگر ہوا تو مسلمان آٹھویں پاس کر کے کہیں مدرس لگ جاتا تھا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اور جو مظفر گڑھ کے بڑے خاندان تھے۔ وہ مثنوی مولانا روم سے آگے نہیں گئے تھے۔

شیخ سراج الدین ہوشیار پور (جالندھر) کے تھے۔ بڑے صحیح قسم کے مسلمان۔ انتہائی صحیح قسم کے مسلمان، عملی مسلمان۔

چنانچہ میں نے لسٹ بنائی۔ غریب ضلع چندہ کون دے۔ زمینداروں کا یہ حال تھا کہ گنک بہت لیکن پیسے تھوڑے۔ گنک دو روپے من، چونا (چاول کی ایک قسم) ڈیڑھ روپے من، کھجور دو روپے من، اور من بھی ۵۶ سیر کا۔ معلوم ہوا کہ ہر زمیندار جب وقت اپنی گنک کی یا چونے کی ڈھیری اٹھاتا ہے، اس میں سے وہ 'رسول وائی' نکالتا ہے۔ کسی آئے گئے فقیر کو دیتا ہے۔ میں نے زمینداروں سے کہا کہ یہ ساری رسول وائی مجھے دیدیا کریں۔ دوسرے میں نے یہ کیا کہ صندوقچی بنا کے ایک آدمی کو دیدی کہ ریل گاڑی پر مسافروں سے چندہ جمع کیا کرو۔ پیسہ دو پیسہ، آنہ دو آنہ جو بھی مل جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے جو انجمن بنائی اس کا نام انجمن اسلامیہ رکھا۔ اور مولوی غلام محمد ایڈووکیٹ اس کے سیکرٹری ہوئے۔

میں بہت دور چلا گیا۔

س:۔ کوئی بات نہیں یہ حقائق تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان سے اس وقت کے سماجی، سیاسی اور

معاشی حالات وواقعات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تب مسلمان کن حالات میں تھے، اور پاکستان کی نعمت غیر مترقبہ نے انہیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

ج:۔ اگر آپ سننے کے لیے تیار ہیں تو میرا کیا ہے۔

ان دونوں ذریعوں سے جو پیسے آتے تھے۔ ان سے گزارا نہیں ہوتا تھا کہ اتنے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن آگئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے یہ پہلے الیکشن تھے۔ میں ممبر منتخب ہو گیا، پھر وائس چیئرمین بھی ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر چیئرمین ہوتا تھا۔ اس کے پاس بہت اختیارات ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ میں چھ آنے نکاح خوانی کا فنڈ ہے۔ یعنی جو مسلمان نکاح پڑھوائے، وہ دو آنے مولوی کو، دو آنے قاضی کو اور دو آنے ڈسٹرکٹ بورڈ کو دے۔ وہ مکمل طور پر مسلمانوں کا فنڈ تھا، اور تھا بھی اختیاری۔ میں نے ڈپٹی کمشنر سے بات کی۔ کیوں نہ یہ رقم ہوسٹل کے لیے مختص کر دی جائے۔ میں نے بورڈ کے اجلاس میں ریزولیوشن رکھوا دیا، وہ پاس ہو گیا۔ چونکہ ریزولیوشن ٹیکسیشن سے متعلق تھا، اور اس نے ایک غیر سرکاری ادارے میں جانا تھا، اس لیے اس کی منظوری کمشنر سے لینا پڑتی تھی۔ ریزولیوشن منظوری کے لیے کمشنر کے پاس گیا تو اس نے رجیکٹ کر دیا۔ میں کمشنر سے ملا۔ اسے کہا کہ ضلع میں تعلیم کی کمی ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ بنا ہی اسی لیے تھا، پھر یہ فنڈ اختیاری ہے۔ اگر ہم مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈہ کر دیں کہ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں سے نکاح مت پڑھواؤ، اس کے پیسے ہم لیں گے۔ آپ ہمیں اس مشکل میں کیوں ڈالتے ہیں۔ کہنے لگا فنڈ ہمیشہ کے لیے آپ کو دیدیا جائے، یہ تو نہیں ہو سکتا، کچھ رقم آپ کہیں تو وہ دے دوں گا۔ بیس ہزار کہیں۔ وہ بھی دے دوں گا۔ لیکن ہمیشہ کے لیے یہ فنڈ آپ کو نہیں دے سکتا۔ میں واپس آگیا کہ اس لحاظ سے بیس ہزار سے کیا بنے گا، یہ تو مستقل آمدنی ہے۔

پھر ہم ریزولیوشن بھیج دیا کرتے تھے، کہ مسلمانانِ مظفر گڑھ کا ایک عظیم الشان جلسہ، اس میں یہ قرار داد منظور کی گئی کہ یہ رقم جو خالصتہً مسلمانوں کی ہے، اسے تعلیم کی کمی دُور کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

اس عظیم الشان جلسے میں کون لوگ شریک ہوتے تھے۔ میں اور میرا منشی۔

بالآخر اسے گورنمنٹ نے منظور کر لیا۔ منظور ہوتے ہی میں نے اس کی فیس چھ آنے سے بڑھا کر دو روپے کر دی۔

اتنے میں زمیندار جو تھے انہیں بھی سمجھ آگئی کہ یہ مُنڈا صحیح بات کرتا ہے۔ مجھے ان کی ہمدردی بھی مل گئی۔ وہاں یہ رسم تھی کہ جب کوئی غیر زمیندار فرد نکاح پڑھواتا تو وہ اس موضع کے زمیندار کو ایک گٹا دیتا۔ گٹا دنبے کو کہتے تھے۔ دو روپے میں آجاتا تھا۔ میں نے کہا زمینداروں کے گٹے بند۔ اب یہ گٹے قوم کو ملیں گے۔ نکاح مولوی صاحب کے پاس درج کرایا جائے۔ جو درج نہ کرائے، وہ اطلاع دے۔ دو چار اطلاعیں میرے پاس نہ آئیں تو میں نے پروانہ جاری کیا۔

"ہر گاہ کہ آپ نے نکاح درج نہیں کروایا۔ حاضر ہو کر وجہ بیان کریں کہ کیوں نہیں درج کرایا۔"

اب شیخ سراج دین نے مجھے دوسرا اٹھا پڑا دیا۔
ان لوگوں کی سفارش کے لیے زمیندار، ذیل دار، نمبردار وغیرہ میرے پاس آئے۔ میں نے کہا، آپ نے جرم تو بہت کیا ہے۔ آپ سے یہ رعایت کر دیتے ہیں کہ آپ لوگ فی کس دو روپے گئے" والی فیس، دو روپے جرمانہ، اور ایک روپیہ بطور خیرات داخل کر دیں۔ وہ ہمیں دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ اب پورے علاقے میں یہ بات پھیل گئی کہ نکاح درج نہ کراؤ تو پانچ روپے دینا پڑتے ہیں۔ پہلے سال ہمیں آٹھ ہزار روپے آمدنی ہوئی۔ پھر بڑھتی گئی۔ ہوسٹل بن گیا۔ ہوسٹل میں ہم طلبہ کو روٹی، فیس، کتابیں اور بستر بھی مہیا کرتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آگیا کہ ہمیں باقاعدہ سلیکشن کرنا پڑتی تھی۔ پھر یہ بھی ہو گیا۔ جو لڑکے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے ہم سولہ سیر آٹا، یا پانچ چھٹانک گھی فی کس لے لیتے۔ باقی سب کچھ ہوسٹل انتظامیہ مہیا کرتی۔
لیہ کے ملک قادر بخش جکھڑ بی اے کر کے مظفر گڑھ پہنچے تو شیخ سراج دین نے انہیں نقول ایجنٹ بنا دیا۔ اور مجھے کہا کہ آپ اکیلے ہیں۔ میں آپ کو ایک آدمی اور دیتا ہوں۔ چنانچہ ملک قادر بخش بھی میرے ساتھ ہو گئے۔

ماسٹر دُرّ محمد ہوتے تھے۔ ابھی زندہ ہیں۔ وہ رات کو بھی بچوں کو پڑھاتے تھے۔ انٹرنس میں ہمارے پہلے بیچ کے تمام لڑکے فسٹ آگئے۔ یہ ریکارڈ ہے۔ اس لیے کہ ایک تو وہ بچے شوق سے آئے تھے۔ دوسرے ماسٹر دُرّ محمد کو بھی بہت شوق تھا۔ وہ ایسا دیانتدار تھا کہ آٹھ لحاف پھٹ کے "لیراں لیراں" ہو گئے۔ اس نے مجھے بھیج دیئے کہ یہ ناقابل استعمال ہیں اور ناقابلِ فروخت بھی۔ انہیں رجسٹر سے خارج کر دیا جائے۔ میری بیوی نے ان کی پرانی روئی نکال کے پنجنے کے لیے بھیج دی۔ اس میں سے چار رضائیوں کی روئی نکل آئی۔ اس وقت کھدر ڈھائی آنے (۱۵ پیسے) گز ہوتا تھا۔ اس نے چار رضائیاں بنا کے بھیج دیں۔ دُرّ محمد آیا۔ وہ جو آپ نے مجھے چپیڑ ماری ہے، وہ پہنچ گئی ہے۔ میں نے کہا "کیوں"؟ کہنے لگا "یہ بات مجھے کیوں نہ سوجھی"۔
چودھری دل محمد ٹریژری آفیسر ہوتے تھے۔ وہ ہوسٹل میں بڑے ذوق شوق کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مجھے بھی گائیڈ کیا کرتے تھے۔ ایک روز مجسٹریٹ کے اعزاز میں پارٹی تھی۔ ہم سب مدعو تھے۔ گلاب جامن، جلیبیوں وغیرہ کی پلیٹ آتی، تو چودھری دل محمد اس سے ایک دوسری پلیٹ میں انڈیل لیتے۔ اس طرح انہوں نے تین چار پلیٹیں اچھی طرح بھر لیں۔ مجھے ان کا یہ عمل بہت برا لگا۔ پارٹی ختم ہوئی، تو چودھری صاحب گھر کی بجائے ہوسٹل کی طرف چل دیئے۔ "لو بچو مٹھائی کھاؤ"۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "اب تو ماتھے سے تیوڑی اتار دے"۔ میں نے ماسٹر دُرّ محمد کو بلایا۔ "ماسٹر جی آپ کا بدلہ اتر گیا۔ آج مجھے چپیڑ پڑ گئی ہے"۔
پھر تو ہم امیر ہو گئے۔ جو بچے فسٹ ڈویژن میں پاس ہوتے، انہیں اوپر بھیج دیتے، ان کی ہیلپ کرتے۔
یہ تفصیل بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان صادق جذبوں سے وہ ہوسٹل بنا۔ اس ہوسٹل

کے فارغ التحصیل ابھی تک ہیں، مثلاً ملتان ڈویژن کے ایس ای مسٹر بلوچ
یہ سلسلہ تو یہاں ختم کریں۔ پھر مسلم لیگ کا دور آ گیا۔

س: مسلم لیگ کے دور کی طرف جانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ قبل ازیں آپ کی مقامی سیاسی زندگی کس نوع کی تھی، کس قسم کے اتار چڑھاؤ تھے۔ کس قسم کے جوڑ توڑ ہوتے تھے، کس قسم کی گروہ بندیاں تھیں، کس قسم کے لوگ پیش پیش تھے۔

ج: میں نے پیچھے ذکر کیا کہ ملک قادر بخش بی اے کر کے آئے تو شیخ سراج دین نے انہیں تقاوی ایجنٹ بنا دیا۔ پھر شیخ صاحب نے انہیں تقاوی دے دی۔ آپ جانتے ہیں، تقاوی کیا ہوتی ہے۔ یہ کہ اگر آپ اپنی زمین پر کھوہ (کنواں) لگائیں تو حکومت پیسے دیتی ہے، وہ پیسے آہستہ آہستہ قسطوں میں اتارنا ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس کو تقاوی دی۔ مسلمان ہونے کے ناطے سے ان کی خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس طرف آئیں۔ چنانچہ انہوں نے قادر بخش کو تقاوی دے کے لاء کالج لاہور میں ایل ایل بی کرنے کے لیے بھیج دیا۔ ملک صاحب ایل ایل بی کر کے آئے۔ تو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر بھی ہو گئے۔ کیونکہ ان کا ایک حلقہ تو تھا۔ ان کا بھائی ذیلدار تھا۔ یہ پھر میرے مقابلے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا وائس چیئرمین کا انتخاب لڑتے رہے۔ صرف ایک بار ہی جیت سکے۔ وہ بھی اس لیے کہ انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر لنکن کی انہیں کھلم کھلا حمایت حاصل تھی۔ ڈپٹی کمشنر ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیئرمین بھی ہوتا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے جو ممبر ہوتے تھے۔ وہ ذیلدار، نمبردار قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ وہ ڈی سی کا کہا ٹال نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ لنکن کی کھلم کھلا حمایت کی وجہ سے قادر بخش میرے خلاف وائس چیئرمین منتخب ہو گئے۔

لنکن بڑا بدقماش اور بددیانت آدمی تھا۔ اس کی بددیانتی کی وجہ سے جن ممبران نے اس کا کہا مان کے قادر بخش کو جتوایا تھا۔ میں نے انہیں غیرت دلائی۔ انہوں نے کہا، ہمارے سے غلطی ہو گئی۔ جیسے آپ کہیں گے ہم اس غلطی کا ازالہ کر دیں گے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کا ضابطہ یہ تھا کہ اگر پندرہ ممبر کسی ریزولیوشن پر دستخط کر دیں تو وہ ریزولیوشن لازمی طور پر ایجنڈے پہ آ جاتا تھا۔ میں نے ان ممبران سے کہا کہ آپ اس ریزولیوشن پر دستخط کر دیں۔ وہ ریزولیوشن یہ تھا، کہ مسٹر لنکن پبلک کے مفاد کے خلاف بددیانت اور رشوت خور افسر ہے۔ لہٰذا اس سے ڈسٹرکٹ بورڈ کی چیئرمینی کے اختیارات واپس لے کے ڈسٹرکٹ بورڈ کو دیئے جائیں۔ آگے ڈسٹرکٹ بورڈ جسے چاہے یہ اختیارات دے۔

ہم نے ریزولیوشن سیکرٹری کے حوالے کیا اور احتیاطاً اس سے رسید لے لی۔ اب یہ ریزولیوشن ضابطے کی رو سے ایجنڈے میں لازماً آنا تھا۔ لنکن نے کہا کہ اسے ایجنڈے میں شامل نہ کیا جائے۔ جب میٹنگ ہوئی تو وہ غیر حاضر رہا۔ اس کی جگہ وائس چیئرمین ملک قادر بخش جھکڑ نے صدارت کی۔ میں نے ملتان سے پریس رپورٹروں کو بلا لیا ہوا تھا۔

ممبران میں سے پانچ افراد نامزد سرکاری افسر ہوتے تھے، مثلاً ایس ڈی او علی پور، ایس ڈی او

لیٹر۔ ایگزیکٹو انجینئر نہر، سول سرجن، ڈسٹرکٹ انسپکٹر ایجوکیشن، پانچ ہندو نامزد تھے
میٹنگ شروع ہوئی، میں اٹھا، میں نے کہا، ایک ریزولیوشن باضابطہ طور پر دیا گیا تھا۔ اس کی رسید بھی میرے پاس ہے۔ ضابطے کی رو سے وہ ریزولیوشن لازمی طور پر ایجنڈے پر ہونا چاہئیے۔ لیکن تحریر میں نہیں آیا۔ تحریر میں نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ضابطہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا میں اس پر بحث کرتا ہوں۔ میں نے بحث شروع کر دی۔ ملک کی بد دیانتیاں بتاتا رہا۔ صدر قادر بخش کہتے رہے، اجازت نہیں، اجازت نہیں، لیکن میں نے تقریر جاری رکھی۔ میں نے کہا، ووٹنگ کرائی جائے۔ صدر نے اس کی اجازت نہ دی تو میں نے کہا کہ جو ممبر میرے ساتھ ہیں، وہ واک آؤٹ کر جائیں۔ صرف پانچ سرکاری ممبر رہ گئے۔ باقی ممبران واک آؤٹ کر گئے۔ پریس والوں نے پریس میں دے دیا۔ کمشنر آ گیا۔ کمشنر نے مجھے بلایا۔ بولا، کون احمق کہتا ہے کہ مظفر گڑھ ایک پسماندہ ضلع ہے۔ میں حیران ہوں کہ ریزولیوشن پاس ہوتا ہے کہ ڈپٹی کمشنر سے اختیارات واپس لے لیے جائیں۔ بے بسی کی حد ہو گئی۔

کمشنر نے اپنی بات ختم کر لی، تو میں کھڑا ہوا۔ میں نے کہا، آپ کچھ اور بھی کہیں گے۔ اس نے کہا، کیا یہ کافی نہیں۔ میں نے کہا، گورنمنٹ گزیٹئر کہتا ہے کہ مظفر گڑھ ایک پسماندہ ضلع ہے۔ اگر یہ بیوقوفی ہے تو پھر یہ بیوقوفی گورنمنٹ کے کھاتے میں جاتی ہے۔ میں نے کہا پسماندہ ضلع تو یہ تسلیم شدہ ہے۔ اگر اب پسماندہ ضلع اس بات پر اڑ جائے جو کہ غیر معمولی ہے۔ کیا آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ حالات غیر معمولی ہیں۔

وہ سمجھ گیا۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اس نے ڈپٹی کمشنر کو تبدیل کر دیا، اور ہدایت کی کہ آپ کسی آنے والے کا انتظار بھی نہ کریں، بلکہ اپنے اختیارات اے ڈی ایم کو سونپ دیں اور فوراً ضلع چھوڑ دیں، حالانکہ میں ممبر تھا، قادر بخش وائس چیئرمین تھے۔ انگریز ڈی سی کی حمایت انہیں حاصل۔ ممبر ذیلدار اور نمبردار قسم کے لوگ جو ڈی سی کی مرضی کے بغیر ایک قدم ادھر اُدھر نہیں جا سکتے تھے۔ پھر بھی یہ ہوا کہ ہاؤس نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے اختیارات مجھے سونپ دیئے۔ کمشنر نے آکے ڈی سی کو چلتا کیا۔ وہ بھی بڑے ذلت آمیز طریقے سے۔ کیا یہ ایک تاریخی چیز نہیں؟

س:۔ اس واقعہ کے بعد ملک قادر بخش کے ساتھ آپ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے؟

ج:۔ قادر بخش کے ساتھ سماجی تعلقات میں رخنہ نہیں پڑا، آنا جانا رہتا۔ خود ستائی نہ ہو تو میں کہوں گا کہ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ کھیل ہے، انسانیت اور چیز ہے۔

س:۔ سیاسی اور عوامی اعتبار سے تو وہ مسلم لیگ کا دور تھا۔ لیکن پنجاب میں حکومتی سطح پر یونینسٹ پارٹی کا دور دورہ تھا۔ آپ کس طرف تھے۔

ج:۔ میں پبلک پراسیکیوٹر تھا۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا وائس چیئرمین بھی، انجمن اسلامیہ میں نے ہی بنائی تھی اور اس کا صدر بھی تھا، ڈسٹرکٹ نیشنل وار فرنٹ کا پریذیڈنٹ بھی تھا۔ اتنے جال میرے گرد بنے ہوئے تھے۔ اس وقت تک مسلم لیگ جاگ اٹھی تھی، اس کی تحریک شروع ہو گئی تھی، اور علاقے

میں میرا کافی اثر و رسوخ ہو چکا تھا۔ میں نے ملک قادر بخش کو بلایا۔ میں نے کہا جتنے بھی میرے معتمد اور دوست ہیں، سب کی بیعت آپکے ہاتھ پر کرا دیتا ہوں، میری خدمات بھی حاضر ہیں۔ اگر آپ کا گروپ اور میرا گروپ مل جائے تو مسلم لیگ بن جائے گی۔ آپ پریذیڈنٹ بن جائیں، میں تو ویسے ہی پبلک پراسیکیوٹر ہونے کے حوالے سے سرکاری ملازم ہوں۔ میں نے ملک قادر بخش سے بھی کہا کہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ۹۵ فیصد مسلمان آبادی والا ضلع اور یہاں مسلم لیگ کا کوئی رہنما نہیں۔ میں نے کہا، آپ مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں اور مسلم لیگ کی تحریک کو چلائیں۔

مظفر گڑھ میں اس وقت تین روہتکی ہندو تھے۔ جو اسسٹنٹ رجسٹرار، ٹریژری آفیسر اور افسر مال کے عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے یونینسٹ گورنمنٹ کے وزیر سر چھوٹو رام کو رپورٹ پہنچائی، کہ اگر آپ دستی کو ساتھ نہیں ملائیں گے تو بھر گئے؟

س:۔ تب تک آپ کسی پارٹی میں نہیں تھے۔

ج:۔ اس وقت تک میں کسی پارٹی میں نہیں تھا۔

س:۔ ملک قادر بخش آپ کے ساتھ مسلم لیگ بنانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ج:۔ ملک صاحب نے میری بات مان لی، چنانچہ میں نے اپنے تمام آدمیوں کو ان کی اطاعت کے لیے بھیج دیا۔ مسلم لیگ بن گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے وزیر اعظم پنجاب سر خضر حیات ٹوانہ کو اطلاع دی۔ کہ یہ مسلمانوں کا ضلع ہے۔ اس میں دو ہی دھڑے تھے، دونوں آپس میں متفق ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب میرے بس کی بات نہیں رہی۔ سر خضر حیات ٹوانہ کو پتہ چلا کہ اس طرح سلسلہ ہو گیا ہے۔ قادر بخش اور دستی نے مل کے مسلم لیگ بنا لی ہے۔ وہ مظفر گڑھ آئے۔ ان کے ساتھ تھے، سر چھوٹو رام، ڈیرہ غازیخان کے نواب جمال خاں لغاری، خضر حیات ٹوانہ کے ساتھ تیسرے صاحب تھے، نواب صادق حسین قریشی کے والد نواب عاشق حسین یہ تینوں خضر حیات کے وزیر تھے۔ یہ سب پہنچے مظفر گڑھ۔ خضر حیات نے مجھے بلایا۔ میں نے انہیں کہا۔ میں تو پبلک پراسیکیوٹر ہوں۔ میرا اس سلسلے میں لینا دینا کیا ہے۔ یوں میں نے انہیں ٹال دیا۔ پھر انہوں نے ملک قادر بخش کو بلایا۔ اسے دو مربعے زمین دی اور ساتھ ہی اسمبلی کی ممبر شپ کے لیے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار بننے کی پیشکش کی۔ گھر آ کر ملک قادر بخش نے مسلم لیگ کے سارے رجسٹر مجھے بھیج دیئے، اور یونینسٹ پارٹی کی طرف سے اُمیدوار بننے کے لیے درخواست دیدی۔ یہ ۱۹۴۵ء والے الیکشن کی بات ہے، جن کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آنا تھا۔

نوابزادہ نصر اللہ خان میرے پاس آئے کہ مجھے مسلم لیگ کا ٹکٹ دلوا دیں۔ میں نے انہیں سمجھایا، جلدی نہ کرو۔ اس وقت فضل کریم قریشی کا مسئلہ ہے۔ وہ سٹنگ ممبر ہے۔ وہ لڑے گا ضرور، اگر مسلم لیگ کی طرف نہ آیا، تو یونینسٹ پارٹی کی طرف چلا جائے گا۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو مسلم لیگ کی طاقت پہلے ہی تھوڑی ہے۔ انہیں بھی ساتھ ملا لیں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔ اس لیے آپ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ اگر کسی طرح سے فضل کریم نہیں مانتا۔ تو پھر پہلا حق تیرا ہے۔

نواب زادہ نصر اللہ خاں صبر نہ کر سکے، لاہور چلے گئے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری احراری تھے، کانگریس کے ساتھ تھے، انہوں نے نوابزادہ کو مظفر گڑھ کے لیے احرار کا ٹکٹ دیدیا۔ چنانچہ یہ احراری ٹکٹ پر آ گئے۔

اُدھر میں فضل کریم کے پیچھے لگا ہوں کہ کسی طرح یہ مسلم لیگ میں آ جائے۔ میں کوشش کرتا رہا۔ ایک مرحلے پر وہ مان بھی گیا، لیکن اس کے عزیزوں نے اسے مشورہ دیا کہ دستی تجھے خواہ مخواہ خراب کر رہا ہے۔ اور تجھے حکومت (یونینسٹ پارٹی) کے خلاف لے جا رہا ہے۔ اسے کہو کہ مسلم لیگ کی طرف سے خود کیوں نہیں کھڑا ہوتا۔ یوں میں فضل کریم قریشی کو مسلم لیگ میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ادھر خضر حیات ٹوانہ نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ آپ دستی سے یونہی ڈر رہے ہیں۔ یہ تو پبلک پراسیکیوٹر ہے، اس کا تبادلہ کر دو۔ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

ٹرانسفر کا حکم آ گیا۔ مجھے پتہ چل چکا تھا یہ ہو رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کا اردلی آیا کہ صاحب نے یاد کیا ہے۔ میں نے استعفا لکھ کے کھیسے (جیب) میں رکھ لیا۔ ڈپٹی کمشنر مسکرا مسکرا کے باتیں کرتا رہا۔ کنوینسنگ بھی کرتا رہا۔ کیا کر رہے ہو چھوڑو اسے۔ وزیر اعظم (پنجاب) آپ کو چاہتا ہے۔ بڑے مربے پڑے ہیں، تُو ہاتھ بڑھائے تو دیکھ، جتنے مرضی ہے اٹھا لے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ٹرانسفر آرڈر دکھایا۔ میں نے کھیسے میں سے استعفا نکال کے اس کی میز پر رکھ دیا۔ کہنے لگا یہ کیا کر رہے ہو، رزق کو لات مار رہے ہو۔ میں نے کہا، آپ لوگ کب سے رازق بنے ہیں، میرا استعفا منظور کرو۔ اور میری ہاگیں کھولو۔ میں نے نیشنل وار فرنٹ کی صدارت سے بھی استعفا دے دیا۔ "خان صاحب" کا خطاب بھی واپس کر دیا۔ اور مسلم لیگ کی تحریک کو سنبھال لیا۔

پھر خضر حیات نے ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا وائس چیئرمین ہے۔ اس بنا پر اس کا رسوخ ہے۔ الیکشن کرا دو۔ اور اسے ہرانے میں اپنا پورا زور لگا دو۔ اس وقت وائس چیئرمین بہت پاورفل ہوتا تھا۔ ملک قادر بخش کو میرے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔

پولنگ شروع ہوئی ڈپٹی کمشنر بیلٹ بکس کے نزدیک بیٹھنے لگا تاکہ ووٹروں پر اس کا رُعب پڑے اور وہ ملک قادر بخش کی طرف ہوتے جائیں۔ میں نے کہا، میں تمہیں یہاں نہیں بیٹھنے دوں گا۔ کیونکہ اس وقت آپ ڈپٹی کمشنر نہیں، بلکہ عملاً ملک قادر بخش کے پولنگ ایجنٹ کا رول ادا کر رہے ہیں، میں ایک امیدوار کے پولنگ ایجنٹ کو بیلٹ بکس کے نزدیک بیٹھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ اگر ایسا کیا تو میں آپ کو اُٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔

بورڈ میں اس وقت پانچ سرکاری افسر بھی نامزد ممبر ہوتے تھے۔ میری اس جرأت پر وہ حیران رہ گئے۔ ہر کوئی حیران تھا۔ اصل میں حق کی طاقت تھی۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ اُس نے اُٹھنا تو ہے نہیں، چلو رعب ہی ڈالو۔ اُس ڈپٹی کمشنر کا نام ہم نے کیکر سنگھ رکھا ہوا تھا۔ ویسے اس کا نام راجہ لال حسین تھا۔ کھاریاں کا تھا۔ شیخ نور محمد کے بعد آیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور وزیر اعظم پنجاب کی کوششوں کے باوجود

ملک قادر بخش ہار گئے۔ میں جیت گیا۔

اب آ گئے وہ الیکشن جن کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آنا تھا۔ یعنی اگر مسلم لیگ جیت گئی تو پاکستان۔ ورنہ ہندوستان اور ہم سب غلام۔

میاں مشتاق احمد گورمانی دہلی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر آف پبلسٹی ہوتے تھے۔ میں نے کوٹ ادو میں ان کے بھتیجے غلام جیلانی گورمانی کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا کرنا تھا۔ میاں مشتاق گورمانی دہلی سے چل کے آئے۔ کہنے لگے، غلام جیلانی۔ ملک قادر بخش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تو نے وہاں سے مسلم لیگ کو کامیاب کرانا ہے تو خود قادر بخش کے مقابلے میں آ۔ میرے خاندان کا نام بدنام نہ کر۔ میں نے کہا میاں صاحب آپ کے خاندان کا نام اللہ کرے گا، ٹھیک رہے گا۔

س :- آپ کو ان انتخابات میں مشکلات تو بہت پیش آئی ہوں گی۔ یونینسٹ گورنمنٹ کے اُمیدوار بھی تھے۔ احرار بھی تھی، اسے ہندو کانگریس کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اپنے ذاتی تجربات میں سے آپ کچھ بتائیں گے کہ قیام پاکستان کے لیے آپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ج :- ہاں، میرے خلاف کانگریس کی ہمنوا احرار کی طرف سے نواب زادہ نصر اللہ خاں اور حکمران یونینسٹ پارٹی کی طرف سے فضل کریم قریشی کھڑے تھے۔ قریشی صاحب کے ساتھ ڈپٹی کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، ساری حکومتی مشینری۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں کی حمایت میں عطاء اللہ شاہ بخاری آ گئے۔ آپ نے انہیں سنا نہیں، عطاء اللہ شاہ بخاری کو جو جانتے ہیں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ وہ سحر البیان مقرر تھے، خوش الحان، قرآن پر انہیں اتنا عبور کہ کوئی حد نہیں۔ اوپر سے مظفر گڑھ کا ضلع سیدوں کا۔ پیروں کا، مریدوں کا۔

"رنگ پور کھیڑیاں دا" جہاں ہیر سیال بیاہی گئی تھی۔ وہ موضع مظفر گڑھ کی ایک حد تھی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری وہاں سے شروع ہوئے۔ لبتی لبتی وعظ کرتے کرتے وہ سارے حلقے میں پھر گئے۔ اور مظفر گڑھ کے دوسرے سرے "اولاں والی دے تھانے" تک پہنچے۔ مجھے یونینسٹوں نے اتنا تنگ نہیں کیا۔ مجھے انہوں نے بڑا تنگ کیا۔ ان کے مرید مولوی لوگ تھے۔ میں جہاں بھی جاتا، وہاں کسی نہ کسی مولوی نے پہنچ جانا۔ مثال کے طور پر ایک جگہ کا واقعہ سناتا ہوں۔ میں پہنچا۔ ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے۔ صحابہ رضؓ ساتھ تھے، آپؐ نے کپڑا ناک پہ رکھ لیا۔ صحابہ رضؓ نے عرض کی یا رسول اللہؐ یہ کپڑا ناک پر کیوں رکھ لیا۔ فرمایا: یہاں کسی کی قبر ہے۔ اس میں سے بُو آ رہی ہے۔ یہ شخص وٹوانی (استنجے کا ڈھیلا) استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ کہہ کے مولوی صاحب نے اپنا زور خطابت ہماری طرف کیا۔ کہنے لگے، پتلون کا بٹن کھول کے کھڑے ہو کر دھار مارنے والے اسلام کا جھنڈا اٹھائے پھرتے ہیں، ساتھ ہی مجھے کہا، "آیئے خاں صاحب"! مجھے تو پتہ تھا۔ میں نے سوچا، سامعین میں سے کئی ایک نے مجھے عدالت میں جلدی جلدی میں کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا ہو گا۔ دوسرے اگر میں کہہ بھی دوں کہ مولوی صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ میری کون مانے گا۔ اس خیال سے مجھے پسینہ آ گیا۔ بہر حال اٹھتے اٹھتے انسپائریشن ہوئی۔ میں نے آ کے کہا: بھائیو!

آپ نے سن لیا کہ مسلمان کا کپڑا بھی پلید ہو جائے تو مرنے کے بعد اس کی قبر میں سے بدبو آتی ہے۔ یہ تو بقول مولوی صاحب حضورؐ کی حدیث ہے۔ بھائیو! مسلمان کا کپڑا بھی پلید ہو جائے تو اس کی قبر سے بدبو آتی ہے اور اگر روح پلید ہو جائے تو پھر کوئی علاج نہیں۔ میں نے کہا: یہ مولوی صاحب ہیں، احراری۔ احراریوں نے بیعت کر رکھی ہے گاندھی اور نہرو کے ہاتھ پر۔ مولوی صاحب کے سر پر قرآن رکھو، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا غلط۔ مولوی صاحب نے سر نیچا کر لیا۔ اصل میں حق کی طاقت تھی۔ میں نے کہا، مولوی بیشک سر نیوا نیچا کر، میں تیرے سر پر قرآن ضرور رکھواؤں گا۔ میں نے کہا: بھائیو! یہ جو ہمارے ہادی تھے، جب انہوں نے قرآن چھوڑ دیا تو ہم جو کھڑے ہو کر پیشاب کی دھار مارا کرتے تھے۔ ہمارے منہ پر لگی چھینٹ۔ ہم نے تعزیرات ہند پھینک دی۔ اور قرآن اٹھا لیا۔ لوگ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر لگانے لگے۔ مولوی صاحب اٹھ کے جانے لگے۔ میں نے کہا، مولویا! نہ جائیں، میں تیری روح پاک کر کے بھیجوں گا۔

اس سے پہلے میری عطاء اللہ شاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ اتنی عقیدت کہ ایک دفعہ خان گڑھ، نصر اللہ خاں کے ہیڈ کوارٹر میں ہی انہوں نے جلسہ رکھا ہوا تھا۔ نصر اللہ خاں کے والد نواب سیف اللہ خاں فوت ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ ان کے بڑے بیٹے نوابزادہ عبداللہ خاں اس وقت مالک تھے۔ شیخ نور محمد کا زمانہ تھا۔ میں پبلک پراسیکیوٹر تھا۔ اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کا مداح تھا۔ میں شیخ نور محمد کے ساتھ بات کرنے گیا کہ میں پبلک پراسیکیوٹر ہوں، لیکن میں نے شاہ صاحب کی تقریر سننے ضرور جانا ہے۔ کہنے لگے ضرور جانا ہے تو پھر ایک بات کریں، شاہ صاحب سے کہنا کہ وہ سیاسی تقریر نہ کریں، مذہبی کریں۔ میں نے کہا، پتہ نہیں کہ وہ مانتے ہیں کہ نہیں مانتے۔

میں وہاں پہنچا تو یہ پوزیشن تھی کہ نوابزادہ نصر اللہ خاں کے بڑے بھائی نوابزادہ عبداللہ خاں نے اس مسجد کو تالا لگوا دیا تھا، جہاں شاہ صاحب نے تقریر کرنی تھی۔ نواب زادہ عبداللہ خاں ہی اس وقت خاندان کے سربراہ تھے۔ اس وقت نصر اللہ خاں بہت چھوٹے تھے، میرے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں۔

سادھو رام ایک ہندو زمیندار تھا۔ اس کے ساتھ میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اس نے کہا کہ ساتھ کھو ہے، وہاں میں جلسے کے لیے جگہ بنا دیتا ہوں۔ میری وجہ سے اس نے کہا، ورنہ ہندو کو کیا ضرورت تھی۔ یہ الیکشن کا زمانہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کی بات ہے۔ (کانگریس احرار گٹھ جوڑ کا ابھی زمانہ نہیں آیا تھا) میں یہ مثال اس لیے سنا رہا ہوں کہ عطاء اللہ شاہ کے ساتھ میری عقیدت کا یہ عالم تھا۔ چنانچہ سادھو رام کے کھو پر سٹیج بن گئی۔ نو بجے شاہ صاحب شروع ہوئے، تین بجے انہوں نے ختم کیا۔ مضمون ان کا عبداللہ خاں ہی رہا۔ مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ سیاسی تقریر نہ کریں۔ انہوں نے اس آیت سے شروع کیا۔

"اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو

(فواحش) پر مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے، پھر اس پر (عذاب کا) حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا"

یہ آیت انہوں نے پڑھی، اوپر سے خوش الحانی تو تھی، پھر اس کا ترجمہ کیا، ہا... ہائے، کر کے لمبی سانس لے کے آہ بھری۔ قرآن اور سادھو رام کے گھر اور عبداللہ خاں مسجد کو ملدے جندرے (تالے) رب دے گھر نوں ... ہا۔

نو سے تین بجے تک اور باتیں بھی ہوتی رہیں لیکن تان آ کے عبداللہ خاں پر ہی ٹوٹتی رہی، مثلاً شاہ صاحب نے کہا، شام ہو گئی، دیے جلے۔ پروانوں میں سے ایک نے کہا کہ جا کے دیکھو تو سہی کہ دیے جلے کہ نہیں جلے۔ جو پروانہ جائے مڑ کے نہ آئے۔ ایک موٹا سا پونڈ عبداللہ خاں ورگا، عبداللہ خاں بڑا موٹا تھا، ایک موٹا سا پونڈ عبداللہ خاں ورگا کہنے لگا، میں جا کے پتہ کرتا ہوں، اس نے آ کے مسجدوں کو تالے لگا دیئے۔

یہ واقعہ میں نے آپ کو سنایا کہ الیکشن سے پہلے میری عطاء اللہ شاہ بخاری سے بڑی عقیدت تھی۔ اب الیکشن (۱۹۴۵ء) میں ان سے سامنا تھا۔ قرآنِ حکیم ان ہدایات سے بھرا ہوا ہے کہ مومنوں کی کافروں سے نہیں بن سکتی۔ میں نے قرآن خاصا حفظ کر لیا۔ میں نے قرآن میں سے رُولنگ نکالنی، مثلاً "جو ان کے منہ سے نکلتا ہے، جو ان کے دلوں میں مخفی ہے، وہ اس سے بھی بڑا ہے" میں نے بی اے تک عربی پڑھی تھی۔ آسانی رہی۔

جہاں شاہ صاحب نے جلسہ کرنا، چوتھے روز میں نے وہاں پہنچ جانا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو میں کہوں گا، وہ لوگ مانیں گے بھی کہ نہیں۔ میرا ذاتی رسوخ تھا۔ میں نے کہنا، بھائیو! اگر میں تمہیں رب کا حکم سناؤں، اپنا نہیں، میں آپ کو رب کا حکم سنانے آیا ہوں، آپ میں سے کوئی حافظِ قرآن ہے کسی نے کہنا، ہے۔ اسے میں نے اپنی دائیں جانب بٹھا لینا، مولوی صاحب کو بائیں جانب بٹھا لینا۔ آیت پڑھنی، پوچھنا، "حافظ جی ٹھیک پڑھی ہے" انہوں نے کہنا، "ہاں، قرآن میں یہ ہے" ترجمہ کر کے مولوی صاحب سے پوچھنا، مولوی صاحب ترجمہ ٹھیک کیا ہے۔ انہوں نے کہنا، "ٹھیک کیا ہے" میں نے کہنا "قرآن کا ہے"۔ انہوں نے کہنا "ہاں قرآن کا ہے" پھر میں سامعین سے کہتا، یہ ہے رب کا حکم، پھر ان سے پوچھتا، آپ رب کا حکم مانیں گے کہ ڈپٹی کمشنر کا۔ لازمی طور پر انہوں نے رب کا کہنا، پھر میں نے تھانیدار پہ آنا۔ اخیر میں میں اس بات پر آتا، آپ رب کا حکم مانیں گے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری کا۔

س:۔ یہ تو معرکۃ الآرا واقعات ہیں اور سنایئے۔

ج:۔ مقصود پور موضع کا عطا حسین ذیلدار ہوتا تھا۔ وہ پیر بھی تھا اور سید بھی اور زمیندار بھی۔ اس کے موضع میں کوئی نہ جائے۔ میں نے پوچھا، کیوں نہیں جاتے، کہنے لگے، وہاں جا کے وقت ضائع کرنا ہے، وہاں عطا حسین ہے، اور عطا حسین یونینسٹوں کے ساتھ ہے، وہ لوگ شیعہ بھی تھے، اور بڑے کٹر شیعہ، اتنے کٹر کہ مدح صحابہؓ کی تحریک شروع ہوئی تو ان میں سے تین آدمی لکھنؤ گئے اور قید

ہوئے، میں نے اپنے آدمیوں سے پوچھا کہ وہ تین آدمی زندہ ہیں۔ انہوں نے بتایا، ہاں زندہ ہیں۔ رحمتِ ربی دیکھو کہ میں مقصود پور گیا۔ اور وہاں جو تین آدمی بیٹھے ہوئے مجھے ملے، وہ وہی تھے۔ "اسلام علیکم"۔ "وعلیکم اسلام"۔ "کون ہو تم جوان؟" "میں عبدالحمید ہوں"۔ کہنے لگے: "اچھا ووٹاں لئی آیاں ایں"۔ میں نے کہا "نہیں"۔ "نہیں! آپ ووٹوں کے لیے نہیں آئے"۔ میں نے کہا "نہیں"۔ کہنے لگے، "آپ وہی عبدالحمید نہیں جو الیکشن پہ کھڑے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا، "ہوں تو وہی"۔ "ووٹوں کے لیے نہیں آئے تو پھر کس لیے آئے ہو"۔ میں نے کہا، میں اپنا پلہ صاف کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس جگہ کی زبان میں کہتے ہیں، "لے بھائی، تیرے پلے نوں کے لگا ہویا اے"۔ میں نے کہا ہم کہتے ہیں ووٹ، عربی میں کہتے ہیں بیعت، یزید نے حسینؓ سے کہا کہ مجھے ووٹ دو، یعنی میری حکومت کو تسلیم کرو، انہوں نے جواب دیا، نہیں تو اس قابل نہیں۔ تو فاسق ہے، تو فاجر ہے۔ میں تجھے ووٹ نہیں دوں گا۔ یزید نے کہا، میں آپ کے بچے مار دوں گا۔ اُدھر سے جواب ملا۔ مار دے لیکن ووٹ نہیں دوں گا۔ میں نے کہا، حسینؓ نے قربانی دے دی۔ ووٹ نہ دیا۔ یزید تو کلمہ گو تھا اور آپ ووٹ دے رہے ہیں، کافر کو، آپ کی پُرسش ہو گی تو آپ کہیں گے، توبہ توبہ ہم نے تو فضل کریم یا نصر اللہ خاں کو ووٹ دیا تھا۔ ہم نے تو کافر کو نہیں دیا تھا، پھر میں پکڑا جاؤں گا کہ تو نے انہیں کیوں نہیں سمجھایا تھا۔ بھائیو! اب گواہ رہنا میں نے سمجھا دیا ہے۔ اب جدھر کو آپ کی مرضی ہو، اُدھر کو چلے جائیں۔ یزید پھر بھی کلمہ گو تھا۔ گاندھی اور نہرو تو بالکل کلمہ گو نہیں۔ یہ معاملہ تو اسلام اور کفر کا ہے۔ آپ جانیں اور آپ کا کام اور میری طرف سے اسلام علیکم۔

میں جانے لگا تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا، "گونگلواں توں مٹی جھاڑ کے چلیاں ایں"۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ وہ کہنے لگے، ہم کوئی تین افراد نہیں، ہم تو چھ سو ہیں۔ میں نے کہا، میں نے آپ سے کہہ دیا، آپ ان سے کہہ دیں، "ہم آپ کی زبان کہاں سے لائیں گے"۔ میں نے کہا، پھر کیا چاہتے ہو، کہنے لگے، آپ یہاں بیٹھیں، ہم انہیں اکٹھا کرتے ہیں۔ انہوں نے اکٹھا کیا۔ امام باڑے میں لے گئے۔ وہاں میں نے آدھا گھنٹہ تقریر کی۔ ان کو تھوڑا سا رُلایا بھی۔

میری تقریر کے بعد ایک بوڑھا آدمی بولا، پیر صاحب (پیر عطا حسین) آئیں گے تو انہیں کیا کہیں گے۔ انہی میں سے ایک نے جواب دیا، پیر صاحب سے کہیں گے، "پیرا اگوں ہٹ جا، اسی انھے اُوں، گھوڑی کھول لے، بکرے پٹ لے، ڈھگا کھول لے، پر ساڈے ایمان نوں ہتھ نہ پانویں"۔ مقصود پور ہمیں ایک بھی ووٹ میرے خلاف نہ گیا۔

میں نے سارے علاقے کا دورہ کیا۔ انہیں مثالیں دے دے کے سمجھاتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں میں ایمان تھا۔ ان کی سمجھ میں آ جائے، کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے، پھر وہ بھٹک نہیں سکتے تھے۔ مقصد بڑا واضح تھا۔ انہیں میں جاٹوں کی مثال دیتا تھا۔ وہاں مربعے نہیں اکٹھے ہوتے تھے۔ زمین کھو (کنوئیں) سے سیراب ہوتی تھی۔ پانی سہ ماہی ہوتا تھا۔ کھو کا ایک حلقہ ہوتا تھا۔ ایک کھو میں جس کے تین حصے وہ مالک ہوتا تھا۔ جس کا چوتھا حصہ ہوتا وہ مالک نہیں ہوتا تھا۔ میں انہیں جا جا کے کہتا کہ چوتھے حصے والا

نہ تو مزارع رکھ سکتا ہے، نہ ڈھیری اٹھا سکتا ہے۔ نہ مزارع کو حکم دے سکتا ہے کہ یہ کاشت کرو اور یہ نہ کرو۔ میں انہیں کہتا، انگریز جانے والا ہے۔ تین وہ ہیں اور چوتھے ہم۔ ہندو اب تو آپ کو پانی پلاتے وقت گڑوی اوپر فاصلے پر رکھ کے انڈیلتا ہے کہ کہیں مسلمان کا ہاتھ لگ گیا تو گڑوی پلید ہو جائے گی۔ اگر پاکستان نہ بنا، اور انگریز راج ہندو کانگریس کے حوالے کر گیا تو پھر ہندو آپ کو اس طرح پانی نہیں پلائے گا۔ بلکہ پانی کی جگہ پیشاب پلائے گا۔ اس قسم کی مثالیں میں انہیں دیتا تھا۔ بات تھی بھی صحیح کہ ہم مسلمانوں کو الگ ملک دیدو، پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔

میں بتا رہا ہوں کہ کیا تکلیفیں تھیں۔

رُول یہ تھا کہ اَن پڑھ ووٹر کے ساتھ ایجنٹ جائے اور دیکھے کہ اَن پڑھ ووٹر جسے ووٹ دینا چاہتا ہے۔ اسی کو پڑ رہا ہے، دیکھیں، گورنمنٹ مسلم لیگ کے امیدوار کو ہرانے کے لیے ہر مرحلے پر کس طرح بندوبست کیے ہوئے تھی۔ پولنگ کے روز پولنگ افسر نے بتایا کہ وہ بحکم ڈپٹی کمشنر پولنگ ایجنٹ کو اَن پڑھ ووٹر کے ساتھ اندر نہیں آنے دے گا۔ مجھے یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔ میں نے پولنگ افسر سے کہا کہ یہ بات لکھ دے۔ کہنے لگا آپ درخواست دیں، میں لکھ دیتا ہوں۔ میں درخواست لکھنے کے لیے باہر آیا تو خیال گزرا کہ تو لکھ بھی دے گا تو کیا کرے گا۔ ٹیلیگرام بھی دینا چاہے تو کسے دے گا ویسے بھی یہاں ٹیلیگراف کا انتظام نہیں، پھر تو قصہ ہی ختم۔ اس لیے عبدالمجید غصہ ٹھنڈا کر۔

ہمارے ہاں کتوں کے ساتھ سؤر کا شکار کھیلتے ہیں، جس وقت سؤر بے بس ہو جائے وہ چیخ مارتا ہے۔ اسے "ری" کہتے ہیں۔

میرا پولنگ ایجنٹ بڑا الرٹ تھا۔ ابھی بیس ووٹ بھگتے تھے کہ پولنگ افسر دوار کا ہاتھ میرے پاس آیا۔ "ایجنٹ بدلو"۔ میں نے کہا اتنی جلدی "ری" کیوں دی۔ فہرستیں لے کے پٹواری وغیرہ جو بیٹھے تھے، وہ کھلکھلا کے ہنس دیئے۔ دوار کا ہاتھ پوچھتا ہے، کیا مطلب؟ میں نے کہا اتنی جلدی ہتھیار کیوں ڈال دیئے۔ کہنے لگا، ہتھیار نہیں ڈالے۔ ابھی پنسل میرے ہاتھ میں نہیں آرہی، کبھی تو تیرے ایجنٹ کا منہ دوسری طرف ہو گا تو پنسل میرے ہاتھ میں آئے گی۔

ان حالات میں ہم نے وہ الیکشن لڑے اور اللہ کے فضل سے جیتے۔ میرے ووٹ نوابزادہ نصراللہ خاں اور فضل کریم قریشی کے مجموعی ووٹوں سے بھی زیادہ نکلے، اُدھر مظفر گڑھ کی کوٹ ادو والی نشست پر مسلم لیگی اُمیدوار غلام جیلانی گورمانی اور ملک قادر بخش کے درمیان مقابلہ تھا۔ اس سیٹ پر اللہ کا فضل یہ ہوا کہ ملک قادر بخش بیچ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس طرح ضلع مظفر گڑھ کی دو نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ تیسری نشست ہم ہار گئے۔ میں نے ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ گالیاں دیں، کچھ کریں مشتعل نہیں ہونا۔ نصراللہ خاں جتوئی ہمارے اُمیدوار تھے۔ اشتعال میں آگر وہ واک آؤٹ کر گئے۔ یوں وہ سیٹ ہم نے کھو دی۔ نصراللہ خاں جتوئی کا بیٹا نذر محمد جتوئی پیچھے پارلیمنٹ کا ممبر رہا ہے۔

س:۔ آپ کے علاقے میں مسلمانوں کے مالی حالات کیا تھے۔

ج :۔ عام آدمی تو مخبر لیس ہی رہتا تھا۔ بڑے زمینداروں کا یہ حال تھا۔ مثلاً نواب زادہ نصر اللہ خاں جو قیام پاکستان کی مخالف احرار کے امیدوار تھے ان کے والد نواب سیف اللہ خاں ہندو کے مقروض تھے۔ فضل کریم قریشی جو انگریز کی حامی اور پروردہ یونینسٹ پارٹی کے امیدوار تھے ان کے والد بھی ہندو کے مقروض تھے۔ ان لوگوں کی کئی بار قرقیاں ہوئی تھیں۔ ان کے پاس جنس ہوتی تھی۔ پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ جنس کی قیمت تھوڑی تھی۔ ان کے خرچ زیادہ تھے۔ اصطبل میں پندرہ پندرہ گھوڑے رکھے ہیں ہر گھوڑے پر ایک نوکر ہے۔ شاہی خرچ تھے۔ ہمارے علاقے کا ہندو ساہوکار صاحب رام تھا۔ ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس لیے صاحبا کانا کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ جب نواب صاحب نے ملتان جانا ہوتا، نواب صاحب نے اپنے ملازم سے کہنا، جائیں فرا صاحبا رام سے سو روپے پکڑ لائیں۔ انہوں نے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا ہوتا تھا۔ خرچ تو تھے۔ حالانکہ نواب سیف اللہ خاں بڑا شریف قسم کا آدمی تھا۔ لیکن وہ بھی مفلس۔ کراڑ (ہندو) نے آنا "مہاراج! حضور کا آدمی آیا تھا سو روپے لے گیا۔ میں نے چر کا ناکاٹ لیا ہے۔ اور پچاس من کنک لگا دی ہے۔ نہ دی تو ڈیڑھ گنا۔ مہاراج یہاں دستخط کر دیں۔" "کہاں کرنے ہیں؟" "یہاں مہاراج!" نواب صاحب کو اب سو تو یاد نہیں۔ وہ اگلے سال ڈیڑھ سو ہو جائے، پھر دو سو۔ اس طرح بڑھتے رہتے۔ غریب مسلمان تو لیس ہی رہا تھا۔ امیر مسلمان بھی ہندو ساہوکاروں کا مقروض ہی رہتا تھا۔

نواب زادہ نصر اللہ خاں، نواب زادہ سیف اللہ خاں کی دوسری بیوی میں سے تھے۔ نواب سیف اللہ خاں نے ۷۰ سال کی عمر میں دوسری شادی کی، مالیر کوٹلہ میں۔ اس بیوی سے ان کے دو بیٹے ہوئے نصر اللہ خاں اور سعید اللہ خاں۔ یہ دونوں چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ نواب زادہ عبداللہ خاں جو نواب صاحب کی پہلی بیوی سے تھا، وہ ان پر قابض ہو گیا۔ انہیں کھانے پینے کی تکلیف دے۔ ان کی والدہ نے اپنے بھائی محمد حسین کو مالیر کوٹلہ سے بلایا۔ وہ پھر میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میں ان کی امداد کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے ڈپٹی کمشنر شیخ نور محمد تھے۔ یہ نارووال کے تھے۔ شیخ سراج دین کے بعد کا زمانہ ہے۔ شیخ نور محمد بھی بڑا مسلمان آدمی تھا۔ انہیں میں نے کہا کہ نواب سیف اللہ خاں کے دونوں بیٹوں کو کورٹ آف وارڈ دلا دیں تاکہ یہ باقی بھائیوں کی گرفت سے بچ جائیں۔

س :۔ گورمانیوں کی اس زمانے میں کیا پوزیشن تھی۔

ج :۔ گورمانی اپنی تحصیل میں بہت بارسوخ تھے۔

س :۔ نہیں، مالی اعتبار سے۔

ج :۔ یہ بھی ہندو کے مقروض ہی رہتے تھے۔ ویسے ان کی جائیداد بہت تھی۔ میاں مشتاق احمد گورمانی نے جب یہ آکے سنبھال لی تو پھر ان کی حالت بہتر ہو گئی۔

س :۔ مسلم لیگ الیکشن جیت گئی۔ پھر پنجاب کے وزیر اعظم سر خضر حیات ٹوانہ کے خلاف ایک موومنٹ چلی تھی۔

نح: جب خضر حیات کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلی اور پنجاب مسلم لیگ کے قائدین، ممدوٹ، دولتانہ اور میاں افتخار الدین وغیرہ پکڑے گئے۔ تو مجھے تار ملا کہ فوراً لاہور پہنچیے۔ شیخ صادق پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ ان کی صدارت میں اسمبلی ممبرز کی اسمبلی ہال میں میٹنگ ہوئی۔ باہر خلقت ہی خلقت، میدان میں پولیس۔ شیخ صادق حسن نے کہا کہ آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ قوم آپ کے انتظار میں ہے، آپ اپنے اپنے اضلاع میں جائیں اور اگلے ماہ کی چار تاریخ تک کوئی ممبر جیل سے باہر نہ رہے، اس وقت ہمیں سات ایسے آدمی چاہئیں جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے والنٹیر کر سکیں۔ شیخ صاحب نے سات افراد کا کہا، وہاں سارے ہی کھڑے ہو گئے۔ شیخ صاحب نے کہا۔ میں نے سات آدمی مانگے ہیں، اس لیے سات آدمی کھڑے رہیں۔ باقی بیٹھ جائیں۔ کوئی نہ بیٹھے۔ کمیٹی بنانا پڑی کہ وہ فیصلہ کرے، کون سے سات جانے چاہئیں، اس پر ہر ایک نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں کہ میرا حق فائق ہے۔ گرفتاری کے لیے مجھے موقع دیا جائے۔ بہرحال جوں توں کر کے سات افراد کو منتخب کیا گیا۔ سیڑھیوں پر لوگ ہار لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے نعروں کے شور میں ان سات افراد کو ہاروں سے لاد دیا۔ اور میں مظفر گڑھ سے گرفتاری پیش کرنے کے لیے واپس چلا آیا۔

مظفر گڑھ پسماندہ ضلع تھا۔ وہ لوگ قید سے بہت گھبراتے تھے، میرا خیال تھا کہ یہ تحریک وہاں کامیاب نہیں ہو سکے گی، اس لیے میں نے آٹھ مسلم لیگیوں کو بلایا اور کہا جمعہ کے روز دفعہ ۱۴۴ توڑ کے گرفتاریاں پیش کرنی ہیں۔ اگلے جمعہ فلاں فلاں اصحاب گرفتاریاں دیں گے، اور اس سے اگلے جمعہ یہ پروگرام ہو گا۔ یوں ہم نے آٹھ جمعہ کا پروگرام وضع کر لیا، اس خیال سے کہ اور کچھ نہیں تو آٹھ ہفتے تک جیل جانے کی تحریک تو چلتی رہے۔ ڈپٹی کمشنر کو پتہ چل گیا۔ تو اس نے آرڈر کیا کہ ان آٹھوں مسلم لیگیوں کو پکڑ لیا جائے۔ ہمیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ ابتدائی آٹھ آدمیوں کی اس گرفتاری سے کہیں تحریک ہی نہ بیٹھ جائے۔ اس دوران میں ایس پی نے کہلوا بھیجا کہ میں نے آپ لوگوں کو پکڑنے کے لیے رات بارہ بجے آنا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ آپ ادھر ادھر کھسک جائیں۔ اور جمعہ کے روز گرفتاری دے دیں۔ ایس پی مسلمان تھا، آغا سعادت علی قزلباش۔ میں گھر گیا، میں نے کہا میں "دستی والا" چلا ہوں، کوئی پوچھے تو میرا بتانا نہیں، میں کل جمعہ کے وقت آ جاؤں گا۔ گھر والوں نے پوچھا آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے وجہ بتا دی تو انہوں نے کہا، یہ غلط بات ہے، دنیا سمجھے گی، آپ بھاگ گئے، انہیں آپ کے منصوبے کا کیا علم۔ جیسے ہی پولیس پکڑنے آئے گی، وہ بھاگ جائے گا۔ کہ بڑے بھاگ گئے ہیں، ہم کیوں گرفتاری پیش کریں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ رات بارہ بجے ایس پی آیا، اس کے ساتھ سکھ ڈی ایس پی اور گارد بھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم موجود نہیں ہوں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ تو بستر وغیرہ باندھ کے گرفتاری کے لیے تیار بیٹھے ہیں، وہ حیران رہ گیا "ہیں"! پھر اسے خیال آیا کہ ساتھ گارد ہے، سکھ ڈی ایس پی ہے، اب اس نے بات کا رخ یوں موڑا، "ہیں، میں سمجھا کہ آپ سو

رہے ہوں گے۔"

ہم اس بات سے مایوس ہو چکے تھے۔ کہ کم از کم مظفر گڑھ میں تحریک نہیں چلے گی، اگلے روز ہم جیل میں نماز ظہر کے بعد خدا تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے "یا اللہ یہ تحریک چل پڑے کہ اتنے میں وارڈ عشر بھاگتا ہوا آیا "جلوس آ گیا" ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جلوس جو دیکھا تو اتنا لمبا کہ تا حدِ نگاہ انسان ہی انسان۔ میں بتا یہ رہا ہوں کہ جذبے کا یہ عالم تھا، مظفر گڑھ جیسا پسماندہ ضلع، جہاں لوگ قید کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے۔ سینے تان کر سڑکوں پر نکل آئے کہ "بن کر رہے گا پاکستان"، "پاکستان زندہ باد"، "قائد اعظم زندہ باد"۔

پھر ڈپٹی کمشنر نے ہمارے متعلق کہا کہ جتنی دیر یہ لوگ مظفر گڑھ میں رہیں گے، تحریک زور پکڑتی رہے گی، انہیں یہاں سے نکالو۔ وہ ہمیں ملتان جیل لے جا رہے تھے کہ مظفر گڑھ کے عوام سڑک پر آ گئے۔ راستہ روک لیا۔ ایس پی نے مجھے کہا کہ آپ کہیں گے تو یہ لوگ راستہ دیں گے۔ میں باہر نکلا اور کہا، راستہ چھوڑ دو۔ اس وقت جذبے کا یہ عالم تھا۔

لوگوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو کس قدر صدقِ دل سے قبول کر رکھا تھا، میں جیل میں تھا کہ دو تین قیدی روٹی دینے والے کو ساتھ لے کے میرے پاس آ گئے۔ "آپ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ ہمیں جیل میں کھانے کو کیا مل رہا ہے" میں نے انہیں کہا، آپ بھی قیدی، میں بھی قیدی۔ انہوں نے پھر کہا "قیدی بیشک ہو، مسلم لیگ کے ہو اس لیے ہماری طرف سے آپ ہی نے بولنا ہے، اس لیے ہم یہ سالن بطور نمونہ آپ کے پاس لائے ہیں، ذرا اسے چکھیئے تو" کہ ساگ پکا ہوا ہے اس کے پتے پانی میں تیر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہا کیا چکھوں، نظر آ رہا ہے۔ وہ مصر ہوئے کہ چکھیے ضرور اس میں نمک بھی نہیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ جیل میاں محمد شفیع کے پاس گیا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ کہنے لگا کیسے آئے ہو۔ میں نے کہا، "رب بھیجے آیا ہوں چھ آنے میں"۔ کہتا ہے، سمجھا نہیں۔ میں نے کہا چار آنے کی لکڑیاں، دو آنے کا نمک، اس کے ساتھ رب راضی ہو جاتے۔ کہنے لگا، ابھی نہیں سمجھا۔ میں نے کہا ساگ کے پتے پانی میں تیر رہے ہیں، چار آنے کی لکڑیوں اور دو آنے کے نمک سے رب راضی ہو جائے گا۔ کہنے لگا، کیا کروں میں ہوں ایک۔ عملہ ہے پچاس، کس کس کے سر پر کھڑا رہوں۔ جو چیز آتی ہے پہلے گھروں کو بھیج دیتے ہیں، جو بچ رہے وہ یہاں رکھ لیتے ہیں۔

آٹھ مسلم لیگی ہم تھے دو اور آ گئے۔ دس ہو گئے، پھر ملتان اور خانیوال سے بھی لوگ آ گئے۔ اس طرح ہم چودہ مسلم لیگی ہو گئے تھے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا کہ اگر تجھے آدمیوں کی ضرورت ہے، تو چودہ میں دے دیتا ہوں۔ کہنے لگا دے دو۔ میں نے مسلم لیگی ساتھیوں سے کہا جاؤ کام کرو۔ پانچویں روز جیل کا عملہ میرے پاس آ گیا۔ "یہ یاجوج ماجوج کی قوم ہمارے اوپر سے اتاریں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کھانا ٹھیک پکائیں گے۔"

جیل میں چکر ہوتے ہیں، اس جیل میں سات چکر (ایریا) تھے۔ ہر چکر میں جا کر میں نے مسلمان قیدیوں کو نماز کی تلقین کی، کہ کل سے ہر چکر سے اذان بلند ہونی چاہیئے۔ دو دفعہ میں اس طرح پھرا۔ اذانیں بلند ہونے لگیں۔ ایک روز ایک سکھ نے شکایت کی آج فلاں مسلمان نے نماز نہیں

پڑھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ سردار تو نے پاٹھ کیا تھا؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا، پھر دُوسروں کی شکایت کیوں؟

جب ہم رہا ہو کر جیل سے نکل رہے تھے تو سارے قیدی دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ نواب عاشق حسین کی والدہ زندہ تھیں انہوں نے ہمارے لیے اپنی موٹر بھیجی تھی۔ ہم اس پر بیٹھ کے آ گئے۔

س:۔ جب پاکستان بن گیا پھر،

ج:۔ جب پاکستان بن گیا۔ لیڈر کا انتخاب ہونا تھا کہ کون ہو ایک طرف نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ تھے۔ دوسری طرف ملک فیروز خاں نون تھے۔ نون صاحب مرکز میں ایجوکیشن منسٹر رہ چکے تھے، پھر یہ ہائی کمشنر ہو کے لندن چلے گئے تھے۔ ممدوٹ کی بجائے ہمارا رجحان فیروز خاں نون کی طرف تھا۔ نون کے چیف کنویسر مولانا عبدالستار نیازی تھے۔ ممدوٹ کے چیف کنویسر ممتاز دولتانہ تھے۔ ممدوٹ کا گھر مسلم لیگ کا دفتر ہوتا تھا۔ ممدوٹ کا پیسہ مسلم لیگ کا خزانہ ہوتا تھا۔ ممدوٹ کی خدمات ناقابل فراموش تھیں۔

قائداعظمؒ کی ہدایت آ گئی کہ ممدوٹ کو پارٹی لیڈر چنا جائے۔ چنانچہ نون بیٹھ گئے۔

س:۔ قائداعظمؒ نے ہدایت بھیجی۔ اس کا ثبوت؟

ج:۔ مجھے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے کہا کہ قائداعظمؒ نے ہدایت بھیجی ہے کہ "ممدوٹ کو لیڈر بنایا جائے"۔ اس لیے آپ جا کے نون کو سمجھائیں کہ اب اسے کھڑا ہونا زیب نہیں دیتا۔ میں جا کے نون کو سمجھا رہا تھا کہ قائداعظمؒ کی ہدایت کے بعد آپ کا کھڑا رہنا ایک قسم کا کفر ہے۔ تو ایک صاحب جو نون کے کنویسر تھے، اور آج کل ایک مذہبی سیاسی جماعت کے لیڈر ہیں۔ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا "کیوں"؟ کہنے لگے "ان حرام زادوں کو لڑنے دو۔ میرے لیے جگہ نکلے گی"۔ خیر!

ممدوٹ لیڈر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے منسٹری بنائی۔ ممتاز دولتانہ۔ سردار شوکت حیات شیخ کرامت علی۔ اور میاں افتخار الدین پر مشتمل کابینہ بنی۔ میاں افتخار الدین کی مجھے تار ملی "فوراً پہنچیے"۔ میں آیا۔ ان کی کوٹھی پہنچا۔ باہر چودھری محمد حسین چٹھہ بھی بیٹھے تھے۔ چودھری فضل الٰہی بھی بیٹھے تھے۔ راجہ سید اکبر تھے پنڈی کے، وہ بھی بیٹھے تھے میں نے اطلاع بھیجی۔ انہوں نے بلا لیا۔ کہنے لگے آپ کو پارلیمانی سیکرٹری لے رہا ہوں۔ اس وقت پارلیمانی سیکرٹری کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ہوتی تھی۔ میں نے کہا، میاں صاحب اگر آپ مجھے یہ عہدہ بطور انعام دے رہے تو یہ انعام نہیں ہے۔ یہ سزا ہے کیونکہ میں مظفر گڑھ میں وکالت کرتا ہوں۔ میرے گھر کا اناج۔ میرے گھر کی لکڑی میرے گھر کا دُودھ دہی۔ پھر میری وہاں جمعہ داری۔ میرا وہاں نام۔ اُرلم پرلم۔ ایس لئی ایہہ انعام شنام کوئی نئیں جے۔ ہاں اگر مسلم لیگ کو میری ضرورت ہے تو وہ الگ بات ہے۔ رکھ لیا انہوں نے۔

میاں صاحب وزیر مہاجرین تھے۔ مہاجرین کا کام دو قسم کا تھا۔ ایک سول دوسرے فوجی۔ فوجی اس طرح کہ جو مسلمان بھارتی کیمپوں میں تھے، انہیں لانے کے لیے ملٹری جائے۔ اس وقت

تک ابھی ملٹری تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وائسرائے کی ریذیڈنسی میں میاں صاحب نے اپنا دفتر بنا لیا۔ میاں صاحب ملٹری والا حصہ ڈیل کرتے تھے۔ اور میرے سپرد سول کا کام تھا۔ میرا دفتر سیکرٹریٹ میں تھا۔ سول معاملات میں میرے دستخط وزیر کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ ہسپتالوں سے ڈاکٹر چلے گئے تھے۔ سٹیشنوں پر بابو نہیں تھے۔ دکانیں ہیں، دکاندار نہیں، چوہڑے بھی چلے گئے تھے۔ ہر چیز لوٹی ہوئی تھی۔ ہندو جاتے وقت مسلیں پھاڑ گئے تھے۔ آڑھتی جاتے ہوئے اناج جلا گئے تھے۔ اتنا کام تھا کہ میں صبح آٹھ بجے سیکرٹریٹ آتا۔ رات ساڑھے نو بجے فارغ ہوتا، پھر مجھے حکم تھا کہ ریذیڈنسی پہنچ کر منسٹر کو ڈیلی رپورٹ دوں۔ چونکہ اس وقت مہاجرین کو لانے، بٹھانے اور لبانے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اخبارات میں یہی خبریں نمایاں ہوتی تھیں۔ میاں افتخار الدین نے یہ کر دیا، وہ کر دیا۔ سیکرٹریٹ میں میری طلبی ہوگئی۔ ممدوٹ بھی تھے، دولتانہ بھی تھے۔ شوکت حیات بھی تھے۔ انہوں نے کہا بھئی یہ کیا اخبارات بھری ہوتی ہیں کہ میاں صاحب نے یوں کر دیا، میاں صاحب نے وُوں کر دیا۔ میں نے کہا کام جو کرتے ہیں۔ کہنے لگے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ گورنمنٹ نے یہ کیا۔ میں نے آکے میاں صاحب سے کہا کہ پریس والوں سے کہیں کہ آپ کا نام نہ لکھا کریں۔ گورنمنٹ کا لکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بڑھتی رہی، کیونکہ میاں صاحب نے پھر استعفا دیدیا۔

س:۔ ان میں سے بعض لوگ پسند نہیں کرتے ہونگے کہ اس طرح میاں صاحب کا وقار عوام میں بڑھے اور وہ مقبول ہوں۔

ج:۔ بہر حال، میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ یہ وقت استعفا دینے کا نہیں، اس وقت ملک کو آپ کے تجربے کی ضرورت ہے۔ ان کا تجربہ بہت تھا، کیونکہ کانگریس میں رہے تھے۔ ہم میں سے کسی کو تجربہ ہی نہیں تھا۔ ہندو کا ذہن، انگریز کا ذہن کام بہت کرتا تھا۔ مسلمان نقل نویس اچھے تھے۔ میاں افتخار الدین میں یہ تھا۔ کہنے لگے، یہ تحریک سو گئی تھی۔ میں سوچتا رہا، کیسے کیا جائے۔ میں نے پولیس کو آدمی بھیج دیا کہ آج مسلم لیگ کی میٹنگ ہو رہی ہے، اس میں اس نے بڑا خوفناک ریزولیوشن پاس کرنا ہے۔ پولیس کو اطلاع ملی تو وہ آگئی وہ ابھی دروازے تک پہنچی تھی کہ میں بھی دوڑ کے دروازے تک چلا گیا، "آپ کون ہیں یہاں سے دفعہ ہو جائیں" بھلا وہ ایس پی۔ پولیس اس کے ساتھ تھی۔ ادھر میں نے کہا، جلدی سے کاغذات ایک طرف کر دو، میں نے شور و ور مچایا۔ انہوں نے ہمیں پکڑ لیا۔ ہم سات تھے۔ انہوں نے ساتوں کو ہی پکڑ لیا۔ جن میں ممدوٹ، دولتانہ، نون بھی تھے۔

میاں افتخار الدین کہتے ہیں، میں نے ہی اس میں جان ڈالی ورنہ یہ سو رہے تھے، واقعی اس تحریک کے ساتھ تحریک بن گئی۔ میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں ہر ایک نے جیل جانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میں ملتان جیل میں تھا۔ پولیس فخر امام کے چچا نو بہار شاہ کو پکڑ لے۔ اور سولہ میل دور جا کے چھوڑ دے۔ اسے پتہ چلا کہ میں ملتان جیل میں ہوں۔ اس نے مجھے پیغام بھیجا، سنا ہے یہاں

کا کپتان (ایس پی) آپ کا واقف ہے، اسے کہو کہ مجھے قید کرے۔ چار تاریخ نزدیک آ رہی ہے جذبہ یہ تھا کہ سفارشوں کے ساتھ ہم قید ہوتے تھے۔ اس جذبے کو ہم قائم نہیں رکھ سکے۔

س:۔ کیوں؟

ج:۔ اس لیے کہ جب الیکشن ختم ہو گیا، وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ یہاں آ گئے۔ انہوں نے پاکستان کے حامیوں کو آہستہ آہستہ کہنیاں مار مار کر باہر نکالا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۵۸ء والا مارشل لاء لگا تو وہ لوگ چھائے ہوئے تھے جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ؎

عقل عیار ہے، سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ، نہ ملا، نہ مفتی، نہ حکیم

پاکستان بنانے والے مارے ہوئے تھے جذبات کے، ادھر عشق تھا، ادھر عقل تھی، جو ممدوٹ کو بھی کھا گئی، ممتاز کو بھی کھا گئی، مولوی باری کو بھی کھا گئی، خواجہ ناظم الدین کو بھی کھا گئی۔ سب کو نکالا، سکندر مرزا آ گیا۔ جذبے کو ہم قائم نہ رکھ سکے۔ اس کے باوجود اگر ایوب والا مارشل لاء نہ لگتا تو ہم اس نکتے تک پہنچ گئے تھے، جسے یہ غیر مستحکم حکومت کہتے تھے۔ دراصل وہ غیر مستحکم حکومت نہیں تھی جس طرح پرسے آپ کنک اٹھا کے لاتے ہیں، اس میں روڑے بھی ہوتے ہیں مٹی بھی ہوتی ہے۔

س:۔ حالات کی خرابی کا آغاز اسی روز نہیں ہو گیا، جب دولتانہ ممدوٹ کشمکش نے جنم لیا۔ اور پھر بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اُونٹ کسی کروٹ بیٹھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

ج:۔ ممدوٹ اور ممتاز کی آپس میں لڑائی بڑی افسوسناک تھی، ممتاز کا اگلے روز بیان آیا ہے، کہ میں نے بڑی غلطی کی۔ بڑی دیر کے بعد انہوں نے تسلیم کیا۔ انہیں شاید یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ ہم جو دیہاتی پاگل تھے۔ وہ اس صورت حال سے کس قدر پریشان تھے۔ میں نماز فجر کے بعد علی الصبح ہی ان کی خوابگاہ میں چلا گیا۔ میری آنکھوں سے صرف آنسو ہی گرنے باقی رہ گئے تھے۔ باقی میں نے سب کچھ کیا۔ ان کی منت کی کہ ممدوٹ کا بینہ سے استعفانہ دیں۔ دراڑ پڑ گئی تو اس دراڑ کے ساتھ کام خراب ہو جائے گا۔ پتہ نہیں ممتاز کو یاد ہے کہ نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بڑی لجاجت سے ان کی منت کی، سماجت کی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر یہ گئے تو ہم کدھر کے رہیں گے۔ یہ ممدوٹ کے رائٹ ہینڈ تھے، ممدوٹ وزارت میں کرتا دھرتا دولتانہ ہی تھے۔ انہیں پنجاب کا دماغ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجوہ بھی تھیں، لائق آدمی تھے، آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے۔ ہماری بدبختی کہ ان دونوں میں پڑ گئی، ممدوٹ نیک آدمی تھا، بھلا مانس، شریف، سیدھا، خدا جانے کیا چیز حائل ہو گئی، ان کی بن نہ سکی۔

س:۔ ان کی یہ چپقلش پورے ملک پر اثر انداز ہوئی؟

ج:۔ ہوئی۔ یہ تو آپ کو بھی پتہ ہے۔ مجھے بھی پتہ ہے۔

س :۔ آپ ان واقعات کے قریبی شاہد ہیں۔ اس لیے آپ کی رائے اور ویلیو رکھتی ہے۔

ج :۔ یہ تو ظاہر بات ہے۔ پھر قائداعظمؒ نے ان دونوں کو ایک دوبار اپنے پاس بلایا بھی۔ وہاں یہ مان آئے کہ ہم بطور ٹیم کام کریں گے۔ یہاں آتے تھے تو پھر شروع ہو جاتے تھے۔ ہمیں تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ ہم دیہاتی تو انہیں پوجتے تھے۔ کبھی تھوڑے سے ممبر ادھر ہو جائیں، کبھی ادھر ہو جائیں۔ ایک ایسا موقع آیا کہ ممدوٹ کے مخالف ممبران نے عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کر دی۔ اس وقت ان کی اکثریت ہوگی۔ مسلم لیگ کا قاعدہ یہ تھا۔ دستور یہ تھا کہ اگر عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کر دی جائے تو پھر لیڈر تاریخ مقرر کرتا تھا۔ اس تاریخ پر بحث ہوتی تھی۔ اس کے بعد فیصلہ ہوتا تھا کہ اسے رکھا جائے یا نہ رکھا جائے۔ ممدوٹ صاحب کہتے تھے کہ میں تاریخ مقرر کرتا ہوں۔ ممتاز کے آدمی کہیں کہ نہیں ابھی ووٹنگ کراؤ۔ اس اصرار میں انہوں نے تلخ کلامی شروع کر دی۔ بڑے بے غیرت ہو۔ کرسی سے چمٹے ہوئے ہو۔

ہم دیہاتی آدمی ان لیڈروں کو بڑا اونچا خیال کرتے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ بات میرے دل سے نکلی تھی، شائد اس لیے اثر کر گئی۔ میں نے کہا۔ یہ کرسی جو آپ لینا چاہتے ہیں۔ اسے اتنا بے عزت کر کے تو نہ لیں۔ اگر اسے بے عزت کر کے لیں گے۔ تو کل کو آپ بھی بے عزت ہوں گے۔ آپ ہی نے ان (ممدوٹ) کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے تو نہیں کیا تھا۔ متفقہ طور پر کیا تھا۔ قائداعظمؒ کی ہدایت پر کیا تھا۔ اب آپ اسی کرسی پر تھوک رہے ہیں۔ دراصل آپ اپنے آپ پر تھوک رہے ہیں۔ ایک ضابطہ ہے۔ آپ کا بنایا ہوا ہے۔ اس ضابطے کو توڑو گے۔ تو آئندہ کس طرح چلو گے۔

چونکہ یہ میرے دل کے محسوسات تھے۔ اس میں میرا ذاتی کچھ نہیں تھا۔ نہ میرا ممدوٹ سے تھا۔ نہ ممتاز کے خلاف تھا۔ میرے اس طرح کہنے پر بات رک گئی۔ رکنے کے بعد جب میٹنگ کی تاریخ آئی تو میاں ممتاز دولتانہ کی اکثریت نہ رہی۔ ان کی اکثریت نہ رہی تو انہوں نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ استعفا کے بعد تحریک چلتی رہی۔ پریس میں اُچھلی۔ لوگوں میں پھیلی حتیٰ کہ اُوپر چلی گئی۔

میاں صاحب نے استعفا دیا تو اپنے ساتھ شوکت حیات کو بھی لے لیا۔ ممدوٹ صاحب کو نئی وزارت بنانا پڑی۔ اس وزارت میں چودھری فضل الٰہی بھی آ گئے۔ میں بھی آ گیا۔ غالباً میاں صاحب اور شوکت حیات کا خیال تھا کہ ممدوٹ کابینہ میں ہم دو ہی پڑھے لکھے ہیں۔ باقی تو سب اَن پڑھ ہیں۔ ہمارے بغیر یہ حکومت کیسے چلائیں گے۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں کیا تھا۔ نئی وزارت بنی اور چلی۔ لیکن چپقلش برقرار رہی۔

اتفاق سے میں کراچی میں تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں مرحوم کو کسی نے کہا ہوگا کہ اس میں کہتے ہیں کہ تھوڑی بہت عقل ہے۔ انہوں نے مجھے بلایا۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا خیال ہے کہ وزارت توڑ دی جائے۔ اسمبلی نہ توڑی جائے۔ وزارت توڑ کے اپنی مرضی کی وزارت بنوا لیں۔ کہنے لگے۔

مجھے فہرست بنا دیں۔ میں نے کہا، یہ تو بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ لاہور تشریف لائیں۔ وہاں قیام فرمائیں۔ سب سے ملاقات کریں۔ سب کے خیالات سن کے، جان کے، مجھے بلا لینا۔ میں بھی کچھ عرض کر دوں گا۔

لیاقت علی خاں لاہور تشریف لائے۔ ٹھہرے دولتانہ صاحب کے ہاں "الممتاز" میں۔ تیسرے دن پتہ چلا کہ انہوں نے اسمبلی توڑ دی ہے۔ صوبے میں گورنر راج کر دیا۔ گورنر تھا سر فرانسس موڈی۔ سر فرانسس موڈی کا راج ہو گیا۔

یہ پھر اکٹھے ہوئے۔ اُسوقت تک ہم لیڈروں کے پجاریوں میں سے نکل کر ساتھیوں میں آ چکے تھے۔ ان کی حرکتیں دیکھ دیکھ کے ان کا سارا تقدّس ذہنوں سے اُتر چکا تھا۔ مثال کے طور پر جب میں پارلیمانی سیکرٹری تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ فلاں ہندو کی کوٹھی میں ایک بہت عالیشان قالین تھا۔ وہ فلاں جو وزیر صاحب ہیں انہوں نے اپنے گھر بھجوا دیا ہے۔ میں نے کہا، اسے پی جاؤ۔ اس کی بات باہر نہ نکالنا۔ اگر آپ نے بات باہر نکالی۔ یہ سُسرا قالین کیا چیز ہے۔ رسم بن جائے گی۔ کہ اگر فلاں وزیر لے جاتا ہے تو میں کیوں نہ لے جاؤں۔ اس لیے اسے پی جاؤ۔ خیر!

جب یہ تحریک ختم ہوئی تو پھر میاں ممتاز دولتانہ صاحب کی سمجھ میں آیا۔ اور نواب ممدوٹ کو کہ یہ تو کام خراب ہو گیا۔ پھر انہیں عرض کی گئی کہ اب آپ مسلم لیگ کا کوئی تیسرا آدمی پریذیڈنٹ بنا لیں اور اس کے ساتھ مل کے کام کریں۔ تب کہیں مسلم لیگ کی ساکھ بحال ہو گی۔ چنانچہ مولوی عبدالباری کو پریذیڈنٹ بنایا گیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ مولوی عبدالباری نے سر فرانسس موڈی کے خلاف تحریک چلائی کہ انگریزوں کو ہم نے اتنی مشکل سے نکالا ہے۔ انگریز پھر ہمارے سر پر مسلط ہے۔

پھر اتفاق سے میں کراچی میں موجود تھا۔ لیاقت علی خاں نے مجھے پھر بلایا۔ نہیں کراچی نہیں راولپنڈی کی بات ہے۔ نواب مشتاق احمد گورمانی وزیر امور کشمیر تھے۔ وطن وار ہونے کی وجہ سے میرا ان سے تعلق تھا۔ وہ راولپنڈی میں بیٹھتے تھے۔ جہاں چودھری فضل الٰہی بطور صدر پاکستان رہتے رہے ہے۔ ایک ہندو کی کوٹھی تھی۔ اچھا تو میں گورمانی صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وزیراعظم بھی آ گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ وقت ملے تو مجھے بلوا لینا۔ کہنے لگے مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ذکر ہوا ہو۔ کیونکہ مولوی صاحب میرے پاس آ گئے۔ کہ وزیراعظم بلا رہے ہیں۔ میں گیا۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا، اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس وقت عرض کیا تھا کہ اسمبلی نہ توڑنا۔ وزارت توڑ دینا۔ اور اگر آپ اپنی مرضی کی وزارت بناتے تو کون تھا، جس میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت ہو سکتی تھی۔ آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ ان نامزدگیوں کی اسمبلی سے اپروول لے لیتے تاکہ کوئی شبہ باقی ہی نہ رہتا۔ یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ اُس وقت جو اسمبلی ممبر تھے۔ وہ لوگ تھے، جنہیں نہ انگریز خرید سکا، نہ ہندو خرید سکا۔ جنہوں نے جیل جانا پسند کیا، لاٹھیاں کھانا پسند کیا، لیکن جھکے نہیں تھے۔ بِکے نہیں تھے۔ وہ خون دینے والے مجنوں تھے۔ اب جو آئیں

گے وہ دودھ پینے والے مجنوں ہوں گے۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ وزارت توڑ دینا، اسمبلی نہ توڑنا۔ اس قسم کی اسمبلی مُڑ کے نہیں آئے گی۔ یہ سن کر لیاقت علی خان نے میز پر الٹا ہاتھ مارا۔ "اُس وقت آپ نے یہ بات کیوں نہیں کہی"۔ میں نے کہا، اگر آپ مجھ سے پوچھتے کہ یہ کیوں کہتے ہو کہ اسمبلی نہ توڑنا، وزارت بیشک توڑ دینا، پھر میں آپ کو اس کی دلیل دیتا۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میری عرض آپ نے مان لی ہے۔ اس پر لیاقت علی خاں نے پھر اپنا ہاتھ میز پر مارتے ہوئے کہا، یہ بات تو اُس وقت کرنی چاہیئے تھی۔

اس کے علاوہ میں نے وزیر اعظم سے عرض کی کہ فی الحال آپ گورنر کے ایڈوائزر مقرر کر دیں اور ان ایڈوائزروں کو وزیروں کے اختیارات ہوں۔ لیکن ایڈوائزر پنجاب مسلم لیگ کا پریذیڈنٹ (مولوی عبدالباری) بنائے۔ یہ تو آپ فوری طور پر کریں۔ مستقل یہ ہے کہ آپ الیکشن کروائیں۔ الیکشن کے لیے فیکٹ فائنڈنگ کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو موزوں امیدواروں کے لیے ٹکٹوں کی سفارش کریں۔ اس سے بہترین آدمی آگے آئیں گے۔ ویسے تو آپ درخت سے بھی مسلم لیگ کا ٹکٹ باندھ دیں گے۔ وہ بھی ہو جائے گا۔

اتنے میں شام ہو گئی۔ اس دوران میں چودھری غلام عباس بھی آئے۔ میں نے کہا، وہ آگئے ہیں، میں جاتا ہوں، فرمایا، نہیں آپ بیٹھے رہیں، میں انہیں باہر گیلری میں مل لیتا ہوں۔ چودھری نذیر احمد آئے۔ انہیں بھی گیلری میں مل لیے۔ مجھے بٹھائے رکھا۔ وہاں پھر باتیں ہوتی رہیں۔

بہرحال۔ اسمبلی توڑنے سے جن امکانی خطرات اور خدشات کا میں نے وزیر اعظم کے آگے ذکر کیا، اور یہ سن کر انہوں نے جو تاثرات دیئے۔ مجھے شبہ ہوا کہ انہیں کسی نے کہا ہو گا کہ اگر آپ اسمبلی نہیں توڑتے صرف وزارت توڑتے ہیں اور پھر اپنی مرضی کی وزارت بناتے ہیں تو دنیا کہے گی کہ یہ نامزدگیوں پر اتر آئے ہیں۔

س :۔ ممتاز دولتانہ نے کہا ہو گا۔

ج :۔ کسی نے کہا ہو گا۔ میں تو موجود نہیں تھا۔ قیاس ہے کہ یہی بات کہی ہو گی۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے ہاتھ مارا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے پھر ٹکٹیں دیں۔ مظفر گڑھ کے حصے آٹھ آتی تھیں، چار مجھے ملیں اور چار ملک قادر بخش کو ملیں، ساتھ ہمیں حلف دینا پڑتا تھا کہ جسے آپ ٹکٹ دیں گے، اسے کامیاب کرانے کیلئے پوری تندہی سے کام کرینگے میں ممتاز دولتانہ سے ملا کہ یہ ظلم ہے کہ کل تک میں جن کے خلاف لڑتا رہا۔ اب ان کے لیے ووٹ مانگوں گا کس منہ سے مانگوں گا، لوگ کہیں گے کہاں گیا آپ کا اسلام۔ میں انہیں بہت کچھ کہتا رہا۔ ان کے خیال میں نہیں آیا۔ انہوں نے چار ٹکٹیں قادر بخش کو دیدیں، چار مجھے دیدیں۔ قادر بخش والی چار میں یہ لوگ شامل تھے، ملک قادر بخش، نواب زادہ نصر اللہ خاں، نواب خاں بھوپانگ، حافظ کریم بخش۔ میرے والی چار میں ایک تو میں خود تھا، دوسرے غلام جیلانی گورمانی، تیسرے لیّہ کے نذر حسین شاہ، چوتھے نصر اللہ خاں جتوئی تھے۔

الیکشن ہو گئے۔ ظاہر ہے اب دولتانہ وزارت بننی تھی۔ میں نے دولتانہ صاحب سے وزارت میں شمولیت کے لیے کبھی خواہش نہیں کی، بلکہ ملاقات کے دوران وہ اصرار سے کہتے رہے "کوئی اور بات؟" "کوئی اور بات؟" میں نے مہربانی کا لفظ بولا اور اجازت چاہی۔ مجھے تو توقع ہی نہیں تھی۔ جب وزارت کا اعلان ہوا تو میرا بھی نام تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ لیاقت علی خاں نے کہا تھا کہ اب تمہیں ممبروں کی بھی ضرورت نہیں، سارے ہی مسلم لیگی ہیں، اب تم میرٹ پر لو، ایک تو اسے لے لو، میرا نام لیا۔ دولتانہ نے قادر بخش کو منسٹر بنانا تھا۔ نہ بنا سکے۔ اسے چیف پارلیمنٹری سیکرٹری بنا دیا۔

س :۔ حالانکہ یہ واضح تھا کہ ملک قادر بخش ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک تو یونینسٹ تھے۔

ج :۔ طبیعت ان کی، فطرت ان کی یونینسٹ ہی رہی۔

س :۔ اس کے باوجود انہیں مسلم لیگ میں لے لیا گیا۔

ج :۔ اس کے باوجود انہیں مسلم لیگ میں لے لیا گیا۔

س :۔ اور بھی کئی یونینسٹوں کو ٹکٹ دیئے گئے۔

ج :۔ اصلی غلطی ان کی یہ تھی کہ یہ اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے۔

س :۔ دولتانہ صاحب۔

ج :۔ میں نام تو نہیں لوں گا، بہرحال، اقتدار کی لڑائی اور اس میں اپنی اکثریت قائم کرنے کی خواہش ایک غلطی کے سرزد ہونے کا موجب بن گئی کہ مسلم لیگ میں ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا گیا، جو قیام پاکستان کی تحریک کے خلاف تھے۔ مناسب یہ تھا کہ انہیں کسی عہدے پر تعینات نہ کیا جاتا۔ حالانکہ صوبائی مسلم لیگ نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ پاس بھی کر دیا تھا۔ کہ جو شخص تحریک پاکستان کے خلاف رہا ہو۔ اس کو جماعت میں کوئی نمایاں حیثیت نہ دی جائے۔ لیکن اس قرارداد پر عمل نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک پاکستان کے منکر جماعت میں شامل ہو کر جماعت میں ملاوٹ کے مرتکب ہوئے۔ اور چند ایک کو عہدے بھی دیئے گئے۔ قادر بخش کا میں نے ذکر کیا، ملک فیروز خاں نون کے عہد میں مظفر علی قزلباش کو وزارت میں لے لیا گیا۔

میں قادر بخش کو الیکٹ کرانے کی خاطر جہاں بھی جاتا تو لوگ یہی کہتے کہ "کل تک تو وہ آپ کا مخالف تھا۔ آج آپ نے اسے مسلم لیگ کا ٹکٹ دے دیا" غلطیاں ہوئیں تو گڑبڑ مچی۔

س :۔ ۱۹۵۳ء والی موومنٹ کے سلسلے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ ممتاز دولتانہ نے مرکز کو کمزور کرنے کے لیے چلائی تھی؟ آپ اس زمانے میں ان کی کیبنٹ میں تھے۔ کیا خیال ہے؟

ج :۔ میرے علم میں نہیں۔ جو سازشی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں، میاں صاحب وہ میرے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ میں سرگودھا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ کا رویہ تو یہ تھا کہ قادیانیوں کے خلاف جلوسوں کی مدد کرنی ہے، میں سرگودھا گیا۔ تو میں نے اس چیز کی مخالفت کی۔ مجھے وہاں انہوں نے کہا، یہ کیا کہہ رہے ہو۔

ادھر یہ تھا کہ چندریگر گورنر تھے، سیکرٹریٹ کے سارے کلرک خلاف ہو گئے، ٹیلی فون کے آپریٹر، وزیروں کی محافظ گاردیں بھی خلاف ہو گئیں، چھاؤنی میں خیبر میل روک دی گئی پھر چندریگر نے سنٹر میں فون کیا۔ جنرل اعظم خاں ایریا کمانڈر تھے، وہ ہماری میٹنگ میں آ گئے، انہوں نے کہا، مجھے ایک گھنٹہ دو، میں ٹھیک کر دوں گا۔ چندریگر نے سنٹر کے ساتھ بات کی۔ وہاں سے حکم ہوا، کر دو۔ پھر لاہور میں مارشل لاء لگا، تین دن میں ٹھیک ہو گیا۔ پھر دولتانہ مستعفی ہو گئے۔

س :۔ دولتانہ صاحب کے استعفا کی تفصیل؟

ج :۔ دولتانہ صاحب چیف منسٹر تھے۔ ۱۹۵۳ء والی موومنٹ کے سلسلے میں وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ناچاقی ہو گئی۔ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خواجہ ناظم الدین صاحب کو زک پہنچانے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں دولتانہ صاحب کا ہاتھ تھا۔ تحریک اس قدر زور پکڑ گئی کہ وہ دولتانہ صاحب اور گورنمنٹ کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس تحریک کو دبانے کے لیے فوج کی امداد طلب کی گئی۔ فوج نے سچوایشن کنٹرول کر لی۔

پھر خواجہ ناظم الدین اور سکندر مرزا لاہور آئے، انہوں نے دولتانہ سے کہا، آپ کے خلاف مقدمہ بنایا جائے یا آپ مستعفی ہوتے ہیں، میاں صاحب نے استعفا دیدیا۔ میں ان کی کوٹھی گیا تو مجھے استعفا کا پتہ چلا۔ میں نے پوچھا، میاں صاحب سے استعفا کیوں لیا جا رہا ہے۔ تو صوفی عبدالحمید مرحوم نے بتایا "کرماں دا پھل"۔ یہاں سے مجھے اندازہ ہوا۔ ذاتی طور پر مجھے علم نہیں تھا۔ میں نے کہا، ایوان میں ہماری اتنی میجارٹی ہے کہ کوئی توڑ نہیں سکتا۔ تمام ارکان ماسوائے چند اصحاب کے میاں صاحب کے ساتھ ہیں۔ اتنی اکثریت ہونے کے باوجود انہیں استعفا پر کیوں مجبور کیا گیا ہے۔ تو مجھے بتایا گیا کہ اس تحریک کے ساتھ یہ قصہ منسلک ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس طرح ان کی وزارت ٹوٹ گئی اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو آ گئے۔

س :۔ آپ کی منسٹری نے بجٹ پیش کر لیا تھا۔

ج :۔ نہیں۔

س :۔ اس کا کیا ہوا۔

ج :۔ خواجہ ناظم الدین صاحب ابھی لاہور میں تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کے کہا کہ تم بجٹ پیش کرو۔ میں نے کہا، خواجہ صاحب یہ تو غلط بات ہے۔ میں ان کی کیبنٹ میں تھا۔ جس کے ساتھ آدمی نے چار دن بھی گزارے ہوں تو اس کے ساتھ بھی بے اصولی کرتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے۔ میں میاں صاحب کے ساتھ اتنی دیر رہا ہوں۔ اور آپ بالا بالا مجھے کہتے ہیں کہ یہ کر دوں۔ آپ انہیں کیوں نہیں کہتے کہ وہ اپنے کسی منسٹر (سابقہ) کو کہہ کے بجٹ پیش کرا دیں۔ خواجہ صاحب نے کہا، اس کو کہتے ہیں، الٹا لٹک۔ وہ الٹا لٹک جاتا ہے اس کو کہتے ہیں سیدھا لٹک، وہ سیدھا لٹک جاتا ہے۔ تم کہتے ہو، اس سے پوچھو۔ میں نے کہا، جی دستور یہ ہے۔

دوسرے دن میاں صاحب (ممتاز دولتانہ) نے مجھے اپنی کوٹھی بلایا۔ میں گیا، کہنے لگے کہ پرائم

منسٹر کا ٹیلی فون آیا ہے، وہ چاہتے ہیں، کہ آپ بجٹ پیش کریں۔ میں نے کہا، کہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا، کر دیں۔ میں نے پھر پوچھا۔ انہوں نے کہا، ہاں پیش کر دو۔ میں اُٹھ کے آ رہا تھا، وہ تھوڑی دور تک میرے ساتھ آئے اور کہا۔ ان کے ساتھ سودا کریں۔ میں نے کہا، میاں صاحب جانے دیں۔

میں گورنمنٹ ہاؤس گیا اور خواجہ صاحب سے پھر شکایت کی کہ آپ نے میرا نام کیوں لیا۔ آپ نے فرمانا تھا، کوئی وزیر دیدو۔ اس پر انہوں نے پھر دولتانہ صاحب کو ٹیلی فون کیا اور فرمایا، میاں صاحب انہیں کہو کہ بجٹ پیش کر دیں۔ چنانچہ ٹیلی فون مجھے دیا گیا اور دولتانہ صاحب نے فرمایا، بھئی بجٹ پیش کر دو۔

میں خواجہ صاحب سے وعدہ کر کے میاں صاحب کی کوٹھی آ گیا۔ میں نے کہا، میاں صاحب میں نے بجٹ پیش کرنا ہے، میں اکیلا نہ ہوں تو اچھا ہے۔ ایک آدمی اور مجھے دیدیں۔ دولتانہ صاحب نے کچھ غصے میں کہا، کوئی اور کیوں آپ کے ساتھ جائے۔ میں نے کہا۔ اس لیے کہ ایک اکیلا دو گیارہ۔ کام ٹھیک ہو جائے گا۔ فرمانے لگے، تو جا تو سہی، تجھے وہاں ہتھکڑی لگے گی۔ یہ سن کے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ میں نے کہا، میاں صاحب آپ نے مجھے اس وقت کہنا تھا کہ بجٹ پیش نہیں کرنا۔ اب میں انہیں کہہ آیا ہوں، وہ آپ سے کہتے ہیں۔ استعفا دو۔ آپ استعفا دے دیتے ہیں۔ اب میں ان سے لڑوں۔ آپ نے مجھے اس مصیبت میں کیوں ڈال دیا۔ اب خواہ ہتھکڑی لگے۔ خواہ کچھ ہو، میں جاتا ہوں۔ میاں صاحب کے پاس سارے وزیر بیٹھے ہوئے تھے۔ مثلاً شیخ فضل الٰہی پراچہ، صوفی عبدالحمید، محمد حسین چھٹہ، علی حسن گردیزی، محمد خاں لغاری، ان میں سے میں نے ایک ایک سے درخواست کی کہ میرے ساتھ چلیں۔ کیونکہ میں پرائم منسٹر سے وعدہ کر آیا ہوں۔ اس لیے ان کی نافرمانی کی مجھ میں اب جرأت نہیں ہے۔ سب نے انکار کر دیا۔ صرف محمد خاں لغاری نے مہربانی کی اور ساتھ چلنا قبول کیا۔

میں محمد خان لغاری کو لے کے اسمبلی ہال پہنچا تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میاں صاحب کے رویے کی وجہ سے طبیعت بھی پریشان تھی۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ ارکان کی بہت بڑی اکثریت میاں صاحب کے ساتھ ہے، وہ میرے بجٹ پیش کرنے میں مزاحم ہوں گے۔ میاں صاحب کے آدمی وہاں کنویسنگ بھی کر رہے تھے۔ ایک بجے کا وقت تھا۔ میرا منہ سوکھا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ہتھکڑی لگتی ہے تو لگے۔ میری بلا سے جو ہونا ہے ہو جائے۔

جب سپیکر نے مجھے بجٹ پیش کرنے کو کہا۔ میں نے عرض کی کہ میں اب وزیر نہیں رہا۔ عام ممبر ہوں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ بجٹ پیش کرنے سے پہلے ہاؤس سے اجازت لوں۔ اگر وہ اجازت دیں تو میں بجٹ پیش کروں۔ چنانچہ میں نے انگریزی میں للکار کر کہا "کیا میں پیش کر سکتا ہوں"۔ چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔ YES, YES, YES.

ہاں، ہاں، ہاں کی آوازیں سنتے ہی میرے اوسان ٹھیک ہو گئے۔ میرے اوسان

ٹھیک ہو گئے، تو میں نے اُٹھ کے کہا: میں اپوزیشن لیڈر سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ رضامند ہوں تو وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں تشریف لائیں۔ وہاں ہم چائے کی پیالی پر بجٹ ڈسکس کر لیں۔ اور جو غیر مناسب ترمیمیں ہیں، ان کو ترک کر دیں۔ مناسب ترامیم کو تسلیم کر لیں۔

ممدوٹ اپوزیشن لیڈر تھے۔ انہوں نے کہا۔ مجھے منظور ہے۔ میں نے اُٹھ کے کہا، مسٹر سپیکر ہاؤس کو بیس منٹ کے لیے ملتوی کر دیا جائے، ہم کمرے میں آ گئے۔ ممدوٹ صاحب کہنے لگے، میرا جھگڑا اس (دولتانہ) کے ساتھ تھا تیرے ساتھ نہیں۔ میں نے کہا پھر؟ انہوں نے کہا، جتنی ترمیمیں تھیں، ہم ساری واپس لیتے ہیں۔ آپ پڑھتے جائیں، ہم منظوری دیتے جائیں گے۔ ایک بات پر وہ اڑ گئے، کہ ہم مہاجروں کے ساتھ وعدہ کر چکے ہیں کہ مہاجر ٹیکس نہیں لگنے دیں گے۔ پھر سمجھوتہ یہ ہوا کہ اس آئٹم کو ملتوی کر دیا جائے۔ آنے والی حکومت اس پر فیصلہ کرے گی۔ باقی بجٹ سارا پاس ہو گیا۔ جو بجٹ دس روز میں پاس ہونا تھا، وہ چار بجے تک پاس ہو گیا۔

س:۔ بجٹ منظور ہونے کے بعد میاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو کیسی رہی۔

ج:۔ میاں دولتانہ کا خیال تھا کہ یہ بجٹ پاس کرا کے سیدھا میرے پاس آئے گا اور کہے گا، لو جی میں بجٹ پاس کرا آیا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے قلندری عطا کی ہوئی تھی۔ میں نہ گیا۔ یہ تین روز تک دیکھتے رہے۔ تین روز کے بعد میری کوٹھی تشریف لائے۔ کہنے لگے "میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے غلطی کی"۔ میں نے کہا، آپ نے خواہ مخواہ مجھے پریشان کیا۔ آپ مجھے کہہ تو دیتے کہ نہیں کرنا، پھر دیکھتے، مجال ہے جو میں کرتا۔

میں:۔ اب تو ممدوٹ کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ غلطی ہوئی۔

ج:۔ بے سود۔ اتنی دیر بعد تسلیم کیا۔ ہاں وہ غلطی ہو گئی ان سے۔ اس سے معاملہ بڑھتا ہی گیا۔ لیکن باوجود اس کے، اگر منٹ کے اوپر دو چیزوں کا خوف تھا۔ ایک خدا کا۔ دوسرے عوام کا۔ ہم گزرتے تھے تو تانگے والا بھی کہتا تھا یہ سؤر اکٹھے ہوئے ہیں۔

س:۔ کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خاں، ممدوٹ کے مقابلے میں دولتانہ کو پسند کرتے تھے؟

ج:۔ اعمال سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

س:۔ مثلاً۔

ج:۔ مثلاً یہ کہ جب یہ کہا کہ الیکشن کراؤ۔ اس الیکشن میں انہوں نے ممدوٹ کو باہر ہی رکھا۔ یعنی اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا جس کمیٹی نے ٹکٹیں دینا تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ نواب صاحب نے جوگندر سنگھ سے مشورہ کیا اور جوگندر سنگھ سے کہا کہ منٹگمری (اب ساہیوال) میں نیرا جو اقبال نگر ہے، وہاں ۱۲۰ مربع نہری جو اراضی ہے، وہ مجھے دیدے۔ اور میری ریاست ممدوٹ تو لے لے۔ ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ جوگندر سنگھ

جب اُدھر گیا تو اس نے ممدوٹ ریاست پر قبضہ کر لیا ہو گا۔ ممدوٹ نے ریاست والے مزارع اقبال نگر والی زمینوں پر لگا دیئے، ادھر ریفیوجی کونسل نے کہا کہ منٹگمری میں اتنے یونٹ سے زیادہ کسی مہاجر کو نہیں مل سکتے۔ یہ چونکہ ۱۲۰ مربع اس یونٹ سے دس بیس گنا زیادہ تھا۔ اس چیز کو بھی انہوں نے اٹھا لیا، کس نے اٹھایا، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال یہ اٹھا، اور سنٹرل گورنمنٹ کے سامنے آیا۔ انہوں نے ممدوٹ پر مقدمہ چلایا۔ پروڈا کہ اس نے چیف منسٹر ہونے کی وجہ سے اتنے مربع اراضی پر قبضہ کیا ہے، حالانکہ باہمی تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس میں ڈپٹی کمشنر نے رقبے مزارع کے نام ڈال دیئے۔ اس کا بھی مواخذہ ہوا۔ خواجہ رحیم کمشنر تھے۔ ان کا بھی مواخذہ ہوا۔ بہرحال وہ قصہ ختم ہو گیا۔ پھر جب میں چیف منسٹر ہوا، ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میرے پاس تشریف لائے۔ مجھے کہنے لگے۔ میں نوابی کو کتنی دیر چلاؤں گا۔ میں کم سے کم مہاجر تو ہوں مجھے ملنا تو چاہیئے، میں نے جاگیر چھوڑ دی، ریاست چھوڑ دی، یہاں کا اثاثہ مسلم لیگ پر ڈالا۔ مجھے ابھی تک ایک مرلہ زمین نہیں ملی۔ میں نے جلدی کی ایک کولڈ سٹوریج تھا۔ وہ الاٹ کرا دیا۔ کہنے لگے اس نمک کے ساتھ بھوک اُتر جائے گی۔ خیر یہ تو مجھے یاد نہیں کہ انہیں میں نے کیا کہا، جب وہ چلے گئے۔ میرا دستور یہ ہوتا تھا۔ کہ ایک چیز میرے ذہن میں آجائے۔ تو افسر متعلقہ کو بلا کر اس کے ساتھ ڈسکس کرنا۔ ڈسکس کر کے اپنا ذہن اس میں ڈال دیتا تھا۔ اکثر طور پر مجھے اپنی سکیم پر تین لفظ لکھنا پڑتے۔ "میں متفق ہوں"۔

میں نے ساری مسل نکلوائی، پروڈا والی، جوگندر سنگھ والی اس مسل سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ۱۲۰ مربع سرکاری اراضی تھی۔ جوگندر سنگھ انگریز کے زمانے میں منسٹر تھا۔ زمیندار آدمی تھا۔ ۱۲۰ مربع اراضی اونچی تھی۔ اسے پانی نہیں لگتا تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے کہا کہ یہ ۱۲۰ مربع زمین مجھے دس سال کے لیے پٹے پر دے دو، میں آباد کروں گا۔ وہ ۱۲۰ مربع اسے الاٹ ہو گئی، اس پر اس نے لفٹ پمپ لگائے، پانی چڑھایا اور اس پر اتنی کپاس ہوئی کہ دو سال میں اس نے لاکھوں روپے کمائے، پھر اس نے گورنمنٹ سے کہا کہ اس میں سے ساٹھ مربع میرے آگے بیچ دو۔ گورنمنٹ نے ساٹھ مربع اس کے آگے۔ بیچ دیئے۔ ساٹھ اس کے پاس پٹے پر رہے جو اصلاً گورنمنٹ کی ملکیت تھے۔

اس زمین کی مسل میں میں نے یہ کیفیت پڑھی، میرے ذہن میں آیا کہ اس زمین کی قسمت ہی وزیروں کے لیے ہے، دوسرے نواب ممدوٹ صاحب کی مسلم لیگ، اور پاکستان کے لیے خدمات اور قربانیاں بھی میرے ذہن پر حاوی تھیں۔ مجھے ان سے بہت ساری ہمدردی ہو گئی تھی۔ شیخ فضل الٰہی پراچہ کمشنر ہوتے تھے، اب وہ ریونیو منسٹر تھے۔ مسل مطالعہ کے بعد میں نے کہا سات سال ہو گئے ہیں۔ جس کے پاس جاگیر تھی۔ اسے ہم نے باغ دیا، ایک نواب کی ریاست تھی۔ اسے ہم بھوکوں مار رہے ہیں، آج اگر وہ ہائی کورٹ میں دعویٰ کر دے کہ میرا حق تھا کہ مجھے زمین ملتی" آج تک انہوں نے مجھے نہیں دی، میری سات سال کی آمدنی جو میرا حق

بنتی تھی، وہ بھی مجھے دو۔ آئندہ کے لیے بھی میرا حق مجھے دو، ہم پر ڈگری ہو جائے گی۔ اور مُنہ کالا الگ ہوگا۔ اب سات سال ہو گئے، جس وقت وہ قانون بنایا تھا کہ اتنے یونٹ سے زیادہ کسی مہاجر کو نہیں ملتی، اب تو ساری مہاجروں کو مل چکی ہے۔ جو ایک سو بیس مربع تھے یہ گورنمنٹ نے خود لے لیے۔ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کو دے دیئے۔ اسے بنا دیا سیڈ فارم۔ میں نے کہا کہ نواب صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مجھے یہ لفظ کہے تھے۔ کچھ آپ کے دل پر بھی لگے، پراچہ نے کہا، بہت ڈراؤے لگے۔ چیف منسٹر کے لفظ کی ویسے بھی تائید ہوتی ہے۔ میں نے نواب صاحب سے کہا تھا کہ ایک درخواست لکھ دیں کہ ابھی تک مجھے کچھ نہیں ملا۔ میں نے وہ درخواست اور مسل پراچہ کو دے دی۔ اور کہا کہ اس مسل پر رپورٹ کریں کہ ساٹھ دے دیئے جائیں، دوسرے جو ساٹھ ہیں، ساری کی ساری سیڈ فارم بنا دیں گے۔ اسے کہیں گے کہ سیڈ فارم بنا، کسی مہاجر کو اب نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اب ہر مہاجر لے چکا ہے۔ گورنمنٹ نے اسے لے لیا۔ اس سے کسی مہاجر کی ویسے بھی حق تلفی نہیں ہوتی۔ پھر جس شخص نے پاکستان بنانے میں اتنا کیا ہو، وہ زمین جو انگریز اپنے منسٹر کو دے سکتا ہے، ہم نہیں دے سکتے۔ یہ چیزیں میں نے انہیں سمجھائیں۔ انہوں نے اپنی رپورٹ لکھ کے مجھے دیدی۔ میں نے اس پر کابینہ کی میٹنگ بلالی۔ کابینہ نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ مجھے یاد ہے پھر میں نے اس پر پانچ چھ صفحے کی اپنی رپورٹ لکھ کے اُوپر بھیجی اوپر چوہدری محمد علی صاحب تھے ان سے زبانی بھی ذکر ہوا۔ میں نے کہا آپ پر تو ڈگری ممکن ہے۔ آپ کا کیا حق ہے کہ اس پر ایگریکلچر فارم بنائیں۔ بہر حال انہوں نے مان لیا۔ اور اقبال نگر ممدوٹ کو مل گیا، ابھی تک ان کے پاس ہے۔

سیڈ فارم کا انہیں یہ فائدہ رہا کہ زرعی اصلاحات کا اس پر اطلاق نہ ہوا۔

جوگندر سنگھ کے بیٹے کا نام تھا اقبال سنگھ۔ اس کے نام پر اس نے اقبال نگر رکھا تھا۔ وہاں اس نے ریلوے سٹیشن بھی بنوا لیا تھا۔ وہاں اس نے باغ بھی لگوایا۔ ڈاکٹر اقبال رح نے اس پر نظم کہی، مثلاً ؎

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

س: محسوس ہوتا ہے کہ دولتانہ نے لیاقت علی خاں کو قائل کر لیا تھا۔

ج: میں لیاقت علی خاں کی بدنیتی کا قائل نہیں کیونکہ قائداعظم رح بھی ان کی دیانت داری کی قسم کھا سکتے تھے، ویسے بھی لیڈر پرستی ہم میں تھی۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ ایک تو وہ دولتانہ کے پاس ٹھہرے دوسرے ممدوٹ کو نہیں رکھا۔ ممدوٹ اگر الیکٹ ہوئے تو اپنے زور پر الیکٹ ہوئے۔

بلکہ بعض دوستوں نے مجھے کہا پہلے تو ممدوٹ کی منسٹری میں تھا۔ اب دولتانہ کی منسٹری میں آگیا ہے۔ میں نے کہا، میں نہ دولتانہ لیگ کا ہوں، نہ ممدوٹ لیگ کا ہوں۔ میں تو مسلم لیگ کا ہوں۔ مسلم لیگ کی منسٹری ہے۔ وہ مجھے بلائے میں انکار تو نہیں کر سکتا۔ شخص پرستی جماعت میں تو غلط ہے۔ شخص پرستی ان میں آگئی، اس سے جماعت کو نقصان پہنچا۔

س:۔ میاں صاحب نے ممدوٹ کو کاہل، سست اور آرام پسند کہا ہے۔

ج:۔ کسی حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ وہ نواب تھے، اس لیے تن آسانی تھی، پڑھے ہوئے بھی زیادہ نہیں تھے۔ اس لیے کانفرنسوں وغیرہ پر وہ خود نہیں جاتے تھے۔ مجھے بھیجتے تھے۔ مثلاً ۴۹ء میں مشرقی پاکستان سے چیف منسٹر نورالامین آئے۔ ادھر سے بھی چیف منسٹر کو جانا چاہیئے تھا۔ نہیں گئے۔ مجھے انڈیا بھیجا، وجہ یہی تھی، تن آسان تھے۔ ویسے بڑے شریف، بڑے نیک، بڑے دیانتدار۔ دخل نہیں دیتے تھے۔ دولتانہ صاحب جب ان کی کابینہ میں وزیر خزانہ تھے۔ انہیں کُلی اختیارات حاصل تھے کہ جس طرح چاہیں، کریں۔ ہماری خواہش یہ تھی کہ ان کی کمی کو دولتانہ صاحب پُورا کرتے رہیں۔ اور یہ چلتی رہے، مگر انہوں نے (دولتانہ نے) وہ روش اختیار کی، کہ بس۔

س:۔ میاں دولتانہ کا کہنا ہے کہ سارا انتشار نواب صاحب (ممدوٹ) کی سستی کی وجہ سے پیدا ہوا۔

ج:۔ انہیں زیادہ پتہ ہوگا، کہ کس وجہ سے وہ نکلے۔ میں تو نہیں کہہ سکتا۔

س:۔ جبکہ میاں صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ سارا معاملہ ان کی بزدلی نے بگاڑا؟

ج:۔ مشہور یہی ہے۔ میں نہ اس کی تائید کرتا ہوں، نہ تردید۔ تائید اس لیے نہیں کرتا کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لیتے تھے، کوئی نہ کوئی طریقہ وہ اس کام کے کرنے کے لیے اختیار کر لیتے تھے۔ مثلاً خواجہ ناظم الدین کے خلاف ختم نبوّت والی تحریک چلائی۔ یہ بزدلی کا کام تو نہیں، یہ قوت ارادی والے کا کام ہے۔ ایسے موقع پر بزدل آدمی کی سوچ تو یہ ہوتی ہے، کیوں مصیبت گلے لگاؤں۔ اس لیے میں آپ کے سوال کی تائید نہیں کر سکتا۔ تردید میں اس لیے نہیں کرتا، جب انہیں کہا گیا کہ استعفا دے دو یا مقدمے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا، میں استعفا دے دیتا ہوں۔

س:۔ بزدلی اور بہادری کے دونوں عنصر ہوئے۔

ج:۔ جو میرے ذہن میں آیا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ نتیجہ آپ نکال لیں۔ اگر ممتاز دولتانہ ابتداء میں لڑائی نہ ڈالتے تو قوم کے لیے غیر منقسم نعمت تھی۔ پھر ایک دفعہ جب شیشے میں بال آجاتا ہے تو پھر وہ بات نہیں رہتی۔

یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ جو ایسا ہوا، دراصل ان میں سب سے نمایاں ہونے کی جو بے پناہ تمنا پائی جاتی تھی۔ اس سے وہ اپنی فراست اور عقلمندی کے باوجود مغلوب ہو جاتے تھے۔ دولتانہ نہ صرف یہ کہ عقل مند ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ وہ عقل مند ہیں، ایک دفعہ میں

نے ان سے کہا، آپ ذہین آدمی نہیں۔ اگر ذہین ہوتے تو پاکستان کے وزیراعظم ہوتے۔ آپ کے ذہن میں کہیں خرابی ہے تو بات رہ گئی۔ میاں صاحب کو پتہ تھا کہ یہ ایک دلیل کے طور پر بات کر رہا ہے۔

ایک دفعہ ہم میٹنگ اٹنڈ کر کے کراچی سے آرہے تھے، وزیروں کے لیے کمپارٹمنٹ ہوتے تھے۔ سب نے لے لیے۔ میں رہ گیا۔ میاں صاحب کہنے لگے۔ میرے کمپارٹمنٹ میں آجاؤ۔ میں نے کہا، آپ کے لیے باعث تکلیف ہوں گا۔ کہنے لگے، نہیں، وہاں دو سیٹیں ہیں۔ ایک پر میں سو جاؤں گا۔ دوسری پر آپ سو جانا۔ میں ان کے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ رات بھر سوئے رہے۔ صبح اُٹھے، ناشتہ کیا، ناشتے کے بعد کہنے لگے۔ آئیں "رمی" کھیلتے ہیں۔ میاں صاحب ہر بار جیت رہے تھے۔ ایک موقعہ پر یہ ہار رہے تھے، میں جیت رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت خیبر میل ان کے علاقے۔ دھاڑی، کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے کہا، میاں صاحب یہ کونسا علاقہ ہے۔ کہنے لگے، کیوں؟ میں نے کہا، یہاں مجھے زمین لے دو۔ یہاں میری قسمت بہت جاگتی ہے۔ کہنے لگے، میں نہیں کھیلتا۔ میں نے تاش ایک طرف رکھ دی۔ میں نے کہا، میاں صاحب، میں ایک بات پوچھتا ہوں، آپ امیر ترین آدمی ہیں۔ لیکن اس تھوڑی سی ہار جیت میں بھی آپ کے ہاتھ کانپنے لگے، اور آپ نے کھیلنا بند کر دیا۔ میاں صاحب نے کہا، میں تین خاندانوں کی جائیداد کا اکیلا وارث ہوں، اپنے باپ کی جائیداد کا، چوہدری شہاب الدین کی جائیداد کا، تیسرے کسی اور کا نام لیا۔ ان تینوں خاندانوں کا میں اکیلا وارث ہوں۔ میری جس طرح سے پرورش ہوئی ہے۔ کھیلنے کے لیے بچے اکٹھے کیے جاتے تھے۔ میں ان کے ساتھ تاش کھیلتا تھا۔ ہار جاتا تھا۔ تو تاش پھاڑ دیتا تھا۔ انہیں مار کے نکال دیتا تھا۔ میرے لیے بیڈمنٹن لگاتے تھے، میں ہار جاتا تھا تو جال جلا دیتا تھا۔ اور انہیں مار کے نکال دیتا تھا۔ مجھ سے شکست برداشت نہیں ہوتی۔

س:۔ اب پتہ چلا کہ ممدوٹ دولتانہ چپقلش کس نفسیاتی مجبوری کا نتیجہ تھی۔

ج:۔ آپ نے بات چھیڑی، بات سے بات پیدا ہو جاتی ہے۔ ممتاز نے خود مجھ سے کہا، میں شکست سہہ نہیں سکتا۔ اس میں سے آپ نکال سکتے ہیں کہ کیوں انہوں نے ممدوٹ کے ساتھ کیا۔ کسی کام کے متعلق انہوں نے کہا ہو گا کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں، ممدوٹ نے نہیں کرنے دیا ہو گا، یا اس میں تھوڑی سی رکاوٹ ڈالی ہو گی۔ وہ بھی آخر نواب زادہ تھا، صائب الرائے بھی تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دولتانہ صاحب کے مقابلے میں ممدوٹ بہت کم پڑھے لکھے تھے۔ اسی وجہ سے بڑی بڑی تقریبات میں خود نہیں جاتے تھے۔ مجھے بھیجتے تھے۔ اس سے پہلے دولتانہ کو بھیجتے تھے۔

س:۔ ممدوٹ نے دولتانہ کی کوئی بات نہ مانی تو انہوں نے سوچا، تاش ہی پھاڑ دو، نیٹ ہی جلا دو۔

ج :۔ ہاں، ان کا اپنا کہنا ہے۔ I CAN'T STAND DEFEAT.
(میں شکست برداشت نہیں کر سکتا) اور یہ کہ میں سیکنڈ لائن میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے فسٹ میں رہنا ہو گا۔ تمنائیں بہت تھیں، وقت سے پہلے شروع کر دیتے تھے۔ کچا پھل توڑ دیتے تھے۔

س :۔ اس لیے تو نہیں مار کھا گئے۔

ج :۔ اس لیے مار کھا گئے۔ انہیں انتظار کرنا چاہیئے تھا، وقت پر ان کی ضرورت پڑتی، دُنیا نے انہیں خود کہنا تھا کہ آپ آجائیں۔ بجائے اس کے کہ یہ کہتے کہ میں چیف بنتا ہوں۔ اگر یہ صبر کرتے تو دنیا کہتی، کیونکہ دنیا نے کام کو دیکھنا تھا۔ اُس وقت کے جو لوگ تھے، ان میں جذبہ تھا، ان میں دنیا کی اتنی رغبت نہیں تھی جتنی آج کل ہے۔

جب کشت و خون شروع ہوا، مسلم لیگ کے جن لوگوں پر مقدمے بنے ہوئے تھے، ان سے نمٹنے کے لیے مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ وکلا صاحبان اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کریں۔ میں نے بھی نام دیا۔ مجھے امرتسر پہنچنے کا حکم آیا، وہاں ڈسٹرکٹ مسلم لیگ امرتسر کے صدر شیخ صادق حسن کے بہت سے آدمی پکڑے گئے تھے۔ میں ان کے ہاں پہنچا، شیخ صاحب کا قالینوں کا کارخانہ تھا۔ میں نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر شیخ صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ قالینوں کے ڈیزائن اور جو قیمتی چیزیں ہیں، یہاں سے بھجوا دیں۔ کہنے لگے، اب تو تو نے بات کر دی، آئندہ نہ کرنا۔ اور اگر آئندہ تو نے یہ بات کی تو میں آپ کو مار دوں گا۔ کہنے لگے۔ میں نے یہاں سے تنکا بھی ہلایا تو امرتسر میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ تو کہتا ہے، ڈیزائن لے جاؤں۔ میں اپنی کسی چیز کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔

یہ تھا جذبہ، شیخ صاحب اس قدر دولت مند آدمی، لیکن ملک و قوم کے مقابلے میں اپنی دولت کے بارے میں بے پرواہ۔

یہاں انہیں میلا رام ٹیکسٹائل ملز الاٹ ہوئی۔ تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ ان کے خاندان کے دو چار نوجوان میرے پاس آئے، کہنے لگے، شیخ صاحب کو سمجھائیں، انہوں نے ہمیں بھوکوں مار دیا۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ یہ جو کارخانہ آپ نے دیا تھا، کاریگروں نے انہیں روپے لا کے پیش کیے۔ شیخ صاحب نے پوچھا اتنے دنوں میں آپ نے اتنے زیادہ روپے کیسے کما لیے۔ کاریگروں نے جواب دیا، ہم نے سوتر بلیک میں بیچا ہے۔ شیخ صاحب کا پارہ چڑھ گیا، "حرام زادو! مجھے حرام کھلاؤ گے۔ نکل جاؤ یہاں سے"۔ دھکے دے کے انہیں نکال باہر کیا۔ وہ پیسے انہیں دے دیئے۔ وہ نوجوان مجھے کہنے لگے، کہ حالت یہ ہے کہ ہمارے پاس کھانے کیلئے پیسے نہیں۔ آپ چلیں اور انہیں سمجھائیں کہ جو سوتر کاریگروں نے بلیک کیا ہے، بلیک کے علاوہ اس کی اصل قیمت بھی تو تھی۔ وہ اصل قیمت اس میں سے نکال کے رکھ لیں اور بلیک کی رقم جو ان چوروں نے حاصل کی ہے، کسی مستحق کو دے دیں۔ وہ ساری کی ساری رقم ان چوروں کو دے رہے ہیں۔

میں جا کے شیخ صادق حسن صاحب سے ملا اور کہا کہ شیخ صاحب اگر چور آپ کے گھر آ کے چوری کریں، آپ انہیں دیکھ لیں تو آپ انہیں کہیں گے: حرام زادو! یہاں سے نکل جاؤ اور یہ چوری کا مال میرے ہاں چھوڑ کے مت جانا۔ شیخ صاحب آپ کے کاریگروں نے جو سونا بلیک کیا ہے۔ اس میں سے جائز قیمت الگ کر کے باقی جو حرام کمائی ہے۔ وہ کسی مستحق کو دے دیں، یہ کیا ہوا کہ آپ سارے کے سارے پیسے ان بلیک کرنے والوں کو دے رہے ہیں۔

شیخ صادق حسن مرحوم اس قسم کے دیانتدار تھے۔ نیک بھی تھے۔ ارادے کے پکے اور انتہائی مخلص۔

جذبات کا یہ عالم تھا۔

ایسے ایسے لوگ تھے۔ جب میں پارلیمانی سیکرٹری تھا، میرے پاس ایک شخص آیا۔ کہنے لگا مہاجر ہوں، مکان لیا ہے۔ اس میں ایک پیٹی تھی، وہ کھل گئی۔ دیکھا تو وہ سونے اور نوٹوں سے بھری ہے۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ پاکستان کا مال ہے، اٹھوا لیں۔

ایک اور آیا۔ کہنے لگا۔ مہاجر ہوں۔ میں گھر والوں کو ریلوے سٹیشن پر بٹھا آیا ہوں۔ میں نے سخت کلامی کی۔ اتنی دیگیں وہاں پک کے گئی ہوئی ہیں۔ اور تو یہاں مانگنے آ گیا ہے۔ اس نے کہا۔ آپ نے مجھے بات ختم نہیں کرنے دی۔ میں اپنے۔ بیوی بچوں کو سٹیشن پر بٹھا آیا ہوں۔ میں نے وہاں دیگیں دیکھی ہیں۔ میں درزی ہوں۔ میں کپڑے سی سکتا ہوں۔ میں آیا ہوں کہ اگر آپ کے پاس سلائی مشین ہے اور سلائی کے لیے کپڑے بھی ہیں، تو مجھے دیں۔ میں سی دوں، ان کی اُجرت سے میں بچوں کو روٹی کھلاؤں گا۔ دیگیں تو میں نے بھی دیکھی ہیں۔

میں ان دنوں پارلیمانی سیکرٹری تھا۔ بھائی کے پاس میکلوڈ روڈ پر رہتا تھا۔ اس کے لیے سلائی مشین کا بندوبست کیا۔ محلے والوں سے سلائی کے لیے کپڑے لے کے دیئے۔ ایسے بھی لوگ تھے۔

میں مظفر گڑھ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا، پاکستان ابھی بنا ہی تھا۔ ایک شخص میرے پاس آیا۔ اس نے میرے آگے رومال رکھ دیا۔ اس میں روپے بندھے تھے۔ کہنے لگا، گاڑیاں چلتی ہیں، سٹیشنوں پر رُکتی ہیں۔ کوئی ٹکٹ دینے والا نہیں، نہ کوئی بابو ہے، نہ کوئی ٹکٹ کلکٹر۔ میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا۔ یہ پاکستان کی گاڑی ہے اور آپ سب مفت سفر کر رہے ہیں۔ جتنا جتنا کسی کا کرایہ بنتا ہے، وہ دے۔ یہ اکٹھا ہوا۔ میں آپ کے پاس لے آیا ہوں کہ آپ مظفر گڑھ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ ہیں۔

جذبے کا تو یہ عالم تھا کہ مظفر گڑھ کی کنجریاں (طوائفیں) میرے پاس آئیں کہ پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں کسی زمیندار کے گھر بٹھا دو۔ اچھی جگہوں پر ہمارے نکاح کرا دو۔

اس وقت دنیاوی رغبت پر یہ جذبہ غالب تھا۔ اب دولت کا غلبہ ہے۔ استحقاق کے بغیر، یونہی کسی چیز کا مل جانا، پلاٹ مل گیا، تین لاکھ میں بیچ دیا۔ کل روٹی نہیں تھی۔ آج تین

لاکھ کا مالک ہو گیا، سوا اس واسطے کہ لٹ مچا دی، غیر مستحق لوگوں کو بغیر تکلیف کے چیزیں ملنا شروع ہو گئیں۔

ایران کا دار الخلافہ مدائن جس وقت فتح ہوا، اتنا مال و دولت آیا کہ جب وہ خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضؓ کے سامنے رکھا گیا تو وہ دیکھ کے رو پڑے۔ لوگوں نے کہا، اتنا مال ہے، مال غنیمت ہے۔ حلال ہے، خدا نے بھیجا ہے، آپ کو شکر کرنا چاہیئے۔ آپ رو رہے ہیں۔ فرمایا یہ چیز ہے، جس کی وجہ سے وہ مغلوب ہو کے مارے گئے۔ اگر ہم میں آ گئی، کہیں، ہمیں بھی نہ مروا دے۔

س :- دولتانہ منسٹری ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ملک فیروز خاں نون چیف منسٹر ہوئے، وہ کیا کہانی ہے۔

ج :- دولتانہ وزارت ٹوٹ گئی، ہم بھی وزیر نہ رہے ہیں مظفر گڑھ جانے کے لیے سامان باندھ رہا تھا کہ ملک فیروز خاں نون میری کوٹھی پر تشریف لائے۔ یہ مشرقی پاکستان (اب مشرقی بنگال) میں گورنر تھے۔ مرکز نے انہیں پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنانے کے لیے بلایا تھا۔ کہنے لگے، مجھے مرکز نے بھیجا ہے اور تیرا نام دیا ہے کہ میں آپ سے صلاح مشورہ کر کے کابینہ تشکیل دوں۔ میری صلاح یہ ہے کہ آج رات میں اور آپ حلف اٹھا کر وزارت بنا لیں۔ باقی وزراء آہستہ آہستہ چن لیں گے۔ میں نے کہا نہیں یہ طریقہ غلط ہے۔ آپ ملک صاحب، یہاں سات آٹھ دن صوبے کے تمام بڑے لوگوں سے ملاقات کریں، ان میں سے بہترین اشخاص منتخب کر لیں۔ بعد میں میرا مشورہ بھی حاضر ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سات آٹھ روز تک بسیں دوڑتی رہیں، سرگودھا سے، کیمبل پور سے۔ اس دوران میں یہ مجھے نہیں ملے۔ پھر ایک روز ان کا ٹیلی فون آ گیا۔ "کیا کر رہے ہو" میں نے کہا "کچھ نہیں"۔ فرمایا "آ جاؤ"۔ میں گیا، انہوں نے مجھے وزراء کی فہرست دکھائی۔ لیکن ایک نام پر انگلی رکھ لی۔ میں نے پوچھا اس کے نیچے کون ہے کہنے لگے وہ ابھی نہیں بتاتا، بہر حال وہ مظفر علی قزلباش کا نام تھا۔ انہوں نے کہا راولپنڈی سے مجھے کوئی آدمی نہیں مل رہا میں نے کہا برکت اللہ کو لے لیں۔ کہنے لگے، اس کو نہیں لینا۔ میں نے ممتاز کا نام دیا۔ اسے بھی نہیں لینا چاہتے تھے۔ دو تین اور نام لیے جواب ملا "نہیں میں ان سب کو جانتا ہوں"۔ پھر میں نے مسعود صادق کا نام لیا کہنے لگے میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے کہا، میں جانتا ہوں، وہ شیخ صادق کے خاندان سے ہیں۔ شیخ صادق حسن کا خاندان بے داغ خاندان ہے، اس خاندان کی بڑی خدمت ہے۔ کیا بات ہے، کیا بات ہے، کہنے لگے، اچھا تو آپ کی ذمہ داری پر لے لیتا ہوں۔ اس طرح مسعود صادق آ گئے۔ وزارت بن گئی اس وزارت میں فیروز خاں نون وزیر اعلیٰ تھے۔ وزراء میں مظفر علی قزلباش، محمد خان لغاری تھے۔ مسعود صادق تھے علمدار حسین گیلانی تھے۔ لائل پور کے علی اکبر تھے۔ میں تھا۔ ایک بڑی خوش آئند بات ہوئی کہ جب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی میٹنگ نون صاحب کو باقاعدہ لیڈر منتخب کرنے کے لیے ہوئی تو دولتانہ صاحب نے بڑی فراخدلی سے

ملک صاحب کی لیڈری کی تائید بڑے خوش آئند الفاظ میں فرمائی۔

س :۔ یہ خوش آئند الفاظ تادیر نہ رہ سکے۔

ج :۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل تھے۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی توڑ دی دستور سازی کے لیے نئی آئین ساز اسمبلی بننا تھی۔ آئین ساز اسمبلی کے لیے صوبائی اسمبلی کے ممبران ووٹر تھے۔ سنٹر نے کہا۔ آپ اپنی ساری ووٹیں ہمارے سپرد کر دیں، ہم اپنی مرضی کے ممبر بنائیں گے، کیونکہ آئین بنانا ہے، اس میں ہم نے چندریگر کو رکھنا ہے۔ چوہدری محمد علی کو رکھنا ہے، مشتاق احمد گورمانی کو رکھنا ہے وغیرہ وغیرہ اُس طرح یہ لوگ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔ اس قسم کے آدمی جنہیں اسمبلیوں میں ووٹ نہیں ملنے، لیکن ہم انہیں بنانا چاہتے ہیں تاکہ آئین بن سکے، اگر اوٹ پٹانگ قسم کے آدمی آ گئے۔ تو وہ آئین کیسے ٹھیک بنے گا۔

مرکز نے ملک فیروز خاں نون کے ساتھ فیصلہ کیا کہ نو اسمبلی کے سارے ووٹ ہمیں بھیج دے، نون صاحب وعدہ کر آئے، آگر معاملہ کیبنٹ میں پیش کیا۔ کیبنٹ نے منظوری دے دی۔ لیکن نون صاحب پھر گئے، مرکز ان سے ووٹیں مانگے۔ یہ انکار کریں۔ مرکز نے پھر میاں ممتاز دولتانہ کو بلایا۔ یہ اس وقت اپوزیشن لیڈر رہتے۔ سنٹر نے انہیں کہا کہ ہم تیری مدد کرتے ہیں تو نون کی اکثریت ختم کر دے اس کا مجھے اس طرح پتہ چلا کہ میاں مشتاق گورمانی نے ٹیلی فون کر کے مجھے بلایا۔ میں گیا۔ کہنے لگے فیروز کے خلاف چلنا ہے۔ میں نے کہا یہ غلط ہے میں اس کی کیبنٹ میں ہوں۔ گورمانی صاحب نے کہا پہلے آپ کی اطاعت سنٹر کے ساتھ ہے، پھر صوبے کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ ملک کا آئین بننا ہے۔ نون آئین کی خاطر خود مان آیا۔ کیبنٹ نے بھی او کے کر دیا۔ اب انکار کر رہا ہے۔ اس لیے آپ مرکز کا ساتھ دیں۔ یہاں مجھے گورمانی صاحب نے بتایا کہ سنٹر نے میاں ممتاز دولتانہ کو کہا تو انہوں نے کہا کہ دستی سے کہیں کہ میرے ساتھ مل جائے چوری نہیں، کھلم کھلا۔ اس لیے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ مرکز کا ساتھ دیں۔ میں نے کہا میں اکیلا کیا کروں گا۔ کہنے لگے۔ آپ کے ساتھ کوئی ہو یا نہ ہو، دولتانہ کا کہنا ہے کہ آپ اس کا ساتھ دیں۔ میں نے کہا، ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ میں وزارت سے استعفا دیدوں۔ اپوزیشن میں چلا جاؤں۔ گورمانی صاحب کہنے لگے۔ ایسے ہی کر۔

میں مستعفی ہو گیا۔ محمد خاں لغاری اور شیخ مسعود صادق ملے۔ کہنے لگے، چاچا آپ چہرے سے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کہا ایک بے اصولی بات مان آیا ہوں۔ "وہ کیا؟" میں نے تفصیل بتا دی اور کہا کہ اب چار بجے میاں دولتانہ کی میٹنگ پر جا رہا ہوں، ان دونوں نے کاغذ پکڑا اور استعفا لکھ کے مجھے دیدیئے کہ چاچا ہم بھی آپکے ساتھ ہیں۔

میں گورمانی صاحب کے ساتھ لڑتا رہا کہ ہم کل تین آدمی ہیں۔ اس سے فیروز کی میجارٹی کیسے ٹوٹے گی، انہوں نے کہا، یہ نہیں پتہ کر کیسے ٹوٹتی ہے۔

محمد خاں لغاری، مسعود صادق اور میں ہم تینوں چار بجے میاں صاحب کی میٹنگ پر چل دیئے۔ مبارک شاہ کی کوٹھی پر ہو رہی تھی۔ میاں دولتانہ نے مجھے دیکھتے ہی خوشی سے بھنگڑا ڈال دیا۔ بغل گیر ہوئے اور بڑے خوش۔

فارغ ہو کے میں اٹھنے لگا۔ تو میاں صاحب نے کہا، پانچ منٹ کے لیے بیٹھ جائیں۔ اتنے میں ملتان والے علمدار حسین گیلانی کا ٹیلیفون آ گیا کہ دستی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب نے کہا، "ہاں" کہنے لگے۔ انہیں روک کے رکھنا میں بھی آ رہا ہوں۔ وہ آ گئے۔ انہیں میں نے استعفا والی بات بتائی۔ کہنے لگے۔ استعفا اس وقت پیش کرنا جب میں اجازت دوں۔ ذرا کمزور دل تھے میں نے کہا، فیروز کے پاس چلتے ہیں۔ ہم فیروز کی کوٹھی پہنچے تو اس نے کہا۔ "آؤ بسم اللہ۔ کیتھوں آئے او"۔ میں نے کہا "میاں دولتانہ کی میٹنگ سے۔" "وہ کیوں؟" "اس لیے کہ ہماری پہلی اطاعت سنٹر کے ساتھ ہے۔ آپ کا انتخاب بھی سنٹر نے کیا تھا۔ آپ ووٹوں کے ذریعے تو آئے نہیں۔ سنٹر نے آپ سے ووٹیں مانگیں، آپ وعدہ کر کے آئے۔ پھر کابینہ کی میٹنگ میں بھی آپ نے وعدہ کیا۔ اب پھر گئے ہو۔ حق کی خاطر ہم آپ کی کابینہ سے مستعفی ہو آئے ہیں۔ اب اگر آپ خلاف گئے، تو ہم آپ کی کھلم کھلا مخالفت کریں گے۔" نون آدمی بڑا شریف تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ لیکن لائی لگ بہت تھا۔ صائب الرائے نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ میں کل ہی میٹنگ بلا کے تسلیم کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا، "گل مک گئی"۔ رات مجھے ممتاز کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے کہا۔ کوئی ضرورت نہیں، ہو گیا کام۔ کل اس نے میٹنگ کرنی ہے۔ اس میں اس نے مان لینا ہے۔

صبح میٹنگ تھی۔ رات اس کے پاس خضر حیات ٹوانہ اور مظفر علی قزلباش پہنچ گئے۔ انہوں نے نون کو بھڑکایا کہ تین منڈے ان کے ساتھ دو اور منڈے کل پانچ یہ بنتے ہیں۔ اور تو چیف منسٹر۔ سارا ہاؤس تیرے ساتھ۔ نون ان پانچ لڑکوں سے گھبرا گیا۔ تون ملک ہے کر جولاہا۔

میٹنگ شروع ہوئی۔ تقریر میں فیروز نے کہنا شروع کر دیا کہ ووٹیں ہمارا حق ہے۔ ہم سنٹر کے سپرد کیوں کریں۔ تقریر کرتے کرتے اس کی آنکھیں میرے ساتھ چار ہوئیں۔ میں نے گھورا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ پھر اس نے علی اکبر سے قرارداد پیش کرا دی کہ ہم ووٹ اپنی مرضی سے دیں گے۔ میں نے اٹھ کے کہہ دیا۔ میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ میرا اتنا کہنا تھا۔ کہ ہاؤس مچھلی بازار بن گیا۔ کا کارارا۔ کا کارارارا۔ تسی میرے نال، اوہ تہاڈے نال۔ رولا پے گیا۔ پھر صدر نے ڈنڈا اٹھا کے کھڑکایا۔ شور تھا۔ امیر محمد خاں آف کالا باغ اٹھے۔ انہوں نے کہا اگر مظفر گڑھ مخالف ہے۔ تو میانوالی بھی مخالف ہے۔ پھر نوابزادہ اصغر علی گجرات والے اٹھے۔ وہ تھتھلاتے تھے۔ کہنے لگے "جے..... جے..... جے..... م...... م..... م مظفر گڑھ مخالف ہے...... تے...... تے....... تے..... گجرات وی مخالف ہے"۔ ہاؤس پھر مچھلی بازار بن گیا۔ پھر انہیں چپ کرایا گیا۔ اس دوران نون نے مظفر علی قزلباش کو اپنی کرسی صدارت

کے پاس بلایا، انہوں نے مشورہ کیا، اور اٹھ کے کہا، اچھا مجھے منظور ہے، میں ووٹیں لے کے سنٹر کو بھیج دوں گا۔ اتنے میں میاں دولتانہ مائیکروفون پر آ گئے۔ انہوں نے ایک ریزولیوشن بنایا ہوا تھا، وہ انہوں نے پیش کیا، اس میں انہوں نے کہا کہ ووٹیں لے کے چیف وہپ کو دی جائیں۔ وہ جا کے گورنمنٹ ہاؤس دے آئیں گے۔ اس وقت چیف وہپ تھے، چودھری عبدالغنی گھمن سیالکوٹ والے۔ مجھے میاں صاحب کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ کیونکہ اصول کے خلاف تھی۔ میں نے کہا، میں اس کی بھی مخالفت کرتا ہوں۔ جتنی دیر فیروز خاں نون کرسی پر ہیں۔ انہیں کیوں نہ کہیں کہ وہ خود مرکز کو ووٹیں دے آئیں۔ میاں صاحب میرے پاس آ گئے۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا جب وزیراعلیٰ خود ہی مان گئے ہیں۔ تو پھر ہمیں ووٹیں ان کے سپرد کر دینی چاہئیں۔ میاں صاحب کہنے لگے۔ نہیں، نہیں، یہ ریزولیوشن گورنمنٹ ہاؤس سے بن کے آیا ہے۔ میں نے کہا اگر وہاں سے بھی بن کے آیا ہے۔ تو غلط ہے۔ میں ابھی گورنمنٹ ہاؤس ٹیلیفون کرتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے۔ جب میں چلنے لگا تو میاں صاحب نے مجھے پکڑ لیا۔ جیسے آپ کہتے ہیں، ایسے ہی سہی۔ دراصل وہ ریزولیوشن گورنمنٹ ہاؤس نے کوئی نہیں بنائی تھی۔ دولتانہ صاحب کی اپنی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس اور اسمبلی کا ڈائرکیٹ کنکشن ہوتا تھا۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں آرام سے بیٹھ کے سن رہے ہوتے تھے۔ بہرحال۔

پھر یہی طے ہوا کہ ووٹیں لے کے ملک صاحب کو پیش کریں۔ اور ملک صاحب (فیروز خاں نون) کو ہم ہدایت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہاؤس جا کے دے آئیں۔ اجلاس برخاست ہو گیا۔

رات گزر گئی۔ صبح ہوئی، پاکستان ٹائمز دیکھا تو اس میں فیروز خان نون کا بیان تھا جس میں انہوں نے کہا کہ ان تین وزراء نے میری پشت میں خنجر گھونپا ہے۔ مجھے سارے ہاؤس کا اعتماد حاصل ہے۔ یہ تینوں غدار ہیں، بے ایمان ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یوں نون صاحب راتوں رات پھر گئے۔ ووٹیں ہی پی گئے۔ دراصل محمد علی بوگرہ نے انہیں کہا تھا کہ میں آپ کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے ہٹنے نہیں دوں گا۔

یہ بیان پڑھ کے میں نے پریس کو جوابی بیان دیا، جس میں میں نے سارا قصہ بیان کیا کہ کس طرح یہ بار بار وعدہ خلافی کرتے رہے۔ یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ یہ ابھی تک لیڈر آف دی ہاؤس ہیں۔ انہیں چھ دن کے اندر اندر میٹنگ بلا کے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر یہ ایسا نہیں کرتے تو میں حکومت سے کہوں گا کہ وہ انہیں ڈسمس کر دے۔ اگر حکومت نے انہیں ڈسمس نہ کیا تو پھر ہم ہاؤس میں اپنا لیڈر چن لیں گے۔ یہ تو سنٹرل گورنمنٹ کو بنی بنائی بات مل گئی۔ انہوں نے اسے ڈسمس کرنے کا آرڈر کر دیا۔

س:۔ اس کے بعد آپ کو چیف منسٹر بنا دیا گیا۔ کہیں یہ سارا ڈرامہ آپ اسی لیے تو نہیں کر رہے تھے۔

ج:۔ نون کی برطرفی کے بعد مجھے گورنمنٹ ہاؤس سے ٹیلی فون آیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہاں میاں ممتاز دولتانہ، کرنل عابد حسین، کالا باغ، ممدوٹ، وزیر اعظم چودھری محمد علی، سکندر مرزا، یہ سب موجود تھے۔ اور بھی لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ہم آپ کو چیف منسٹر بنا رہے ہیں۔ اس لیے آپ کابینہ تشکیل دیں۔ میں نے کہا، مجھے بخش دیں۔ "وہ کیوں؟" "اس لیے کہ چیونٹی والے پَر مجھے نہیں چاہئیں"۔ کہنے لگے، "چیونٹی والے پر کیسے؟" میں نے کہا ممدوٹ آئے، ڈیڑھ سال رہے۔ گئے۔ ممتاز آئے، دو سال رہے۔ گئے۔ فیروز آئے، دو سال رہے گئے۔

یہ چیونٹی والے پر میں نہیں لگانا چاہتا۔ میں جہاں ہوں، وہیں اچھا۔

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر میاں دولتانہ نے یا چودھری محمد علی نے بات کی کہ ہم تین چار دن سے لڑ رہے تھے کہ کسی ایک پر سب متفق نہیں ہوئے۔ بالآخر آپ کا نام سامنے آیا تو سب اتفاق کر گئے کہ ہمیں منظور ہے۔ میں نے کہا، لیکن مجھے منظور نہیں۔ کہنے لگے، آپ اب بھی کیوں نہیں مان رہے؟ میں نے کہا، میں لڑاکا نہیں، مجھے لڑنا آتا ہی نہیں، مجھے صرف کام کرنا آتا ہے۔ میاں صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ کرنل عابد حسین نے کہا، تگڑا ہو، ڈرنا کیوں ایں۔ اس طرح میں چیف منسٹر ہوا۔

س:۔ مرکزی حکومت دستور ساز اسمبلی میں اپنی مرضی کے آدمی لانا چاہتی تھی۔ اس کے لیے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا۔ ۵۴ء کی اسمبلی اور خواجہ ناظم الدین کے بعد فیروز خاں نون بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ مرکز کے لوگ کس قسم کا آئین بنانا چاہتے تھے۔ کیا ۵۶ء کا آئین ان کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ جس کے لیے آئین سازی کا کام اتنے سال موخر رہا۔

ج:۔ آئین اس لیے نہیں بن سکا تھا کہ مشرقی پاکستان ایک ہی صوبہ تھا۔ آبادی اُن کی زیادہ تھی۔ یہاں چار صوبے تھے۔ مشرقی پاکستان والے یہاں سے کسی بھی ایک صوبے کو ساتھ ملا سکتے تھے۔ یہ تو آگے ہی تیار تھے۔ جس طرح ابلیس نے کہا تھا کہ اللہ میاں اب کوئی اور خلقت بنا۔ میں تو ابھی ادھ میل پرے ہوتا ہوں تو یہ گر پڑتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کی اکثریت ختم کرنے کا حل یہ سوچا گیا کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنایا جائے۔ اور ون مین ون ووٹ کی بجائے پیریٹی ہو۔ سو ممبر مغربی پاکستان سے، سو ممبر مشرقی پاکستان سے۔

س:۔ ون یونٹ کی تشکیل پر مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کا کیا رویہ تھا۔

ج:۔ سندھ اور فرنٹیئر والے بگڑ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ون یونٹ اگر بنا تو ہم پنجاب کے نیچے آ جائیں گے، کیوں کہ ڈاکٹر ان کے انجینئر ان کے، سیکرٹری ان کے اُوپر سے اکثریت ان کی۔ ہم نے پیش کش کی، ہم اکثریت کو اقلیت میں بدل دیتے ہیں۔ کہنے لگے وہ کیسے؟ اپنے بندے مار دو گے؟ ہم نے کہا نہیں بندے نہیں ماریں گے۔ ہم اپنے ممبران اسمبلی کی تعداد کم کر دیں

گے۔ آپ کا حلقۂ انتخاب پچاس ہزار کی آبادی پر ہوگا۔ اور پنجاب کا حلقۂ انتخاب ایک لاکھ کی آبادی پر ہوگا۔ جہاں ہمارا ایک ممبر جائے گا۔ آپ کے دو جائیں گے ہم اکثریت سے اقلیت میں آجائیں گے، کہنے لگے پھر بھی آپ تگڑے ہیں۔" اسے وہ کیوں؟ "وہ یوں کہ سارے سیکرٹری، سارے انجنیئر، سارے ڈاکٹر آپ کے ہیں۔" ہم نے کہا وہ تو پھر آپ کی غلطی ہوئی، کیوں نہیں پڑھے بہرحال طے یہ پایا کہ دس سال تک مغربی پاکستان کا چیف منسٹر پنجاب سے نہیں ہوگا۔ اس دوران میں آپ اپنے انجنیئر بھی بنالیں، سیکرٹری بھی بنالیں۔ یوں آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، پھر وہ مان گئے،

س:۔ آپ نے ون یونٹ بنایا تا کہ ایسٹ پاکستان کی اکثریت ختم کی جاسکے، کہیں وہ ہم پر ہمیشہ حکمران ہی نہ رہیں۔ یہی چیز پھر ایسٹ پاکستانیوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

ج:۔ نہیں اس وقت نہیں، اس وقت انہیں یہ شکایت تھی کہ وہاں کا گورنر ہے تو پنجابی ملک فیروز خان نون کو گورنری چھڑوا کے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا تھا۔ کمشنر ہے تو پنجابی۔ چیف سیکرٹری ہے تو پنجابی، یہ انہیں شکایت ہوتی تھی کہ ان پر پنجابی سوار ہیں۔ دراصل جب پاکستان بنا ہے تو مشرقی پاکستان بہت پسماندہ علاقہ تھا۔ اس لیے کہ وہ لوگ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہوئے تھے۔ ہم انہیں کہتے تھے کہ آپ کا اپنا چیف منسٹر ہے۔ اپنے منسٹر ہیں، ان سے مانگیں اور لیں۔ پھر بھی مرکز ان کے لیے بہت کچھ کرتا تھا۔

ون یونٹ کی بنیاد پر آئین بنانے سے پہلے ان سے پوچھ لیا گیا تھا کہ دو صوبے ہوں گے۔ آپ جو مانگیں گے، وہ آپ کو مل جائے گا۔ اس لیے انہیں شکایت نہیں تھی اور آئین (۱۹۵۶ء) متفقہ طور پر بن گیا۔

س:۔ بعد میں انہوں نے احساس محرومی کی بہت دہائی دی۔

ج:۔ اس وقت بھی اسمبلی اجلاسوں میں بنگالی ممبر جب بولتے تھے۔ تو یہی کہتے تھے، ہمیں یہ نہیں ملا۔ ہمیں وہ نہیں ملا۔ انکے ذہنوں میں یہ باتیں ہندوؤں نے ڈالی تھیں، ہندو وہاں اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ نیشنل اسمبلی کے آٹھ ممبر ہندو تھے۔ اُسی طرح دھوتی باندھ کے آتے تھے۔ ہندو نے ان کے ذہنوں میں ڈالا کہ یہ آپ کو لوٹ رہے ہیں۔ آپ کی پٹ سن کے سارے پیسے مرکزی حکومت لے جاتی ہے آپ کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ تحقیق وہ کرتے نہیں تھے، ذہنوں میں بٹھا لیتے تھے کہ ہمارا سونے کا ریشہ کھا گئے۔ نورالامین اور خواجہ ناظم الدین انہیں بہت سمجھاتے تھے کہ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم مرکز سے اپنا حصہ جو لے سکتے ہیں، لے رہے ہیں۔ بنگالی کہتے کہ یہ بھی مغربی پاکستان سے ملے ہوئے ہیں، ان کے بھی خلاف ہو گئے، پھر ۱۹۵۴ء میں وہاں مسلم لیگ کامیاب نہ ہو سکی۔

س:۔ ٹھیک ہے۔ طے پایا کہ دس سال کے لیے مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ پنجاب سے نہیں لیا جائے گا۔ چھوٹے صوبوں سے ہوگا۔ ڈاکٹر خان صاحب پر ہی نظر انتخاب کیوں پڑی،

باوجود یکہ قیام پاکستان کے موقعہ پر انہوں نے پاکستانی پرچم کو سلامی نہیں دی تھی۔ ان کی وزارت توڑنا پڑی، پھر یہ ہوا، کہ ڈاکٹر خان صاحب کو وحدت مغربی پاکستان کا پہلا وزیر اعلیٰ بنانے کے لیے راتوں رات ری پبلیکن پارٹی بنانا پڑی۔

ج:۔ جس وقت ہمارے مسلم لیگی فرنٹیئر گئے، انہیں پتہ چلا کہ جیل میں ہونے کے باوجود اس خاندان کا صوبے میں اثر ہے، پھر ممدوٹ وغیرہ جیل میں ان سے ملے۔ ممکن ہے دولتانہ بھی ساتھ ہوں، ممدوٹ کا تو مجھے پتہ ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر خانصاحب کو سمجھایا کہ اب پاکستان بنے اتنے سال ہو گئے، اب تو ہندوؤں کی دوستی چھوڑیں، آپ فرنٹیئر (سرحد) کے چیف منسٹر رہے ہیں، آپ کی کارکردگی ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے آپ کو مغربی پاکستان کا پہلا وزیر اعلیٰ بنا رہے ہیں۔ میں اس موقع پر موجود نہیں تھا۔ بہرحال ڈاکٹر خان صاحب کو جیل میں سے نکال کے لائے، انہیں کراچی میں لایا گیا، اور مرکزی حکومت میں انہیں بغیر کسی شعبے کے وزارت دے دی گئی، پھر جب مغربی پاکستان کے تمام صوبے ون یونٹ پر رضامند ہو گئے تو وحدت مغربی پاکستان کا مسودہ تیار کیا گیا، جو سہروردی صاحب نے بطور وزیر قانون پیش کیا، سہروردی صاحب سے مسودہ پیش کروانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مشرقی پاکستان بھی ساتھ ہو جائے۔

جب ۱۹۵۶ء والا آئین وفاقی اسمبلی میں پیش تھا تو اپوزیشن کے کسی رکن نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر خان صاحب کو یہ تاثر دیا کہ مسلم لیگ والے ان کا تعاون تو لے لیں گے لیکن بعد میں ان کو لات مار کر الگ کر دیں گے۔ یہ واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو تین مرتبہ اسمبلی میں پیش آیا، اور ہر مرتبہ جب بھی یہ الزام لگایا گیا مسلم لیگ کے وزیر اعظم چوہدری محمد علی صاحب نے بھرے ہوئے ایوان میں اس کی بڑے تیقن آمیز لہجے میں تردید کی۔ بلکہ چوہدری صاحب نے ڈاکٹر خان صاحب کے حق میں جو اپیل شائع کی وہ میاں ممتاز دولتانہ نے لکھی تھی۔

س:۔ ڈاکٹر خان صاحب کو ووٹ دینے کی اپیل میاں ممتاز دولتانہ نے لکھی؟

ج:۔ انہیں پوچھ لینا اگر مان جائیں۔ مجھے چوہدری صاحب نے پوچھا، آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے، آپ میاں صاحب سے پوچھیں۔ انہوں نے کہا میاں صاحب تو کہتے ہیں، میں ساتھ ہوں، چنانچہ وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے بڑے مسلم لیگی رہنماؤں اور دوسرے صوبوں کے سربراہوں کی ایک نشست طلب کی۔ ان میں خان افتخار حسین خان ممدوٹ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، کرنل عابد حسین اور میں بھی شامل تھا۔ مقصد اس اجلاس کا جو چوہدری صاحب نے بیان کیا، یہ تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کا حسب وعدہ وزیر اعلیٰ منتخب کیا جانا ضروری ہے اور اس کی تکمیل کے لیے پوری کوشش ہونی چاہیئے۔ اس بات کو جملہ حاضرین نے تسلیم کیا۔ اور تعاون کا وعدہ کیا۔ طے یہ پایا کہ وزیر اعظم کی طرف سے ایک اپیل بھی شائع کی جائے، کہ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ تعاون کرنا لازمی ہے اور یہ بھی طے پایا کہ وہ اپیل

میاں ممتاز دولتانہ مرتب کریں گے اور چوہدری محمد علی صاحب کے دستخطوں سے وہ شائع ہوگی، چنانچہ وہ شائع ہوئی۔

اس ضمن میں مسلم لیگ کی پراونشل کونسل کا اجلاس بھی طلب کیا گیا ممبران کو اکٹھا کر کے بتانا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان بنانا ہے۔ اس مجلس کے ممبران کچھ وہی پرانے تھے، جو ۱۹۵۱ء میں میاں دولتانہ صاحب کی سربراہی میں منتخب کیے گئے تھے۔ اس لیے وہ میاں صاحب کے دائرہ اثر میں تھے۔ خود مجھ سے انہوں نے مظفر گڑھ سے اپنی مرضی کے تین کونسلر منتخب کرائے تھے۔ مثلاً لاہور کے ابوسعید انور، راولپنڈی کے سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی اور لائلپور کے میر صاحب تھے۔ یہ عجیب بات ہوئی کہ مسلم لیگ کی اس پراونشل کونسل کے اجلاس میں سندھ کے دو ہندو ممبر بھی شامل تھے۔ یہ پتہ نہیں کیسے ہوا تاہم اس اجلاس میں میاں ممتاز دولتانہ صاحب نے بڑی مدلل تقریر کے ساتھ حاضرین کو ڈاکٹر خان صاحب کے حق میں ووٹ دینے کی زوردار کوشش فرمائی۔ میں نے بھی خطاب کیا اور ممبران پر واضح کیا کہ مخالفین بھرے ایوان میں مسلم لیگ پر الزام دھر رہے تھے کہ مسلم لیگ والے ڈاکٹر خان صاحب کو استعمال کر کے باہر پھینک دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلم لیگ کے نام پر ایک اور سیاہ داغ لگ جائے۔ لہٰذا ہمیں اپنے قول پر قائم رہنا چاہیئے۔ بالخصوص جبکہ وزیر اعظم کی مخلصانہ اپیل بھی اس کے حصول کی خواہاں اور ملتجی ہے۔ چنانچہ ان تقریروں کے بعد جب ووٹوں کا شمار کیا گیا تو پارٹی کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان کے حق میں ووٹ بہت زیادہ تھے اور ڈاکٹر خاں صاحب کے کم تھے۔

س:۔ مسترد ہی کر دیا نا؟

ج:۔ ہاں مسلم لیگ نے ڈاکٹر خان صاحب کو رجیکٹ کر دیا۔

س:۔ کیسے؟

ج:۔ میاں دولتانہ کے آدمیوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی مخالفت میں ووٹ دیئے۔

س:۔ ایک طرف تو میاں صاحب نے اپیل لکھی اور بقول آپ کے صوبائی مسلم لیگ کی کونسل میں ڈاکٹر خان صاحب کے حق میں مدلل تقریر کی۔ کیا واقعات ہوئے کہ میاں صاحب کے آدمی ڈاکٹر خان صاحب کے خلاف گئے۔

ج:۔ ووٹوں کے لیے اپیل انہوں نے لکھی۔ بڑی مدلل تقریر کی۔ میاں صاحب میں صفت تھی کہ اگر آپ کو ناپسند کرتے ہیں تو تقریر کریں گے۔ اور آپکو اتنا اٹھائیں گے کہ سننے والا اگر نہ مانے تو بڑا ہی بیوقوف ہوگا۔ جب مرکز نے ان سے استعفا لیا اور ان کی جگہ فیروز خان نون کو وزیر اعلیٰ بنا کے بھیجا تو انہوں نے ہاؤس میں تقریر کی کہ یہ مسلم لیگ کے لیڈر ہیں، مسلم لیگ نے انہیں مرکز سے بھیجا ہے۔ میں ان کی وہی خدمت کروں گا، جو ایک اردلی اپنے صاحب کی کرتا ہے۔ میاں صاحب نے نون کی بڑی تعریف کی، باہر نکلے تو گالیاں دے رہے تھے۔

"میں اس حرامزادے سے نپٹ لوں گا" پھر اپوزیشن میں چلے گئے، سنٹر نے نون کو ہٹانا چاہا تو میاں صاحب کو ہی استعمال کیا۔

جن دنوں انہوں نے اینٹی قادیانی ایجی ٹیشن شروع کروائی، خواجہ ناظم الدین لاہور آئے ان کے ساتھ عبدالرب نشتر بھی تھے۔ میاں صاحب خواجہ صاحب کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کی میٹنگ تھی، اس میں انہوں نے نشتر کو بلا لیا اور انہیں اتنا اٹھایا کہ یہ شخص دوسرا قائداعظمؒ ہے۔ قائداعظمؒ کا جسم تو چلا گیا۔ ان کی روح نشتر میں ہے، خدا جانے میاں صاحب نے کیا کچھ کہا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو میاں نے مجھے کہا۔ آپ میری گاڑی میں ہی بیٹھ جائیں، میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے کہا میاں صاحب آپ نے نشتر صاحب کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہت زیادہ، میری تے تھک نئیں سی لنگدی، میں واقعی بڑا متاثر ہوا تھا۔ میاں صاحب نے جو جواب دیا تھا، وہ بھی سن لیں۔ فرمایا "میں نے اس حرامزادے کو نہ اُدھر کا چھوڑا ہے نہ اِدھر کا چھوڑا ہے"۔ یعنی یہ خواجہ صاحب کے ساتھ ہیں، میں نے اتنی تعریف کر دی ہے۔ کہ خواجہ صاحب کو پتہ چل گیا کہ یہ اس قسم کا ہے۔ اب نشتر اُدھر سے گیا، اور دستی کو پتہ چل گیا۔ کہ میاں ممتاز خان دولتانہ کون ہیں،

ہیں تو ہم بے وقوف لیکن بندہ پہچان لیتے ہیں۔

س:۔ ہم دور چلے گئے۔

ج:۔ ہاں تو میاں صاحب ڈاکٹر خان صاحب کے اس لیے خلاف گئے کہ ان کا مقصد تھا۔ ایسا شخص وزیراعلیٰ بنے جو ان کے ہاتھ میں رہے۔ ڈاکٹر خانصاحب ان کے ہاتھ میں نہیں کھیل سکتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ پراونشل کونسل میں سردار بہادر خان کو سامنے لا کھڑا کیا۔ میاں صاحب کی ساری عمر یہی کوشش رہی ہے کہ آدمی ان کے ہاتھ میں کھیلے جب دیکھا کہ ایسا نہیں ہو رہا۔ مخالفت شروع کر دی۔ میاں صاحب ممدوٹ کابینہ میں وزیر خزانہ تھے۔ ممدوٹ کے رائٹ ہینڈ تھے۔ کرتا دھرتا یہی تھے۔ ممدوٹ نے کوئی بات نہیں مانی ہو گی۔ اس کے خلاف ہو گئے۔ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان تھے۔ دولتانہ صاحب وزیراعلیٰ پنجاب تھے۔ خواجہ صاحب کو زک پہنچانے کے لیے ۵۳ء والی ایجی ٹیشن شروع کر دی۔

آپ نے پوچھا تھا کہ راتوں رات ری پبلکن کیوں بنی۔ اب میں اس طرف آتا ہوں۔

اس امر سے اکابرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میاں صاحب کے رفقاء نے ڈاکٹر خان صاحب کے خلاف ووٹ دیئے ہیں اور مسلم لیگ، مسلم لیگ نہیں رہی، گروپ بن گئی ہے، یہی امر مسلم لیگ میں تفریق کا باعث ہوا۔ پرانے مسلم لیگی، مثلاً پنجاب سے نواب ممدوٹ، کالاباغ، کرنل عابد حسین، سندھ سے قاضی فضل اللہ، پیرزادہ عبدالستار، سرحد سے سردار عبدالرشید، خداداد خان، ارباب نور محمد وغیرہ وغیرہ، انہوں نے پھر الگ پارٹی بنانا لازمی سمجھا اس طرح ری پبلکن پارٹی ظہور میں آئی۔ پہلے تو نام ہی نہیں ملتا تھا کہ کیا رکھا جائے۔

چونکہ آئین میں ری پبلک آف پاکستان تھا اس مناسبت سے پارٹی کا نام ری پبلکن رکھ دیا گیا۔ آدمی تو اس میں سارے مسلم لیگی تھا۔ ممدوٹ مسلم لیگی تھے۔ ممتاز حسن قزلباش جو ریاست خیر پور میں وزیر اعظم تھے، مسلم لیگی تھے۔ قاضی فضل اللہ مسلم لیگی تھے، پیرزادہ عبدالستار مسلم لیگی تھے، چونکہ عوام کو مسلم لیگ سے اُنس تھا۔ اس لیے جب اس سے ہٹ کر نیا نام رکھا، تو لوگوں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان اسمبلی ممبر شپ کا الیکشن ایک ووٹ سے جیتے وہ ووٹ بھی میں نے انہیں دلوایا۔ مولوی عبدالباری واپس آرہے تھے۔ میں نے انہیں روکا۔ کہ ووٹ دے کے جائیں۔ انہوں نے کہا آپ نے گورُو سے پوچھا ہے؟ میں نے کہا کون گورو۔ کہنے لگے "گورمانی"، میں نے کہا آپ ووٹ ہمیں دیں۔ ان کی ذمہ داری میں لیتا ہوں، پٹھان ممبران کو کافی دیر تک یہ شک رہا کہ میں نے ووٹ اُدھر دیا ہوگا۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کو پتہ تھا کہ اس نے نہ صرف ووٹ دیا ہے۔ بلکہ جتوایا بھی اس نے ہے، اگر مولوی عبدالباری چلے جاتے تو ڈاکٹر خان کیسے جیت سکتے تھے۔

س:۔ معلوم تو یہی ہو رہا ہے کہ یہ پارٹی کٹھن حالات سے دوچار ہو چکی تھی۔ سب سے اہم مرحلہ تو سپیکر کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جس پارٹی کا سپیکر جیت جائے۔ اسی کی حکومت بن جاتی ہے۔ آپ نے یہ مرحلہ کس طرح طے کیا۔

ج:۔ ہم نے چوہدری فضل الٰہی مرحوم کو جو بھٹو دور میں صدر مملکت بھی رہے، سپیکر پیش کیا۔ دولتانہ نے غالباً سردار بہادر خان کو سپیکر پیش کیا ہوا تھا۔ سپیکر کا الیکشن ایک قسم کا پارٹی ٹیسٹ تھا۔ اور جب دو بڑی ہستیاں میاں ممتاز دولتانہ اور میاں مشتاق احمد گورمانی مخالف گروپ یعنی مسلم لیگ کی کھلم کھلا رہنمائی کر رہی ہوں۔ گورمانی صاحب نے مجھے بلا کر چوہدری فضل الٰہی کی مخالفت پر آمادہ کرنا چاہا۔ میرے انکار پر انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جیت رہے ہیں۔ آپ کو بھی وزارت دی جائے گی۔ میں نے کہا سوال وزارت کا نہیں۔ اصول کی بات ہے۔ جب مسلم لیگ نے تین مرتبہ بزبان وزیر اعظم بھرے ایوان میں اپنے اس وعدے کا اعادہ کیا کہ وہ اپنے قول پر قائم رہتے ہوئے ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ بنائیں گے۔ میں نے کہا وزیر اعظم نے یہ بیان جب ایوان پاکستان میں دیا تو اس وقت غیر ممالک کے تمام سفیر گیلری میں موجود تھے۔ ایسے میں ہمارا پھر جانا ملک کے نام پر داغ لگانے کے مترادف ہوگا۔ گورمانی صاحب نے میری عرض نہ مانی اور بدستور مخالفت کرتے رہے۔

ممتاز حسن قزلباش منتظر ہوتے تھے۔ انہیں سپیکر کے الیکشن کے لیے (عارضی) سپیکر بنایا ہوا تھا۔ دولتانہ صاحب نے ایک ممبر کو پتہ نہیں کس طرح توڑا کہ اس نے سپیکر سے کہا کہ گورنمنٹ نے میری مرضی کے خلاف میرا ووٹ زبردستی لے کر چوہدری فضل الٰہی کو دلوایا ہے۔ یہ بات ناممکن تھی۔ تاہم (عارضی) سپیکر ممتاز حسن قزلباش نے شہادت لینا شروع کر دی۔ مجھے پتہ تھا

کہ ووٹ تو برابر جا رہے ہیں، اگر ایک ووٹ گیا تو ہم گئے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اور سپیکر پر اعتراض کیا کہ یہ تو ایک پٹیشن ہے۔ آپ کو الیکشن کمشنر کے اختیارات کس نے دیئے ؟ آپ صرف اناؤنسر ہیں۔ ممتاز حسن قزلباش ہمارا ہی آدمی تھا۔ اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے شکایت سننے سے انکار کر دیا۔ بعد میں اس نے اناؤنس کیا کہ دونوں طرف کے ووٹ برابر ہیں۔ میں اپنا کاسٹنگ ووٹ اس طرف ڈالتا ہوں۔ ہم اس کاسٹنگ ووٹ سے جیت گئے۔ کالا باغ نے جا کے سکندر مرزا سے کہا کہ یہ الیکشن ہم نے دستی کی وجہ سے جیتا ہے۔ ورنہ ہم ہار گئے تھے۔ اس وجہ سے سکندر مرزا میرا تھوڑا سا کرتا تھا۔

میرا ایکسیڈنٹ ہوا۔ میں ہسپتال تھا۔ اچانک افراتفری مچی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ صدر صاحب آ رہے ہیں۔ سکندر مرزا کی چائے تھی۔ میاں امیر دین کے ہاں، مسلم لیگیوں کے پاس سے آ رہے تھے۔ مجھے ڈاکٹر نے بتایا کہ صدر صاحب تھکے تھکے ہیں۔ آتے ہی مجھے پوچھا "کیا حال ہے، تمہارا"؟ میں نے کہا میرا حال تو ٹھیک ہے آپ بتائیں آپ کا حال کیسا ہے۔ کہنے لگے ٹھیک ٹھیک ہے۔ دراصل وہ خان قیوم کے ۳۲ میل لمبے جلوس سے ڈر گئے تھے۔ مراتب علی زدگان اور مظفر علی قزلباش نے سکندر مرزا کو سمجھایا کہ اب آپ پریذیڈنٹ نہیں رہیں گے۔ مارشل لاء لگائیں۔ تب آپ کی صدارت رہے گی۔

س:۔ ری پبلکن بننے سے مسلم لیگ کو سیٹ بیک (دھچکا) تو پہنچا۔

ج:۔ سیٹ بیک کیا۔ مسلم لیگ ختم ہو گئی۔ یہ ایک شخص کے کھیسے (جیب) میں چلی گئی۔ اس شخص کا خیال کرتے یا ملکی سالمیت کا؟

س:۔ آپ کا مطلب ہے کہ مسلم لیگ دولتانہ کی جیب میں چلی گئی۔

ج:۔ بالکل۔

س:۔ مسلم لیگ پر پہلا وار ری پبلکن کی صورت میں ہوا۔ دوسرا وار ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ بنا کے کر دیا۔

ج:۔ کنونشن والے وہ لوگ تھے جن کا ملک کے ساتھ اور مسلم لیگ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا صرف اقتدار سے دلچسپی تھی۔

س:۔ آپ پھر ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ میں رہے۔ آپ کے ان کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔

ج:۔ میں ان کی کابینہ میں رہا۔ میرے اور ان کے تعلقات بہت زیادہ تھے۔

س:۔ کبھی آپ نے ان سے دریافت کیا کہ وہ قیام پاکستان کے اس قدر کیوں مخالف تھے۔ وہی پاکستان جس کے ایک حصے کا انہیں وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔

ج:۔ ہاں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ یہ کیا ہوا کہ آپ کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہ آئی کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہو گا۔ اور بھارت ہندوؤں کا۔ اور آپ کانگریس کے ساتھ مل گئے۔ کہنے لگے ہم انگریزوں کے بڑے خلاف تھے۔ انگریز وہاں سڑک بناتا تو ہم بنانے نہیں دیتے تھے۔

ہندو بھی انگریز کے سخت خلاف تھے۔ آپ کی مسلم لیگ کے متعلق ہمیں کہا جاتا تھا کہ یہ انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ اس واسطے ہمارے دل میں بیٹھ گیا کہ مسلم لیگ انگریزوں کی ایجنٹ ہے۔ پھر نہرو وہاں دو تین بار آیا۔ انہیں ایک بڑا مخلص، دیانتدار اور بیوقوف آدمی چاہیئے تھا۔ اور وہ میں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے سرحد کا وزیر اعلیٰ بنا دیا۔

پھر میں نے ڈاکٹر خان صاحب سے پوچھا، آپ بڑے ہیں یا عبدالغفار خان۔ کہنے لگے میں بڑا ہوں۔ میں نے کہا، چھوٹا ہے تو اسے سمجھاتے کیوں نہیں؟ کہنے لگے، نہرو نے اسے (غفار خاں کو) کہا تھا کہ ہم صوبہ سرحد کو آزاد کر دیں گے۔ اور تجھے اس کا بادشاہ بنائیں گے، اس واسطے اسے باچا خان کہتے ہیں، بادشاہ خان۔ اب بھی کہتے ہیں، اور جتنے ہمارے خدائی خدمت گار تھے، انہوں نے قرآن پر قسم کھائی تھی، اور وہ سب اس قسم کے پابند تھے۔ میں نے ڈاکٹر خان صاحب سے کہا کہ اب آپ غفار خاں کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ کانگریس نے تو آپ کو فرنٹیئر کا بادشاہ بنانا تھا۔ اب آپ کے گھر میں پورے ویسٹ پاکستان کی بادشاہی آگئی۔ ڈاکٹر خان صاحب نے کہا۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ اگر نہ سمجھا تو میں اسے جیل میں ڈال دوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر خاں نے غفار خاں کو جیل بھیج دیا

س:۔ ڈاکٹر خان صاحب نے یہ کہہ کے کہ نہرو کو سرحد میں ایک بڑا مخلص، دیانتدار اور بیوقوف آدمی چاہیئے تھا۔ اور وہ میں تھا۔ ایک طرح سے اعتراف کر لیا کہ وہ غلط تھے۔

ج:۔ جو آپ سمجھ لیں۔ یہ ایک خوبی ہے کہ آدمی سمجھ جائے۔ پھر جب پاکستان بن گیا تو یہ بالکل مخلص آدمی تھے

س:۔ محب وطن پاکستانی۔

ج:۔ جس وقت چیف منسٹر بنے ہیں۔ انتہائی درجے کے مخلص آدمی۔

س:۔ پاکستان کے لیے۔

ج:۔ اور کس کے لیے ہو سکتے تھے۔ سکندر مرزا پران کا اتنا رعب تھا کہ وہ کہتا ہی رہا۔ ایوب کھوڑو کو بھی منسٹر لے لو۔ ان کا یہی جواب ہوتا تھا۔ میں کھوڑو کو وزارت میں نہیں لوں گا۔ میں نے اس کی شہرت خراب سنی ہے۔ نہیں لیا۔ ڈاکٹر خان صاحب میں بہت خوبیاں تھیں۔

س:۔ مثلاً۔

ج:۔ مثلاً یہ کہ جب ری پبلکن پارٹی نے چودھری فضل الٰہی کو سپیکر کے انتخاب کے لیے کھڑا کیا۔ مسئلہ تو بڑا نازک تھا۔ کیونکہ جس پارٹی کا سپیکر جیت جائے وہی حکومت بناتی ہے۔ چودھری فضل الٰہی جیت جاتے تو ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ ہوتے، ورنہ نہیں۔ نواب ممدوٹ اور ممتاز حسن قزلباش وغیرہ ووٹ کے لیے خیر بخش مری کے پاس گئے، اس نے کہا، مجھے ڈاکٹر خان صاحب کہیں تو میں ووٹ دوں گا۔ یہ دونوں میرے پاس آئے کہ ایک ووٹ ہمیں ملتا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے پاس ہم گئے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں اسے جا کے

کہوں کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں، اس لیے آپ مجھے ووٹ دیں، یہ تو میں نہیں کہوں گا، اس لیے دستی صاحب آپ ڈاکٹر خان صاحب سے کہیں۔ میں نے کہا، انہوں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ میری کیسے مانیں گے۔ کہنے لگے، آپ کے بہت قریب ہیں، میں گیا۔ میں لڑ پڑا۔ میں نے کہا اگر آپ اکیلے ہوں تو اپنی مرضی کی باتیں کر سکتے ہیں۔ اگر گاڑی میں بیٹھے ہوں تو پھر آپ کو سواریوں کی طرف دیکھنا ہوگا۔ اب آپ پارٹی لیڈر ہیں۔ آپ کو پارٹی مفادات دیکھنا ہوں گے۔ اور پارٹی کی خاطر خیر بخش مری کے پاس جانا ہوگا۔ مان گئے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ مری کے پاس گئے۔ اور اسے کہا، دیکھو بھائی اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس قابل ہوں، تو آپ مجھے ووٹ دیں، اگر مجھے اس قابل نہیں سمجھتے تو بیشک نہ دیں۔ اس نے ووٹ نہیں دیا۔ بعد میں ہم نے کہا کہ ڈاکٹر خان صاحب کو ہم آپ کے پاس لائے بھی اور آپ نے ووٹ پھر بھی نہیں دیا۔ مری کہتا ہے، میں نے اس لیے کہا تھا، اسے لاؤ کہ وہ آکر مجھ سے ووٹ مانگے تاکہ وہ میرا ممنون ہو۔ لیکن اس نے کہا کہ اگر مجھے اس قابل سمجھتے ہوں تو پھر ووٹ دو، ورنہ نہ دینا۔ میں نے سوچا کہ اسے ووٹ دینا تو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ حالانکہ اتنا سخت مقابلہ تھا کہ ہم کاسٹنگ ووٹ سے جیتے تھے۔

ڈاکٹر خان صاحب اتنے صاف گو تھے کہ قربان علی خان جو بڑے رعب والا آئی جی پولیس ہوا کرتا تھا۔ دولتانہ اسے چاچا کہا کرتے تھے۔ گورمانی صاحب بھی اس کے مرید تھے۔ جب ویسٹ پاکستان بنا ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اسے بھی وزیر لے لیا۔ یہ پولیس سے ریٹائر ہو چکا تھا، اسے قبائلی علاقے کا قلمدان دیا۔ وہ بھی پٹھان تھا، رعونت اس میں بڑی تھی۔ عام کوٹھیوں میں نہیں ٹھہرتا تھا، گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرتا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب کی کوٹھی کے رستے میں میری کوٹھی تھی ۔ ۲، کالج روڈ۔ جب کیبنٹ میٹنگ ہوتی تو وہ اپنی کوٹھی سے نکلتے اور مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ جب قربان علی نے نکلنا "تاڑے موشئے، خیر موشئے" کہتے ہوئے ڈاکٹر خان صاحب سے بغل گیر ہونا۔ میں اس کی رعونت جانتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ڈاکٹر خان صاحب قبائلی علاقے کے دورے پر گئے۔ وہاں سے انہیں حالات کا کچھ پتہ چلا۔ خلاف ہی پتہ لگا ہوگا۔ کیبنٹ میٹنگ میں جا رہے تھے، میں ساتھ تھا۔ قربان علی اسی طرح باہر نکلا "اُو تاڑے موشئے، خیر موشئے" کہنے لگے، "نہایت بے ایمان۔ نہایت بے ایمان" وہ حیران رہ گیا۔ ہم بھی حیران! "بڑا بے ایمان ہے۔ میں گیا۔ میں نے دیکھا وہاں۔ تم تو بڑے بے ایمان ہو" پندرہ روز بعد اسے ڈسمس کر دیا۔ عام طور پر لوگ رواداری کرتے ہیں کہ میرے خلاف بات سنی، دل میں رکھ لی، اُس سے پوچھا۔ اس سے پوچھا، پھر طریقے طریقے سے بات کی۔ یہ کوئی نہیں کرتا کہ "ہٹ بے ایمان"!

س:- پندرہ روز بعد قربان علی خاں کو ڈسمس کر دیا۔ اس کی کیا بے ایمانی یا بدعنوانی ان کے سامنے آئی تھی۔

ہے۔ یہ انہوں نے نہیں بتایا، بتایا ہوتا تو میں بھی بتا دیتا۔ ایک اور واقعہ سناتا ہوں، مظفر گڑھ سے تحصیل کا ایک وفد آیا۔ اس میں ایک ممبر اسمبلی نذر حسین شاہ تھے وہ تحصیل کی تکالیف و مسائل لے کے میرے پاس آئے۔ میں نے کہا، آپ ڈاکٹر خان صاحب سے ملیں، چلے گئے، واپسی پر پھر میرے پاس آئے۔ نذر حسین شاہ کا ساتھی کہنے لگا، نذر حسین شاہ تو بیڑی ڈبو آیا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ لڑ آیا ہے۔ "یہ کیونکر ہوا؟" نذر حسین شاہ کے ساتھی نے بتایا کہ جب ڈاکٹر خان صاحب حکومت کی طرف سے دلائل دے رہے تھے تو اس نے کہا، اس طرح نہیں اس طرح ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر خان صاحب کہنے لگے، تجھے سمجھ تو ہے نہیں، نذر حسین کہنے لگا، فرشیا آپ کو کیا سمجھ ہے، بٹوں (ٹیلوں) کا آپ کو کیا پتہ۔ آپ پہاڑوں کی چٹانوں پر رہنے والے، آپ کو ریت کا کیا پتہ"۔

میں نے کہا، میں تو ان کے بہت قریب ہوں، وہ کہیں گے تیرے ضلع کے اچھے آدمی ہیں۔ یہ تو نذر حسین شاہ آپ نے بہت برا کیا ذرا ضبط کرنا تھا، ان کے مقام کو دیکھنا تھا، آخر وہ چیف منسٹر ہیں۔

اس واقعہ کے بعد جب مجھے ڈاکٹر خان صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو میں بہت جھجکتا ہوا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ یہ کیا آدمی آپ نے بھیجے تھے۔ لیکن انہوں نے حیرت زدہ کر دیا" او دستی تمہارا نذر حسین شاہ تو بڑا خوب آدمی ہے، اس کے ساتھ ہماری دوستی لگوا دو" ڈاکٹر خان صاحب کو نذر حسین شاہ کی وہ ادائے جرأت مندانہ پسند آگئی۔ اتنی کہ اپنی بے عزتی محسوس نہ ہوئی۔ کون ایسا کرتا ہے۔

جب چیف منسٹر تھے، ہم سارے منسٹر کراچی جاتے تھے، تو رح ہاؤس میں ٹھہرتے تھے، وہیں یہ ٹھہرتے تھے، ہم میں سے کسی کو وہ روٹی نہیں پکانے دیتے تھے۔ ہر منسٹر کے ساتھ عملہ ہوتا تھا، عملہ منسٹر کا تھوڑا نہیں ہوتا، پی اے، سٹینو، کلرک، گن مین، اردلی پی اے کا ایک نوکر۔ لیکن کسی کو کھانا نہیں پکانے دیتے تھے۔ یہی کھلاتے تھے، جتنے دن رہنا۔ کسی منسٹر کو اپنا خرچ نہیں کرنے دینا، ناشتہ بھی نہیں، ناشتے پر ہمارے لیے انڈے ٹوسٹ، مربے۔ الم غلم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب کا ناشتہ کیا ہوتا تھا۔ مکی کی روٹی، گڑ اور ساگ۔ لباس کے معاملے میں بھی بہت سادہ تھے، کھدر پہنتے تھے۔

اتنے سیر چشم تھے کہ سکندر مرزا (صدر پاکستان) سمیت چند ایک وزیروں کی خواہش ہوئی کہ اب ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ نہ رہیں، مثلاً کرنل عابد حسین، اگرچہ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مخدوم زادہ حسن محمود نے تو کہنا شروع کر دیا کہ یہ پاگل ہے۔ یہ یوں کر رہا ہے۔ یہ دوں کر رہا ہے۔ اسی طرح کالا باغ بھی مخالف تھے، موقف ان سب کا یہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب اب بوڑھے ہو گئے۔ اب انہیں مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ سکندر مرزا نے میٹنگ کال کی۔ کرنل عابد حسین اٹھے لیکن کہہ نہ سکے، حسن محمود اٹھے۔ وہ بھی

رعب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔ کالاباغ اٹھے، انہوں نے کہا، ڈاکٹر خان صاحب! آپ ہو گئے ہیں، بوڑھے۔ چیف منسٹری بوڑھوں کا کام نہیں، مزید کچھ کہنے لگے تو ڈاکٹر خان صاحب کھڑے ہو گئے۔ "میں نے کب کہا تھا کہ یہ حرام زدگی میرے گلے میں ڈالو۔ اٹھاؤ اپنی حرام زدگی کو۔ ابھی اٹھاؤ۔ میں نے چھوڑ دی۔ میں فیلڈ میں کام کروں گا۔" میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا، میں نے کوٹ کھینچا، تو کہا، "چھوڑ دے۔ کیا کوٹ کھینچتا ہے۔" میں نے کہا یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں، سارے مغربی پاکستان کی چیف منسٹری ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں ابھی چھوڑتا ہوں۔ ٹھیک ہے آپ نے نہیں کرنی۔ لیکن آرام سے سوچیں۔ کسے بنانا ہے۔ کسے نہیں بنانا۔

ان کی سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ اس چیف منسٹری کے لیے لوگ مرتے تھے۔ یہ اتنا نہ سہہ سکے۔ چھوڑ دی۔

پھر یہ بھی تھا کہ جسے چیف منسٹری سے ہٹایا جاتا تھا، وہ اپوزیشن میں چلا جاتا تھا۔ یہ نہیں گئے، حالانکہ ان کے ساتھ ساٹھ آدمی تھے۔ پکے ساٹھ آدمی۔ انہیں وہ ہر الیکشن میں ساتھ رکھتے تھے۔ لیکن اپوزیشن میں نہیں گئے، پارٹی کے ساتھ وفادار رہے۔ آپ ان کی سیر چشمی مانتے ہیں کہ نہیں۔

ایسی سیر چشمی ان میں تھی یا چودھری محمد علی میں تھی۔ چودھری محمد علی نے بھی جب آئین (۵۶ء والا) بنا لیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے حالات دیکھے کہ دولتانہ صاحب کے ساتھ چل نہیں سکتے تھے، آ گئے۔ اور کہا کہ میری پارٹی کوئی نہیں، اس لیے آئینی طور پر وزیراعظم نہیں رہ سکتا، استعفا دیتا ہوں۔ ہم ان کی قابلیت، دیانت اور ذہانت کے بڑے قائل تھے۔

ساری اسمبلی نے ان سے گزارش کی کہ ایسا نہ کریں۔ عوامی لیگ تک نے حتیٰ کہ ہندو ممبران نے بھی، چودھری صاحب کی منتیں کیں کہ ایسا نہ کریں۔ انہوں نے کہا، مُڑ کے سوچوں گا۔ ہم نے انہیں کہا ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ آپ کی پارٹی نہیں، ہم جو آپ کے ساتھ ہیں۔ چودھری صاحب کہنے لگے، ٹھیک ہے۔ کل کو اگر آپ کی جماعت نے کوئی ریزولیوشن پاس کیا آپ تو اس ریزولیوشن کے پابند ہوں گے، تب آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے استعفا دے دیا۔

یہ دو آدمی ہیں جنہوں نے سیر چشمی دکھائی۔ اور وزارت عظمیٰ و علیہ خود بخود چھوڑیں۔ باقی جو تھے، وزارت عظمیٰ اور وزارت علیہ کے لیے لڑتے رہے۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ وزارت اعلیٰ غصے میں چھوڑ دیں، لیکن بعد میں بھی پارٹی کے وفادار رہیں، اور ساٹھ آدمی بھی ہوں، ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں۔ ساٹھ، پکے ساٹھ، گٹھڑی میں بندھے ہوئے، یہ وفاداری میں نے ڈاکٹر خان صاحب میں دیکھی۔

ڈاکٹر خان بہت مخلص آدمی تھے۔ خاندان تو یہ بڑا مظلوم ہے، میری نگاہ میں بھی۔ میں بھی ان کے خلاف ہوں۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کا مداح ہوں، ان کی صاف گوئی، ان کی سادہ روی،



میجر جنرل سکندر مرزا (تب صدر پاکستان)، چودھری محمد علی (تب وزیر اعظم پاکستان) ڈاکٹر خان صاحب (تب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان)
اور کرنل عابد حسین (وزارت کا حلف اٹھاتے ہوئے)

ان کی سادگی. سب سے بڑی بات یہ تھی کہ چھپا کے نہیں رکھتے تھے، آپ کو میں نے بتایا ناکہ جب انہیں پتہ چلا کہ قربان علی خاں بڑا آدمی ہے، کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھی "ہٹ بے ایمان، ہٹ بے ایمان،" جب انہیں پتہ چل جاتا کہ فلاں بُرا آدمی ہے تو منافقت نہیں برتتے تھے، ان کے بعد سردار عبدالرشید آئے۔ (۱۹۵۷ء-۱۹۵۸ء) پھر مظفر علی قزلباش آئے۔ (۱۹۵۸ء) میں بدستور وزیر رہا۔ پھر سات اور آٹھ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی رات مارشل لاء لگ گیا۔

اگر ڈاکٹر خان صاحب زندہ رہتے تو مارشل لا نہ لگتا، میرا تو ایمان ہے۔

س:۔ وہ مارشل لا کو کیسے روک سکتے تھے۔

ج:۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا اُن کا رعب تھا۔ اتنے اُن کے عقیدتمند تھے۔ چیف منسٹر نہ ہونے کے باوجود سکندر مرزا پر اتنا ان کا رعب تھا۔ اگر یہ زندہ رہتے تو سکندر مرزا کو مارشل لا لگانے کی جرأت نہ ہوتی۔ میرا یہ ایمان ہے۔ کوئی میرے ساتھ اتفاق کرے نہ کرے۔

س:۔ آپ نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ جب ایوب خاں نے مارشل لا لگایا تو ہم سیاسی استحکام کی منزل تک آ پہنچے تھے۔ جبکہ ایوب خاں نے یہی بہانہ کیا کہ ملک میں سیاسی عدمِ استحکام کا دور دورہ ہے۔

ج:۔ اور وہ کیا کہتا، جب میری اور قادر بخش کی مخالفت تھی تو بعض لوگوں نے آکے مجھے کہنا کہ آج ملک قادر بخش آپ کے متعلق یہ بات کر رہے تھے۔ میں جواب دیتا تھا۔ اور وہ میرے قصیدے گائے گا۔ ایوب خاں اور کیا کہتے۔

ایوب خاں کا یہ کہنا کہ ہم سیاسی عدمِ استحکام کا شکار تھے، غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نقطۂ استحکام تک پہنچ چکے تھے، میں کہا کرتا تھا کہ یہ چھلنی لگی ہوئی ہے۔ کون آدمی اچھا ہے کون اچھا نہیں ہے۔ جو اچھا نہیں اسے نکالتے جاتے تھے۔ اگر ایوب خاں والا مارشل لا نہ لگتا اور فروری ۱۹۵۹ء والے الیکشن ہو جاتے تو بہت استحکام حاصل ہوتا۔

س:۔ سکندر مرزا نے یہ سارا کچھ اچانک کر دیا یا پہلے سے تیاریوں میں مصروف تھا اس امر کی کبھی سن گن ہوئی۔

ج:۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال معلوم یہ ہوتا ہے۔ مارشل لا لگنے سے پہلے سکندر مرزا اور اس کے ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ مسلم لیگ اگر جیت گئی تو وہ پریذیڈنٹ نہیں رہیں گے۔ پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ مسلم لیگ کے ساتھ ان کا لگاؤ بڑھ جائے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شبہ ہو گیا کہ مسلم لیگ میں ان سے بہتر آدمی موجود ہیں۔ اس لیے ان کی وہاں جگہ نہیں بن سکتی تھی۔ غالب خیال ہے کہ پھر انہوں نے مارشل لگانے کی سوچی۔ اس کے لیے انہوں نے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً وزارتِ عظمیٰ سے سہروردی (۱۸ اکتوبر، ۱۹۵۷ء) کو ہٹایا۔ ان کی جگہ نون کو لے آئے۔ مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ سے سردار عبدالرشید

(۱۸/ مارچ ۱۹۵۸ء) کو ہٹا کے مظفر علی قزلباش کو لے آئے۔ گویا اپنے ہم خیال اور ہم طرز آدمیوں کو اکٹھا کر کے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ڈاکٹر خاں صاحب اس وقت اقتدار میں نہیں تھے، انہیں پتہ چلا کہ سکندر مرزا سہروردی کو وزارت عظمیٰ سے نکال رہے ہیں۔ انہوں نے کہا "سکندر مرزا سہروردی کو ہٹا رہا ہے" غلط کر رہا ہے۔ میں نے جا کے سکندر مرزا سے بات کی کہ سہروردی کو کیوں ہٹا رہے ہو، تو انہوں نے کہا کہ یہ بڑی میٹنگیں کرتا پھرتا ہے۔ اس کے جلسے بڑے بھرپور ہوتے ہیں۔ اور اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے بلا کے پوچھیں۔ سکندر نے کہا، میں نے بلایا ہے۔ اور میرے سامنے وہ (سہروردی) رو پڑا ہے۔ اور اس نے قسم کھائی ہے کہ میں آپ کی ہدایت کے مطابق چلوں گا۔ اس پر میں نے سکندر سے کہا، آپ کو اور کیا چاہیئے۔ جو شخص آپ کے پاس آ کے رو پڑے۔ اسے اگر آپ رہنے دیں۔ وہ تو آپ کا ہمیشہ کے لیے مرید رہے گا۔ میں نے کہا یہ کیا سیاست ہوئی کہ آپ اسے گنوا رہے ہیں۔ سکندر نے میرے دلائل سُن کر اپنے ارادے پر نظر ثانی کرنے کا وعدہ کیا۔ اور مجھے صبح نو بجے آنے کا کہا۔ لیکن رات سکندر کو اکسانے والے پہنچ گئے۔ اور انہوں نے اسے سہروردی کی برطرفی پر آمادہ کر لیا۔ کیونکہ میں صبح نو بجے اس کے پاس پہنچا تو پتہ چلا کہ آٹھ بجے سہروردی کو ہٹا دیا گیا۔ اور ان کی جگہ چندریگر کو پرائم منسٹر (۱۸/ اکتوبر ۱۹۵۷ء) بنا دیا گیا ہے۔

س:۔ سکندر مرزا کے بارے میں مشہور ہے کہ انٹریگر تھا۔ بالآخر اپنے انجام کو پہنچا۔

ج:۔ انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کا پرانا آدمی تھا ملنسار بھی تھا۔ خوش کلام بھی تھا۔ ذہین و فطین بھی تھا۔ فوجی ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ذرا زبردستی تھی۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جو پاکستان بنانے میں شامل نہیں تھے۔ جو پکا ہوا پھل کھانے والے تھے۔ جہاں بھی دیکھتے تھے کہ ہماری ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ وہاں یہ لوگ قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے میں نے لیاقت علی خاں سے کہا تھا اسمبلی نہ توڑنا۔ وزارت توڑ دینا۔ کیونکہ وہ اسمبلی ان افراد پر مشتمل تھی۔ جو قربانی دینا جانتے تھے۔ لیکن یہ لوگ جو پاکستان بنانے میں شامل نہیں تھے، قربانی دینا نہیں جانتے تھے۔ یہ آ گئے برسر اقتدار۔ یہ چیز ہمیں کھا گئی۔

میرا تو ایمان ہے کہ جس نے یہ ملک دیا ہے۔ وہ اسے رکھے گا ضرور۔ یہ ضرور رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز معجزے ہو رہے ہیں۔ کبھی خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ ایوب خاں کا دس سالہ جشن اقتدار اس طرح ختم ہو گا کہ وہ خود بھی ختم ہو جائے گا۔ کسی کے ذہن میں نہیں تھا کہ بھٹو صاحب نے اگلے روز قید ہو جانا ہے اور پھر پھانسی لگ جانا ہے۔ فرشتہ بھی آ کے کہتا تو کوئی نہ مانتا۔ یہ معجزے ہیں۔

س:۔ سکندر مرزا کے متعلق سر ظفر اللہ خاں نے مجھے بتایا تھا کہ بڑے کام والا اور بڑی صلاحیتوں والا آدمی تھا، لیکن جوڑ توڑ میں پڑ کے ختم ہو گیا۔

ج :۔ ٹھیک ہوگا۔ وہ فارن منسٹر تھے۔ انہیں ان سے ملنے کے زیادہ اتفاقات ہوتے تھے۔ ملنے کا تو بہت سارا اتفاق مجھے بھی ہوا ہے۔ برج بھی کھیلا کرتے تھے۔ مگر اعمال سے پتہ چلتا ہے

س :۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ، سکندر مرزا کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ یہ انگریز کا ایجنٹ ہے۔

ج :۔ محترمہ کہتی ہوں گی۔ میرے علم میں نہیں۔ میرے سامنے کبھی اس کا ذکر نہیں آیا۔

س :۔ مروا گیا۔

ج :۔ اگر وہ رہ جاتا تو پھر بھی امکان تھا کہ جمہوریت لوٹ آتی۔

س :۔ خود ہی اس نے مارشل لا لگوایا۔ عین اس وقت جب بقول آپ کے جمہوری اور سیاسی استحکام آنے والا تھا۔ پھر وہ کیسے جمہوریت کی طرف آتا۔

ج :۔ کیونکہ اسے قوت چاہیئے تھی۔ عمر بھر کے لیے تو وہ فوج کی وجہ سے نہیں رہ سکتا تھا۔

س :۔ آپ کے خیال میں اس نے وقتی طور پر فوج کا سہارا لیا تھا۔

ج :۔ میرا تو غالب خیال یہی ہے کہ اس نے وقتی طور پر فوج کو بلایا تھا۔ اگر وہ رہ جاتا تو میرا دل یہ کہتا ہے کہ اسے جمہوریت کی طرف لوٹنا پڑتا۔

س :۔ سوال تو یہ ہے کہ رہتا کیسے؟

ج :۔ ہاں طاقت تو فوج کے پاس تھی۔ اس نے ان کی آڑ لی۔ انہوں نے اسے چلتا کیا۔ سکندر خان قیوم کے ۳۲ میل لمبے جلوس سے گھبرا گیا۔ اسے مراتب علی زردگان اور مظفر علی قزلباش نے کہا کہ مسلم لیگ آئی تو تو پریذیڈنٹ نہیں رہے گا۔ مارشل لا لگا۔ پھر صدارت رہے گی۔ مظفر علی قزلباش جس کے ساتھ بھی لگا۔ اس کی بیڑی ڈبوئی۔

س :۔ بیڑیاں ڈبونے کا بھی کوئی خاص نسخہ ہوتا ہے۔

ج :۔ غلط مشورے دینا۔ چمچاں دیندیاں رہنا۔ خضر حیات ٹوانہ کا یہ دایاں ہاتھ تھا۔ اخیر دم تک اس نے خضر کو مسلم لیگ کے خلاف کیے رکھا۔ فیروز خان نون اور سکندر مرزا کے متعلق تفصیل بتا چکا ہوں کہ ان کی بیڑیاں کیسے ڈبوئیں۔ ایوب کو بھی شکار کھلایا کرتا تھا۔ اس کی فلمیں بھی بناتا تھا۔ اس کی بیڑی ڈبوئی۔ پھر یحییٰ خاں کے ساتھ لگا۔ اس کی بیڑی ڈبوئی۔ ویسے تو بھٹو نے بھی فرانس میں سفیر بنا دیا تھا۔

س :۔ ملک خضر حیات ٹوانہ سے پاکستان بننے کے بعد آپ کی ملاقات ہوتی رہی۔

ج :۔ بہت کم۔

س :۔ اس نے کبھی اعتراف کیا کہ وہ غلط تھا۔

ج :۔ نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ یہ بڑی موٹی بات تھی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کبھی وفا نہیں کی۔ ہندو کا ساتھ دینے والوں نے جو غلطی کی۔ اس کے نقصانات کی تلافی اقرارِ گناہ کرکے تو ہو نہیں سکتی۔

س :۔ آپ ہر دور میں وزیر رہے۔ ایوب خاں کے دور میں بطور وزیر آپ کا نام نہیں دیکھا سنا۔ کبھی آفر ہوئی۔

ج :۔ ایوب خاں نے سیاستدانوں کی ایک فہرست بنائی تھی کہ انہیں آٹھ سال کے لیے ایبڈو کرنا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے مجھے بھی اس قابل سمجھا جس سے ذرا بھی خوف تھا۔ ایوب خاں نے اسے ایبڈو کر دیا تھا۔ ہم سب ایبڈو زدگان ممدوٹ صاحب کی کوٹھی میں جمع ہوئے۔ طے پایا کہ جس جس کا ہائی کورٹ کا کوئی جج واقف ہے، وہ اس سے مشورہ کرے۔ میرے جسٹس کیانی کے ساتھ تعلقات تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ وہ میرے گلے پڑ گئے۔ "تمہارے گردے کدھر گئے؟" میں نے کہا۔ "گردے تو ہیں۔ لیکن باہر توپ پڑی ہے"۔ کافی بحث کے بعد کیانی کہنے لگے، دفعہ کرو، کیونکہ ایوب خاں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ثابت ہو نہ ہو۔ انہیں نکالنا ضرور ہے۔ چنانچہ ممتاز نے، ممدوٹ نے، میں نے ہم سب نے آپشن دیدی کہ ہم آٹھ سال تک سیاست میں حصہ نہیں لیں گے۔

س :۔ سہروردی نے نہیں دی۔

ج :۔ وہ لڑے، ایک اور تھے ان کے ساتھ۔ محمد خاں لغاری نے بھی ایبڈو کا کیس فائٹ کیا۔ اس میں میری بھی شہادت تھی۔ مگر ایبڈو کر دیا۔

س :۔ قبل ازیں ایوب خاں سے یاد اللہ تھی۔

ج :۔ میں منسٹر تھا۔ میجر جنرل اعظم خاں لاہور میں ایریا کمانڈر تھے۔ میرے ان کے تعلقات تھے عیدین کے موقع پر، عید پڑھنے کے بعد پہلے مجھے عید مبارک کہنے آتے تھے۔ پھر کہیں اور جاتے تھے۔ حسن ابدال کیڈٹ سکول کے سلسلے میں جنرل ایوب خاں، میجر جنرل اعظم خان کو بطور سفارش میرے پاس لے کے آئے تھے۔ میں انہیں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے مارشل لا لگایا تو انہیں اچھی طرح جاننے لگا۔

س :۔ ایوب خاں نے آتے ہی وزیروں کی مسلیں طلب کر لی تھیں۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ لوگ جاتے جاتے کیا آرڈر کر گئے ہیں۔

ج :۔ میں شروع اکتوبر ۵۸ء انڈیا میں ایک سرکاری کانفرنس میں شرکت کیلئے گیا ہوا تھا۔ ۵ کی شام کو واپس پہنچا۔ ۶ کو مسلیں نکالیں۔ آرڈر لکھوائے۔ سات اور آٹھ کی درمیانی شب مارشل لاء لگ گیا۔ ایوب خاں نے وزیروں کی مسلیں منگوائیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی غلط حکم تو نہیں لکھ گئے۔ وہ مسلیں بڑی دیر بعد واپس ہوئیں۔ لیکن میری مسلیں فوراً آگئیں۔

س :۔ انڈیا کا وہ دورہ کس مقصد کے لیے تھا۔

ج :۔ اکتوبر ۵۸ء کا ذکر ہے کہ شملہ میں ۲۔ ۳۔ ۴ اکتوبر کو انٹر پیرو انشل ڈیبیٹ کانفرنس ہوئی۔ اس میں پاکستان کی جانب سے میں اور میرے ساتھ عبدالستار پیرزادہ تھے۔ اس کے علاوہ چیف سیکرٹری سید فدا حسن اور فنانس سیکرٹری ایم ایم احمد تھے۔ اور باقی عملہ۔ اس میں متنازعہ

معاملہ بھارت کی طرف سے بیلنس شیٹ کے حصول پر اصرار تھا۔ باقی کچھ اور چھوٹے چھوٹے مسئلے بھی تھے۔ جن میں ایک مسئلہ یہ تھا کہ لاہور عجائب گھر میں بتوں کی صورت میں جو نوادرات ہیں، وہ ہم بھارتی پنجاب کو ان کے حصے کے مطابق دیں۔ تاہم ان کا زیادہ زور بیلنس شیٹ کے متعلق ہوتا تھا۔ اس لیے جانے سے پہلے، میں نے مرکز والوں سے دریافت کیا کہ بیلنس شیٹ کا کیا جواب دینا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ آئیں، بائیں، شائیں کر دینا۔ چنانچہ جب ہم شملہ پہنچے اور اجلاس شروع ہوا۔ اس میں مطالبے پیش کیے گئے اور ان کی جانب سے بڑی دھواں دھار تقریریں ہوتی رہیں جن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ دیکھو جی یہ بُت شکن بنے پھرتے ہیں، اور یہ بُت واپس نہیں کرتے، اور بیلنس شیٹ کے متعلق وہ دلچسپ انداز میں ہم پر ضربیں لگاتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ کہتے ہیں، بیلنس شیٹ تیار نہیں۔ حالانکہ تیار ہے۔ ہمارے پاس اس کی چرائی ہوئی نقل موجود ہے۔ یہ ایمان اور اسلام والے جھوٹ بول رہے ہیں، انہوں نے پاکستان بنایا ہے اور یہ ایسے پاک لوگ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اب ہم نے اگلے روز ان کا جواب دینا تھا۔ شروع ہونے سے پہلی شام ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس صورتِ حال میں بیلنس شیٹ کا کیا جواب دینا چاہیے۔ کوئی خاص بات بن نہیں پا رہی تھی۔ پیرزادہ عبدالستار صاحب نے تو کہا یہ معاملہ پنجاب کا ہے۔ آپ لوگ ہی اسے سنبھالیں۔ لیکن رات بھر مجھے یہ احساس تنگ کرتا رہا کہ الٹم فلٹم جواب سے مایوسی اور بدنامی کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کوئی جواب سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اللہ کی رحمت سے خیال آیا کہ ان لوگوں نے ہماری نہروں کا پانی بند کرنے کی دھمکی دی ہوئی ہے۔ اس خیال پر سوچتے سوچتے کچھ نہ کچھ کہنے کی بات دل میں آ گئی۔ چنانچہ ان کے مطالبے کے جواب میں بتوں کے متعلق یوں کہہ کے پیچھا چھڑایا کہ ہمارے ہاں بھی ہندو موجود ہیں۔ جو کہ سندھ میں آباد ہیں اور جگہ بھی آباد ہیں۔ ان کے جذبات کی حرمت و تکریم کی خاطر ہم نے یہ بت رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اعتقاد کے خلاف ہیں۔ لیکن ان کی دلجوئی کی خاطر، آپ لوگ بڑے تنگ دل ہیں کہ اپنے بھائیوں کی دلجوئی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

بیلنس شیٹ کے متعلق بڑے ڈرامائی انداز میں میں نے اپنے سکھ بڑوں کی طرف مخاطب ہو کے کہا۔ بھائی کیوں نہیں دیتے۔ ساتھ ہی میں نے بھارتی حکومت کے گورنر کیڈ گل جو کہ صدارت کر رہے تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ آپ ہم کو یقین دہانی کی سند دے دیجیے۔ کہ آپ ہماری جاری شدہ نہروں کے پانی سے ہمیں کبھی محروم نہیں کریں گے۔ اور اس کی ایک بوند بھی اپنے تصرف میں نہیں لائیں گے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم کیسے کر سکتے ہیں، یہ تو مرکزی حکومت کا کام ہے۔ میں نے کہا تو پھر ہم بیلنس شیٹ کیسے دے سکتے ہیں۔ کیونکہ آج پانی کی وجہ سے جو زمینیں کروڑوں روپے کی ہیں۔ کل آپ کے پانی بند کر دینے کی وجہ سے کوڑی کی ہو جائیں گی۔ وہ چیزیں جو کوڑی کی ہو جاتی ہیں۔ ان کی آج کروڑوں کی مالیت کے حساب سے آپ کو بیلنس شیٹ بنا کے دی جائے۔ یہ ہمارے لیے غداری ہو گی۔ اور آپ کے لیے



دورۂ بھارت کے موقع پر، جگ جیون رام۔ ایک چھوڑ کر، پیرزادہ عبدالستار اور سردار عبدالحمید خاں دستی

بے ایمانی۔ اس لیے بیلنس شیٹ آپ اس وقت مانگ سکتے ہیں. جب نہروں کے متعلق آپ ہماری تسلی کر دیں گے، ورنہ آپ ڈنڈی مارنا چاہتے ہیں، ہم نہیں مارنے دیں گے۔

س :۔ آپ جب وہاں گئے تو پاکستان کو بنے گیارہ سال ہو گئے تھے۔ سرکاری سطح سے ہٹ کر بھی ہندوؤں سکھوں کا ذہن پڑھنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر ہندوؤں کے متعلق سکھوں کی سوچ کیا تھی۔

ج :۔ ہندوؤں نے ہمارا استقبال بڑی سادگی سے کیا۔ ان کے لباس بڑے سادہ تھے۔ ان کا سلوک اچھا رہا، لیکن دل ان کے ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ البتہ سکھ صاحبان۔ جو کہ اس علاقے میں زیادہ آباد ہیں، خاص کر مہاراجہ فرید کوٹ، جو شملہ سے ملحقہ قصبہ منوبرا کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی رہائشی کوٹھی بھی وہاں بنائی ہوئی ہے، جس کا نام انہوں نے "کینل ورتھ" رکھا ہوا ہے، اس کے گرد جو جنگل ہے اس کا نام شروڈ رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے غالباً پنجابی رشتے کی وجہ سے ہمیں لنچ دیا، جس میں ان کے گورنر پنجاب اور سرکاری افسر بھی شامل تھے، انہوں نے میرے گن مین سلطان کو بلوایا اور تیتر اور مرغیاں ذبح کروائیں، ہم کھڑے ہو کر لنچ کر رہے تھے، کہ مہاراجہ صاحب میرے پاس آئے۔ ان کے ساتھ بہت سے سکھ سردار بھی تھے۔ انہوں نے میرے گرد گھیرا لگا لیا، شراب تو چلتی تھی، خوب چلی۔ انہوں نے بھی پی ہوئی تھی، ایک سردار بولے، بھئی تم لوگ اچھے تھے، اس کتی قوم سے گزارا بڑا مشکل ہے، دوسرے سکھ نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا، پیچھے گورنر (بھارتی پنجاب) ہے۔ اس سکھ نے گورنر کی طرف دیکھا، ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "مہاراج بلتی ہوئی اے"۔ سکھوں کی ہندوؤں کے متعلق سوچ کیا ہے اس کی میں نے آپ کو مشاہداتی صورت بتا دی ہے، مہاراجہ فرید کوٹ نے مجھ سے گلہ کیا کہ تم وہابی ہو، میں نے کہا، تمہیں کیسے پتہ چلا۔ کہنے لگا۔ شراب پانی کی طرح یہاں چلی، لیکن تم نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی، میں نے کہا، آپ نے سگریٹ پیا کہنے لگا "واری سمجھتی"۔

میں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ یہ خواتین جو بیٹھی ہیں ان میں مہارانی کون سی ہے اور رانیاں کون سی ہیں۔ ایک خاتون جو مہمانوں کی خدمت میں پیش پیش تھی، مہاراجہ نے اسے آواز دی۔ وہ آئی۔ اسے کہا، بھائی دستی کہتے ہیں، کہ مہارانی کون ہے، اور رانیاں کون سی ہیں، اس خاتون نے پوچھا "مہاراج آپ نے کیا کہا"۔ "مہاراجہ کہتا ہے کہا نہیں، اب کہنے لگا ہوں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھائی دستی، یہی مہارانی ہے، یہی رانی ہے، یہی بیوی ہے، یہی ماں ہے، اس خاتون کا یہ سننا تھا کہ "ہائے مہاراج"، کہہ کر بھاگ گئی۔

س :۔ اس سے پہلے بھی تو آپ انڈیا گئے تھے، آپ نے بتایا تھا کہ چیف منسٹر کو انٹر ڈومینین کانفرنس میں جانا چاہیئے تھا، لیکن آپ کو بھیجا گیا۔

ج :۔ انٹر ڈومینین کانفرنس کے سلسلہ میں مجھے انڈیا جانے کا اتفاق ہوا، ایک وفد میں ملک غلام محمد ہمارے لیڈر تھے۔ دوسرے میں سر ظفر اللہ خاں، جس کانفرنس میں سر ظفر اللہ خاں ہمارے لیڈر

تھے۔ اس میں نہروں کا معاملہ زیر بحث تھا۔ ہندو سیکرٹری نے پانی کے معاملے میں جو ایجنڈا بنایا ہوا تھا۔ اس ایجنڈے میں انہوں نے دریائے ستلج، راوی اور بیاس کے پانیوں کو اپنا لیا تھا۔ ایسی چالاکی سے الفاظ کا ہیر پھیر کیا ہوا تھا۔ جس سے یہ مطلب نکل سکتا تھا کہ یہ ان کا پانی ہے۔ اس پر انہوں نے میاں ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات کے بھی دستخط لے لیے۔ اس بنا پر ان کا دعویٰ تھا کہ پاکستان کی پنجاب گورنمنٹ نے ان تینوں دریاؤں پر ان کا حق تسلیم کر لیا ہے۔ جب میں نے اس ریکارڈ کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ یہ گورنمنٹ کی طرف سے معاہدہ نہیں ہے۔ پھر میں نے وفد کے لیڈر سر ظفر اللہ خاں کو مطمئن کر دیا کہ یہ مسودہ گورنمنٹ کی طرف سے معاہدہ نہیں ہے، یہ محض مذاکرات ہیں، جو پاکستان کے سامنے پیش ہونے ضروری تھے، جو نہیں ہوئے۔ سر ظفر اللہ خاں معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے دن اپنی عالمانہ تقریر میں اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا۔ پھر اس کے بعد انڈیا نے یو این او میں یہ دلیل نہیں دی کہ پاکستان کی پنجاب گورنمنٹ نے ستلج، بیاس اور راوی کے پانیوں پر ان کا حق تسلیم کر لیا ہے۔ یہ کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی طرف سے گوپالا سوامی آئینگر تھے۔ ادھر سے سر ظفر اللہ خاں تھے، وفد میں میں بھی تھا۔

س:۔ دولتانہ اور شوکت حیات نے کیسے دستخط کر دیئے۔

ج:۔ لفظوں کے ہیر پھیر کو نہ سمجھ سکے۔ شوکت حیات نے تو اسی طرح چلنا ہوتا تھا جیسے انہیں دولتانہ کہتے تھے۔

جس انٹر ڈومینین کانفرنس میں ملک غلام محمد ہمارے لیڈر تھے، شاید اسی میں ایسٹ پاکستان کے چیف منسٹر نور الامین صاحب اور خواجہ شہاب الدین صاحب بھی تھے۔ ہم چاروں جب دہلی پہنچے، گورنر جنرل۔ راج گوپال اچاریہ کے ہاں ٹھہرے، غلام محمد تو ہائی کمشنر اسمٰعیل کے پاس ٹھہرے۔ میں، نور الامین اور خواجہ صاحب، راج پال اچاریہ کے پاس پونے بارہ بجے کے قریب پہنچے، ان کے پاس یوگوسلاویہ کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ انہوں نے ہمارا تعارف ان الفاظ میں کرایا "ان سے ملیے، یہ پاکستان سے ہمارے دشمن آئے ہیں"۔ ہمیں محسوس ہوا۔ بہر حال! اس کے بعد کھانے کا وقت آیا تو کہنے لگے کھانا لگ گیا ہے۔ کھانے پر پہنچے۔ گورنر جنرل کا سوپ آیا۔ میں نے بیرے کی طرف دیکھا، مسلمان لگتا تھا۔ میں نے اسے انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور پوچھا۔ یہ کاہے کا سوپ ہے۔ کہنے لگا "مونگی کی دال کا"۔ میں مطمئن ہو گیا۔ میرے ساتھ راج گوپال اچاریہ کی بیٹی تھی، وہ بھی معمر خاتون تھی۔ ان کا داماد بھی تھا۔ سوپ کے بعد اُبلے ہوئے چاول آ گئے۔ ساتھ مونگی کی دال اور بھنڈی کا سالن، تھوڑے سے میں نے چاول لیے، تھوڑی دال ڈالی۔ اس کی بیٹی کہنے لگی، کیا آپ ان دنوں کم خوری کر رہے ہیں؟ میں نے کہا، نہیں تو۔ اس نے کہا یہی مین ڈش ہے۔

دراصل وہ بنگالی تھے۔ چاول ان کی خوراک تھی۔ ہم لوگ روٹی کھانے والے تھے میں نے

تھوڑے بہت کھائے۔ گورنر جنرل سمجھ گئے۔ کہ یہ اس خوراک سے مطمئن نہیں، کہنے لگے۔ یہ میرا ذاتی کھانا تھا۔ اور آپ میرے ذاتی مہمان تھے، شام کے وقت آپ لوگ گورنمنٹ گیسٹ ہوں گے۔ اور پاکستانی ڈنر کھائیں گے۔

شام کو مہاراجہ جودھ پور آئے۔ ان سے ہمیں متعارف کراتے ہوئے کہنے لگے "یہ پاکستان سے ہمارے دوست آئے ہیں" میں نے کہا راجہ جی "اتنے مختصر عرصے میں اتنا فرق"۔ کہنے لگے "اوہ میرے دوست وہ تو ایک مذاق تھا" میں نے کہا، راجہ صاحب کاش کہ یہ مذاق نہ رہے۔

یہ ملاقات ہوئی ہماری گورنر جنرل کے ساتھ، کانفرنس میں کوئی بات نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔

س:۔ وہ کونسا دورۂ بھارت ہے، جس میں آپ کی نہرو سے بھی ملاقات رہی۔

ج:۔ ٹیٹو شو ہوتا تھا، ادھر بھی، اُدھر بھی، ایک سال لاہور میں ہوتا تھا۔ اگلے سال پھلور (انڈیا) میں ہوتا تھا۔ ان کی پولیس یہاں آتی تھی۔ ہماری پولیس وہاں جاتی تھی۔

۵۳ء میں ہم انڈیا گئے۔ جب ہم پھلور پہنچے۔ پتہ چلا کہ وہاں وزیر اعظم نہرو بھی آئے ہوئے ہیں، ہمارا قیام قلعہ پھلوار میں تھا۔ مظفر گڑھ کے ہندو مہاجرین کو میرا پتہ چلا کہ میں آیا ہوا ہوں۔ بہت سارے پہنچ گئے، میں باہر پلاٹ میں چلا گیا، مظفر گڑھ اور ملتان کے طریقے کے مطابق وہ میرے گھٹنے چھوئیں، میں نے انہیں گلے لگایا، ان سے فارغ ہو کے میں آیا۔ رات کا وقت تھا۔ میرا دروازہ کھلا، میں نے مڑ کے دیکھا تو نہرو کھڑے تھے، انہوں نے کہا، مجھے اندر آنے کی اجازت ہے۔ میں نے کہا، تشریف لے آیئے۔ کہنے لگے، کیا آپ پیر ہیں، میں نے کہا نہیں، لیکن آپ کو یہ پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کہنے لگے۔ "لوگ آپ کے پاؤں پڑتے تھے"۔ مجھے مذاق سوجھا، میں نے کہا، دیکھا پنڈت جی ہمارے کردار، آپ کی قوم اب تک ہمارے پاؤں پڑتی ہے، پھر میں نے کہا، یہ تو میں نے ازراہِ مذاق کہا ہے۔ یہ دراصل ہمارے علاقے کا رواج ہے کہ چھوٹا بڑے کے گھٹنے کو ہاتھ لگاتا اور بڑا اسے گلے لگاتا ہے۔ اس پر نہرو نے کہا، آپس میں کتنا پیار ہے، میں نے کہا، انفرادی طور پر، ہم ایک دوسرے کے بڑے دوست ہیں، بڑا پیار کرنے والے ہیں، لیکن بحیثیت قوم کے ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ نہرو نے پھر میری بات دہرائی "انفرادی طور پر آپس میں کتنا پیار ہے"۔ میں نے کہا، پھر پنڈت جی، انہیں آپس میں قریب لے آیئے، کہنے لگے میں منع تو نہیں کرتا، میں نے کہا۔ آپ منع تو نہیں کرتے لیکن آپ کے اور ہمارے درمیان کشمیر کا جو تنازعہ ہے۔ اسے حل کر دیجئے، پھر دیکھنا ہماری قوم دوستی اور آپس کے پیار کی طرف کتنا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ نہرو نے کہا، بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ مسئلہ قومی مسئلہ ہے۔ اور مجھے تو قوم کے ساتھ ہی چلنا ہوگا، میں نے کہا۔ پنڈت جی مجھے اس کے ساتھ بھی اتفاق نہیں۔ برصغیر میں دو لیڈر تھے، ہمارے تھے، قائداعظمؒ اور ہندوؤں کے آپ تھے۔ قائداعظمؒ اور آپ دو ایسی ہستیاں تھیں جو ہوا کے رخ پر نہیں

چلے، بلکہ ہوا کا رُخ اپنی مرضی کے مطابق بدل دیا۔ قائداعظمؒ کی قوم ان کے پیچھے چلتی تھی۔ آپ کی قوم آپ کے پیچھے چلتی تھی۔ ہم تو بدقسمت ہیں کہ قائداعظمؒ جلد ہی ہم سے جُدا ہو گئے۔ آپ کی قوم خوش قسمت ہے کہ آپ زندہ ہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے ہوا کے رُخ کے مطابق چلنا ہے۔ میں نے کہا، آپ جب کانگریس کے لیڈر ہوتے تھے۔ ہم اس وقت کالج کے طالب علم تھے۔ اس وقت مسلم لیگ نہیں تھی۔ (فعال نہیں تھی) ہم بھی کانگریسی ہی تھے۔ مجھے آپ کی تقریر یاد ہے۔ آپ نے تقریر فرمائی تھی کہ جب کسی قوم کی آنکھ کھل جائے پھر اسے کوئی دوسری قوم دبا نہیں سکتی۔ دیر ہو سکتی ہے۔ دو سال، پانچ سال، دس سال، بالآخر وہ قوم اُبھرتی ہے۔ میں نے کہا ہم پانچ سال زور لگاتے رہے ہیں ہم کشمیریوں کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ اب کشمیریوں کی اپنی آنکھ کھُلی ہے آپ کے مقولے کے مطابق، اب انہوں نے ضرور آزاد ہونا ہے۔ آپ کہتے تھے دیر لگ سکتی ہے، لیکن رُک نہیں سکتی۔ پھر میں نے کہا، پنڈت جی اگر کشمیریوں نے آزاد ہونا ہی ہے تو پھر آپ کے جیتے جی کیوں نہ ہو جائیں۔ پنڈت جی یہاں مجھے ایک بات یاد آگئی، قلعہ لاہور جب بن رہا تھا۔ اس کی ایک دیوار کے نیچے ایک مائی کی کٹیا آگئی۔ اس مائی نے کہا کہ میری کٹیا چھوڑ کے آپ دیوار پورے کر لیں۔ حکومت نے بات نہ مانی۔ مائی دوڑی میاں میرؒ صاحب کی خدمت میں۔ میاں میرؒ صاحب نے کاغذ کا ایک پرزہ پکڑ کے اس پر کچھ لکھ دیا۔ مائی سے کہا کہ وہ جا کے حاکم وقت کو دے دے۔ وہ رقعہ لے گئی۔ حاکم کو دے دیا۔ حاکم نے دیوار ہٹا کے بنا دی۔ اب تک اس دیوار میں خم ہے۔ اس رقعہ پر میاں میرؒ صاحب نے لکھا تھا ؎

سن او بیلیا ساڈا اسرہ
جو مر کے چھڈنا ای جیوندیاں ای چھڈ

پنڈت جی آپ کے مرنے کے بعد جو ہونا ہے۔ آپ جیتے جی کیوں نہیں کر جاتے۔ نہرو کہنے لگے۔ کاش آپ کی پبلک میری پبلک ہوتی۔ میرے عوام نے تو مجھے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ میں نے کہا، ہمارے عوام کا آپ نے جوش و خروش نہیں دیکھا۔ کہنے لگے، یہی تو میں مانگتا ہوں۔ اندھی پبلک۔ لیڈر کے پیچھے چلنے والے عوام۔ جیسے ہی لیڈر کہے یوں کرنا ہے۔ پھر وہ سوچے سمجھے نہیں۔ بس کر گزریں۔ میری قوم تو اچھی طرح تول کے میری بات مانتی ہے۔

س:۔ جب ایوب خاں کا محترمہ فاطمہ جناحؒ سے انتخابی صدارتی معرکہ ہوا تو اس وقت آپ کا رویہ کیا تھا۔

ج:۔ میں محترمہؒ کے ساتھ تھا اور ان کی حمایت میں میں نے بھرپور حصہ لیا۔ اتنا بھرپور کہ ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ پیر صلاح الدین مجھے کہنے لگا۔ مجھ سے یہ ضلع سنبھالا نہیں جا رہا۔ میں نے کہا، حوصلہ کرو تو ڈی سی ہے۔ پھر اس نے ایوب خاں کو لکھ دیا۔ اس وقت نصراللہ خاں اور میں اکٹھے تھے۔ بات ایوب خاں تک پہنچی تو اس نے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ کو بلایا۔ موسیٰ خاں نے میرے داماد میجر جنرل نصیر احمد کو بلایا، میری بیٹی اور جنرل نصیر مظفر گڑھ آئے

اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ چھوڑنے اور ایوب کے لیے کام کرنے کو کہا۔ میں نے پوچھا، اگر میں محترمہ کے لیے کام کرتا ہوں تو آپ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ نصیر کا بھلا ہو، اس نے کہا، ہمیں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، ہم کہیں گے، ہمارا باپ ہے، بیٹا تو نہیں، ہم گزارش ہی کر سکتے ہیں، رُعب نہیں ڈال سکتے۔

اس کے بعد رانا خداداد خاں مرحوم کے بڑے بھائی رانا عبدالحمید آ گئے، ون یونٹ کے زمانے میں وہ اور میں اکٹھے رہے تھے۔ پیشتر اس کے کہ وہ بات کرتے۔ میں نے انہیں تھاپڑی دیتے ہوئے کہا، رانا میں آپ پر خوش ہوں کہ آپ نے ابھی تک ایوب خاں کے حق میں کوئی بیان نہیں دیا۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ سن کر رانا عبدالحمید کو بات کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔

پھر آ گئے کالا باغ۔ ان کے ساتھ میرے اچھے تعلقات رہے تھے۔ انہوں نے میرے پاس عبداللہ روکڑی کو بھیجا۔ روکڑی سے پوچھ لینا، یہ آئے کہ کالا باغ یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ اسے کہو۔ کیا فائدہ؟ یہ ضروری ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے "ناں" کروں۔ اگر میں نے ناں ہی کرنی ہے۔ تو پھر آپ مجھے تنگ نہ کریں۔ میں نے کہا، کالا باغ اپنے دوست کے لیے کر رہا ہے۔ میں اپنے مربّی کے لیے کر رہا ہوں۔ وہ اپنا زور لگائے۔ میں اپنا زور لگاتا ہوں۔ جھگڑا کاہے کا؟

س:۔ مربّی سے آپ کی مراد؟

ج:۔ مادرِ ملت جس نے پاکستان بنایا تھا۔ میں نے کہا "تو اپنے دوست کے لیے کر رہا ہے۔ میں اپنے مربّی کے لیے کر رہا ہوں"۔

ساتھ ہی محترمہ کا پیغام آ گیا۔ میں صبح اٹھارہ ہزاری پہنچ رہی ہوں آپ بھی گورمانی کو ساتھ لے کے آ جائیں۔ میں نے گورمانی صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ انہوں نے کہا، میں تیار ہوں لیکن کوٹ ادو سے مجھے اٹھارہ ہزاری نزدیک ہے۔ بجائے اس کے کہ میں مظفر گڑھ آؤں۔ میں سیدھا اٹھارہ ہزاری پہنچوں گا۔ آپ بھی وہیں پہنچ جائیں۔ لوجی، کالا باغ مظفر گڑھ بیٹھا رہا۔ میں اٹھارہ ہزاری پہنچ گیا۔ کہنے لگا۔ میں اس کے پاس آیا ہوں۔ رات میں نے اسے ٹیلی فون کیا۔ کہتا تھا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ اب طبیعت خراب نہیں۔ سومیل پر گیا ہے۔

س:۔ اس وقت تو یہی شور تھا، کہ بالواسطہ طریقِ انتخاب ہونے کے باوجود مادرِ ملت جیت رہی تھیں اگر ایوب خاں دھاندلی نہ کرتا۔ واقعی ایوب خاں نے دھاندلی کی؟

ج:۔ جی، میرے اپنے ضلع کی مثال ہے۔ میں نے اپنے لڑکے امجد حمید کو پولنگ ایجنٹ بنایا ہوا تھا کہ دیکھنا پیر صلاح الدین گڑبڑ نہ کرے۔ جہاں سے ووٹرز نے گزرنا تھا۔ ہم سڑک پر بیٹھے رہے میں تھا۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں تھے۔ دو چار اور تھے۔ رحمت علی علوی بھی تھے۔ ووٹروں کے ایک بینچ نے گزرتے ہوئے ہمیں اشارے سے کہا، آپ مطمئن رہیں۔ ووٹ ہم محترمہ کو ہی دیں

گئے۔ جو انہیں لا رہا تھا۔ اس نے جا کے ڈی سی پیر صلاح الدین کو بتا دیا۔ ڈی سی نے اس بیج کو الگ بٹھا دیا اور ہدایت کی کہ جب یہ بیج ووٹ دینے کے لیے اندر جانے لگے تو اسے بلا لینا۔ امجد کا پیغام آیا کہ ڈی سی ووٹروں سے بیلٹ پیپر چھین چھین کے اور خود نشان لگا لگا کر ڈال رہا ہے۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس کنوینس نہ تھی۔ میں پیدل چل پڑا۔ میرے پہنچنے تک پیر واپس آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ دیر سے آئے ہو۔ میں کر بیٹھا ہوں جو کچھ کرنا تھا۔ یہ وہی پیر صلاح الدین ہے جس کا موجودہ مارشل لاء کے دوران راولپنڈی میں مارشل لاء والوں نے منہ کالا کیا تھا۔ اور سر عام کوڑے لگے ہوٹل میں فحاشی کا اڈہ قائم کرنے کی سزا میں

اس کے بعد میں پیر صلاح الدین کے گھر گیا۔ یہ مرزائی ہے۔ اس نے قرآن حکیم کے کئی نسخے سامنے کھول رکھے تھے، مطالعہ کر رہا تھا۔ غالباً کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ یہ گناہ کیوں کما رہے ہو۔ کہنے لگا۔ قرآن پڑھنا گناہ ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا تو اپنے نوکر سے بار بار کہے۔ فلاں کام کرو، فلاں کام کرو۔ لیکن وہ وہ کام نہ کرے اور روزانہ ہی ایسا کرے۔ روزانہ گناہ ہوا کہ نہ ہوا۔ میں نے کہا قرآن حکیم میں حکم لکھے ہوئے ہیں۔ آپ پڑھ کے عمل نہیں کرتے۔ گناہ ہی کرتے ہیں نا، میں آپ کے حضرت صاحب کو لکھوں گا۔

میری ان کے حضرت صاحب سے یوں واقفیت تھی کہ جب یہ ربوہ کی زمین لینے لگے اس وقت انہیں بڑی مشکلات پیش آئی تھی۔ چنیوٹ والوں نے مظاہرے کیے۔ میں نے چنیوٹ والوں کے پاس جا کے دو تین روز تک ان سے بات کی کہ آخر انہیں کہیں جگہ تو دینی ہے، اور یہ جگہ اس قسم کی ہے کہ جسے کسی نے نہیں قبولنا۔ کسی مہاجر نے نہیں بیٹھنا۔ اونچی ہے۔ پانی نہیں ہے۔ کہنے لگے، ہمارے نزدیک گند کیوں ڈال رہے ہو۔ میں نے کہا، آپ کو اپنے پر اعتماد کیوں نہیں۔ بہر حال ان کے حضرت صاحب کو میری اس کوشش کا پتہ تھا۔ اس بنا پر میں نے ڈی سی پیر صلاح الدین سے کہا کہ میں آپ کے حضرت صاحب کو لکھوں گا۔ اس نے جواب دیا۔ آپ چاہیں خدا کو لکھیں، میں کروں گا وہی جو گورنر مجھے کہے گا۔

جب الیکشن ختم ہو گئے، حکومت نے اسے ڈپٹی کمشنری سے ہٹا کے ملتان میں کنسالیڈیشن آفیسر لگا دیا۔ یہ مظفر گڑھ آیا۔ میں نے کہا، خدا سے تو نہیں، گورنر سے دعا کر۔ یہ تیرے ساتھ کیا ہوا۔ کہنے لگا، ”کوئی اور بات کرو۔ کوئی اور بات کرو۔“

دھاندلی تو ایوب خاں نے کی۔ اس نے یہاں تک کیا تھا کہ بی ڈی ممبری کے لیے پابندی لگا دی گئی کہ جہاں جس کا ووٹ ہو اسی موضع یا حلقہ میں وہ الیکشن لڑ سکتا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی پڑھا لکھا نہ منتخب ہو جائے۔ وہی ہوا۔ کوئی سگریٹ فروش ہے۔ کوئی خشت فروش ہے۔ وہی جو تھانیدار کے رعب تلے آ سکتے تھے۔

میں نے محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں اس قدر بھرپور حصہ لیا کہ پورے مغربی پاکستان میں انہیں سب سے زیادہ ووٹ کراچی سے ملے دوسرے نمبر پر مظفر گڑھ تھا۔

س:۔ اگر ایوب خاں دھاندلی نہ کرتے اور محترمہؒ الیکشن جیت جاتیں تو کیا خیال ہے، جمہوریت کی طرف کوئی پیش رفت ہوتی۔

ج:۔ اگر محترمہ فاطمہ جناحؒ جیت جاتیں تو پھر یقینی طور پر جمہوریت آجاتی۔ کیوں کہ جمہوریت اس وقت آتی ہے۔ جب لوگ لیڈر کو تسلیم کرنا شروع کر دیتے ہیں، جب تک میرے دل میں آپ کی عزت نہ ہوگی۔ میں آپ کا کہا نہیں مانوں گا، لیڈر کا تو مطلب ہوتا ہے جو لیڈ کر سکے۔ جسے لوگ پسند کریں اور مان لیں کہ لیڈر ہے ہمارا۔ اگر محترمہؒ جیت جاتیں تو ایک بار پھر ہماری کایا پلٹ جاتی تھی، ہماری قسمت ہی اچھی نہیں تھی۔ ورنہ وہ جیت جاتیں اور ہم بچ جاتے۔

س:۔ انہوں نے عوام کی صحیح سمت پر رہنمائی فرمائی تھی۔

ج:۔ قائداعظمؒ کا سلسلہ پھر پلٹ آنا تھا۔ مجیب جیسی علاقائی لیڈرشپ نہ اُبھر پاتی۔

س:۔ الیکشن سے پہلے بھی محترمہؒ سے ملاقاتیں رہی ہوں گی۔

ج:۔ جب بھی لاہور آتے تھے۔ مجھ پر اتنی مہربانی کرتے تھے۔ کہ جب تک مجھے ساتھ نہیں لیتے تھے کسی تقریب پر نہیں جاتے تھے۔ اتفاق ایسا تھا کہ انہیں زیادہ تر یا تو صحت والے بلاتے تھے، یا تعلیم والے۔ گرلز کالج یا فاطمہ جناح میڈیکل کالج وغیرہ۔ بطور وزیر یہ شعبے میرے پاس رہتے تھے۔ ویسے بھی جب میرا کراچی جانا ہوتا۔ محسوس ہوتا تھا کہ شفقت فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے انہیں فنکشن پر بلانا ہوتا تو فرماتے، دستی سے پوچھو۔ شائد اس لیے کہ صحت اور تعلیم میرے پاس تھے۔

س:۔ پروٹوکول کا خیال رکھتے ہوں گے۔

ج:۔ بہر حال، میں تو اسے ان کی شفقت ہی کہوں گا۔

س:۔ بڑا اعزاز ہے۔

ج:۔ انہیں کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی، اگر وہ کسی کا ریفر کرتی تھیں تو اس کا مطلب ہے، اس کا احترام کرتی تھیں، یہ تصویر میں آپ شفقت نہیں دیکھ رہے۔ مجھے تھکا ہوا دیکھ کر فرمایا: ان کے لیے چائے لاؤ۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں ہی ہے۔ ان کے ہاتھ میں نہیں۔

س:۔ ایک بات ہے۔ محترمہؒ نے قوم کو ایک بار جگا ضرور دیا تھا۔

ج:۔ ان کے الیکشن میں حصہ لینے سے ملکی سیاسیات پر بڑے سخت اثرات مرتب ہوئے تھے، یہ تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا مس فاطمہ جناحؒ جہاں سے گزرتی تھیں، لوگ پلکیں اٹھا لیتے تھے۔ الیکشن کے زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ ملتان ریلوے سٹیشن سے جس وقت گزری ہیں۔ تو اتنے لوگ تھے کہ بڑی مشکلوں سے ہم پلیٹ فارم پر پہنچ سکتے تھے۔ حالانکہ اس وقت ہماری شخصیت ایسی تھی کہ لوگ دیکھتے ہی راستہ دے دیتے تھے، مگر اس روز ہمیں پلیٹ فارم تک پہنچنے کے لیے بڑی مشکل سے راہ ملی، پلیٹ فارم لوگوں سے اٹا ہوا تھا، سڑکوں، ریلوں، بوگیوں پر بھی لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ درختوں تک پر لوگ چڑھے ہوئے

تھے۔ وہ اگر جیت جائیں تو اس قوم نے ان کے پیچھے اندھا دھند لگنا تھا۔

س:۔ الیکشن کے بعد حکومت نے آپ کو پریشان کیا، کیونکہ اس وقت ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں۔

ج:۔ الیکشن کے بعد انہوں نے میرا موگا بند کر دیا۔ قادر بخش وزیر اہار تھا، محمد خاں لغاری اور کالاباغ کے درمیان آپس میں شادیوں کا سلسلہ تھا۔ لغاری کی لڑکی کالاباغ کے لڑکے کے ساتھ بیاہی گئی۔ محمد خاں میرے پاس آیا کہ کالاباغ بڑا کینہ پرور آدمی ہے۔ میرے خیال میں آپ اسے مل لیں، میں ساتھ چلتا ہوں۔ میں نے کہا۔ اس نے میرا موگا بند کر دیا ہے۔ لغاری کہنے لگا۔ وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم گئے۔ کالاباغ کہنے لگا۔ مجھے آپ پر غصہ ہے۔ میں نے کہا۔ لاٹ ہو، حاکم ہو، گورنر ہو۔ کہتا ہے، اگر لاٹ نہ ہوتا تو۔ میں نے کہا، اگر لاٹ نہ ہوتا تو میں کہتا۔ اونٹھ نہ رُنے۔ بورے رُنتے۔ یعنی اونٹ تو نہیں روئے جن پر بوجھ لدا ہوا تھا، بلکہ بوجھ رو پڑا۔ میں نے کہا۔ میں ہوتا گورنر۔ تو ہوتا عبدالحمید۔ تیرا کوئی گرتا موگا بند۔ میں اودیاں وراچھاں کچھ لیندا۔ جو سرکاری چیز ہے۔ اسے استعمال کرتے ہو۔ ذاتی عداوت کے لیے۔ میرے کوئی احسانات، میری کوئی خدمتیں۔ کہنے لگا۔ آپ بزرگ ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہر حال موگا بحال ہو گیا۔ جس روز میں کالاباغ سے مل کے آیا۔ میں نے اپنی ڈائری میں یہ شعر لکھا۔ ؎

میں دامنِ گناہ بچا کر نکل گیا
ملنے کو راستے میں قیامت ملی تو تھی

س:۔ اس کے بعد کالاباغ ٹھیک رہا۔

ج:۔ پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر اس بیچارے کی موت ایسی ہوئی کہ بڑی عبرت انگیز۔ پتہ نہ چلے کہ کس کے ساتھ افسوس کریں۔ بیٹے کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، بیٹیوں کے ساتھ۔ کیسے تار دیں۔

س:۔ جب یہ اسمبلی ممبر ہوتا تھا۔ سنا ہے بیک بینچر تھا۔

ج:۔ بس بولتا نہیں تھا۔ ویسے رسوخ تو اس کا تھا۔ میانوالی کے سب ممبر اس کے کہنے پر چلتے تھے۔ وہ تو اس کے لیے وکیل ہوتے تھے۔ اسے بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

س:۔ اس زمانے میں کسی وزارت میں اس کا ذکر نہیں سنتے۔ ایوب خاں کے زمانے میں یہ گورنر بن کے نمودار ہوا۔ گورنر بھی ایسا کہ بس۔

ج:۔ جب میں چیف منسٹر ہوا تو میں نے اسے کہا تھا کہ میں تجھے منسٹر لینا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا، نہیں۔ میرا کاروبار اتنا ہے کہ میں وزارت نبھا نہیں سکتا۔ اس سے بھی پہلے جب میں صرف منسٹر تھا، یہ ممبر تھا۔ اسے میانوالی کے کام پڑتے تھے۔ جو کام بھی پڑتے تھے۔ ان کا منشی یا مینجر یا عبداللہ روکڑی جو بھی کام بتاتے تھے، میں کر دیا کرتا تھا۔ بشرطیکہ دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔ پھر جب یہ گورنر ہوا ہے تو میں نے گلہ کیا تھا کہ میں نے تجھے کہا وزیر بن۔ تو نہ بنا۔ اب

گورنر بن گیا۔ اب کاروبار متاثر نہیں ہوگا۔ کہنے لگا۔ اب بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔
س:۔ بطور گورنر تو یہ ظالم ہی مشہور ہوا۔ اس وقت کیسا تھا۔
ج:۔ اس وقت جب یہ اسمبلی کا ممبر تھا اور میں منسٹر تھا۔ ایک روز اس نے کہا کہ میں عبرتناک سزا دیتا ہوں، اس کی مثال اس نے یہ سنائی کہ میرے سیب کے درخت سے ایک سیب خود بخود گر گیا، وہ سیب ایک آدمی اٹھا کے لے گیا۔ پتہ نہ چلا۔ کون لے گیا۔ تین ماہ بعد پتہ چلا کہ فلاں شخص تھا۔ پھر میں نے اسے سزا دی۔ اس کے بعد میرے پھل گرے پڑے رہتے ہیں، لیکن مجال ہے جو کوئی نزدیک آئے۔
س:۔ سزا کیا دی۔
ج:۔ یہ نہیں میں نے پوچھا۔ اس میں اوصاف بھی تھے۔ کہ جب رقابت کی وجہ سے قزلباش نے میرے خلاف کیس بنوایا۔ اور کالا باغ کو پتہ چلا تو اس نے بغیر میرے علم کے، بغیر میرے کہنے کے۔ فیروز خان نون سے جا کے کہا کہ تو قزلباش سے یہ کام غلط کرا رہا ہے، تیار رہ، ہم اس مسئلے میں دستی کے ساتھی ہوں گے۔ جس کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا تھا، اس کے ساتھ بڑا مخلص ہوتا تھا۔ لیکن جس کے ساتھ دشمنی ہوتی تھی۔ اس کے لیے بڑا جلاد تھا۔ یہ صفات بہادروں میں بھی پائی جاتی ہیں اور ڈاکوؤں میں بھی۔
س:۔ میاں مشتاق احمد گورمانی آپ کے ضلع کے تھے۔ پھر آپ نے پنجاب اور مغربی پاکستان میں اقتدار میں اکٹھے کام بھی کیا۔ سنا ہے کہ وہ بھی انٹریگ کے بادشاہ تھے۔
ج:۔ ہاں، یہ بھی شہرت ان کی۔
س:۔ پاکستان بننے سے پہلے انہوں نے مسلم لیگ میں کام کیا۔
ج:۔ نہیں، جب مسلم لیگ کی موومنٹ شروع ہوئی، یہ سرکاری ملازم تھے، پاکستان بن گیا، انگریز چلا گیا۔ یہ پاکستان آ گئے، مسلم لیگ جائن کر لی۔ میٹرک فیل تھے۔ ذہین بہت تھے۔ ذہانت کی وجہ سے پراونشل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر نامزد ہو گئے۔ پھر دہلی میں ڈائریکٹر پبلسٹی ہو گئے۔
اسمبلی کے ممبر کیسے ہوئے۔ یوں کہ انگریزوں کو شکار کا بہت شوق ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے علاقے میں گورنر کا شکار رکھ لینا۔ ان کے ہاں ایک چھوٹی سی جھیل ہے، پانی، آگے خشکی، پھر پانی آگے خشکی، دو تین ٹوبے ہیں، انہوں نے انگریز گورنر کا شکار رکھ لینا، دو روپے من مونجی ہوتی تھی۔ سو روپے کی پچاس من مونجی لے کے ان ٹوبوں میں ڈال دیتے تھے۔ وہاں مونجی پڑی ہے، مرغابی کیسے اڑے گی، بندوق چلے اور مرغابی پھر وہاں آ بیٹھے۔ لاٹ صاحب کو ایسا شکار کہاں سے ملے گا، اس نے آتے ہی انہیں لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر نامزد کر دیا۔ پھر سنٹر میں ڈائریکٹر پبلسٹی ہو گئے۔
جب یہ اسمبلی کے ممبر نامزد ہوئے تو مجھے، کہنے لگے۔ اسمبلی میں جاؤں گا، کیسے بولوں گا، میں نے انہیں تقریر بنا کے دی، وہ انہوں نے رٹ لی۔ ذہین بہت تھے، پھر ایک وقت آیا کہ یہ

پنجاب کے گورنر تھے اور میں چیف منسٹر تھا۔ میں نے کوئی رپورٹ بھیجی، انہوں نے تصحیح کر دی۔ میں نے کہا، وہ دور بھول گئے، جب میں نے تقریر لکھ کے دی تھی۔ کہنے لگے۔ اب دیکھ کیا تبدیلی ہے۔ مطالعہ اور ذہن بہت تھا۔ ایک تقریر کو ایک دفعہ سن لیتے تو اس کی طرز قابو کر لیتے تھے۔

س :۔ حالانکہ میٹرک فیل تھے۔

ج :۔ حالانکہ میٹرک فیل تھے، ہمارے ہاں بچوں کو نہ بڑھانے کا ایک یہ بھی تصور ہوتا تھا کہ کونسی ان سے نوکری کرانی ہے۔ اس لیے اتنی ہی تعلیم کافی ہے کہ خط لکھ لیں۔

س :۔ غلام محمد کے متعلق مشہور ہے کہ ذہنی طور پر ماؤف ہو چکے تھے۔ اور گورنر جنرل بھی تھے۔ گالیاں بہت دیتے تھے۔

ج :۔ بلڈ پریشر تو انہیں تھا۔

س :۔ زبان بھی صحیح نہیں چلتی تھی۔

ج :۔ نہیں چلتی تھی۔ بڑی مشکل سے ان کی بات سمجھ میں آتی تھی۔ میں تو بمشکل تمام سمجھ ہی لیتا تھا۔ دوسرے تو بالکل سمجھ نہیں پاتے تھے۔

ملتان سول ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عبدالعزیز تھے۔ بڑا قابل سرجن تھا۔ ملک صاحب نے وہاں ہسپتال میں بستر دیکھا، گندا تھا۔ بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔ اسے ڈرا دھمکا کے باہر نکال دیا۔ میں وزیر صحت تھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے کہ میں بستر تو نہیں بچھاتا۔ میں تو آپریشن کرتا ہوں، گورنر جنرل صاحب نے بے عزت کیا اور معطل بھی کر دیا ہے۔ میں نے ڈائریکٹر ہیلتھ سے کہا کہ اسے لائل پور (اب فیصل آباد) بھیج دے، لائل پور والے کو ملتان بھیج دے۔ ہسپتال خالی نہ رہے، غلام محمد صاحب کو خبر پہنچی کہ میں نے اسے معطل کیا ہے اور اس نے اسے لائل پور بھیج دیا ہے۔ یہاں آئے تو انہوں نے مجھے بلا لیا۔ چارپائی پر نہیں سوتے تھے، زمین پر سوتے تھے، فرقہ واں ماردی سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ نیچے سوتے ہیں۔ مجھے جب انہوں نے بلایا میں بھی نیچے ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، آپ زمین پر کیوں سو رہے ہیں۔ انگلی اوپر کی۔ مطلب تھا، خدا کے ڈر سے۔ میں نے کہا خدا کا ڈر نیچے سونے تک ہے یا بے گناہوں کو بھی سزائیں دینے کے لیے۔ آپ نے ڈاکٹر کو گالیاں دے کے نکال دیا ہے۔ اس وقت آپ کو خدا کا ڈر نہ آیا۔ پھر انہوں نے ہولا ہولا کی تو مجھے سمجھ آئی کہ کہہ رہے ہیں، میں نے تو تجھے جھاڑ کے لیے بلایا تھا، تو الٹا مجھے پڑ گیا۔ پھر ڈاکٹر کو چھوڑ دیا۔

ایک اور بھی واقعہ تھا۔ ریڈ کراس کا سیکرٹری گبن ہوتا تھا۔ میں وزیر صحت ہونے کے ناطے سے چیئرمین تھا۔ بڑا پریذیڈنٹ ریڈ کراس کا گورنر جنرل ہوتا تھا۔ وہاں میٹنگ تھی۔ گبن بھی وہاں آ گیا۔ وہ ریڈ کراس میں بڑا اچھا کام کرتا تھا۔ وہاں سے انہوں نے اسے گالیاں

والیاں دے کے باہر نکال دیا۔ سندھ ریڈ کراس کے چیئرمین نے کہا ہوگا کہ آپ اسے نہیں نکال سکتے۔ پنجاب کا چیئرمین ہی اسے نکال سکتا ہے۔ میں پنجاب کے چیئرمین سے کہوں گا کہ اسے نکال دے۔ کیونکہ آپ کا نکالا ہوا قابل قبول نہیں۔ اتنے میں میں نے انہیں سمجھا دیا۔ کہ اچھا آدمی ہے۔ اسے نکالو نہیں۔

س:۔ گالیاں بہت نکالتے تھے۔

ج:۔ بلڈ پریشر کے مریض جو تھے۔

س:۔ وہ کہا کرتے تھے: "میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش ہوں، شریفوں کے ساتھ شریف ہوں"۔

ج:۔ ویسے سمجھدار آدمی تھے۔ قابل آدمی تھے۔

س:۔ پیسے کے معاملے میں۔

ج:۔ اس وقت کوئی بھی کرپٹ نہیں تھا۔ آپ پرانے وزیروں میں جس کسی کو لیں، کسی کو ایسا نہیں پائیں گے۔

س:۔ سکندر مرزا؟

ج:۔ نہیں، کوئی چیز نہیں بنائی۔

س:۔ قاسم بھٹی نے اس کی بیوی ناہید مرزا کو ہار دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں اسے سمگلنگ کی کھلی مل گئی۔

ج:۔ ہار اور چیز ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو ملک کے متعلق ہو۔ مثلاً زمین لے لی، کارخانے لے لیے، کارخانے تو تھے ہی نہیں اس وقت۔ کوئی چیز لے لی، ٹرانسپورٹ ہو گئی۔ پرانے وزیروں میں اور غلطیاں ہوں گی۔ بددیانتی کی غلطی نہیں ہوگی۔ فرشتے وہ نہیں تھے، بہرحال اس وقت روایت تھی۔ جذبہ ایمانداری کا تھا۔

سکندر مرزا کے زمانے میں بھی اس طرح کا نہیں تھا کہ آؤ یہ لے لو، وہ لے لو، یہ بنا لو، وہ بنا لو۔ جس طرح ایوب خاں نے آتے ہی پریذیڈنٹ ہاؤس بنانا شروع کر دیا، اور پلاٹ دینے شروع کر دیئے۔ کارخانے دینے شروع کر دیئے۔

میں منٹگمری (اب ساہی وال) وٹو کی فارم میں گیا۔ اب وہ مرگیا ہے۔ اس کی اولاد ہوگی۔ وہاں سے میں واپس آیا تو اس نے دو گائیں بھیج دیں۔ میں نے اسے بلا کے کہا کہ میرے تو یہاں گتا وا کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ ایہہ توں کی کیتا اے۔ انہیں واپس لے جا۔ وہ لے گیا۔ پھر نون منسٹری میں مبارک علی شاہ بھی منسٹر ہو گئے۔ شاہ جیونے والے۔ کلب روڈ پر رہتے تھے۔ میں گیا تو دیکھا کہ گائے بندھی ہوئی ہے۔ اس فارم کی گایوں کا رنگ ایک ہی ہوتا تھا۔ میں اندر گیا۔ میں نے مبارک شاہ سے کہا کہ میں نے یہ گائے دیکھی ہے۔ یہ تو مجھے وٹو فارم کی معلوم ہوتی ہے۔ مبارک شاہ نے کہا، "ہاں وہ دے گیا تھا"۔ میں نے کہا تو

تو اتنا بڑا زمیندار ہے، اوئے اتنا بڑا زمیندار، یہ کیا کیا، سویرے ہی اس نے واپس بھیج دی۔

س:۔ اتنا ڈر ہوتا تھا۔

ج:۔ ڈر کی بات نہیں۔ اس نے اسے سنجیدگی سے نہ لیا۔ بس یونہی آ گئی گائے تو کیا بات ہے، زمینداروں میں ہوتا ہے۔ تحفے تحائف۔ وٹو بھی زمیندار آدمی تھا۔ میرے کہنے سے اسے یہ سمجھ آ گئی کہ وزیر ہوتے ہوئے نہیں لینی چاہیئے۔ صبح سویرے ہی واپس بھیج دی۔

کوہ مری جل گئی۔ اسے آباد کرنا میرے ذمہ لگا۔ طے پایا کہ پلاٹ انہیں دیئے جائیں جو بنا سکیں۔ چنانچہ بڑے بڑے لوگوں کو دیئے گئے مثلاً ممتاز دولتانہ۔ ممدوٹ، وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے خود نہیں لیا۔ میں نے نقشہ منگوایا۔ اس میں دیکھا کہ ایک جگہ بیکار پڑی ہے۔ میں نے عملے سے دریافت کیا یہ ابھی تک کیوں بیکار پڑی ہے، جواب ملا، آپ کے لیے رکھی ہے۔ "اوہ تہاڈی تا مرادو، ایہہ کی کیتا جے۔ میرے پُوچھے بغیر کیوں رکھی"۔ چنانچہ میں نے نہیں لی۔ مری برادری والوں کو دے دی۔

میں اتنا عرصہ وزیر رہا۔ یورپ وغیرہ سے دعوتیں آئیں۔ بالخصوص یونیسکو کی طرف سے۔ مگر میں اس خیال سے نہیں گیا کہ یہ مخواہ مخواہ کا اسراف ہو گا۔ آج تو چھ ماہ وزیر رہیں، فوراً دورہ کر آتے ہیں۔ میں گیارہ سال وزیر رہا ہوں۔

آپ کہیں گے، اپنی بات ضرور بیچ میں لے آتا ہے۔

اس دور کی دیانتداری کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

س:۔ خواجہ ناظم الدین کے متعلق سنا ہے کہ قوتِ فیصلہ نہیں تھی۔

ج:۔ ان کی عادت تھی کہ آپ نے بات کی تو کہیں گے "اچھا پھر فرمایئے، کیا ہونا چاہیئے"۔ آپ کی رائے انہوں نے لے لی۔ پھر میں گیا میرے ساتھ ذکر کر دیا کہ فلاں آیا تھا۔ اس نے یہ بات کہی ہے۔ آپ کی رائے میں کیا کرنا چاہیئے۔ بہ صورتِ حال دیکھ کے میں تو یہی کہوں گا کہ قوتِ فیصلہ کی کمی ہے۔ دراصل وہ غلطی سے بچنے کے لیے پورا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔ آدمی بڑے نیک تھے۔ ان کی نیکی اور ان کا اخلاص مسلمہ تھے۔ یہ وہ مخلص لوگ تھے، جن کی وجہ سے پاکستان بنا۔ ان کے بھائی خواجہ شہاب الدین البتہ سیانے آدمی تھے۔

س:۔ سہروردی صاحب؟

ج:۔ بہت اچھا آدمی۔ بڑا محبِ وطن۔ جمہوریت پسند۔ ایماندار۔

س:۔ سردار عبدالرب نشتر؟

ج:۔ نشتر مرحوم بہت صحیح آدمی تھے۔ نیک آدمی تھے۔ یونہی ملتان کے ہسپتال کا نام نشتر ہسپتال نہیں رکھا گیا تھا۔

س:۔ چندریگر؟

ج:۔ بہت قابل اور لائق آدمی تھے۔ بہت مخلص آدمی تھے۔ خامی تو ہر شخص میں کوئی نہ کوئی ہوتی ہے۔ بحیثیت گورنر بہت اچھے چلتے رہے۔ بندہ اس وقت کوئی بھی مارا نہیں تھا۔ دولتانہ بھی مارا نہیں تھا۔ اس میں تمنائیں جو تھیں وہ کام خراب کرتی تھیں۔ جب ہم ان کی وزارت میں تھے، جو "منہ پُنا" تھا، اس میں مجھے نزدیک نہیں آنے دیتے تھے۔ انتظامی معاملات میں وہ میرے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ان کی وزارت کے زمانے میں بڑے اچھے کام کیے۔

س:۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں ان کے سفیر بن جانے کو بھی لوگوں نے سخت ناپسند کیا تھا۔ اس خیال سے کہ انہیں ملک میں رہ کر متبادل قیادت مہیا کرنی چاہیے تھی۔

ج:۔ پے در پے، پے در پے غلطیوں کی وجہ سے یہ لوگوں کے دلوں سے نکل گئے تھے۔ اگر وہ اس وقت یہاں ہوتے بھی تو لوگ ان پر اعتماد کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ سمجھدار لوگوں کے ذہنوں سے میاں ممتاز دولتانہ نکل گئے تھے۔

س:۔ ایوب کھوڑو؟

ج:۔ ان کی البتہ شکایت ہوتی تھی کہ یہ سفارشیں بھی مان لیتے ہیں، وغیرہ۔ سندھ ہی کے قاضی فضل اللہ قابل آدمی تھے۔ بڑے دیانتدار بڑے نیک اور وطن پرست۔ عبدالستار پیرزادہ بڑے قابل آدمی تھے۔ غلام علی تالپور ہوتے تھے پھر علی احمد تالپور منسٹر رہے۔ تالپور سندھ کا بڑا شریف خاندان تھا۔ بڑا دیانتدار خاندان تھا۔ یہ سندھ کے آخری حکمران تھے، جنہیں انگریز نے فتح کیا۔

س:۔ ملک میں جمہوریت ختم کرنے یا سیاسی عمل کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے میں بیوروکریسی پر بھی تو الزام آتا ہے۔

ج:۔ وجہ یہ ہے کہ ہم غلامی کی لعنت سے ابھی نکلے ہی تھے۔ پھر مڑ کے مارشل لاء لگ گیا۔ بیوروکریسی آ گئی۔ ایک دفعہ کیا ہوا، پراونشل مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ ساری کیبنٹ موجود تھی۔ شہر سے جلوس آ گیا، آٹے کے متعلق۔ انہوں نے جلدی کی اجلاس ختم کر دیا۔ وزیر اعلیٰ دولتانہ تھے۔ جلوس سے ڈر کے میاں صاحب اسمبلی کے عقبی دروازے سے بھاگ گئے۔ ہم وزیر لوگ جب موٹروں پر چڑھنے لگے تو لوگ ہماری موٹروں کی طرف بھاگے۔ پتھر مارے، شیشے توڑ دیئے۔ ایک خاتون ممبر ہماری زخمی ہو گئی۔ لیکن نہ لاٹھی چارج ہوا، نہ کوئی گرفتاری، نہ کوئی انکوائری۔ کیوں؟ اس لیے کہ خدا کا ڈر تھا یا پھر عوام کا۔

اس کے بعد جب سب اکٹھے ہوئے تو سب نے کہا یہ بہت بُری بات ہے کہ اس طرح پتھر پڑنے لگے۔ ہمارے میں سے ہی بولنے والے تھے۔ جو کہتے تھے۔ آپ چوروں کی طرح بھاگے۔ چوروں کو تو پتھر پڑنے ہی تھے۔ اگر آپ لیڈر تھے تو جا کے ان کے سامنے کھڑے ہوتے۔ کہتے بھائی کیا بات ہے۔ سنتے سناتے۔ بات تو اتنی تھی "آپ چوروں کی طرح بھاگ کھڑے

ہوئے"، ویسے تو میاں دولتانہ صاحب نے جسے حقارت سے پکارنا ہوتا۔ اسے کہا کرتے تھے۔ لیڈر یہ کیا کر دیا۔ یہ تو میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ چوہدری سے کہہ رہے تھے۔ او لیڈر اِدھر بھی ذرا جھاڑ دے دینا۔

ہم میں ہمت نہیں ہوتی تھی، کم از کم مجھ میں نہیں تھی کہ کوئی رات کے دس بجے بھی مجھ سے ملنے آ جائے۔ اور میں طرح دے جاؤں، یا میرا اردلی کہہ دے، یا میرا نوکر کہہ دے کہ نہیں صاحب آرام فرما رہے ہیں، یہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر ڈر ہوتا تھا کہ کوئی آدمی آ گئے، اسے وقت دو۔ پاکستان مِنٹ کا ایک مزدور میرے پاس آیا۔ اس کا نام بھی مجھے یاد ہے، فرحت علی۔ اس نے بہن کی یا بیٹی کی شادی کا ذکر کیا۔ کہنے لگا، آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ انکار کیا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے میں نے کہا اچھا بھائی فارغ ہوا تو ضرور آؤں گا۔ کہنے لگا۔ اگر آپ کو ممدوٹ صاحب کہتے تو اس کو بھی یہی جواب دیتے۔ میں نے کہا "نہیں"۔ "کیوں؟ اسے کسی اور خدا نے بنایا ہے اور مجھے کسی اور خدا نے بنایا ہے، یا اس کے پاس چار پیسے زیادہ ہیں؟" میں نے کہا۔ نہیں، ممدوٹ ہے ایک، مِنٹ کے مزدور ہیں ڈھائی ہزار اگر میں ڈھائی ہزار کی شادیاں اٹنڈ کرنے لگوں۔ تو پھر یہاں سے استعفا دیدوں۔ مگر وہ بڑا سیانا تھا۔ تاڑ میں رہا۔ ایک روز میں اپنی سرکاری رہائش گاہ ۲ کالج روڈ کے لان میں بیٹھا تھا۔ وہ آ گیا۔ "جناب کا وعدہ تھا" ساتھ لے گیا۔

س :۔ آپ نے کہا کہ مارشل لا لگ گیا۔ بیوروکریسی آ گئی، غلام محمد اور سکندر مرزا بھی تو بیوروکریسی کے کل پرزے تھے۔

ج :۔ اس وقت بیوروکریٹس کا زور نہیں چلتا تھا۔ ڈی سی وغیرہ لوگوں سے پوچھتے تھے کہ ہم سے راضی ہو کہ نہیں۔ اب ایسا کوئی نہیں کرتا۔ کیونکہ ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ پہلے ایوب آیا۔ ایوب نے کہا مجھے ووٹ لے دو اور جو آپ کی مرضی کرتے پھرو۔ بیوروکریسی نے سوچا کہ ہم نے اس کے لیے بے ایمانی کرنی ہے تو اپنے لیے کرتے ہوئے ہمیں موت پڑتی ہے۔ پھر عام ہو گیا معاملہ۔

س :۔ دستی صاحب! جب تک ملک میں مارشل لا نہیں لگ گیا۔ آپ بدستور وزیر رہے۔ کون سی "گیدڑ سنگھی" تھی آپ کے پاس۔

ج :۔ آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اپنی مرضی سے وزیر نہیں رہا۔ گیدڑ سنگھی، یہی تھی میرے پاس کہ جب پہلا چانس ملا۔ محنت سے کام کیا۔ کوئی مسل نہیں تھی۔ جو لے سے لے کر ہی تک نہیں پڑھنا تھا۔ سر فرانسس موڈی جب گورنر تھا تو کہنے لگا۔ آپ اتنا کام کس وقت کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہو ہی جاتا ہے۔ ایک انگریز کرنل نے ڈھائی بجے رات میرے گھر کی لائٹ جلتے دیکھی تو اس نے گورنر کو بتایا کہ یہ مسلیں اٹھا کے اور پی اے اور سٹینو گرافر کو لے کے چار بجے شام گھر چلا جاتا ہے۔ اور رات گئے تک بیٹھا رہتا ہے۔ فرانسس موڈی کہتا ہے۔ اب میں اسے

پوچھوں گا تو سوتا کب ہے ، اس محنت کی وجہ سے میں اتنا عادی ہوگیا کہ پھر مجھے محنت کی اتنی ضرورت نہ رہی ، ہمارے ذمے کام جو لگاتے تھے ، وہ ہم صحیح کرتے تھے۔

س :- پھر تو اس زمانے میں مشہور ہوگیا کہ کوئی آئے یا جائے ، دستی کی بلا سے ، یہ وزیر پکے۔

ج :- اسمبلی میں غالباً مولانا عبدالستار نیازی نے کہا تھا :

کل من علیہا فان

الا دستی عبدالحمید خان

نون کی وزارت کے زمانے میں ضمیر جعفری کے یہ تین شعر نوائے وقت میں چھپے تھے

آج تک جتنے بھی مسلم لیگ کے گزرے وزیر
جملہ رفت و لٹو دیں دستی بلند اقبال ہیں
مجلس ممدوٹ ہیں ، کابینہ ممتاز میں
اور اب ملک فیروز خاں کے بھی شریک حال ہیں
کوئی بھی بستی ہو اُس بستی میں دستی ہے ضرور
آپ مسلم لیگ کے لالہ منوہر لال ہیں

قیام پاکستان سے قبل لالہ منوہر لال وزیر تعلیم ہوتے تھے ، وہ بھی ہمیشہ ہی رہے۔

(اگست ۱۹۸۲ء)

■■

سردار عبدالحمید دستی کے اس انٹرویو پر میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ر اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں یہ بیان دیا۔

سردار عبدالحمید دستی نے میرے متعلق کئی سراسر غلط لغو بے بنیاد اور بعید از قیاس باتیں کہی ہیں جنکی میں قطعی ، غیر مبہم ، پرزور ، واضح اور ناقابل جواب تردید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں سردار عبدالحمید دستی سے میرے تعلقات ہمیشہ خوشگوار اور بغیر کسی الجھاؤ کے رہے ہیں حالانکہ مجھے کبھی ان سے زیادہ قرب یا بے تکلفی نصیب نہیں ہوئی اس لیے میری حیرت اور رنج کی کوئی انتہا نہیں کہ انہوں نے اس قسم کی بے حقیقت اور معاندانہ باتیں مجھ سے منسوب کرنا کیوں مناسب سمجھا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ قلق اور حیرت ان کے بیان کے اس حصہ سے ہوئی ہے جس میں انہوں نے میرے منہ سے قبلہ محترم جناب عبدالرب نشتر کے متعلق اخلاق سوز ، سوقیانہ ، بعید از تہذیب دشنام طرازی منسوب کی ہے ۔ جناب نشتر مرحوم برصغیر کے مسلمانوں کی ایک عظیم ترین اور واجب بے پناہ احترام ہستی تھے جن کا شمار پاکستان کے مؤثر اور پاکیزہ ترین معماروں میں ہوتا ہے ۔ وہ ہمیشہ میرے خاص مہربان اور مربی رہے اور ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک میں ان کا ایک ادنیٰ اور وفادار کارکن رہا ہوں ۔ قبلہ مجھ سے ایک والد سے زیادہ عنایت فرماتے تھے اور میں ان کا ایک بیٹے سے زیادہ فرمانبردار تھا

یہ حقیقت مسلم لیگ کے ہر کارکن پر واضح تھی اور ہے ہیں اور ان کے متعلق کوئی نازیبا اور پھر اس قدر پست اور ذلیل بات کروں اس کا گمان تک بھی ناممکن ہے اور پھر اس سلسلے میں واقعات بذات خود سردار دستی صاحب کے ناقابل برداشت الزام کی ہر طرح تردید کرتے ہیں میں جب پنجاب کا وزیر اعظم منتخب ہوا تو اس وقت قبلہ نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر تھے ۱۹۵۱ء ہی میں قبلہ جناب لیاقت مرحوم کی شہادت کے بعد سردار صاحب مرحوم گورنری کا عہدہ چھوڑ کر جناب خواجہ ناظم الدین مرحوم کی مرکزی وزارت میں وزیر مقرر ہو گئے۔ جناب دستی فرمائیں کہ اس دور میں کونسی اور کس موقع پر اور کس مقصد کے لیے صوبہ مسلم لیگ کا کوئی اجلاس ہوا جس میں میں نے سردار صاحب مرحوم کا ذکر کیا اور جب وہ گورنر تھے اور بر اعتبار عہدہ جماعتی سیاست سے لاتعلق تھے تو میں ان کا ذکر کسی سیاسی پس منظر میں کر ہی کس طرح کر سکتا تھا جناب نشتر مرحوم کے مرکز میں جانے کے بعد کونسا اور کہاں ایسا صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں جناب خواجہ ناظم الدین اور سردار نشتر موجود تھے؟ یہ بالکل درست ہے کہ میں قائداعظمؒ اور شہید ملتؒ لیاقت علی خان کے بعد سردار عبدالرب نشتر کو مسلم لیگ کی عظیم ترین شخصیت تصور کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں مگر قائداعظمؒ کی جانشینی کا ذکر تو میں نے اپنی تمام عمر میں ایک بار بھی کبھی نہیں کیا کیونکہ ان کا جانشین کوئی نہ ہو سکتا تھا نہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال اگر بحث کی خاطر یہ مفروضہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ میں نے سردار عبدالرب نشتر صاحب کے متعلق اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا تو اس سے ان کی عظیم شخصیت کو کیا گزند پہنچ سکتی تھی اور کون تھا جو اس جذبہ میں میرا ہمنوا ہوتا۔ پھر اگر میں اتنا ہی کمینہ اور از اخلاق رفتہ تھا کہ میں مسلمانوں کے عظیم ترین محسنوں میں سے ایک کو ایک گندی گالی دیتا تو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ میں یہ بات خلوت میں صرف قبلہ دستی صاحب سے ہی کہتا جن سے کبھی میرا کوئی گہرا تعلق نہ تھا اور اگر میں نے ایسی ناقابل معافی حرکت کسی محفل میں کی ہے تو میں دستی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسے باحیثیت یا قابل ذکر شخص کی شہادت پیش کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو اخلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ کھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف فرمائیں۔

مجھ میں کئی عیب ہونگے مگر دستی صاحب سے کم لوگ مجھے نہیں جانتے میری طرز زندگی گفتگو سب کو معلوم ہے میں نے آج تک پبلک میں اور خلوت میں کسی بزرگ یا دوست یا حریف کا نام بد اخلاقی سے نہیں لیا یہ صرف دستی صاحب کی صحبت میں کھل کر اپنا آپ اس طرح کیسے بھول گیا یہ کون باہوش انسان باور کریگا۔ ملک فیروز خان نون مرحوم سے میرے اختلاف بھی رہے مگر ان سے میرے پرانے خاندانی تعلقات تھے وہ میرے والد بزرگوار کے دوستوں میں سے تھے یہ بھی سراسر جھوٹ ہے کہ میں نے ان کے متعلق کبھی کوئی نازیبا یا بد اخلاق لفظ استعمال کیا ہو یہ میری عادت نہیں اپنے بیان میں دستی صاحب نے ایک ہی گالی دو بار میرے منہ سے کہلوائی اور پھر وہی گالی مرحوم ڈاکٹر خانصاحب سے منسوب کی ہے خدا جانے یہ گالی کس کا تکیہ کلام ہے؟ دستی صاحب کی میرے متعلق کوئی رائے ہو مجھے اس سے سروکار نہیں اور نہ ذاتی نہ جماعتی نہ ملکی اور نہ تاریخی لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت ہے۔ مگر مختصراً ان کی چند اور غلط بیانیوں کی بر زور تردید کروں۔

(۱) نواب صاحب ممدوٹ کے ہاتھوں مجھے کوئی شکست نہیں ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں سردار

شوکت حیات صاحب اور میں نے ان کی وزارت سے استعفا دے دیا میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ آج میری قطعی رائے ہے کہ نواب صاحب سے میری دوری کبھی نہیں ہونی چاہیئے تھی مگر جہاں تک دونوں میں شکست کا تعلق ہے کسی موقع یا وقت پر بھی نواب صاحب کے ہاتھوں مجھے شکست نہیں ہوئی مگر اس پر مجھے کوئی مان نہیں۔

(۲) یہ سراسر جھوٹ ہے کہ خواجہ ناظم الدین صاحب نے مجھے یہ چیلنج دیا تھا کہ یا مستعفی ہو جاؤ یا تم پر مقدمہ چلایا جائے گا میں وزارت عظمیٰ پنجاب سے مستعفی اپنی مرضی سے ہوا تھا کیونکہ چند اختلافات کا کوئی صالح حل نہ تھا مجھ پر نہ صرف کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا بلکہ مرحوم خواجہ ناظم الدین صاحب جن کا آخر تک میں سیاسی رفیق رہا بار ہا میرے اس موقع پر رویہ کی تعریف بھی کرتے تھے اور افسوس بھی کہ ایسا ہوا۔ مگر دستی صاحب نے تو شاید ۱۹۵۳ء کے بعد قابل احترام خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم کی کبھی شکل بھی نہ دیکھی ہوگی۔

(۳) ۱۹۵۳ء میں جب میں وزارت سے مستعفی ہو گیا تو اسمبلی کی سربراہی کے کام سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا نہ میں نے دستی صاحب سے کہا کہ آپ بجٹ پیش کریں اور نہ انہیں منع کیا آج بھی میرے وزارت کے باقی ماندہ زندہ ساتھی یعنی جناب چودھری محمد حسین چٹھہ، سید علی حسین شاہ گردیزی اور جناب شیخ فضل الٰہی صاحب پراچہ اس کی غیر مبہم اور منہ توڑ شہادت دے سکتے ہیں۔

آخر میں میری عرض ہے کہ مجھے دستی صاحب سے نہ کوئی پرخاش ہے نہ مخالفت، مگر آئندہ اگر وہ انشاء پردازی کا شوق فرماتے رہیں تو بصد ادب میری ان سے گذارش ہے کہ وہ بنیادی اخلاق زبان کی پاکیزگی اور کم سے کم کچھ سچائی کا خیال رکھیں۔

■■

میاں ممتاز دولتانہ کے اس بیان کے جواب میں سردار عبدالحمید دستی نے ۷ ستمبر ۸۲ء کے روز ہمیں یہ جواب ریکارڈ کرایا۔

اگرچہ میاں ممتاز دولتانہ نے سردار عبد الرّب نشتر مرحوم کے لیے وہ لفظ استعمال کیا ہے لیکن یہ چھپنا نہیں چاہیئے تھا۔ اس کا میں نے جو ذکر کیا ہے۔ اس کے استعمال کا ذکر بھی ناشائستگی ہے، 'نقل کفر کفر نہ باشد' والی بات نہیں۔

کسی کا راز کھول دینا۔ پھر انہوں نے (دولتانہ) یہ بھی بیان (جنگ ۲۳ اگست ۸۲ء) میں کہا ہے کہ اب دستی مزید انشا پردازی نہ کریں۔ بالواسطہ طور پر انہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں جواب نہ دوں۔ باتیں جو میں نے کی ہیں وہ سب ٹھیک ہیں گلاں ساریاں ٹھیک سان۔

س :- دولتانہ صاحب کہتے ہیں کہ چٹھہ صاحب، گردیزی صاحب فضل الٰہی پراچہ صاحب سے پوچھ لیں کہ میں نے کبھی دستی صاحب سے نہیں کہا کہ بجٹ پیش کرو۔

ج :- جھوٹ بولیں گے۔ یہ جو انہوں نے نام دیے ہیں۔ ان کے خاص آدمی ہیں۔ اس چیز سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ میں نے بجٹ پیش کیا تھا۔

س :۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں نہیں کہا تھا کہ بجٹ پیش کرو۔

ج :۔ جھوٹ بولتے ہیں، بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔ میں اس عمر میں کیوں اپنا اعمال نامہ خراب کروں گا۔ لیکن جو باتیں ذہن میں تھیں آپ نے مجھ سے کہلوائیں۔ اسی واسطے میں انکار کرتا تھا کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ لیکن جب آپ نے کہلوانا شروع کر دیں تو اس عمر میں میرے لیے جھوٹ بولنا مناسب نہیں تھا۔

مرنج کرنے سے میں گھبراتا ہوں، اس بات کا مجھے افسوس ہوا کہ آپ ہاتھ ذرا نرم کر دیتے ویسے میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ مبالغہ بھی کوئی نہیں ورنہ گرمیٔ تقریر کی خاطر آدمی مبالغہ کر دیتا ہے لیکن اس میں مبالغہ بھی کوئی نہیں۔

مجھے یاد ہے نون کے متعلق میاں صاحب نے تائید کی تھی۔

س :۔ انہوں نے تائید کی تھی کہ میں نون کا اردلی بن کے رہوں گا۔

ج :۔ میاں صاحب نون کے خلاف ہی رہے۔ یہ تو واقعہ ہے کہ میاں صاحب اپوزیشن میں ہی تھے کہ سنٹر نے مجھے کہا کہ آپ دولتانہ کے ساتھ مل کے نون کو نکالیں اب یہ کس طرح کہتے ہیں کہ نون کے ساتھ ان کے خاندانی تعلقات ہیں۔ انہوں نے تو اسے (نون کو) نکالا میں نے بھی اسے نکالا۔

س :۔ وہ کونسی شکست ہے جس کے متعلق دولتانہ صاحب نے کہا کہ میں نے کبھی ممدوٹ سے شکست نہیں کھائی۔

ج :۔ جب وزیراعلیٰ ممدوٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی گئی اور ووٹنگ کے لیے تاریخ مقرر ہوئی۔ پھر غالباً میاں صاحب کی اکثریت نہ رہی۔ انہوں نے استعفا دے دیا۔ استعفا دینا ہی شکست ہے۔ ورنہ انہوں نے کیوں استعفا دیا؟ یہ کوئی خوش ہو کے گئے تھے؟ استعفا دینا ہی شکست ہے۔ کیا وہ شکست نہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ شکست نہیں کھائی لیکن استعفا دے کے آپ چلے گئے۔ کیوں دے گئے؟

یہ تو تھی خان ممدوٹ والی بات۔ جب انہوں نے خواجہ ناظم الدین کے وقت استعفا دیا۔ میں گیا اور میں نے کہا کہ انہوں نے استعفا کیوں دیا۔ صوفی عبدالحمید نے کہا "کرماں دا پھل"۔ لیکن تب تک مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میں ان کے پاس گیا، کھوج لگانے کے لیے۔ پھر بھی میں نے کہا۔ سارا ہاؤس ان کے ساتھ ہے پھر یہ کیوں استعفا دیتے ہیں۔ جواب ملا۔ "مجبوریاں" میرا اندازہ ہے۔ میرا اپنا علم تو نہیں۔ ورنہ مجھے علم ہوتا تو میں کہتا ٹھیک ہے۔ یا اس وجہ سے مستعفی ہو رہے ہیں۔ البتہ میرا ذاتی علم یہ ہے کہ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ دولتانہ سے کہیں کہ میں بجٹ پیش کروں۔ انہوں نے کہا کہ اسے کہیں الٹا ہو جا۔ وہ الٹا ہو جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں سیدھا ہو جا۔ سیدھا ہو جاتا ہے۔ یہ میرے ذاتی علم میں ہے۔

س :۔ وہ کہتے ہیں کہ دستی صاحب نے خواجہ ناظم الدین کی شکل ہی نہیں دیکھی رہیں تو انہیں ملتا رہا ہوں جب خواجہ صاحب وزارتِ عظمیٰ سے الگ ہو گئے۔

ج :۔ جھوٹ۔

س :۔ نشتر مرحوم کے بارے میں انہوں نے اسے یہی کہا جیسے کہ آپ نے ہمیں بتایا تھا۔

ج :۔ وہ کیوں کہا۔ آپ مانتے ہیں کہ نہیں کہ خواجہ ناظم الدین کے خلاف انہوں نے تحریک شروع کی۔ ان کے ساتھ ہی نشتر مرحوم لاہور آئے تھے۔ وہ ان کی (خواجہ صاحب) وزارت میں تھے۔ دونوں نے مسلم

لیگ کو ایڈریس کیا پہلے وقت ناظم الدین نے کیا۔ دوسرے وقت دولتانہ صاحب نے کیا۔ چونکہ نشتر ناظم الدین کے آدمی تھے، اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ نشتر تو آئے اس کی تحریک کے خلاف مگر یہ تو نے کیوں چلائی۔ اس وقت جب انہوں نے نشتر کی تعریف کر دی۔ اس تعریف کے متعلق انہوں نے بتایا کہ یہ میں نے اس لیے کی ہے کہ نشتر نہ ادھر کا رہے نہ اُدھر کا رہے۔

واقعات بتاتے ہیں اور یہ تسلیم شدہ بات ہے۔ اس نے ناظم الدین کے خلاف تحریک چلائی۔ یہ بھی تسلیم شدہ بات ہے کہ نشتر ناظم الدین کے ساتھ وزیر تھے۔ وہ دونوں آئے چونکہ نشتر ناظم الدین کے ساتھی تھے۔ لازمی طور پر انہوں نے کہنا تھا۔ کیا انہوں نے اس طرح کہ پہلے مجلس میں تعریف کی۔ میں نے کہا یہاں صاحب بڑی تعریف کی ہے۔ کہنے لگے۔ میں نے اس حرامزادے کو نہ اُس طرف کا چھوڑا ہے نہ اس طرف کا چھوڑا ہے۔

اگر آپ میرا یہ انٹرویو چھاپتے وقت "حرامزادے" کا لفظ نکال دیتے۔ پھر یہ بول ہی نہیں سکتا تھا۔

س:۔ ہاں اور بیشمار باتوں کی انہوں نے تردید نہیں کی۔

ج:۔ نشتر کے ساتھ یہ لفظ ہر ایک کو بُرا لگتا ہے۔

س:۔ وہ صوبائی مسلم لیگ کا باقاعدہ اجلاس نہیں تھا۔

ج:۔ نہیں۔

س:۔ وہ پھر غلطی سے لکھا گیا۔

ج:۔ انہوں نے مسلم لیگ کے دفتر لکشمی بلڈنگ میں ایڈریس کیا۔

س:۔ مسلم لیگی کارکنوں کو۔

ج:۔ ہاں۔

س:۔ ناظم الدین نے بھی، نشتر نے بھی، دولتانہ نے بھی۔

ج:۔ پہلے وقت ناظم الدین نے، شام کے وقت نشتر نے۔ نشتر نے صدارت کی تو دولتانہ صاحب نے تقریر کی۔ اس میں انہوں نے بڑی تعریف کی نشتر کی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کی تعریف کروں گا۔ ناظم الدین سنے گا کہ اس کی تعریف ہوئی ہے۔ وہ اس پر شک کرنے لگ جائے گا۔ کہ یہ تو اُن سے ملا ہوا ہے، اس واسطے یہ کہتا تھا کہ میں نے اسے نہ اس طرف کا چھوڑا ہے، نہ اُس طرف کا چھوڑا ہے۔

س:۔ ابھی دولتانہ نے استعفا نہیں دیا تھا۔

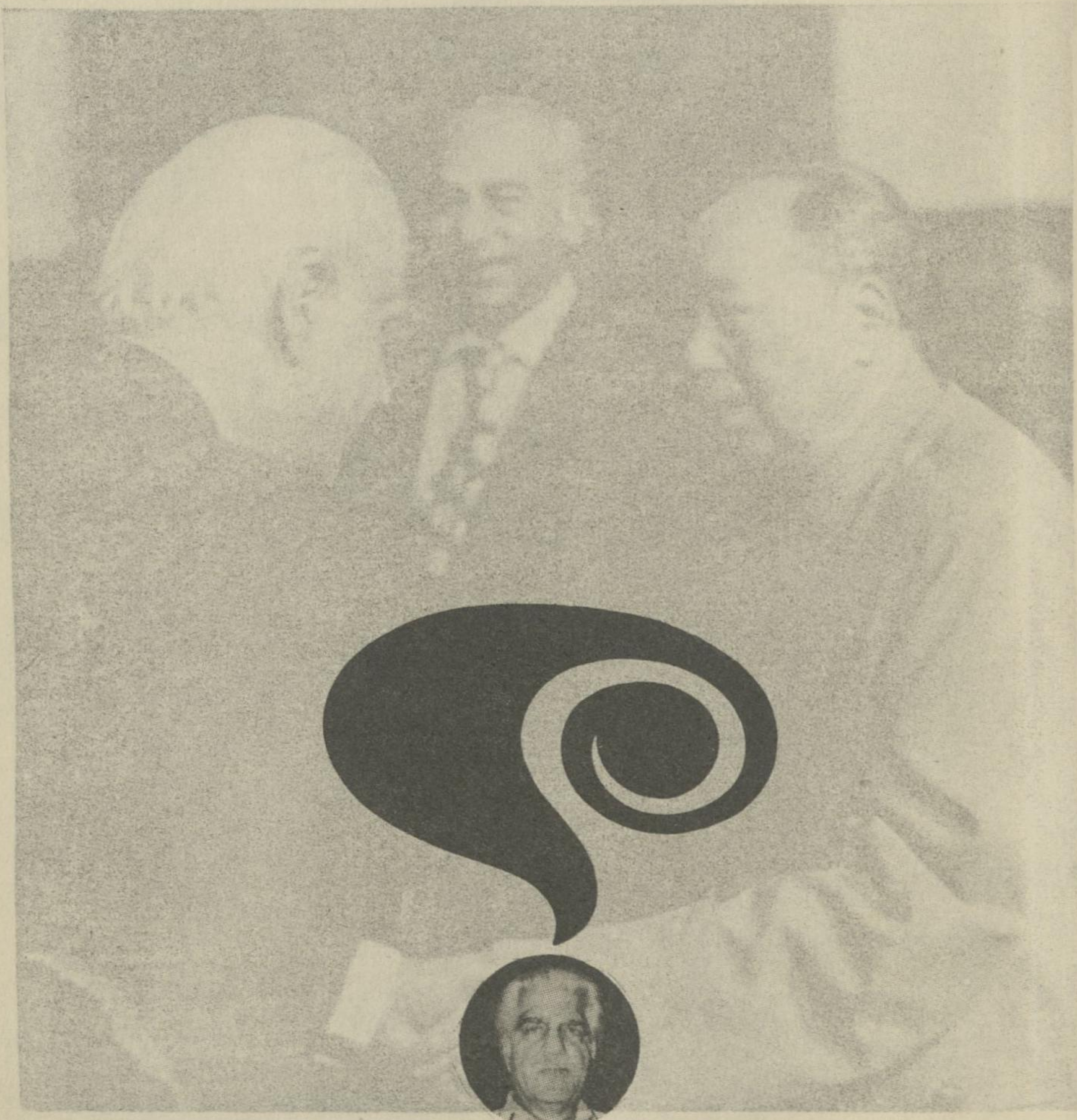
ج:۔ نہیں نہیں۔

س:۔ ابھی موومنٹ چل رہی تھی۔

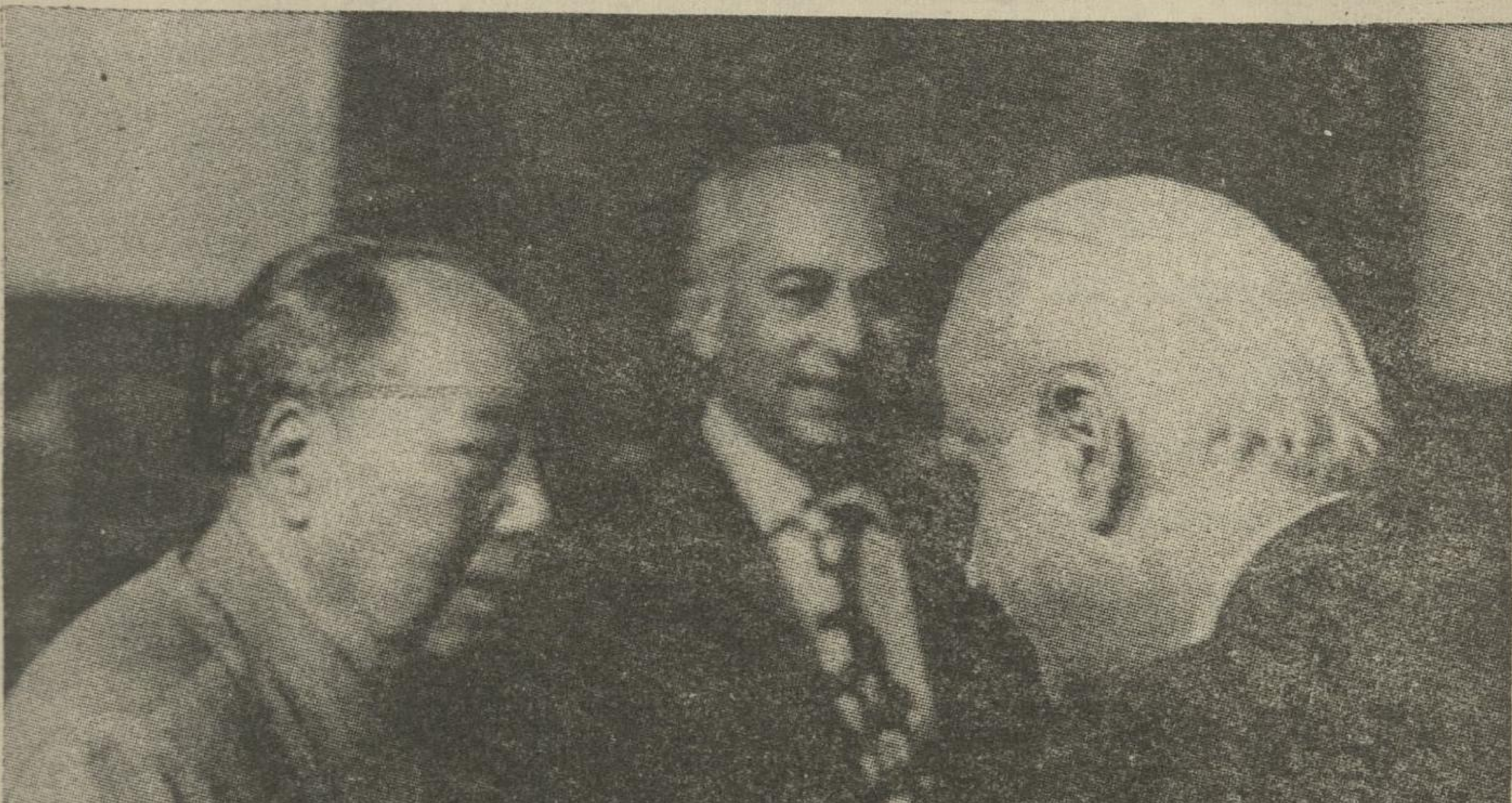
ج:۔ اس وقت تحریک چل رہی تھی۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ تحریک اس نے چلائی تھی۔

س:۔ وہ تو منیر انکوائری رپورٹ میں بھی ہے۔

ج:۔ وہ تسلیم شدہ بات ہے۔



یوسف خٹک سے انٹرویو



چین: اپریل ۱۹۷۴: یوسف خٹک، ذوالفقار علی بھٹو اور چیئرمین ماوزے تنگ

سوانحی خاکہ

میری ڈیٹ آف برتھ ۱۸ نومبر ۱۹۱۷ء ہے۔ والد مرحوم محمد قلی خاں سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس لئے ابتدائی تعلیم کرم پارا چنار میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد مانسہرہ اور پھر پشاور۔ اسلامیہ کالج پشاور سے انٹرمیڈیٹ کیا مجھے ٹینس کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۶ء میں بی اے کیا۔ پھر آکسفورڈ سے بی اے آنرز کیا۔ بارایٹ لا لنکنز ان سے کیا۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس ان سے بارایٹ لا کیا جہاں سے قائداعظمؒ نے کیا تھا۔ انگلستان سے واپسی جلدی ہو جاتی لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ۱۹۴۴ء میں واپس آسکا۔ اسی سال میں نے مسلم لیگ جائن کر لی۔ ۱۹۴۶ء کے آخیر میں سرحد پراونشل مسلم لیگ کا جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب مسلم لیگ پاکستان مسلم لیگ اور انڈین مسلم لیگ میں تقسیم کر دی گئی تو میں سرحد پراونشل مسلم لیگ کا آرگنائزنگ جنرل سیکرٹری ہو گیا۔ فروری ۱۹۴۹ء میں سرحد پراونشل مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس کے دو تین ماہ بعد پاکستان مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ ۱۹۵۱ء تک میں اس عہدے پہ کام کرتا رہا۔ ایوب خاں نے کنونیشن مسلم لیگ بنائی تو میں دولتانہ صاحب کی کونسل مسلم لیگ میں رہا اور سرحد پراونشل مسلم لیگ کا صدر منتخب ہوا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں میں نیشنل اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا اور اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ایوب خاں نے ہروا دیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد میں قیوم مسلم لیگ میں چلا گیا اور پشاور کے ضمنی انتخاب میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہو گیا۔ ۱۹۷۴ء میں قیوم مسلم لیگ نے بھٹو صاحب کی کابینہ جائن کی۔ مجھے قدرتی وسائل کی وزارت دی گئی۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں ہم مستعفی ہو گئے۔



...ی میں ایک فنکشن کے موقعہ پر ۔ (۱) میاں عبدالباری (۲) چودھری نذیر احمد (۳) نواب مشتاق احمد گورمانی (۴) چودھری محمد علی [illegible] (۶) ممتاز دولتانہ (۷) یوسف خٹک



س :۔ خٹک صاحب آپ اپنی گفتگو کا آغاز اپنے خاندانی پس منظر سے کریں گے۔

ج :۔ ہم خٹک یہیں کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا آبائی گاؤں زرگئی ضلع کوہاٹ میں تھا۔ اب ضلع کرک بن گیا ہے۔ ہمارے پردادا کو ان کے کزن وغیرہ نے وہاں سے نکال دیا۔ تو وہ بنوں جا کے آباد ہو گئے۔ بنوں وہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ انہوں نے وہاں زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ پہلے قبضہ ہی ہوتا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے نیا گاؤں آباد کیا۔ پھر انگریز آ گئے۔ ان کا قانون تھا کہ باہر کے لوگ بنوں میں گاؤں آباد نہیں کر سکتے تھے چنانچہ اس گاؤں کو قانونی حیثیت نہ ملی۔ بلکہ انگریز چاہتے تھے کہ ہم وہاں سے نکل جائیں۔ بالآخر اجازت مل گئی۔ جس روز اجازت ملی، اسی روز میرے والد پیدا ہوئے۔ پشتو میں گاؤں کو قلعہ کہتے ہیں۔ اس لیے میرے والد کا نام محمد قلی خاں رکھا یعنی گاؤں کا خان۔ کہ آج ہی اجازت ملی ہے۔ اور آج ہی یہ پیدا ہوا ہے تو گاؤں کا خان یہ ہے قلی خاں سے پھر ان کا نام قُلی خاں ہو گیا۔ کیونکہ پشتو میں تو قلی خاں سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے باقی علاقوں میں قُلی خاں رائج تھا۔ اور یہ ایک تاریخی نام بھی تھا۔ پھر ہمارے والد نے پشاور صدر میں یہ گھر (۲ مال روڈ) بنایا۔ جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر تو مستقلاً یہیں بود و باش ہو گئی۔ ویسے میں اپنے آبائی گاؤں بھی جاتا ہوں۔ یہ ہے ہماری مختصر سی روداد۔

س :۔ آپ سیاست میں کیسے آئے؟

ج :۔ ۱۹۳۶ء میں میرے والد نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیجا۔ وہاں سیاست کا بڑا زور تھا۔ اس زمانے میں سپین میں جنرل فرانکو کا انقلاب بھی رونما ہوا۔ ایک تو یہ تھا کہ بائیں بازو والے بڑے زوروں پر تھے۔ سارا انگلستان دو پارٹیوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک فرانکو کے طرفدار اور دوسرے ری پبلکن گورنمنٹ کے حامی۔ بلکہ ان کی آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ دوستانے ٹوٹ جاتے تھے۔ ہندوستانی نوجوان ہندوستان کی آزادی کے لیے بھی سرگرم تھے۔ بس سیاست کا چسکا مجھے وہاں سے پڑا۔

میرے والد قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کو بخوبی جانتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ خود بھی مسلم لیگ میں آ چکے تھے۔ وہ صوبہ سرحد میں ان چند ابتدائی افراد میں سے تھے۔ جنہوں نے وہاں مسلم لیگ کی تنظیم نو کی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب عبدالغفار خان کا بڑا زور تھا۔ جب میں فارغ التحصیل ہو کے انگلینڈ سے واپس آیا تو والد صاحب نے مجھے کہا۔ تم سیاست میں مسلم لیگ کو سپورٹ کرو گے۔ بس ان کی حوصلہ افزائی تھی۔ میری عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت مسلم لیگ اور سرخپوشوں کا آپس میں ہر جگہ تصادم تھا۔

مسلم لیگ جو صوبہ سرحد برائے نام ہوتی تھی ۔ اب قوت پکڑ رہی تھی ۔ لوگ سرخ پوش تحریک سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس میں شامل ہو رہے تھے ۔ پھر تو مسلم لیگ میں دن رات ہی کام کرتا ہوا ۔

س :: صوبہ سرحد میں سرخپوشوں کا بڑا زور تھا ۔ پھر تو آپ کو بڑے سخت حالات پیش آئے ہوں گے ۔

ج :: سرخپوشوں کا وہاں بڑا زور تھا ۔ ہمارا آبائی علاقہ کرک ایسے تھا ۔ جیسے چارسدہ ۔ یعنی سرخپوشوں کا گڑھ ۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں کرک میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا ۔ جہاں سے کم از کم ایک آدمی جیل نہ گیا ہو ۔ کئی گھروں سے تو تین تین ، چار چار آدمی جیل گئے تھے ۔ اس پس منظر میں وہاں ان کا اتنا زور تھا کہ ہم جلسہ نہیں کر سکتے تھے ۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں جلسے برپا کرنے سے روکتے تھے ۔ سرحد میں یہ روایت رہی ہے کہ ایک دوسرے کا جلسہ نہیں توڑتے تھے ۔ لیکن وہ سرخ وردی والے بیچ میں اوٹ پٹانگ سوال کر دیتے تھے جس سے جلسہ درہم برہم ہو جاتا تھا ۔ ہم نے ان حالات میں کام شروع کیا ۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیاب رہے ، وہی جگہ جہاں سرخپوشوں کے ڈر سے کوئی جلسہ نہیں کر سکتا تھا ۔ وہاں ایک سرخپوش بھی نہ رہا ۔ جبکہ وہاں حالت یہ تھی کہ آمد و رفت کے لیے سڑکیں بھی نہیں تھیں ۔ ہمیں بیس بیس ، پچیس پچیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا ۔ ہم اونٹ پر آٹا وغیرہ رکھ لیتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے ۔ آٹا اور اشیائے خوردنی اس لیے ساتھ رکھتے تھے کہ جہاں جائیں اپنی روٹی خود پکا کھائیں ۔ حالانکہ لوگ تو بڑے مہمان نواز تھے ۔ لیکن ہم کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے ۔ کہ پاکستان کا پیغام لے کے جاتے اور انہیں کہتے کہ کھانا بھی ہمیں کھلاؤ ۔ میرے ساتھ بڑے اچھے کارکن تھے ہمارے ہر دورے میں بیس پچیس میل کا پیدل سفر ہوتا تھا ۔

س :: یہ آپ پورے صوبہ سرحد کی بات کر رہے ہیں یا صرف کرک کی ؟

ج :: پورے سرحد کی نہیں ۔ میں کرک کی بات کر رہا ہوں ۔ جو اب ضلع بن گیا ہے ۔ کیونکہ ہم سب [illegible] وہیں کے رہنے والے تھے ۔ ویسے تو ہم باقی جگہوں پر بھی جاتے تھے ۔ پشاور میں جلسہ ہوتا تھا وہاں بھی جاتے تھے ۔ ہزارے میں جلسہ ہوتا تھا ، وہاں بھی جاتے تھے ۔ لیکن کرک کو میں نے اپنا خاص بیس (BASE) بنایا ہوا تھا ۔ کرک میں بادشاہ میر مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے پہلے سالار تھے ۔ وہی جگہ جہاں ڈھونڈے سے بھی کوئی مسلم لیگی نہیں ملتا تھا ۔ وہاں ہم نے پاکستان کے حق میں بڑے زور و شور سے سول نافرمانی کی تحریک چلائی ۔ جیلیں بھر دیں ۔ بڑے زور شور سے ریفرنڈم جیتا ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل تھا ۔

س :: آپ کا تو صحیح معنوں میں ایک عوامی پارٹی سے مقابلہ تھا ۔ جس کی عوام میں جڑیں بہت مضبوط تھیں ۔

ج :: مجھ سے پنجاب کے دوست ناراض ہو جاتے ہیں ۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہمیں تو پاکستان طشتری میں ملا ہے ۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں نے قربانیاں نہیں دیں ۔ آپ نے بھی قربانیاں دیں ، بڑی زبردست قربانیاں دیں ۔ اگر پنجابیوں نے قائداعظم کا پیغام یکدم اپنا لیا تو یہ چیز ان کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے ۔ بلکہ ہمارے لیئے بُرا تھا کہ ہم ایک دم نہیں کچھ ۔ لیکن آپ کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی سے تھا جو کوئی پارٹی نہ تھی ۔ جبکہ ہمارا ایک ایسی پارٹی سے مقابلہ تھا جس کی عوام میں جڑیں تھیں ، جو بڑی منظم تھی ۔ وہ لوگ بڑے زبردست اور فعال تھے ۔ بڑی آزمائشوں میں سے گزر چکے تھے ۔ تین تو انہوں نے سول نافرمانیاں کی تھیں ۔ ۱۹۲۰ء میں ۔ ۱۹۳۰ء میں اور پھر ۱۹۴۲ء میں ۔ انگریز کے خلاف بڑی تحریک چلا چکے تھے وہ

بڑے جان نثار تھے۔ ان کو توڑنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس وقت یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ سرخپوش بھی مار کھا جائیں گے۔ عبدالغفار خاں نے بڑا کام کیا تھا۔ اس وقت ان کا ورکر ہر جگہ اور ہر پول پر تیار ہو چکا تھا۔ میں عبدالغفار خان کو اس بات پر خراج بھی پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے مشکل دور میں اور بڑے مخدوش حالات میں وہاں سیاسی بیداری پیدا کی۔ سوال یہ تھا کہ انگریز یہاں سے چلا جاتا ہے اور مغربی جمہوریت کے نتیجے میں ہم انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہندو تو ہندوستان میں بڑی غالب اکثریت میں تھے۔ اور ہم ان کے ہمیشہ کے لئے غلام ہو جاتے۔ چنانچہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ نے دیوانہ وار کام کیا۔ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کا عرصہ بڑا بھرپور تھا۔ اس وقت ہر مسلم لیگی یہی سمجھتا تھا کہ میں قائداعظمؒ ہوں۔ اگر میں نے کام نہ کیا تو پاکستان نہیں بنے گا۔ ہر ایک نے دن رات کام کیا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ان کے سرخپوش اور کانگریسی مسلمان جو اچھے باضمیر لوگ تھے، وہ ہمارے ساتھ آ گئے۔ ارباب عبدالغفور خاں، جنہیں عبدالغفار خاں کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا، وہ آئے۔ خان بخت جمال خاں، ثمین جان خاں، میاں محمد شاہ، غلام محمد خان لوند خوڑ۔ یہ سب "وقتاً فوقتاً" مسلم لیگ میں آتے رہے۔ یہ تو ایسے لیڈر تھے جنہوں نے جیلیں کاٹی تھیں۔ سرخپوش تحریک کو بنانے والے یہ لوگ تھے۔ یہ سب بڑی زبردست کڑی آزمائش میں سے نکل کے آئے تھے۔ لیکن انہوں نے مسلم لیگ کا مقصد اپنا لیا تھا۔ اس لئے آج بھی مسلم لیگ صوبہ سرحد میں دوسرے تمام صوبوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ اور جب میں کہتا ہوں کہ آپ کو پاکستان طشتری میں ملا اور ہم نے لڑ جھگڑ کے لیا۔ ہم نے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ کیونکہ ہمارا مقابلہ ایک بہت بڑی زبردست سیاسی تنظیم سے تھا۔ ان کو ہم نے عوام میں سیاسی شکست دینی تھی۔ جو بڑی مشکل بات تھی۔ ہندوؤں کی تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ہر ہندو کے پاس "ملاپ" اور "پرتاپ" آتا تھا۔ سارے گاؤں میں وہی پھرتا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ "آناً فاناً" حالات بدل گئے۔ اور ہم نے انہیں شکست دے دی۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے وہاں الیکشن جیتا۔ ان کی منسٹری بنی۔ ہم نے فروری ۱۹۴۷ء میں ان کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ وہ تو ہمیں موٹر لیگ کہتے تھے۔ ہنستے تھے کہ یہ چند خوانین اور ان کے نوکر ہیں۔ چار پانچ روز میں ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے تمام جیلیں بھر دیں۔ جیلوں میں جگہ نہ رہی۔ وہ ہاتھ جوڑتے تھے۔ خدا کے لئے جیل سے نکلو۔ اب تو جیلوں میں جگہ نہیں رہی۔ ہم کہتے تھے، جب تک قائداعظمؒ آرڈر نہیں کریں گے، نہیں نکلیں گے۔ انہوں نے ہمیں بڑی تکلیفیں دیں۔ ہم نے پھانسی گھر جلا دیئے۔ اسی پشاور جیل میں ہم پر فائرنگ ہوئی۔ ہمارے دو آدمی شہید ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام بھی مجھے یاد ہے۔ ظفر۔ تین جون کو آل انڈیا ریڈیو پر قائداعظمؒ نے جو تقریر کی۔ وہ ہم نے جیل میں سنی۔

دوسری شکست ہم نے انہیں ریفرنڈم (۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء) میں دی۔ تیسری شکست ہم نے انہیں ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں دی۔ وہ الیکشن جو یحییٰ خاں نے کرایا۔ اسے سبھی کہتے ہیں کہ بڑا صحیح الیکشن تھا۔ اس میں کوئی دھاندلی نہیں ہوئی تھی۔ انہیں تین سیٹیں ملیں، مسلم لیگ کو نو ملیں۔ اب بھی یہ

تین سیٹوں سے آگے نہیں جائیں گے۔ بلکہ ان میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔ ہاں، اگر مزدور کسان پارٹی ان کی مدد کرے تو یہ تین سیٹیں جیت سکتے ہیں۔ لیکن تین سے آگے یہ نہیں بڑھیں گے۔ انشاء اللہ۔ لیکن ولی خان اور عبدالغفار خاں کا پنجاب میں اتنا چرچا کیا جاتا ہے۔ اور مسلم لیگ جو کہ فاتح جماعت تھی، جس نے انہیں فتح کیا ہے۔ ان حالات میں انہیں فتح کیا ہے جب ان کی منسٹری تھی۔ جب ان کا اقتدار تھا۔ ہمیں ان سے ذاتی پرخاش نہیں۔ نظریے کا معاملہ ہے۔ لیکن پنجاب کے اخبارات ان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ لوگوں کو شک گزرتا ہے کہ شاید صوبہ سرحد میں ایک بار پھر مسلم لیگ کا مخالف نظریہ لوگوں میں آگیا ہے۔

س:۔ یہ بات نہیں۔ دراصل لوگ اپوزیشن مائنڈڈ ہوتے ہیں۔ اور یہ کرتے ہیں ہر حکومت کی مخالفت۔

ج:۔ ہاں، ہم پاکستان توڑنے کی بات نہیں کرتے۔ ہم پاکستان بنانے کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان کو مضبوط کرنے کی بات کرتے ہیں۔

س:۔ توڑنے کی تو وہ بھی بات نہیں کرتے۔

ج:۔ اب تو نہیں کرتے۔ لیکن اگر آج پھر پاکستان میں ریفرنڈم ہو تو وہ پاکستان کے حق میں تو ووٹ نہیں دیں گے۔

س:۔ آپ کے خیال میں ان کا ذہن ابھی تک وہی ہے۔

ج:۔ ذہن تو نہیں ٹوٹتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن خیر، یہ ایسی بات ہے کہ کسی کے دل کا کیا پتہ۔ لیکن ہم جو بات کہتے ہیں، وہ اور ہوتی ہے۔ یہ جو بات کرتے ہیں، وہ اور ہوتی ہے۔ ضیاء سے تو ہم بھی نالاں ہیں۔ مارشل لاء کو ہم بھی نہیں چاہتے۔ لیکن ہم مارشل لاء کو اس لئے نہیں چاہتے کہ مارشل لاء کی جگہ سیاسی عمل ہو تو پاکستان مضبوط ہوگا۔ کیونکہ سیاسی عمل سے ملکی معاملات میں عوام کی شرکت ہوگی۔ تو عبدالغفار خاں کے ساتھ کوئی بات میں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اب وہ اِشوز نہیں رہے۔

س:۔ بقول آپ کے عبدالغفار خاں نے سرحد میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ اور ان کی تنظیم بھی بڑی مضبوط تھی۔ مسلم لیگ تو وہاں بہت بعد میں شروع ہوئی۔ لوگوں میں یہ ذہنی تبدیلی کیسے آئی کہ لوگ جوق در جوق اس طرف آئے۔ جبکہ وہ بھی قرآنی نظام کی بات کرتے تھے۔ اور ان کی تنظیم کا نام ہی "خدائی خدمتگار" تھا۔

ج:۔ انگریز جا رہا تھا۔ ہر مسلمان سوچتا تھا کہ ہمارا کیا مستقبل ہوگا۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ واقعی قائداعظمؒ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ صحیح بات کر رہے ہیں کہ اگر پاکستان نہ بنا اور انگریز اس طرح یہاں سے چلا گیا تو ایسی جمہوریت میں سے مسلمانوں کو کچھ نہیں ملے گا جس میں ہندو غالب اکثریت میں ہوں گے۔ ٹھیک ہے عبدالغفار خان نے کام کیا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ ان کے غلط نظریے کو اپنا لیتے۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ پاکستان تو اب بن کے رہے گا۔ اور ۳ رجون (۱۹۴۷ء) کا اعلانِ آزادی بھی آگیا تو انہوں نے پختونستان کا شوشہ چھوڑ دیا۔ حالانکہ انہوں نے کبھی پختونستان نہیں مانگا تھا۔ یہ تو ہمیشہ کہتے تھے۔ ہندو مسلمان ایک قوم ہیں۔ ایک ہندوستان کی تو وہ تقسیم بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے جب کانگریس نے بھی مان

لیا۔ انگریزوں نے بھی مان لیا کہ ہندوستان کی تقسیم اس نظریے پر ہوگی کہ جہاں ہندو زیادہ ہیں وہ علاقے ہندوؤں کو ملیں گے۔ اور جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہ علاقے مسلمانوں کے ہوں گے۔ اس وقت انہوں نے نئی بات نکالی کہ پختونستان بھی ہونا چاہئے۔ اور یہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے پختونستان کا کبھی نام ہی نہیں لیا تھا۔

س:۔ اور کابل نے۔

ج:۔ نہ کابل نے لیا تھا۔

س:۔ ولی خاں کہتے ہیں کہ جب صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا فیصلہ ہو گیا تو خدائی خدمتگاروں نے مطالبہ کیا کہ پشتونوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ بھارت اور پاکستان کے علاوہ اپنے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت حاصل کر سکیں۔ انگریز وائسرائے نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

ج:۔ وہ تو کانگریس نے بھی رجیکٹ کر دیا تھا۔

س:۔ افغانستان پختونستان کے مسئلے پر سنجیدہ تھا۔

ج:۔ نہیں۔

س:۔ ویسے ہی پروپیگنڈا کرتا تھا۔

ج:۔ ویسے ہی پروپیگنڈا کرتا تھا۔

س:۔ روس کی وجہ سے مجبور ہوگا۔

ج:۔ ان کی اپنی سیاست وغیرہ تھی۔

س:۔ ۶۵ء اور ۷۱ء میں جب بھارت کے ساتھ ہماری جنگیں ہوئیں، کہتے ہیں کہ افغانستان کے بارڈر پہ ہماری فوج نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے مداخلت نہ کی۔

ج:۔ ہاں۔ بلکہ افغانستان کے جو فوجی طورخم کے بارڈر پر ہوتے تھے، وہ ہمارے فوجیوں سے پوچھتے رہتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور وہ پاکستان کے لئے دعائیں کرتے تھے، یا اللہ پاکستان کو فتح ہو۔ پختونستان کے مسئلے پر افغانستان سنجیدہ نہیں تھا۔

س:۔ جب اصولی طور پر طے ہو گیا کہ ریفرنڈم ہوگا تو انہوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔

ج:۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ مسلمان پاکستان کے خلاف ووٹ نہیں دیں گے۔ انہوں نے ریفرنڈم میں باقاعدہ حصہ تو نہیں لیا لیکن لوگوں کو وہاں جانے سے روکتے تھے۔ پولنگ سٹیشنوں پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ ووٹ زیادہ تعداد میں پول نہ ہوں۔ ہر ووٹر پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ بوگس ہے۔ یہ بوگس ہے۔ یہ بوگس ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ پولنگ کی رفتار سست رہے۔ چنانچہ ابتدائی دو تین گھنٹوں کے دوران میں چند ہی ووٹ گذرے۔ رُول یہ تھا کہ اگر کوئی ایسے ہی اعتراض کرتا جائے۔ اور اس کا اعتراض جینوئن نہ ہو تو ایک خاص حد کے بعد اسے ہر اعتراض پر دس روپے فی ووٹ جمع کرانا پڑتے تھے۔ چنانچہ یہ ہر چیلنج ووٹ کے دس روپے جمع کراتے گئے اور اعتراض کرتے گئے۔ جتنے روپے یہ لائے تھے، وہ سارے گورنمنٹ کے کھاتے میں جمع ہو گئے۔

وہ تو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ ہم انہیں شکست پر شکست دیتے چلے گئے۔ پاکستان بننا تھا۔ ورنہ یہ اتنے مضبوط تھے، اتنے مضبوط تھے کہ میں ہمیشہ رات کو سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم ان کو شکست دے چکے ہوں گے۔

س:۔ آپ کے والد انگریز کے زمانے میں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہے۔ پھر بقول آپ کے وہ مسلم لیگ میں آگئے۔ ولی خاں کا مؤقف ہے کہ یہ پولیٹیکل ایجنٹ انگریز کے اشارے پر مسلم لیگ کو سپورٹ کرتے تھے۔

ج:۔ خود ولی خاں کے چچا ڈاکٹر خان صاحب انگریز کی فوج میں تھے۔ انہوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ٹھیک ہے میرے والد انگریز کی ملازمت میں تھے۔ وہ ۱۹۳۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اسلامی حکومت بن رہی ہے، وہ مسلم لیگ میں آگئے۔ قائد اعظمؒ نے جب حکم دیا کہ انگریز کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیئے جائیں تو میرے والد نے سب سے پہلے اپنے خطابات واپس کئے۔ وہ کانگریس کو ہندوؤں کی جماعت سمجھتے تھے۔ اس لئے اس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ باقی خلافت موومنٹ کے زمانے میں وہ کوہاٹ میں افسر مال تھے۔ انہوں نے بڑی خفیہ امداد کی۔ چھپ چھپ کر کی۔ لیکن کی۔ اسلام کے نام پر وہ ہر کام کرنے کو تیار تھے۔ وہ بڑے باعمل مسلمان تھے۔ وہ مسلم لیگ میں اسلام کے نام پہ شامل ہوئے تھے کہ یہ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اسلامی جماعت ہے۔ نماز کا قضا ہونا تو ایک طرف رہا، انہوں نے کبھی تہجد کی نماز بھی قضا نہیں کی تھی۔ خواہ بخار ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بڑے باعمل مسلمان تھے۔

س:۔ قبائلی علاقے میں پٹھانوں نے جو نہرو کے ساتھ کیا اور مردان میں جو گاندھی کے ساتھ ہوئی، ولی خاں کہتے ہیں کہ سب کچھ انگریز کے پولیٹیکل ایجنٹوں کا کیا دھرا تھا۔

ج:۔ پھر انگریز کے اشارے پر ہم جیل بھی گئے؟ کیا بات کرتے ہیں۔ وہ تو قائد اعظمؒ کے متعلق بھی یہی کہتے ہیں۔ جو آدمی انہیں پسند نہ ہو، اس کے متعلق یہ بے سروپا باتیں کہہ دیتے ہیں۔ خود تو یہ ہندوؤں کی جماعت کے ساتھ تھے۔ جو ان کا پریذیڈنٹ ہوتا تھا، اس کو یہ پریذیڈنٹ مانتے تھے۔ ہم نے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل نہیں بنایا تھا۔ لیکن جب یہ بناتے ہیں تو بطلِ حریت ہوتے ہیں۔ جب ہم کرتے ہیں تو انگریز کے تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ قائد اعظمؒ کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ انگریز کے ایجنٹ ہو سکتے تھے۔ اب انہوں نے قائد اعظمؒ کے متعلق کہہ دیا۔ ان کا تو ایسا کردار تھا جو سورج کی طرح نمایاں تھا۔ جب آپ کے پاس کچھ نہ ہو تو آپ کوئی بات کر دیں۔ دوسرا اس کی صفائی کرتا پھرے۔ لوگ کہیں گے، کوئی تو بات ہو گی۔ کہتے ہیں، میں نے تحقیق کی۔ جب نہرو متحدہ ہندوستان کا پرائم منسٹر بنا، سب چیزیں اس کے سامنے تھیں۔ اس کے پاس تو سب کاغذات موجود تھے۔ انہوں نے تو کبھی انکشافات نہ کئے۔ وہ ایسی چیزیں نکال کر پاکستان کی تحریک کو ختم کر سکتا تھا۔ لیکن اس کو تو نظر نہ آئیں۔ اور بھی کسی کو نظر نہ آئیں۔ اب انہیں نظر آگئیں۔ حالانکہ اگر انگریزوں نے کچھ بھی مدد کی تو کانگریس کی کی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن تو بالکل نہرو کا دوست تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو کے ساتھ تعلقات کے تذکرے آپ پڑھ ہی رہے ہیں۔ اس نے ہندوستان کو فیروز پور کا ضلع دیا۔ گورداسپور کا

ضلع دیا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہمارا فوجی سامان نہ دیا۔ بڑی مشکلات پیدا کیں۔ انگلستان کی لیبر گورنمنٹ کانگریس کی ہمنوا تھا۔ کبھی آپ ویول کی کتاب پڑھیں، جو ہندوستان میں وائسرائے تھا۔ وہ تو لارڈ پیتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ کرپس کے متعلق اعلانیہ لکھتا ہے کہ یہ بے ایمان تھے۔ بے ایمانی کرتے رہے۔ جو بات ہوتی تھی، وہ خود جا کے گاندھی کے کیمپ میں پہنچا دیتے تھے۔ اس نے ان کے لئے BISGRACEFULLY DISHONEST کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

س :۔ غفار خان مسلم لیگ کو گالی دیتے ہیں۔ لیکن خود کو کہتے ہیں کہ ہم نے انگریز کو ہندوستان سے نکالا۔

ج :۔ ٹھیک ہے۔ انہوں نے سیاسی بیداری پیدا کی۔ بڑا اچھا کردار ادا کیا۔ لیکن مسلم لیگ والے کہاں سے آتے؟ انہی کے ساتھی تھے۔

س :۔ انہوں نے جو سیاسی بیداری پیدا کی، وہ پورے ہندوستان میں پیدا کی یا صرف صوبہ سرحد میں۔

ج :۔ صرف صوبہ سرحد میں۔

س :۔ انگریز تو پورے ہندوستان سے گیا۔

ج :۔ یہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے نکالا۔

س :۔ لیکن کریڈٹ تو پورے برِصغیر کا لیتے ہیں۔

ج :۔ یہ غلط ہے۔

س :۔ اس حد تک تو درست ہے کہ انہوں نے سرحد میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

ج :۔ میں تو ہمیشہ ان کو یہ کریڈٹ دیتا ہوں۔ یہ ان کا کارنامہ ہے۔ لیکن مسلمان قوم سے انہوں نے اپنے کو الگ کر لیا۔ اس وقت تو متحدہ ہندوستان میں یہ ایک قوم مانتے تھے۔ اب پاکستان میں چار قوموں کا ذکر کرتے ہیں۔

س :۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے مسلم لیگ سے مدد مانگی جو اس نے نہ دی؟

ج :۔ کیا مدد مانگی تھی۔ یہ تو سول نافرمانی کی تحریک میں کانگریس کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ مسلم لیگ سے کیا مدد مانگی تھی؟ یہ ایسے ہی ایک بات ہے۔ بھئی اگر مسلم لیگ کے کچھ لیڈروں سے کوئی کوتاہی ہوئی تو آپ چلے جائیں ہندو کے پاس۔ یہ تو کوئی بات نہیں۔

س :۔ خان قیوم مرحوم تو ان پر ہندو سے پیسے لینے کا الزام بھی لگاتے رہے؟

ج :۔ وہ تو ابوالکلام آزاد کی "انڈیا وِنز فریڈم" پڑھ لیں۔

س :۔ ولی خان غدار ہیں یا محب وطن؟

ج :۔ ہم تو کبھی ان کے قریب نہیں رہے۔ جتنا آپ انہیں جانتے ہیں۔ اتنا ہی میں جانتا ہوں۔

س :۔ جب قائد اعظمؒ گورنر جنرل آف پاکستان کی حیثیت سے اپریل ۱۹۴۸ء میں صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو ولی خان وغیرہ کا کہنا ہے کہ اتمان زئی میں غفار خان سے ان کی ملاقات ہو رہی تھی، قیوم خان

نے ملنے نہ دیا۔

ج :۔ آپ یقین کر سکتے ہیں کہ قائداعظمؒ کو کوئی روک سکتا تھا۔ قائداعظمؒ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ قیوم خان کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ قائداعظمؒ کو یہ کہنے کی جرأت کر سکتا۔ اور اگر کہتا تو وہ مان جاتے۔ یہ نہیں تھا کہ قائداعظمؒ غفار خان سے ملے نہیں تھے۔ ان سے ملے تھے۔ ان کے ساتھ باتیں بھی کی تھیں۔ اسمبلی (کراچی) میں بھی ان سے ملے تھے۔

س :۔ سنا ہے گورنر ہاؤس پشاور میں مذاکرات ہوتے رہے؟

ج :۔ ہاں ہوتے رہے۔ اگر قیوم خان ایسی بات کرتے تو قائداعظمؒ بتا سکتے تھے۔ اخبارات میں بیان دے سکتے تھے۔ خط لکھ سکتے تھے کہ قیوم خان نے تمہارے تک پہنچنے نہیں دیا۔ لیکن انہوں نے تو عبدالغفار خان سے ملاقات کی۔

س :۔ وہ قائداعظمؒ پر الزام دھرتے ہیں کہ انہوں نے سرحد میں ڈاکٹر خان کی منتخب وزارت برطرف کر دی تھی؟

ج :۔ بڑا اچھا کیا آپ نے یہ سوال مجھ سے پوچھا۔ میں کہتا ہوں کہ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں یہ جیت گئے۔ ۱۹۴۷ء میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ۴۵ء میں کانگریس کا سلوگن متحدہ ہندوستان تھا۔ ۴۷ء میں کانگریس نے خود پاکستان کا قائم ہونا تسلیم کر لیا۔ اس وقت ریفرنڈم ہوا تھا جس میں پاکستان کے حق میں زبردست اکثریت نے فیصلہ دیا۔ تو وہ مینڈیٹ (اختیار)، جو انہیں ۴۵ء کے الیکشن میں ملا تھا۔ ریفرنڈم کے اس فیصلے کے بعد WITHDRAW ہوگیا۔ تو چاہیے یہ تھا کہ اس اسمبلی کو ڈسمس کر کے نئے الیکشن کرائے جاتے۔ اور وہ فیصلہ صحیح اور آئینی ہوتا۔ لیکن قائداعظمؒ نے اسمبلی ڈسمس نہ کی، صرف ان کی حکومت ڈسمس کی اور اس وقت کی جب وہ (ڈاکٹر خان وغیرہ) پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے نہیں آئے۔ اب کہتے ہیں کہ انگریز گورنر نے انہیں روکا کہ مت جاؤ ورنہ تمہارے خلاف بلوہ ہو جائے گا۔ حالانکہ لوگ تو خوشی کے موڈ میں تھے۔ اگر یہ پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دیتے۔ لوگ تو بڑے خوش ہوتے، ہمیں تو بڑی خوشی ہوتی، ہم تو چاہتے تھے کہ یہ جھنڈے کو سلامی کریں۔ کیونکہ جھنڈا تو ہماری آزادی کی علامت تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب میں پہلی مرتبہ اٹک کے پل پر سے گزرا۔ وہاں اٹک کے قلعہ پر انگریزوں کے یونین جیک کی جگہ پاکستان کا جھنڈا دیکھ کر خوشی سے میرے آنسو نکل آئے اور کئی میل تک میرے آنسو ہی نہ تھمے کہ خدا تعالیٰ نے ہماری زندگی میں ہی ہمیں پاکستان دکھایا۔ بڑے فخر کی بات تھی۔ ہمیں تو بڑی خوشی ہوتی اگر یہ پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے آتے۔ ہم اس خوشی میں ان سب کو معاف کر دیتے۔ یہ پاکستان کے جھنڈے کو سلامی دینے نہ آئے تو ان کی منسٹری کا ڈسمس ہونا قدرتی بات تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بڑی فاش غلطی ہوئی کہ اسمبلی کو نہ توڑا گیا۔ اس اسمبلی کو توڑ کر نئے الیکشن کرانے چاہئیں تھے۔

س :۔ اگر سرحد میں اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرائے جاتے تو یہ ہار جاتے؟

ج :۔ اوہ بالکل۔ کھڑے ہی نہ ہوتے۔ اگر کھڑے ہوتے تو بڑی طرح شکست کھاتے۔ اس وقت مسلم لیگ ایک فاتح جماعت تھی۔ اسی نے انہیں سول نافرمانی میں زبردست شکست دی تھی۔ اس نے انہیں ریفرنڈم میں زبردست شکست دی تھی۔ اس لیے مسلم لیگ سو فیصد آ جاتی۔ تو پھر بعد میں قیوم خان نے اپنی وزارتِ اعلیٰ کے زمانے میں جو جھ

سات سرخپوش اسمبلی ممبران توڑے تھے۔ اس کی نوبت نہ آتی اور ان ممبران اور مسلم لیگی ورکرز کے درمیان جو گڑبڑ پیدا ہوئی وہ بھی پیدا نہ ہوتی مسلم لیگ اکٹھی رہتی۔ اگر مسلم لیگ یہاں سرحد میں اکٹھی رہتی تو خان قیوم کو دسمبر ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں دھاندلی کی کوئی ضرورت نہ رہتی۔ اگر ہم یہاں متحد رہتے تو پنجاب میں دولتانہ اور ممدوٹ میں بھی صلح کرا دیتے۔ بس سرحد اسمبلی کو ڈسمس کر دینا چاہیے تھا۔

س :۔ گورنر جنرل نے تو جذبۂ خیر سگالی کے تحت اسمبلی نہیں توڑی ہوگی کہ شاید اب بھی یہ سمجھ جائیں۔ صرف حکومت برطرف کی۔ وہ بھی اس وقت جب انہوں نے پاکستانی جھنڈے کو سلامی نہیں دی؟

ج :۔ وہ تو فراخدلی تھی۔ لیکن ایسی باتوں میں فراخدلی بڑی نقصان دہ ہوتی ہے۔

س :۔ انہوں نے یہ اقدام شاید اس لیے نہ کیا ہو کہ اس طرح دوسرے صوبوں میں الیکشن کرانا پڑتے؟

ج :۔ مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب کی اسمبلیوں سے مینڈیٹ تو واپس نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا مینڈیٹ پاکستان کے حق میں ثبت کیا تھا۔ جبکہ یہاں ریفرنڈم سے اسمبلی کا مینڈیٹ خود بخود واپس ہو گیا تھا پھر بھی اگر دوسرے صوبوں میں نئے الیکشن ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔

س :۔ لیکن اس وقت جب لٹے پٹے اور المناک واقعات وحادثات سے دوچار مہاجرین کا ایک سیلاب پاکستان کی طرف آرہا تھا۔ اور مہاجرین کی آمد کا یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہیں ملک اس پرابلم تلے ہی دب کر ختم نہ ہو جائے۔ ایسے میں انتخابات کا انعقاد کیسے ممکن تھا؟

ج :۔ پنجاب میں تو اس وقت الیکشن ناممکن تھے۔ سندھ میں بھی نہیں کرائے جا سکتے تھے۔ کیونکہ کھوکھرا پار سے بھی مہاجرین آرہے تھے۔ ایسٹ پاکستان میں بھی ایسے ہی حالات تھے۔ لیکن صوبہ سرحد میں الیکشن ہو سکتے تھے۔ اور ہونے بھی چاہئیں تھے۔

س :۔ آپ نے کہا ہے کہ ہمارے مقابلے میں پنجاب میں ولی خان وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ سیٹیں کم لیتے ہیں۔ دراصل پیپلز پارٹی کے ساتھ جب آپ شریک اقتدار ہو گئے۔ اسی وقت یہ تاثر ابھرا جو اب تک قائم ہے کہ سرحد میں اب مسلم لیگ ختم۔

ج :۔ یہ تاثر اس سے پہلے کا ہے۔ عبدالغفار خان لاہور جاتے تھے تو اخبارات یہ تاثر دیتے کہ آدمی تو یہی ہے۔ باقی تو ایسے ہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے قربانیاں دیں۔ بھئی مسلم لیگ میں جو لوگ آئے۔ وہ سرخپوشوں کے بہترین ورکر تھے۔ جنہوں نے خلافت موومنٹ کے زمانے سے لے کر ہر قربانی دی۔ سخت جان جیسے، تمین جان جیسے۔ کتنے آدمی گنواؤں۔ غلام محمد خان لوندخوڑ کو لیں۔ ۳۰ء کی تحریک میں انگریزوں نے اس کا گھر جلا دیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے جس کا گھر جلایا گیا تھا جس کو جیل سے بید مارے جاتے تھے۔ غلام محمد خان لوندخوڑ کا بڑا شاندار کردار ہے۔ ۳۰ء کی سول نافرمانی تحریک میں اس نے جیل کاٹی۔ بڑا زبردست آدمی تھا۔ یہ مسلم لیگ میں آیا۔ ارباب عبدالغفور خان آئے۔ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ نے قربانی نہیں دی۔ مسلم لیگ پہلے تو تھی نہیں۔ جب بنی اور قربانی کا وقت آیا تو وہ بھی ہم نے دی۔ ہم نے جیل بھر دیے۔ سب کچھ کیا۔ ان سے ریفرنڈم جیتا۔ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ میں سرحد سے سو والنٹیئر لے کے گیا وہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کی شورش کا زمانہ تھا۔ ہم مارے بھی جا سکتے تھے۔ ہم نے ہر قسم کا خطرہ مول لیا۔ سب کچھ کیا۔ وہ کون سے کام ہیں جو یہ کر سکتے ہیں اور ہم نے نہیں کیے۔ لیکن ہمارے اپنے دوست ہی ہمیں حقیر سمجھیں

توہین کا کیا کیا جائے۔ یہ سمجھنا کہ ہم صوبہ سرحد کے نمائندے نہیں، بڑا ظلم ہے۔ کہتے ہیں کہ اصل نمائندے وہ ہیں چونکہ وہ پختونستان چاہتے ہیں، ہم پختونستان نہیں چاہتے۔ پاکستان چاہتے ہیں۔ کوئی بھی آئے گا یہی کہے گا کہ سرخپوش بڑے ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو انہیں میدان میں شکست دی ہے۔ ایک بار نہیں بار بار۔ اب کتنی بار انہیں شکست دیں روز روز تو شکست نہیں دی جا سکتی۔

س :۔ آپ لوگوں کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ مسلم لیگ والے بک جاتے ہیں اور وہ لوگ با اصول ہیں؟

ج :۔ قیوم خان کے زمانے میں سرحد اسمبلی میں ان کے سات آدمی نہیں بکے تھے۔ یہ خود انڈین نیشنل کانگریس کے آگے نہیں بکے تھے۔ یہ ان کے تنخواہ دار نہیں تھے۔ ان کا پیسہ ان کے پاس نہیں آتا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے انڈیا ونز فریڈم میں نہیں کہا کہ کانگریس انہیں پیسے دیتی تھی۔ یہ بات بھی ہمارے خلاف جاتی ہے کہ ہم ہندو کے آگے کیوں نہیں بکے۔ خوفِ خدا کرنا چاہیے کہ کس چیز کا ہم پر الزام لگاتے ہیں۔ ہم انگریز کے آگے بھی نہیں بکے۔ مونٹ بیٹن کو ہم نے تو گورنر جنرل نہیں بنایا تھا۔

س :۔ تازہ ترین تاثر بھٹو صاحب کے زمانے میں ابھرا کہ دیکھو نیپ والے ڈٹ گئے۔ مسلم لیگ والے ساتھ مل گئے؟

ج :۔ اگر یہ بھی ہوتا تو ٹھیک تھا لیکن ہمارے خلاف بہت پہلے کا سلسلہ ہے۔

س :۔ پنجاب کے عوام میں یہ بالکل پاپولر نہیں، آپ فکر نہ کریں۔

ج :۔ لیکن آپ کا انٹیلیکچوئل طبقہ جو ہے۔ آپ کے اخبار والے جو ہیں۔ وہ تو ان کے حق میں لکھتے ہیں۔

س :۔ جن دنوں آپ لوگوں نے بھٹو صاحب کی حکومت جائن کی، یہ خبر بھی گرم تھی کہ اگر آپ حکومت میں نہ جاتے تو نیپ چلی جاتی؟

ج :۔ ان کی باتیں یہیں جانیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن بھٹو صاحب ان تین آدمیوں کو لے کے کیا کرتے۔

س :۔ ولی خان وغیرہ کے بارے میں آپ کی رائے بجا۔ لیکن بقول ولی خان اگر وہ ایسے ہی ہیں تو پھر ہر حکومت انہیں وزارتوں کی پیش کش کیوں کرتی رہی؟

ج :۔ ہر حکومت نہیں مارشل لاء کی حکومتیں کیا کرتی ہیں۔

س :۔ ایوب خان نے بھی ایسی پیش کش کی؟

ج :۔ ایوب خان تھوڑا ان کو زیادہ جانتا تھا۔ لیکن ان کو پیش کشیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تو اس حکومت نے کیں۔

س :۔ اور سکندر مرزا نے بھی۔

ج :۔ اس نے سوچا ہو گا۔ توڑ کے لے آئیں گے۔ جیسے ڈاکٹر خان کو لے آئے تھے۔ وہ تو ورغلانے کی بات ہے۔

س :۔ ڈاکٹر خان صاحب کو مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنانا اچھا اقدام تھا۔ حالانکہ وہ بھی سرخپوش تھے۔

ج :۔ ایک آدمی اپنے ساتھ آتا ہے تو اسے کیوں نہ لایا جائے؟

س :۔ لیکن وہ مسلم لیگ میں تو نہیں آئے۔ ری پبلکن میں تھے؟

ج :۔ ہاں۔

س :. قیوم خان بھی پہلے انہی سرخپوشوں کے ساتھی تھے؟

ج :. ہاں۔

س :. وہ اس وقت کانگریس چھوڑ کے مسلم لیگ میں آئے جبکہ وہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ انکا کانگریس یا سرخپوشوں سے اصولی اختلاف ہوا یا ذاتی۔

ج :. اب تو وہ مرگئے ہیں۔

س :. آف دی ریکارڈ ہی سہی۔

ج :. آف دی ریکارڈ تو کوئی بات نہیں ہوتی۔

س :. بعض کہتے ہیں کہ خلوصِ نیت سے آئے تھے۔ بعض کا کہنا ہے کہ پاکستان کا قیام یقینی دیکھ کر آگئے۔

ج :. دوسری شملہ کانفرنس کے ایک مہینے کے بعد مسلم لیگ میں آگئے۔ جو بھی سلسلہ تھا انہوں نے اچھا کام کیا۔ ایک آدمی کام کرے تو ٹھیک ہے۔ نیت کا کیا معلوم؟

س :. ان کی چیف منسٹری کے زمانے میں وہاں ڈویلپمنٹ تو بہت ہوئی۔

ج :. کام تو ہوا۔ لیکن جمہوریت نہیں تھی۔ اب میں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔

س :. ذاتی نہیں قومی، ایسے حقائق ریکارڈ پر آنے چاہئیں۔

ج :. ان کی اب موت واقع ہو چکی ہے۔

س :. ایسے واقعات قومی امانت ہوتے ہیں۔

ج :. یہ تو تھا کہ ہم سب کو زبردستی شکست دلائی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے الیکشن ہی نہیں ہوں گے۔ ہمارے پاس مسلم لیگ کے ٹکٹ بھی تھے۔ میرے مقابلے میں انہوں نے غیر معروف اور ان پڑھ آدمی کو کھڑا کر دیا میں اس پر اس لیے نہیں بولنا چاہتا کہ میں اس میں ذاتی طور پر ملوث ہوں۔

س :. آپ ذاتی طور پر ملوث ہیں۔ پھر تو بات اور زیادہ معتبر ہو جائے گی۔

ج :. پھر کسی وقت کریں گے۔

س :. انتخابات میں دھاندلی کا آغاز پھر وہیں سے ہوا۔

ج :. وہیں سے ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دھاندلی نے قیوم خان سے پاکستان کا وزیر اعظم بننے کا چانس چھین لیا۔ ورنہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور پاکستان کے وزیر اعظم بن جاتے۔ ان کا رویہ بڑا غیر جمہوری ہوتا تھا۔ الیکشن میں دھاندلی تو بعد کی بات ہے۔

س :. وزیر اعظم نہ بن سکنے کے سلسلے میں تو بعض لوگ دولتانہ کو بھی بد قسمت سمجھتے ہیں۔

ج :. دولتانہ بے چارے نے کبھی ایسی غیر جمہوری باتیں نہیں کیں۔

س :. ان کا اپنا انداز تھا۔

ج :. ہا ہا ہا ہا۔

س :. پیر مانکی شریف سے قیوم خان کی چپقلش کیسے شروع ہوئی؟

ج :. ابتداً ان کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی۔

س : ۔ وہ کیا قصّہ ہوا۔

ج : ۔ یہی کہ مسلم لیگ پر کس کا کنٹرول ہو۔ قیوم خان اپنا چاہتے تھے۔ پیر صاحب چاہتے تھے ان کا ہو۔ بس یہ ایک بڑی ہی بدقسمتی تھی۔ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں تھی۔ لیکن قیوم خان کی ان کے ساتھ سیاسی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ رقابت سمجھ لیں۔ بہرحال اس سے مسلم لیگ کو نقصان بہت پہنچا۔

س : ۔ پیر مانکی شریف مسلم لیگ کا کوئی عہدہ نہ رکھنے کے باوجود خاصے با اثر تھے؟

ج : ۔ پیر مانکی شریف کا بڑا اثر تھا۔ دراصل سرحد میں ہمیں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی، جو بڑی موثر ہو۔ کیونکہ ادھر عبدالغفار خاں تھا۔ قائدِ اعظمؒ تو ملک گیر شخصیت تھے۔ ہم نے سوچا کہ عبدالغفار خان کے مقابلے میں مرکزی شخصیت کے طور پر پیر مانکی ٹھیک رہیں گے۔ نفسیاتی جنگ میں وہ بہت کام آ سکتے تھے۔ ایک تو ان کی پرسنیلٹی بہت تھی۔ دوسرے پاکستان سے عشق اور اسلام سے شیفتگی بہت تھی۔ پیری مریدی کا سلسلہ تو تھا ہی۔ ان کی بنی بنائی شخصیت تھی۔ انہوں نے کام بھی بڑا اچھا کیا۔ بڑے خلوص سے کیا۔ بڑی جانفشانی سے کیا۔ نوجوان تھے، ہماری عمر کے ہی تھے۔ بڑے اچھے اور پاک آدمی تھے۔ ارباب عبدالغفور بھی ان کے گروپ کے تھے۔ یعنی سب دوست تھے۔ پیر مانکی شریف بڑا ہی اچھا آدمی تھا۔ ۶۲ء میں یا ۶۳ء میں یا ۶۴ء میں ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے۔ پاکستان کو تو اُن کی موت سے بڑا ہی نقصان پہنچا۔

س : ۔ اور ثمین جان خان

ج : ۔ مردان کے تھے۔ عبدالغفار خان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ مسلم لیگ میں آئے۔ ۴۵ء سے سرحد صوبہ مسلم لیگ کے صدر چلے آ رہے تھے۔ پاکستان بنا قیوم خان سرحد کے وزیر اعلیٰ ہوئے تو اسی ثمین جان خان کو بولنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اچھے وکیل تھے۔ بہت شاندار مقرر تھے۔ فوت ہو چکے ہیں۔ کام انہوں نے بہت کیا۔

س : ۔ خان بخت جمال خان بھی عبدالغفار خان کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے؟

ج : ۔ ہاں۔ سرخپوشوں سے ٹوٹ کر مسلم لیگ میں آئے تھے۔ پھر صوبہ سرحد مسلم لیگ کے صدر چنے گئے۔ انہوں نے بڑا کام کیا۔ ویسے بھی لمبا قد تھا۔ خوب صورت آدمی تھے۔ چہرے پر سفید داڑھی۔ بخت جمال بڑے اچھے سیاسی ورکر تھے۔ بہت کام کیا۔

س : ۔ کام کی دھن تو اس وقت ہر ایک میں سما چکی تھی۔

ج : ۔ ہاں، کس کس کا نام لوں۔ لیکن ایک آدمی کا میں نام ضرور لینا چاہوں گا۔ اور وہ تھے۔ ارباب عبدالغفور خان۔ وہ تحریک خلافت میں رہ چکے تھے۔ پھر سرخپوش تحریک میں عبدالغفار خان کے دست راست بن گئے۔ عبدالغفار خان کی طرح دراز قد تھے۔ میرے خیال میں وہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ مسلم لیگ میں آ گئے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو اس وقت وہ مسلم لیگ میں تھے۔ اور بڑے سرگرم۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرخپوشوں کا زوال اس وقت شروع ہو گیا جب یہ شخص مسلم لیگ میں آیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے لیے بڑا ہی زبردست کردار ادا کیا۔ انتھک آدمی تھے۔ دن رات کام کرتے۔ دفتر میں ہی بیٹھے تھے۔ وہیں سوتے۔ وہی ایک طرح سے ان کا گھر تھا۔ مسلم لیگ تھی اور وہ تھے۔ لڑنا تو ان کا کام تھا۔ سول نافرمانی کی۔ جیل گئے اور وہاں بھوک ہڑتال کر دی۔ پھانسی گھر جلوا دیے۔ ہم پر فائرنگ بھی ہوئی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایجی ٹیشن کیا چیز ہے۔ ارباب عبدالغفور ایک جینئس تھے۔

میں نے اپنی زندگی میں اس قدر انتھک کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ دن رات کام کرتے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ آرام بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے کارکن کی حیثیت سے جس شخص نے متاثر کیا وہ ارباب عبدالغفور ہی تھے۔ میں نے کام کرنا بھی انہی سے سیکھا۔ میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ میں اُن کے ساتھ دوروں پر بھی جاتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کوئی ڈرائیور نہیں تو میں موٹر چلاتا تھا۔ یہ مجھے بیرسٹر صاحب کہہ کے مخاطب ہوتے تھے۔ بنوں باڈیرہ اسماعیل خاں وغیرہ سے ہم واپس آ رہے ہوتے تو مجھے پتہ ہوتا تھا کہ جب پشاور بیس میل دور رہ جائے گا تو یہ اگلے دورے کا پروگرام بنائیں گے کہ کل صبح اس پر بھی نکل جائیں۔ چنانچہ جب پشاور بیس میل رہ جاتا تو کہتے۔ "بیرسٹر صاحب! اب اگلا دورہ کہاں سے شروع کیا جائے؟" میں کہتا: "ارباب صاحب! ابھی تو دس روز بعد ہم واپس آ رہے ہیں۔ ایک دن تو آرام کریں" کہتے: "نہیں نہیں، پروگرام بنالیں۔ تسلسل ٹوٹ جاتا ہے"۔ بعض اوقات میں کہتا۔ "اب آپ کسی اور کو لے جائیں۔ ارباب عبدالغفور خان بڑے ہی انتھک آدمی تھے۔ اس شخص نے بڑا ہی کام کیا۔

سرحد میں ارباب محمد جہانگیر خان جو وزیر ہیں۔ اور جنرل ارباب جہاں زیب کے دادا ارباب دوست محمد خان ارباب عبدالغفور خان کے نانا تھے۔ ارباب محمد جہانگیر کا گھرانہ بھی مسلم لیگی تھا۔

س :۔ ارباب صاحب مسلم لیگ کے عہدیدار بھی تھے۔

ج :۔ ارباب عبدالغفور کے پاس کوئی عہدہ نہ ہوتے ہوئے بھی سب عہدے تھے۔ جب آدمی کام ہی اس قدر کرے تو اسے کسی عہدے کی ضرورت نہیں رہتی۔

س :۔ پھر بھی اس قدر تندہی، اس قدر لگن، اس قدر انہماک۔ بڑے بے لوث تھے۔

ج :۔ وہ پرسنیلٹی ہی ایسی تھی۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ایک جینئس تھے۔ وہ ایک سیاسی دماغ تھے۔ ہر لمحہ وہ اسی سوچ میں رہتے تھے۔ اور کسی بات میں دلچسپی نہیں۔ ۲۴ گھنٹے کام کیا۔ انرجیٹک بہت تھے۔ چونکہ ان میں کیپاسٹی زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے زیادہ کام کیا۔ سرحد میں پاکستان کے لیے ان کی کنٹری بیوشن سب سے زیادہ تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ارباب عبدالغفور نہ ہوتے تو پاکستان نہ بنتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل فرمانا تھا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر وہاں ارباب عبدالغفور خان کی وہاں قیادت نہ ہوتی تو صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اتنی فعال نہ ہوتی۔ لیکن وہ پاکستان جسے بنانے میں انہوں نے اتنی جان ماری۔ وہاں انہیں آٹھ سال تک خواہ مخواہ جیل میں رکھا گیا۔

س :۔ ہیں!

ج :۔ وہ عبدالقیوم خان کو پسند نہیں تھے۔

س :۔ اوہو!

ج :۔ پھر بھی ارباب عبدالغفور نے اف تک نہ کی۔

س :۔ ان کے خلاف کیا کیس بنایا گیا؟

ج :۔ کون سا کیس ان کے خلاف بن سکتا تھا۔ بس سیکورٹی پر نظر وغیرہ کر دیا۔ پیر صاحب مانکی شریف کو تو وہ جیل میں ڈال نہیں سکتے تھے۔

س : ۔ ارباب عبدالغفور نے بقول آپ کے پاکستان کے لیے اتنی جدوجہد کی ۔ پھر انہیں ذاتی پسند ناپسند کے حوالے سے آٹھ سال جیل کاٹنا پڑی ۔ آپ تو ان سے ملتے رہے ہوں گے ۔ انہوں نے اس انفرادی فعل کے ردعمل میں کبھی سرزمین پاکستان کو برا بھلا کہا ؟

ج : ۔ نہیں ۔ میں نے بتایا اف تک نہیں کی ۔

س : ۔ یہ بھی نہیں کہا کہ پاکستان کو کچھ ہو جائے ۔

ج : ۔ نہیں ، یہ بالکل نہیں کہا کہ پاکستان کو کچھ ہو جائے ۔

س : ۔ یا یہ غلط بنا ؟

ج : ۔ بالکل نہیں کہا ۔

س : ۔ نہ گالی دی ۔

ج : ۔ نہ پاکستان کو گالی دی ۔

س : ۔ یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ہم نے لوگوں کو کسی ذاتی نقصان یا ذاتی پسند یا ناپسند پر اس نچلی سطح پر اترتے دیکھا کہ وہ پاکستان کے وجود کو بھی زیر بحث لے آتے ہیں اگرچہ وہ تعداد بہت کم ہے ۔ اس حوالے سے ارباب عبدالغفور خان قابل ستائش شخصیت ہیں ۔

ج : ۔ بالکل جی ۔

س : ۔ اخیر تک مسلم لیگی رہے ۔

ج : ۔ اخیر تک مسلم لیگی رہے ۔ پھر انہوں نے افغان جرگہ بھی بنایا ہوا تھا ۔ پھر یہ تھا کہ وہ لاتعلق سے ہو گئے تھے ۔ ایک سال پہلے میری ان سے آخری ملاقات ہوئی ۔ میں ان کے پاس گیا ۔ میں نے کہا ارباب صاحب ! آپ پھر باہر نکلیں ۔ پاکستان کو آپ کی پھر ضرورت ہے ۔ کہنے لگے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں ۔ میں نے کہا ، کوئی بات نہیں ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں صرف اسلام کی خدمت کے نعرے پر نکل سکتا ہوں ۔ سیاسی نعرے پر نہیں اسلام کے لیے جو کچھ ہو سکے گا ، کروں گا ۔ اگر ہم ان کو کھینچ لاتے تو ایک بار پھر لوگوں میں حرکت کی لہر دوڑ جاتی ۔ لیکن اس ملاقات کے چند ماہ بعد ہی وہ وفات پا گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

ان کے جنازے پر بہت لوگ آئے ۔ مسلم لیگی بھی اور نیپ والے بھی ۔ مسلم لیگیوں کے دل میں ان کے لیے بڑا ہی احترام تھا ۔ سب کہتے تھے ہمارا آدمی گیا ہے وہ ایک محترم شخصیت تھے ۔ ارباب عبدالغفور بڑے کیریکٹر کے انسان تھے ۔

س : ۔ سرحد میں مسلم لیگیوں کی یہ چپقلش کافی نقصان دہ ثابت ہوئی ۔

ج : ۔ بہت نقصان ہوا ، بہت نقصان ہوا ۔ ہم نے سرخپوشوں کو توڑ دیا تھا ۔ ہم میں اختلافات کی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ طے نہ ہو سکتی ۔ قیوم خان ذرا جابر ٹائپ کے آدمی تھے ۔ کوئی اختلاف برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے ۔ اس سے بڑا نقصان ہوا ۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی یہاں مسلم لیگ کی حکومت ہوتی ۔ بلکہ مارشل لا ہی نہ آتا ۔ دیکھئے ، ان چند اختلافات نے ہی تو مسلم لیگ کو کمزور کیا ۔ پنجاب میں دولتانہ ممدوٹ یہاں سرحد میں قیوم خان اور پیر مانکی شریف یا جس کا بھی کہہ لیں ۔ کبھی میں ہوا ۔ کبھی اور کوئی ۔ ورنہ کوئی پارٹی مسلم لیگ کا سامنا ہی

نہیں کر سکتی تھی۔

س : ۔ مسلم لیگیوں کے ساتھ قیوم خان کے اختلافات کیونکر ہوئے ؟

ج : ۔ قیوم خان تو سرخپوش بھی تھے ۔ سب کچھ تھے ۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس چیز کو سامنے لایا جائے ۔

س : ۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے ۔

ج : ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے ۔ پھر تو میرے اور قیوم خان کے درمیان بھی اختلافات شروع ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد سرحد اسمبلی میں سرخپوشوں کے چھ سات اسمبلی ممبران فلور کراس کر کے مسلم لیگ میں آگئے ۔ اس وقت اسمبلی ممبر کو ایم ایل اے کہتے تھے ۔ وہ آتے تو عجب دو عملی شروع ہو گئی ۔ مسلم لیگی ورکروں کے ساتھ وہ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے ۔ ہم قیوم خان سے کہتے تھے کہ وہ اوپر اوپر سے آپ کے ساتھ ہیں ۔ باقی تو وہ تمام کام سرخپوشوں کے لیے کر رہے ہیں ۔ میں سرحد صوبہ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا ۔ اس لیے کارکن میرے پاس آتے تھے ۔ کہتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں سرحد میں ڈاکٹر خان کی حکومت تھی ۔ ہماری کمر ہوتی تھی اور سرخپوشوں کے ڈنڈے ہوتے تھے ۔ اب پاکستان بن گیا ہے تو بھی ہماری کمر ہے اور ان کے ڈنڈے ہیں ۔ یہ کیا تماشا ہے ۔ ان باتوں پر قیوم خان کہتے تھے ۔ میں کیا کروں ۔ وہ ممبرانِ اسمبلی ہیں ۔ پھر یہ بھی تھا کہ جب مسلم لیگی کارکن جاتا تھا ۔ تو وہ ایک طرح سے فخریہ انداز میں کہتا تھا کہ پاکستان میں نے بنایا ہے ۔ بات تھی بھی صحیح ۔ لیکن سرخپوش انہیں جھک کے سلام کرتے تھے ۔ خان قیوم خان مسلم لیگی ورکروں کے مقابلے میں انہیں ترجیح دیتے تھے ۔ اس بات پر ہی ہمارا آپس میں تنازعہ ہوتا گیا ۔ جو بڑھتا گیا ۔ بڑھتا گیا ۔ کیونکہ سرخپوشوں کے تمام روابط قدرتی طور پر قیوم خان کے ساتھ تھے ۔ پھر جب عبدالغفار خان باہر نکلے تو کچھ لوگ پھر ان سے مل گئے ۔ لالہ ایوب وغیرہ ۔ کچھ رہے بھی ۔ زندگی بھر کی دوستیاں کہاں ٹوٹتی ہیں ۔ اور قیوم خان بھی ان کو سوٹ کرتے تھے ۔

س : ۔ قیوم خان کی ان سے دوستی تو بہت ٹوٹی ۔

ج : ۔ کیا ٹوٹی ؟ جو آ گئے وہ ان کے ساتھ تھے ۔ جو نہیں آئے ان کے ساتھ ٹوٹی ۔

س : ۔ اُن کے زمانے میں سرخپوشوں پر جو بھابڑا فائرنگ ہوئی تھی ؟

ج : ۔ واللہ اعلم کیا حالات تھے ۔ وہ ایک تکلیف دہ بات تھی ۔ ایک حادثہ ہو گیا ۔ نہ ہوتا تو اچھا تھا ۔ اس وقت آدمی اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ضروری تھا کہ نہیں ضروری تھا ۔ لیکن اس وقت تو سمجھا گیا کہ ضروری تھا

س : ۔ کہ یہ پاکستان کے خلاف کارروائی کر رہے تھے ۔

ج : ۔ اب قیوم خان تو ہیں نہیں ۔

س : ۔ بعض مسلم لیگیوں کے متعلق ہم سنتے آ رہے ہیں کہ انہیں قیوم خان نے جسمانی طور پر اٹھوا کے اٹک کے اس پار پھنکوا دیا تھا ؟

ج : ۔ ہاں الیکشن کے دنوں میں ایسا کیا ۔

س : ۔ اس حد تک چلے جاتے تھے ۔

ج : ۔ ہاں ۔

س : ۔ آپ کے ساتھ گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قیوم خان نے زیادہ نقصان پرانے مسلم لیگیوں کو پہنچایا ۔

ج :۔ ان کے زیادہ اختلافات پرانے مسلم لیگیوں کے ساتھ ہی ہوئے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے پاکستان بنایا ہے۔ اگر آپ سے زیادہ کام نہیں کیا تو کم بھی نہیں کیا۔

س :۔ ہاں، یہ بات تو ہے کہ خان قیوم اخیر میں ہی مسلم لیگ میں آئے۔ آپ نے بتایا نا کہ دوسری شملہ کانفرنس کے بعد۔ وہ کیا حالات ہوئے؟

ج :۔ عبدالغفار خان ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں جب سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں بھیجا گیا تو یہی سمجھا گیا کہ کچھ عرصہ بعد پھر الیکشن ہوں گے۔ قیوم خان کو معلوم تھا کہ ۴۵ء کے بعد ان کو ٹکٹ نہیں ملے گا۔ عبدالغفار خان اپنے لڑکے کو بھیجیں گے۔ پھر یہ مسلم لیگ میں آگئے۔

س :۔ اس وقت عبدالغنی خاں ان کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔

ج :۔ ہاں عبدالغنی کو۔ پھر عبدالغفار خاں نے عبدالغنی کو بھیجا بھی۔

س :۔ ان کا مسلم لیگ میں آنا کوئی اصولی امر نہیں تھا۔

ج :۔ کیونکہ ۴۵ء میں مسلم لیگ بڑی با اثر ہو گئی تھی۔ اور پاکستان بننے والا تھا۔

س :۔ دسمبر ۵۱ء میں سرحد میں جو الیکشن ہوئے۔ آپ نے بتایا کہ قیوم خان نے دھاندلی کے ذریعے آپ کو ہروا دیا۔ اس کی کیا تفصیل ہے۔

ج :۔ بعض باتیں ہیں کہ میں اس وقت ان کو دہرانا نہیں چاہتا کہ گزر گئیں۔ ورنہ پاکستان میں پہلی دھاندلی قیوم خان نے کی۔ لیاقت علی خان شہید ہو چکے تھے۔ میں اس وقت پاکستان مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا اگر میں ہارنے والا ہوتا تو بھی ٹھیک تھا۔ لیکن میرے مقابلے میں جس غیر معروف اور ان پڑھ شخص وطن بادشاہ کو لایا گیا۔ اس کے ساتھ تو پچاس ووٹ بھی نہیں تھے۔ اسے تو تجویز کنندہ اور تائید کنندہ نہیں ملتا تھا۔ اس کے تجویز کنندہ اور تائید کنندہ کے طور پر چارسدہ سے سرخپوش لائے گئے۔ ایسی الیکشن تو پھر مجھے زندگی میں نصیب ہی نہ ہوئی۔ ایک جگہ سے مجھے خبر آئی کہ انہوں نے دو ہزار ووٹ ڈال لیے ہیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ ہم اس کو پورا کر دیں گے۔ ووٹ نہیں تھے تو اس کے حق میں کاؤنٹر فائل بھی ڈال دیے گئے۔ وہ جیت ہی نہیں سکتا تھا۔ کوئی ووٹ ہی میرے مخالف نہیں تھا۔ لیکن وہ جیت گیا۔

س :۔ آپ کہتے ہیں کہ پاکستان میں پہلی دھاندلی قیوم خان نے کی۔

ج :۔ ہاں۔

س :۔ اس سے بھی پہلے پنجاب کے الیکشن ہوئے تھے۔ یہاں بھی بعض سیٹوں کے متعلق مشہور ہے کہ دھاندلی ہوئی۔ جس کے لیے جھرلو کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی۔

ج :۔ اگر پنجاب میں دھاندلی ہوئی تھی تو پنڈی ڈویژن میں ہوئی ہوگی۔ قربان علی خان آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ فدا حسن چیف سیکرٹری تھے۔ ان کی بیگم زینت فدا حسن کھڑی ہوئی تھیں۔ یہاں ہو سکتا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہو قربان علی کی وجہ سے۔

س :۔ لاہور شہر کی تین چار سیٹوں کا بھی بہت چرچا ہے۔

ج :۔ ممدوٹ لاہور سے بھی جیت گئے اور سیالکوٹ سے بھی۔

س : نہیں وہ ممدوٹ کے علاوہ ہیں ۔ احمد سعید کرمانی وغیرہ کی ۔ خیر انہیں چھوڑیں ۔ یہ بتائیں کہ اس وقت گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر تھے ۔ ایک بڑے ہی معتبر راوی کے مطابق ڈی سی اور ایس پی سیالکوٹ کی آئے روز لاہور طلبی ہوتی تھی کہ ممدوٹ کے مقابلے میں مسلم لیگ کے امیدوار خواجہ صفدر کے لیے کچھ کرو ۔ وہ جواب دیتے تھے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے ۔ ممدوٹ تو پاپولر ہی بہت زیادہ ہیں ۔

ج : میں ان دنوں مستقلاً پنجاب میں تھا ۔ ہمارے جو امیدوار کمزور اور ناتجربہ کار تھے وہ ہمیں کہتے تھے کہ نشتر صاحب ہماری کوئی مدد نہیں کر رہے ۔ چنانچہ میں نے لیاقت علی خاں سے سردار نشتر کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے خوب دھمکایا ۔ بہت جھاڑا ۔ "بھلا نشتر بھی مسلم لیگ کے خلاف ہو سکتا ہے ۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم کہاں رہیں گے ۔ کیسی بات کرتے ہو ۔" مجھے خوب یاد ہے سرگودھا سے ہمارے بعض لوگوں نے وہاں کے ڈی آئی جی پولیس کے متعلق کہا کہ انہیں یہاں سے تبدیل کرا دو ۔ میں نے سردار نشتر سے بات کی تو انہوں نے مجھے سختی سے کہا کہ کوئی نہیں جیت سکتا تو نہ جیتے ۔ میں ان کے لیے افسروں کے تبادلے نہیں کر سکتا ۔"

یہ غلط ہے کہ دھاندلی ہوئی ۔ وہاں اگر ایک آدھ امیدوار نے مقامی افسروں سے گٹھ جوڑ کر کے ایسا کر لیا ہو تو اور بات ہے ۔ لیکن بطور حکومتی پالیسی کے دھاندلی بالکل نہیں ہوئی تھی ۔ جس طرح کہ بعد میں قیوم خاں نے کی ۔ یا بھٹو صاحب نے کی تھی ۔ معلوم نہیں کی تھی کہ نہیں کی تھی ۔ بعض کہتے ہیں کہ کی تھی ۔ لیکن اس پیمانے پر نہیں کی تھی جس پیمانے پر پراپیگنڈہ کر دیا گیا ہے ۔ بہر حال ۔

س : یا جس طرح ایوب خاں نے کی تھی ۔

ج : وہ تو چند بی ڈی ممبر ہوتے تھے ۔ انہیں ڈرا دھمکا کر ووٹ لے لیے ۔ عوام الناس کو ڈرانا دھمکانا بہت مشکل کام ہے ۔

س : یہ بھی سنا ہے کہ آپ بھی سیالکوٹ کے ڈی سی اور ایس پی کی گورنر نشتر کے آگے شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ مسلم لیگی امیدوار خواجہ صفدر کے لیے کچھ نہیں کر رہے ۔ اور ڈی سی اور ایس پی اپنی بے بسی کا اظہار کرنے پر مجبور تھے ۔ کیونکہ لوگ تو ممدوٹ کے ساتھ تھے ۔

ج : انوار الحق صاحب (بعد میں جسٹس) سیالکوٹ کے ڈی سی تھے ۔ اب بھی میرے بڑے اچھے دوست ہیں ۔ لیکن اُس وقت میری ان کے ساتھ ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی ۔ ہم چاہتے تھے کہ خواجہ صفدر جیتیں ۔ کیونکہ وہ ہمارے امیدوار تھے ۔ یہ بھی درست ہے کہ نشتر صاحب مسلم لیگ گورنمنٹ کی طرف سے پنجاب کے گورنر تھے لیکن وہ غلط کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ نشتر بڑا پاکباز مسلمان آدمی تھا ۔ بے ایمانی اس سے ہو نہیں سکتی تھی ۔ انتخابات میں دھاندلی بھی تو بے ایمانی ہی ہے ۔ سیالکوٹ میں الیکشن کے روز جب ہم نے پولنگ سٹیشن وزٹ کیے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہاں ہمارا ایک بھی ووٹ نہیں ۔ سب ممدوٹ کے ساتھ تھے ۔

س : "ممدوٹ نے سیالکوٹ والی سیٹ چھوڑ دی ۔ تو پھر ڈی سی اور ایس پی نے کام دکھا دیا ۔ مخالف امیدوار کے کاغذات ہی مسترد کر دیے اور خواجہ صفدر بلا مقابلہ جیت گئے" سیالکوٹ کے بڑے بوڑھے آج تک اس کا ذکر کرتے ہیں ۔

ج : اس کا مجھے پتہ نہیں ۔ لیکن اس وقت مسلم لیگ کا بڑا دبدبہ تھا ۔ صوبے میں مسلم لیگ کی منسٹری بھی

بن چکی تھی۔ پھر مدوٹ کی ذات تک تو معاملہ ٹھیک تھا۔ عوام کی ان کے ساتھ وابستگی تھی۔ لیکن ان کی جگہ کون امیدوار ہوا ہوگا۔

س: ہمارے ملک میں جمہوری عمل صحیح طرح شروع نہیں ہو سکا۔ یا جاری نہیں رہ سکا کہہ لیجئے۔ اس کی ذمہ داری عام طور پر سیاست دانوں پر ڈالی جاتی ہے۔

ج: ڈالنی بھی چاہیئے۔

س: لیکن جمہوریت کی بنیاد پر اور خالصتہً ووٹوں کے ذریعے وجود میں آنے والے اس ملک میں زیادہ عرصہ تو فوج ہی برسرِ اقتدار رہی۔ مارشل لا کا ہی دور دورہ رہا۔

ج: میں سمجھتا ہوں کہ جمہوری عمل کے رائج نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے۔ اور یہ ہماری بدقسمتی بھی ہے کہ پاکستان بننے کے ایک سال بعد ہی قائداعظمؒ ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور بڑا سانحہ ہوا کہ نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کو شہید کر دیا گیا۔ کیونکہ اگر وہ بھی ہوتے ناں جی۔ ملک کو تو انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ لوگوں نے بھی انہیں قائداعظمؒ کا جانشین تسلیم کر لیا تھا۔ اگرچہ بعض لوگ انہیں ڈراتے بھی تھے کہ آپ مہاجر ہیں لیکن پنجاب کے الیکشن (۱۹۵۱ء) میں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ لوگ انہیں مہاجر نہیں سمجھتے بلکہ قائداعظمؒ کا جانشین سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ جہاں جاتے تھے۔ لوگ ان پر دیوانہ وار نچھاور ہوتے تھے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے وہ مکا دکھایا تھا۔ یہ تو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ مہاجر ہیں۔ یہی تھا کہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کے لیڈر ہیں۔ لیکن جب ان میں یہ اعتماد آ گیا کہ لوگ انہیں قائداعظم کا جانشین سمجھتے ہیں تو انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کی شہادت کے بعد بدقسمتی سے ہمیں صحیح آدمی نہ مل سکا۔ سردار عبدالرب نشتر کو وہ اپنا ڈپٹی پرائم منسٹر بنا رہے تھے۔ اس کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا۔ سردار نشتر اس وقت پنجاب کے گورنر تھے۔ دولتانہ کی منسٹری تھی۔ عبدالرب نشتر تو بہت شریف آدمی تھے۔ دولتانہ چاہتے تھے کہ یہ مرکز میں نہ جائیں۔ لیاقت علی خان کہتے تھے کہ یہاں مجھے ان کی سخت ضرورت ہے۔ پنجاب میں بیٹھ کر یہ کیا کریں گے۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی جگہ کسے بھیجا جائے کہ اسی دوران میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ اگر لیاقت علی خان چند ہفتے اور زندہ رہ جاتے تو یہ تبدیلی آ جاتی۔ تو پھر یہ تسلسل رہتا۔ کیونکہ سردار نشتر وہی پالیسی چلاتے جو قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاں چلا رہے تھے۔ انہی کی لائن پر چلتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پھر وہ جمہوری عمل رکتا نہیں تھا۔ آپ دولتانہ سے پوچھ سکتے ہیں۔ چوہدری محمد علی نے انہیں بتایا کہ جب لیاقت علی خان کی شہادت ہو گئی۔ اور یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ کون وزیراعظم ہو۔ میں نے کہا کہ یہی سردار عبدالرب نشتر۔ لیکن وہ لوگ انٹریگ کر گئے۔

س: یہ انٹریگ کن لوگوں نے کی؟

ج: غلام محمد، گورمانی اور خواجہ شہاب الدین نے۔

یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہوئی۔ قائداعظمؒ کا انتقال کر جانا، لیاقت علی خاں کا شہید ہو جانا اور نشتر صاحب کا ڈپٹی پرائم منسٹر نہ بن سکنا۔ پھر ایک انٹریگ ہوئی۔ غلام محمد کو گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ وہ بہت بیمار تھا۔ بات نہیں کر سکتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب پرائم منسٹر بنے۔ لیکن بڑے کمزور آدمی تھے۔ اس عہدے کے لیے ان فِٹ آدمی تھے۔

س : ۔ قوت فیصلہ نہیں تھی۔

ج : ۔ قوت فیصلہ نہیں تھی۔ ان پر شہاب الدین اور ایسے لوگ چھائے ہوئے تھے۔ بس پھر محلاتی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک تو ہماری یہ بدقسمتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کانگریس ۱۸۸۵ء میں بنی تھی، ۴۷ء تک یہ بڑی زبردست پارٹی بن چکی تھی جو گاؤں کی سطح سے لے کر اوپر تک بڑی منظم تھی۔ اس دوران میں اس پارٹی نے تین سول نافرمانیاں کی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں۔ ۱۹۳۰ء میں اور پھر ۱۹۴۲ء میں۔ جب کہ مقابلے میں مسلم لیگ صحیح معنوں میں اس وقت متحرک ہوئی جب قائداعظمؒ نے اس کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۳۷ء میں کھنؤ سیشن ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن پاس ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا۔ یہ ایک طوفانی دور تھا مسلم لیگ کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ اس طرح اپنی تنظیم کرتی۔ اس لیے جب پاکستان بنا تو مسلم لیگ تنظیمی سطح پر اتنی مضبوط نہیں تھی۔ پھر یہ بھول گئے کہ ہمارا کوئی دشمن بھی ہے۔ یہ آپس میں ہی لڑنے لگے۔ پنجاب میں دولتانہ اور ممدوٹ ہمارے ہاں۔ پیر مانکی شریف اور عبدالقیوم خاں، عبدالقیوم خان اب تو مر گئے ہیں۔ انہیں کیا کہیں۔ تو یہ سب چیزیں شروع ہوگئیں۔ اس سے پھر جمہوری عمل کو دھچکا لگا۔

س : ۔ بنگال میں سہروردی اور خواجہ ناظم الدین۔

ج : ۔ وہاں بھی تھا، ہر جگہ تھا۔

س : ۔ سندھ میں ایوب کھوڑو اور سر غلام حسین ہدایت اللہ۔

ج : ۔ وہاں ایسی صورت نہیں تھی جیسی پنجاب اور سرحد میں تھی۔ سندھ میں اختلافات ہوتے تھے، آج دوست ہیں تو کل دشمن ہیں۔ پھر دشمن دوست ہو جاتے تھے۔ جبکہ پنجاب اور سرحد میں بڑی مضبوط دشمنیاں ہوگئیں۔ اس نے مسلم لیگ کو بہت نقصان پہنچایا۔

س : ۔ یہ صورت حال بالآخر ۵۸ء کے مارشل لاء پر منتج ہوئی۔

ج : ۔ جب مسلم لیگ کمزور ہوگئی تو پھر قدرتی بات تھی کہ فوج کو موقعہ مل گیا۔

س : ۔ آپ کے خیال میں جمہوری عمل میں تسلسل نہ رہ سکنے کی وجہ یہ تھی۔

ج : ۔ ہاں، مسلم لیگ کی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا۔

س : ۔ کمزوری آپس کے اختلافات سے پیدا ہوئی۔

ج : ۔ کمزوری آپس کے اختلافات سے پیدا ہوئی۔

س : ۔ عوام نے ایوب خان کو جو ویلکم کیا۔ اس کی وجہ بھی یہی صورت حال تھی۔

ج : ۔ اس وقت تو لوگوں کو مارشل لاء سے بڑی امیدیں تھیں کہ فوج آجائے تو بڑا اچھا ہو جائے۔

س : ۔ فوج آجائے نہیں بلکہ جب فوج آ ہی گئی اور اس نے پھر کام بھی کیے۔ مثلاً بدنام زمانہ سمگلروں کی پکڑ دھکڑ۔ ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کا تعاقب وغیرہ۔ لوگ اس مارشل لاء کے ان ابتدائی کاموں کی وجہ سے خوش بھی ہوئے۔

ج : ۔ شروع میں چند روز تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن فوج سے سیاسی کام کروانے کا مطلب ہے کہ الٹ کام کروانا۔ ان کا اپنا کام ہے۔ سیاسی لوگوں کا اپنا کام ہے۔

س : ۔ مسلم لیگیوں میں اختلاف ہوئے جس وجہ سے صورت حال خاصی پریشان کن ہوگئی۔ اسکے باوجود اگر الیکشن ہوتے رہتے تو بھی صحت مند سیاسی ماحول پیدا ہو جاتا۔ جو کسی ملک کے معاشی اور عسکری استحکام کے لیے بھی بڑا ضروری ہوتا ہے۔

ج : ۔ وہ تو لیاقت علی خاں اگر ایک دو سال اور زندہ رہتے تو الیکشن بھی کروا دیتے۔ آئین بھی بن جاتا۔

س : ۔ عموماً انہی کی نیت پر شبہ کیا جاتا ہے۔

ج : ۔ دیکھئے جی۔ نیت پر شبہ کرنا بڑا آسان ہے۔ آپ اس وقت کے حالات کو بھی سامنے رکھیں۔ یہاں ایک کروڑ کے قریب ہندوستان سے مہاجر آگئے تھے۔ میں نے خود دیکھا کہ ٹرینیں لاشوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور لاشوں سے بدبو اٹھ رہی ہے۔ اس وقت ایک کروڑ انسان کا یہاں آنا اور پھران کو بسانا معمولی کام نہیں تھا۔ پاکستان نے انہیں بسایا اور اقوام متحدہ یا کسی بھی عالمی ادارے سے ایک پیسے کی بھی امداد نہیں لی۔

س : ۔ اس وقت امداد لینے کا تصور ہی نہیں ہوگا۔

ج : ۔ کوئی خیال ہی نہیں تھا۔

س : ۔ نہ یہ امداد لینا چاہتے ہوں گے۔

ج : ۔ نہ ہم امداد لینا چاہتے تھے۔

س : ۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا جذبہ تھا۔

ج : ۔ جی ہاں۔ ان ایک کروڑ مہاجرین کو آباد کیا۔ اوپر سے انڈیا نے کوئلہ بند کر دیا۔ ساؤتھ افریقہ سے کوئلہ منگوایا۔ انڈیا والے تو کوئی نہ کوئی تنازعہ کھڑا کر دیتے تھے۔ اس وقت یہ تھا کہ گاڑی کسی طرح چلے۔ پاکستان قائم رہے۔ اس لیے میں تو لیاقت علی خان کی نیت پر شبہ نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حالات ہی ایسے تھے۔ ان حالات میں پہلا کام یہ تھا کہ اس ملک کو بچاؤ۔

س : ۔ لیاقت علی خان بیک وقت پاکستان کے وزیر اعظم تھے اور پاکستان مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ بھی۔ ان کے اس عمل کو بھی غیر جمہوری کہا جاتا ہے۔

ج : ۔ فریئر ہال کراچی (دسمبر ۴۸ ۱۹ء) میں اس پر بڑا بحث مباحثہ ہوا تھا۔ وہاں ایک طبقہ جیسے میاں افتخار الدین لیڈ کر رہے تھے۔ چاہتا تھا کہ جو وزیر ہو ، وہ مسلم لیگ کا عہدیدار نہ بنے۔ ور چودھری خلیق الزماں کو مسلم لیگ کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں قائد اعظمؒ کی خواہش تھی کہ لیاقت علی خاں صدر بنیں۔ کیونکہ وہ مسلم لیگ کا تنظیمی کام کرنے کا مرحلہ تھا۔

س : ۔ آپ کا اندازہ ہے کہ قائد اعظمؒ ایسا چاہتے تھے۔ اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔

ج : ۔ ہاں۔ یہ میرا خیال ہے۔ کیونکہ قائد اعظمؒ نے اس بات کا کسی سے اظہار نہیں کیا۔ لیکن وہ طبقہ مسلم لیگ کے آئین میں یہ ترمیم لانا چاہتا تھا کہ جو وزیر ہوگا۔ وہ مسلم لیگ کا عہدیدار نہیں ہوگا۔ قائد اعظمؒ نے کہا کہ دیکھو، آئین میں ایسی بات مت لاؤ۔ ٹھیک ہے آپ اس کو ایک کنونشن (روایت) بنالیں کہ وزیر کو ملک کا عہدیدار نہیں بنائیں گے لیکن شاید کوئی ایسا موقعہ آجائے۔ جب آپ ایک وزیر کو عہدیدار بنانا چاہتے ہوں۔ پھر آپ دوڑتے پھریں گے۔ آئین روز روز تو نہیں بنتے۔ اس لیے آپ اس کو کنونشن بنالیں تو جب تک کوئی خاص بات نہ ہو کہ وزیر کا عہدیدار

ہونا ضروری ہے۔ اسے عہدیدار نہیں بنائیں گے۔

جیسا کہ امریکہ میں کنوینشن تھی کہ کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ ملک کا پریذیڈنٹ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن روز ویلٹ کو تیسری مرتبہ بنانا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے اب کر دیا کہ کبھی نہیں بنے گا۔

قائداعظمؒ تو ایک کنوینشن کی بات کر رہے تھے اور ٹھیک بات کر رہے تھے۔ وہ ان لوگوں نے نہیں مانی۔ قائداعظمؒ واک آؤٹ کر کے چلے گئے۔ پھر انہوں نے پاس کر لیا کہ وزیراعظم مسلم لیگ کا صدر نہیں بنے گا۔ چنانچہ چودھری خلیق الزمان کو آرگنائزیشنل پریذیڈنٹ بنایا گیا۔ انہوں نے پھر مسلم لیگ کو آرگنائز کیا۔ اس کے بعد جب چودھری خلیق الزماں نے استعفا دیا تو پھر چینج کرنا پڑا۔ اور لیاقت علی خان صدر مسلم لیگ بنے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی غیر آئینی بات نہیں تھی کہ جو شخص مسلم لیگ کا وزیر ہے وہ کیوں نہ پارٹی کا عہدیدار بنے اگر لوگ چاہتے ہوں تو اسے بن جانا چاہیئے۔

س :۔ چودھری خلیق الزمان کا دورِ صدارت کیسا رہا؟

ج :۔ بڑا اچھا رہا۔ قیام پاکستان کے لیے بھی انہوں نے بڑا کام کیا تھا۔ یوپی میں تو مسلم لیگ انہوں نے ہی آرگنائز کی۔ اب ایک آدمی کچھ کام کرتا ہے تو اسے اس کا کریڈٹ ملنا چاہیئے۔ اگر وہ یوپی میں مسلم لیگ آرگنائز نہ کرتے تو بڑا مشکل ہوتا۔ جب پاکستان نہیں بنا تھا مسلمانوں کی لیڈرشپ تو یوپی سے نکلی۔ چودھری صاحب وہاں کانگریس کے بھی پریذیڈنٹ رہ چکے تھے۔

س :۔ بالآخر جنرل ایوب خان سے پاکستان مسلم لیگ کے دو ٹکڑے بھی انہوں نے ہی کرائے۔

ج :۔ انہوں نے نہیں کرائے۔ وہ تو ایوب خان نے کر لیے تھے۔

س :۔ سنا ہے کہ انہی کا مشورہ ہے۔

ج :۔ وہ ایوب خان کا اپنا فیصلہ تھا۔ وہ ملک کے پریذیڈنٹ بن گئے تھے۔ آمر تھے۔ سب کچھ تھے۔ ان کا فیصلہ تھا کہ مسلم لیگ ان کے ساتھ آئے۔ لیکن مسلم لیگ بنیادی جمہوریت کو کیسے مانتی۔ وہ بالغ رائے دہی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اگر بالغ رائے دہی کی جگہ بنیادی جمہوریت نہ لائی جاتی تو مسلم لیگ کے دو ٹکڑے نہ ہوتے۔

س :۔ مسلم لیگ کو پھر سب سے زیادہ نقصان ایوب خان نے پہنچایا۔

ج :۔ بالکل۔ مارشل لاء بھی یہی لائے تھے۔

س :۔ بلکہ ملک کو ہی کہنا چاہیئے۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ آپ نے کوئی کوشش کی کہ مسلم لیگ دو ٹکڑے نہ ہو۔

ج :۔ ایوب خان نے مجھے بلایا۔ اس وقت حبیب اللہ خان اور میرا بہنوئی سیف اللہ خان بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ایوب خان نے کہا کہ اگر آپ پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننا چاہتے ہیں تو اپنے لیے جنرل سیکرٹری چن لیں۔ اگر جنرل سیکرٹری بننا چاہتے ہیں تو اپنے لیے صدر کا انتخاب کریں۔ میں نے کہا۔ میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ مجھے موقع دیں کہ میں سارے مسلم لیگیوں کو اکٹھا کر لوں۔ یہ سن ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ انہوں نے غالباً ۱۳ جولائی کی تاریخ بتائی کہ اس روز میں لاہور میں تقریر کرنے والا ہوں۔ میں نے کہا پھر

میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے ان پر واضح کردیا کہ مسلم لیگ جمہوری پارٹی ہے۔ وہ یہ قبول نہیں کرسکتی کہ بالغ رائے دہی نہ ہو۔ فضل القادر چودھری کو بھی اس گفتگو کا پتہ تھا۔ ہوسکتا ہے صبور خان کو بھی علم ہو۔ لیکن اس کے سامنے یہ بات نہیں ہوئی۔

بس لیاقت علی خان کی شہادت سے ہمیں بہت نقصان پہنچا۔ ان کے سینے میں جو گولی لگی وہ دراصل پاکستان کے سینے میں پیوست ہوئی۔

س :۔ کہتے ہیں کہ وہ وزیر خزانہ غلام محمد کو بھی ڈسمس کرچکے تھے۔ صرف اعلان باقی تھا۔

ج :۔ قیوم خان نے سرحد میں مسلم لیگ میں سے بہت سے لوگوں کو نکال دیا ہوا تھا۔ ان سب کو انہوں نے سٹے آرڈر دے دیے تھے کہ ان کا یہ اقدام غیر آئینی ہے۔ میں اس میٹنگ میں نہیں تھا۔ جہاں انہیں شہید کردیا گیا۔ لیکن اسی روز یعنی ۱۶ اکتوبر (۱۹۵۱ء) کو راولپنڈی میں میری ان کے ساتھ میٹنگ ہونے والی تھی۔ مشتاق احمد گورمانی وزیر امور کشمیر ہونے کے باعث راولپنڈی میں ہوتے تھے۔ لیاقت علی خاں نے انہی کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ گورمانی صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ آج رات نواب صاحب نے آپ کو کھانے پر بلایا ہے۔ میں نے کہا کہ وہاں تو بہت سے لوگ ہوں گے۔ گورمانی صاحب نے بتایا۔ نہیں، آپ ہوں گے۔ نواب صاحب ہوں گے اور میں ہوں گا۔ میں نوٹس تیار کر رہا تھا کہ یہ بات کریں گے۔ لیکن وہ کھانا ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ چار بجے سہ پہر کمپنی باغ (اب لیاقت باغ) میں جلسہ تھا۔ اور وہیں وہ شہید ہوگئے۔

س :۔ آپ ان سے گفتگو کے لیے کس موضوع پر نوٹس تیار کر رہے تھے۔

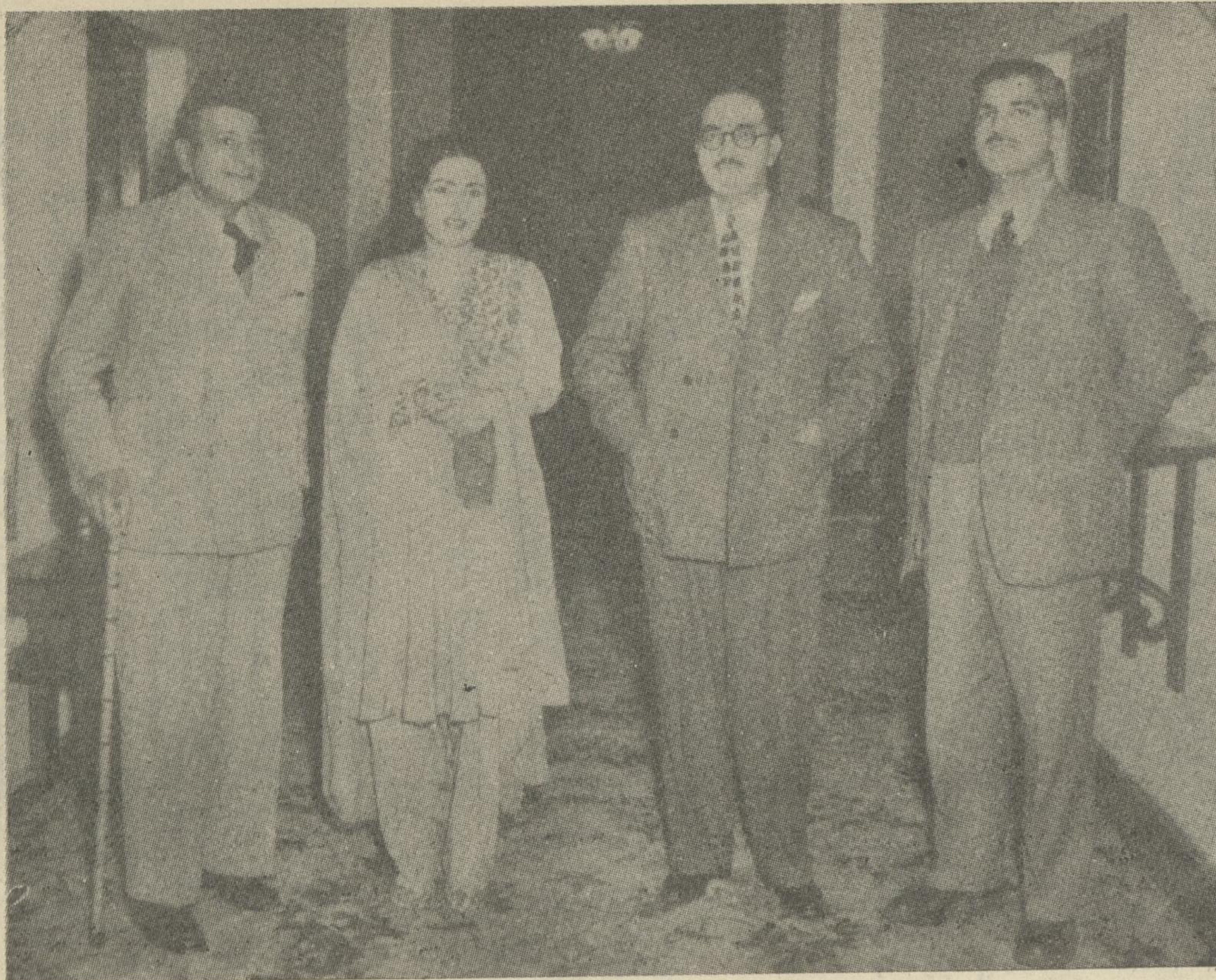
ج :۔ وہی صوبہ سرحد میں قیوم خاں کے ساتھ ہمارا تنازع چل رہا تھا۔ وہ چیف منسٹر تھے۔ انہوں نے ہمارے بہت سے لوگوں کو مسلم لیگ میں سے نکال دیا تھا۔ اس پر لیاقت علی خان ان سے بہت ناراض تھے۔ انہوں نے ان سب کو سٹے آرڈر دے دیے تھے کہ چیف منسٹر کا یہ اقدام غیر آئینی ہے۔ آغا عبدالحمید ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب لیاقت علی خاں روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ میں اس کے دماغ سے چیف منسٹری کا بھوت نکال دوں گا کہ اس نے ان لوگوں کو مسلم لیگ سے کیوں نکالا۔ تو بس وہ نہ ہوا۔ اگر ہو جاتا تو سرحد میں حالات ٹھیک ہو جاتے۔ وہاں صحیح الیکشن بھی ہو جاتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی تھی۔ لیاقت علی خان ۱۶ اکتوبر کو شہید ہوئے۔ سرحد میں دسمبر میں الیکشن ہوئے۔ قیوم خان نے دھاندلی کی۔

س :۔ قیوم خان نے اس معاملے میں شہرت بھی خوب پائی۔

ج :۔ لیکن لیاقت علی خان کے ہوتے ہوئے وہ دھاندلی نہیں کرسکتے تھے۔

س :۔ لیاقت علی خان کے قتل کے الزام میں غلام محمد اور گورمانی وغیرہ کا نام اکثر لیا جاتا ہے۔

ج :۔ الزام تو بہت سوں پہ آتا ہے۔ دیکھئے، پرائم منسٹر پر آئی جی پولیس اور ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو حاضر ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس وقت ہماری انٹیلی جنس کے پاس یہ اطلاعات آچکی تھیں کہ وزیر اعظم کو قتل کرنے کے لیے ہندوستان سے کچھ انتظام ہو رہا ہے۔ جب قائداعظمؒ گورنر جنرل تھے تو وہ پاکستان میں نمبر ون تھے۔ ان کے لیے حفاظتی انتظامات بڑے سخت ہوتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خان نمبر ون ہوگئے۔ تو پھر ان کے لیے وہی حفاظتی انتظامات ہونے چاہئیں تھے۔ جو گورنر جنرل کے لیے ہوتے تھے۔



۱۹۵۲ء — یوسف خٹک، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ (تب وزیرِاعلیٰ پنجاب) بیگم الماس دولتانہ، غلام محمد (تب گورنر جنرل پاکستان)

اس لیے آئی جی پولیس اور ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو وہاں ضرور موجود ہونا چاہیئے تھا.

س :. کہتے ہیں کہ وہ بڑی اہم تقریر کرنے والے تھے.

ج :. وہ تقریر بھی اہم تھی. لیکن اس طرح جو کام وہ کرنے والے تھے. وہ مجھے معلوم تھا. ایک تو وہ آئین جلدی لانا چاہتے تھے. دوسرے الیکشن کرانا چاہتے تھے. بس اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا.

س :. ان کا قتل انفرادی فعل تھا یا سازش کا نتیجہ؟

ج :. سازش کا نتیجہ.

س :. کوئی ثبوت؟

ج :. سازش کا ثبوت ہے اور اب بھی مل سکتا ہے. کیونکہ ان کی تقریر براہِ راست ریڈیو پاکستان پر ساتھ ہی ساتھ نشر ہو رہی تھی. جب لیاقت علی خان برادرانِ اسلام کہتے ہیں تو گولی چلتی ہے. جیسے ہی گولی چلتی ہے تو ایس پی نجف خاں پشتو میں کہتا ہے. وَلے. یعنی اسے مارو. اب دیکھیں قتل پنجاب میں ہو رہا ہے. اسے تو چاہیئے تھا کہ پنجابی میں بات کرتا.

س :. لیکن وہ پٹھان تو ہے.

ج :. ہاں. نجف خاں چھچھ کا رہنے والا ہے. چھچھ میں پشتو بھی بولتے ہیں.

لیکن راولپنڈی میں وہ پشتو میں وَلے کیوں کہتا ہے. مارو کیوں نہیں کہتا. جس اے ایس آئی کو اس نے وَلے کہا وہ بھی پشتو بولنے والا تھا. اب اسے کیسے معلوم تھا کہ مجھے اس کے ساتھ پشتو بولنی چاہیئے. اس نے وَلے کہا تو وہ اے ایس آئی قاتل کو گولیاں مارتا ہی گیا، مارتا ہی گیا. اس نے اس پر پانچ گولیاں چلائیں. حالانکہ لوگوں نے قاتل کو تو بے بس کیا ہوا تھا. یہ ایک طے شدہ پروگرام تھا.

س :. انہوں نے قاتل کو موقع پر ہی ختم کر دیا تاکہ سازش بے نقاب نہ ہو.

ج :. ہاں.

س :. اس سلسلے میں لوگ عام طور پر غلام محمد اور گورمانی کا نام لیتے ہیں.

ج :. ہاں. وہ تو بہت لوگ تھے. اگر آپ کہیں گے تو آپ کے اخبار پر بھی دعویٰ ہو جائے گا. گورمانی کی لڑکیاں یکدم دعویٰ کر دیتی ہیں. اب کون ثبوت دے سکتا ہے. کوئی ثبوت نہیں دے سکتا.

س :. ثبوت تو ہے. اے بھی اعوان نے بھی تفتیش کی. وہ کہتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں آخری آدمی رہ گیا ہوں. میں اس وقت ڈی آئی جی سرحد تھا. لیکن گورنمنٹ مجھے وہ تفتیش چھاپنے کی اجازت نہیں دیتی.

ج :. کیا کہا جا سکتا ہے.

س :. ایک دفعہ اکبر لیاقت علی خاں سے میں نے انٹرویو کیا تو وہ بھی اپنے والد کے قتل کو سازش قرار دیتے تھے. بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ جو لوگ اس قتل میں ملوث تھے ان کی ترقیاں ہو گئیں.

ج :. لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد ان سب کی ترقیاں ہو گئیں. قربان علی خاں آئی جی (پنجاب) سے اے جی جی (ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل) بلوچستان ہو گئے. میاں انور علی ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) پنجاب کو آئی جی پنجاب بنا دیا گیا. خواجہ شہاب الدین کو تو نکال رہے تھے. اناؤنس ہو گیا تھا کہ مصر میں سفیر غلام محمد

کوتو نکال ہی رہے تھے۔ کیونکہ وہ تو بیمار تھا۔ یہ قتل سازش تو تھی۔ اگلی صف میں قاتل بیٹھا تھا۔ ساتھ اس کے نو سالہ بیٹا تھا۔ اس کی جیب میں سے دو ہزار روپے نکلے۔ جو اس کو اس لیے دیئے گئے ہوں گے کہ تم بچ کے نکل جاؤ گے اور یہ پیسے بھاگنے میں کام آئیں گے۔ لیکن اسے وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ قتل کا راز چھپانے کے لیے یہ تو عام طریقہ ہے کہ قاتل کو ہی ختم کر دو۔ پھر یہی ہوا۔ سازش تو تھی۔

س :۔ لیاقت علی خان کی شہادت بڑا سفاکانہ عمل تھا۔ غلام محمد حکومت پر قابض ہو گیا۔ لوگوں نے اسے الٹ کیوں نہ دیا ؟

ج :۔ لوگ لیاقت علی خان کی شہادت سے اتنے دلفگار تھے کہ وہ اسی غم میں لگے رہے۔

س :۔ سکندر مرزا نے جوڑ توڑ کی انتہا کر دی۔ ادھر یہی مسلم لیگ خاموش تماشائی بنی رہی۔ بلکہ بعض مسلم لیگی اس کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔

ج :۔ نشتر صاحب بھی فوت ہو گئے۔ ادھر مسلم لیگ دولتانہ اور ممدوٹ کی خانہ جنگی سے کافی نقصان اٹھا چکی تھی۔

س :۔ قیوم خان کو صوبے کی وزارت اعلیٰ سے ہٹا کر مرکز میں بھیج دیا گیا۔ یہ کیا سازش تھی ؟

ج :۔ وہ غلام محمد وغیرہ کی محلاتی سازش تھی۔

س :۔ اس کی تفصیل۔

ج :۔ قیوم خان کانفرنس اٹنڈ کر کے کراچی سے پشاور آ رہے تھے۔ جنرل اعظم خان نے لاہور ریلوے سٹیشن پر انہیں آرڈر دیا کہ آپ واپس کراچی چلے جائیں۔ کیونکہ اب آپ مرکز میں وزیر ہیں۔ یہ پھر واپس کراچی چلے گئے۔

س :۔ یہ سب اس چپقلش کا نتیجہ تھا جو صوبہ سرحد میں شروع ہو چکی تھی۔

ج :۔ ہاں۔ بالکل۔

س :۔ جنرل اعظم خان نے سرحد کے وزیر اعلیٰ خان قیوم کو حکم دیا کہ آپ کراچی واپس جائیں۔ اب آپ مرکز میں وزیر ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ فوجی عمل دخل اس وقت شروع ہو چکا تھا۔

ج :۔ غلام محمد گورنر جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کی وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔ فوج غلام محمد کے ساتھ تھی۔ تبھی کیا۔ ورنہ ناظم الدین کو اسمبلی نے ووٹ دیا تھا۔ غلام محمد نے انہیں غیر آئینی طریقے سے ڈسمس کر دیا۔

س :۔ اگر ایوب خان غلام محمد کے ساتھ نہ ہوتے تو اسے یہ اقدام کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی ؟

ج :۔ ہاں۔

س :۔ پھر تو بعض سیاست دانوں کا یہ خیال درست ہے کہ ایوب خان، غلام محمد اور سکندر مرزا کی پشت پر تھا۔ ورنہ ان میں اس قدر غیر آئینی اور غیر جمہوری اقدامات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

ج :۔ سکندر مرزا سے ایوب خان کی دوستی تھی۔

س :۔ ہمارے ملک میں سیاسی وابستگی بدلتے رہنے کا بڑا رواج ہے ؟

ج :۔ جب سیاسی عمل کمزور ہو جائے تو یہی ہوتا ہے۔ رائے عامہ ہی اس چیز کو روکتی ہے۔ یہ تمام کمزوریاں جمہوری عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔

س :۔ مسلم لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایوب خان نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس سے بھی پہلے سکندر مرزا نے "ری پبلکن" پارٹی بنائی تھی۔ اس سے بھی تو مسلم لیگ کو نقصان پہنچا۔

ج :۔ ہاں۔ ری پبلکن میں مسلم لیگی راتوں رات چلے گئے۔ حالانکہ وہ لوگ ایکٹ تو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ہوئے تھے۔ یہ بری بات تو تھی۔ لیکن وہ پارٹی ایسی تھی کہ خود بخود ختم ہو گئی۔ جب مارشل لاء آیا تو اس کے بعد کسی نے اس کا نام ہی نہ لیا۔

س :۔ وہ رسوا جو ہو گئی تھی۔

ج :۔ ظاہر ہے۔ راتوں رات وفاداریاں بدلنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

س :۔ آپ نے بھی تو جائن کی تھی۔

ج :۔ ری پبلکن پارٹی ایک سال نو مہینے چلی۔ ایک سال چھ مہینے میں نے اس کی بھرپور مخالفت کی قیوم خان نے دسمبر ۵۱ء کے الیکشن میں میرے ساتھ جو دھاندلی کی تھی۔ اس وجہ سے میری ان سے بول چال تک بند تھی۔ نشتر صاحب کی وفات کے بعد وہ مسلم لیگ کی صدارت کے امیدوار ہوئے تو انہوں نے میرے ساتھ صلح کر لی۔ میں نے کہا۔ اچھا آپ پاکستان مسلم لیگ کے صدر بن جائیں۔ اس وقت تو میں نے ان کی تمام زیادتیاں بھلا دی تھیں۔ لیکن انہوں نے نہیں بھلائیں۔ پہلے تو ہم برداشت کرتے رہے۔ جب یہ باز نہیں آئے تو انکا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے ری پبلکن جائن کی۔ حالانکہ میں تو اسمبلی کا ممبر بھی نہیں تھا۔ مسلم لیگ سے میری وابستگی ویسی ہی تھی۔ تین مہینے بعد مارشل لاء آگیا، تو ری پبلکن کے ساتھ تعلق بھی ختم ہو گیا۔ ۶۲ء کے الیکشن میں میں نے بطور مسلم لیگی قومی اسمبلی کا الیکشن جیتا۔ وہ تین مہینے میں ری پبلکن میں رہا تھا۔ وہ بھی قیوم خان کی وجہ سے۔ حالانکہ اسے جائن کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کوئی پارٹی بھی نہیں تھی۔ لیکن یہ میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا کہ میں مسلم لیگ میں نہیں ہوں۔ اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ایک راستہ تھا۔ یہ اگر آپ ایک فروگذاشت سمجھیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی یا کیا ہوا۔ برداشت کر لینا چاہیئے تھا۔ ظالم کا کسی وقت تو مقابلہ کر لینا چاہیئے۔

س :۔ ہمارے لیڈروں نے بھی پھر جمہوری عمل کو نقصان پہنچایا۔

ج :۔ ظاہر ہے۔

س :۔ لوگ مسلم لیگ کو بھی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

ج :۔ غلطیاں تو ہوئیں۔ غلطیاں نہ ہوتیں تو کیوں ایسا ہوتا۔ لیکن غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک دیدہ دانستہ، دوسری نادانستہ، غلطیاں اگر نہ ہوتیں تو ایسا کیوں ہوتا۔

س :۔ مسلم لیگیوں سے کس قسم کی غلطیاں ہوئیں۔ دیدہ دانستہ یا نادانستہ؟

ج :۔ دیدہ دانستہ تو ہوئیں جب ہر جگہ آپس میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ چیف منسٹرز من مانی کرنا چاہتے تھے۔ ہم کہتے تھے کہ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم نے بھی پاکستان بنایا ہے۔ ورنہ اتحاد کے اس جذبے کو برقرار رکھا جاتا جو پاکستان موومنٹ میں تھا تو بہت اچھا ہوتا۔

اُس وقت جذبہ یہ تھا کہ جب ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ صوبہ سرحد مسلم لیگ نے سو رضا کاروں کا ایک وفد وہاں بھیجا۔ میں اس وفد کا لیڈر تھا۔ وہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کی شورش کا زمانہ تھا۔ ہم مارے بھی جا سکتے تھے۔ ہم نے ہر قسم کا خطرہ مول لیا۔ یہ جو سرخپوش پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے قربانی نہیں دی۔ قربانی کا وقت آیا تو مسلم لیگ نے قربانی بھی دی۔ جب ہماری ٹرین جہلم پہنچی۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ وہاں اتنے لوگ آ گئے کہ ہم سو نہیں سکے تھے۔ صبح گاڑی لاہور پہنچی تو وہاں بھی لوگ موجود تھے۔ کھانے پر لے گئے۔ بڑی مہمان نوازی کی۔ کھانا تو ہمیں الہ آباد مسلم لیگ نے بھی دیا۔ لیکن سب سے بڑی مہمان نوازی بنارس کے مسلمانوں نے کی۔ جب ہم بنارس پہنچے۔ شام کا وقت تھا۔ وہاں مسلم لیگی ورکروں نے پلیٹ فارم بھر ہی سو آدمی کے لئے دسترخوان لگا دیا۔ میں نے رضا کاروں سے کہا کہ یہاں صرف تین چار منٹ کے لئے گاڑی رکتی ہے۔ اس لئے ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔ گاڑی میں ہی کھا لیں گے۔ بنارس والوں نے اصرار کیا کہ جتنا کھانا کھا سکتے ہیں۔ کھا لیں۔ اس اثنا میں ریلوے کا گارڈ ہمارے پاس آیا۔ وہ اینگلو انڈین تھا۔ کہنے لگا، جلدی کھانا کھا لیں۔ ہم نے کہا۔ نہیں آپ گاڑی چلائیں۔ اس نے کہا گاڑی کا ڈرائیور مسلمان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک یہ رضا کار کھانا نہیں کھا لیں گے۔ گاڑی نہیں چلے گی۔ میں نے رضا کاروں سے کہا کہ آپ ٹرین لیٹ مت کریں اور جلدی کھانا کھا لیں۔ کھانا کھا کے ہم اپنے ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ تھرڈ کلاس کے تین ڈبے تھے۔ گارڈ پھر ہمارے پاس آیا۔ میں نے کہا ہم نے کھانا کھا لیا ہے۔ آپ گاڑی چلائیں۔ اس نے بتایا کہ ڈرائیور گاڑی نہیں چلاتا کہ جب تک وفد کا لیڈر آ کے نہیں کہے گا میں گاڑی نہیں چلاؤں گا۔ وہ مجھے اس کے پاس لے گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ہم نے کھانا کھا لیا ہے۔ آپ گاڑی چلائیں۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے اب جب تک آپ اپنے ڈبے میں جا کے بیٹھ نہیں جاتے میں گاڑی نہیں چلاؤں گا۔ گارڈ میرے ساتھ ڈبے تک آیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس نے جھنڈی دی۔ پھر ڈرائیور نے گاڑی چلائی۔ اتنا جذبہ تھا کہ ڈرائیور کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اس کی نوکری چلی جائے گی۔

وہاں ہم نے ایک اردو کا اخبار دیکھا جس پر اقبال کا شعر درج تھا ع

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی دیکھ

بہار میں ہم نے بڑے خوفناک حالات دیکھے۔ کنوئیں مسلمانوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے رضا کاروں کا دستہ مقامی مسلم لیگ کے حوالے کر دیا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ کے ساتھ ابھی سے یہ کچھ ہو رہا ہے جبکہ انگریز بھی یہاں ہے۔ جب وہ چلے جائیں گے۔ پھر یہ لوگ آپ کے ساتھ پتہ نہیں کیا سلوک کریں۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں ہمیں خوب معلوم ہے کہ پھر تو ہندو ہمیں مار ڈالیں گے۔ لیکن اگر ہمارے مرنے سے پاکستان بنتا ہے تو ہم مرنے کو تیار ہیں۔ یہ جذبہ تھا۔

سہروردی صاحب اس وقت متحدہ بنگال کے پرائم منسٹر تھے۔ انہیں نے وہاں دوائیوں کی ایک ٹرین بھیجی۔ ہندوستان میں انگریز کی بادشاہی تھی۔ لیکن انہوں نے دوائیوں کی ٹرین بھیج دی۔ ڈاکٹر کرنل جعفر اس کے انچارج تھے۔ این ایم خاں آئی سی، ایس کو بھی انہوں نے ساتھ بھیجا تھا۔ سہروردی مرحوم بڑے دلیر آدمی تھے۔ دلیری میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

س :- دلیر تھے تو ایوب خاں کے ایبڈو کو تسلیم نہیں کیا۔

ج :- ہاں - کہتے تھے اچھا کیا انہوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا۔ سیاسی طور پر لوگ مجھے بھول چکے تھے۔ اب پھر زندہ ہو گیا ہوں۔

س :- قائداعظمؒ کے بعد لیاقت علی اور لیاقت علی کے بعد۔

ج :- سہروردی ہی تھے - دلیری اور سٹیٹسمین شپ میں۔

س :- غالباً الطاف گوہر نے ایک دفعہ اس قسم کی بات لکھی تھی کہ سہروردی کے نزدیک پاکستان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

ج :- سہروردی صاحب کے دل میں پاکستان کے لیے بڑا درد تھا۔ ۶۲ء کی نیشنل اسمبلی میں میں اپوزیشن لیڈر تھا۔ سہروردی صاحب نے مجھے ایک نہیں دو مرتبہ کہا تھا کہ "آپ ایوب خاں سے کہیں کہ میں مرنے سے پہلے پاکستان کے لئے ایک آخری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک CONSTITUTIONAL SETTLEMENT (آئینی تصفیہ) ہو جائے۔ ورنہ میرے بعد کوئی ایسی شخصیت نہیں ہو گی جو یہ خدمت انجام دے سکے۔ میں ایوب خاں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں پاکستان میں نہ رہوں تو اس کے بعد جبتک ایوب خاں صدر ہوں میں ملک سے باہر چلے جانے کے لئے بھی تیار ہوں۔ بلکہ وہ اگر دوسری مرتبہ بھی صدر منتخب ہونا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دے دوں کیونکہ میں دل کا مریض ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ اب میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ لیکن میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دینا چاہتا ہوں اور مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔"

آپ نے اپنے سوال میں جو بات اٹھائی ہے۔ وہ میں کیسے مان لوں۔ میں نے سہروردی صاحب کے دل میں پاکستان کے لئے بہت ہی درد پایا۔ ان کا خیال تھا چونکہ میرے بھائی (جنرل حبیب اللہ خاں) کی ایوب خاں سے رشتے داری ہے۔ اس لئے میرے ایوب خاں کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہوں گے۔ لیکن میں تو اپوزیشن میں تھا۔ میرے ان کے ساتھ کوئی تعلقات نہیں تھے۔

س :- آپ نے ایوب خاں تک ان کی بات پہنچائی۔

ج :- پہنچائی۔ لیکن اس وقت کون سنتا تھا۔

س :- ولی خاں نے کہا ہے اور سردار شوکت حیات کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایوب خاں

چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان الگ ہو جائے۔

ج :۔ ایوب خاں ایسا کیوں چاہتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ نہیں چاہتے تھے اور ایسے ہی جب کہ کوئی ثبوت نہ ہو۔ خواہ مخواہ یہ کہہ دینا کہ وہ یہ چاہتے تھے۔ خدا جانے کیا چاہتے ہوں گے اور کون چاہتا ہوگا۔

س :۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے پالیسیاں ایسی اختیار کیں جن کا منطقی نتیجہ ایسٹ پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں نکلا۔

ج :۔ ہاں۔

س :۔ لیکن وہ یہ چاہتے ہوں کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جائے۔ ثبوت کوئی نہیں۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ سہروردی صاحب نے جس آئینی سمجھوتے کا آپ کے ساتھ ذکر کیا۔ وہ کیا تھا۔

ج :۔ یہ تو میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ اس وقت دونوں حصوں میں پیرٹی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ اس پر مہر ثبت کر دیتے۔ جو کچھ بھی ہوتا۔ افہام و تفہیم سے بات ہوتی۔

س :۔ انہوں نے ایک طرح سے اُس خدشے کا اظہار کر دیا جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک المیہ بن کے رونما ہوا۔

ج :۔ جو ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ انہوں نے بڑی صحیح بات کی۔ وہ ایک پیغمبرانہ بات تھی۔

س :۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان کے درمیان دو رابطے ہیں۔ ایک میں دوسرا پی آئی اے۔ واقعی جب دونوں رابطے ٹوٹ گئے تو بنگلہ دیش بن گیا۔ جب آپ نیشنل لیڈر شپ کو مسترد کر دیں گے تو پھر شیخ مجیب الرحمٰن کی صورت میں ریجنل لیڈر شپ کا اُبھرنا فطری بات ہے۔

ج :۔ مجیب تو سہروردی صاحب کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا۔

س :۔ آپ نے وہ منظر بھی دیکھا؟

ج :۔ ہاں۔ یونہی وہ بولنے لگتا تھا۔ سہروردی صاحب کہتے، چپ رہو۔ وہ ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ سہروردی صاحب کی بڑی شان تھی۔ جب انہیں ایوب خاں نے قید کر لیا۔ اس کے بعد وہ رہا ہوئے تو ان کی ٹرین جس سٹیشن پر جا کے رُکتی تھی۔ لاکھوں افراد ان کے استقبال کے لئے موجود ہوتے تھے۔ جب سہروردی صاحب نہیں رہے تو پھر مجیب آ گیا۔

س :۔ شیخ مجیب سے بھی آپ کی ملاقات رہی۔

ج :۔ کیوں نہیں۔

س :۔ وہ شروع سے ہی بنگلہ دیش بنانے کے حامی تھے۔

ج :- شروع میں تو نہیں تھا۔ میری اس سے زیادہ ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب میں نیشنل اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر تھا۔ سہروردی صاحب نے ایک این ڈی ایف بنائی ہوئی تھی۔

س :- اس وقت مجیب اسمبلی ممبر تو نہیں تھا۔

ج :- نہیں تھا۔ لیکن عوامی لیگ کا لیڈر تھا۔ اس لئے ملاقاتیں رہیں۔

س :- اس وقت بھی کوئی ایسا تاثر ملا کہ یہ علیحدگی چاہتا ہے۔

ج :- اُس وقت تو اس نے ایسی بات کبھی نہیں کی۔ بعد میں وہ کہتا تھا کہ لوگوں کے دل میں علیحدگی کا تاثر اس وقت پیدا ہوا۔ جب ایوب خاں نے کراچی کی بجائے دارالحکومت راولپنڈی کو بنا لیا۔ اس وقت تک بنگالیوں نے کراچی کو قبول کر لیا ہوا تھا اور کراچی ہمیں پسند بھی تھا۔ دارالحکومت تبدیل کیا گیا تو ہمارے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اگر تبدیل ہی کرنا تھا تو پھر ڈھاکہ کو کیوں نہیں بنایا کیونکہ ہم اکثریت میں ہیں۔ دوسرے وہ کہتا تھا کہ ستمبر ۶۵ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو ایسٹ اور ویسٹ ایک دوسرے سے کٹ گئے۔ ۱۷ روز لڑائی رہی۔ ان ۱۷ دنوں میں سنٹرل گورنمنٹ نے ایک فرد بھی ایسٹ پاکستان نہیں بھیجا۔ اس وقت تو ہم چائنا کی وجہ سے بچ گئے۔ پھر ہم نے سوچا کہ اس طریقے سے ہم نے رہنا ہے کہ جب لڑائی ہو تو ہمیں کوئی کمک وغیرہ نہیں ملے گی یہ تو بڑی بُری بات ہے اس سے بھی علیحدگی کا تاثر پیدا ہوا۔

س :- "الیکشن ہوتے رہتے تو علیحدگی کا المیہ پیش نہ آتا" یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے۔

ج :- الیکشن تو اُس زمانے میں ہو رہے تھے لیکن وہ بی ڈی کے الیکشن تھے۔ اگر لوگوں کو ووٹ کا حق دیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ سہروردی صاحب بھی بالغ رائے دہی کا حق مانگتے تھے کہ لوگوں میں احساسِ شرکت ضرور ہونا چاہیئے۔ فوج کے ذریعے تو احساسِ شرکت پیدا نہیں ہو سکتا۔

س :- جب مادرِ ملت ؒ کو ایوب خاں نے زبردستی ہروا دیا تو بھی ان میں علیحدگی کا تاثر ابھرا کیونکہ انہوں نے محترمہؒ کا ساتھ بڑے جوش و خروش سے دیا تھا۔ اس شکست سے وہ دل شکستہ ہو گئے کہ مغربی پاکستان ہی ہم پر حکومت کرے گا۔ حالانکہ مادرِ ملت ؒ کیلئے صدارت کا عہدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو جمہوریت کی خاطر میدان میں آئی تھیں۔

ج :- وہ ملک کی بہتری کی خاطر الیکشن لڑنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ جب سب لوگوں نے انہیں کہا کہ ایوب خاں کا مقابلہ آپ ہی کر سکتی ہیں اور جو وفد ان سے ملاقات کے لئے گیا اس میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی تھا۔

س :- آپ نے مادرِ ملت ؒ کی حمایت کی تھی۔

ج :- ہاں ہاں۔ بیشک۔

س :- ایوب خاں کی طرف سے آپ پر پریشر نہ ڈالا گیا؟

ج :- نہیں - جو پریشر نہیں لیتا تھا - اس پر پریشر نہیں ڈالا جاتا تھا۔

س :- وہ بھی اپوزیشن والوں کو خرید لیتے تھے۔ جب آپ اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر تھے۔ کوئی پیش کش ہوئی۔

ج :- مجھے کوئی پیش کش نہیں ہوئی۔

س :- پاکستان میں جب بھی مارشل لا لگا یا غیر نمائندہ حکومت قائم ہوئی۔ علاقائی عصبیتیں پھیلتی ہیں- کیوں؟

ج :- جب پورا سیاسی عمل نہیں ہوگا تو اس قسم کے فروعی مسئلے اٹھیں گے۔ علاقائی- قبائلی- شیعہ سُنی کے- جب بھی مارشل لا آیا ہے اس ملک پر قہر ٹوٹی ہے۔

س :- آپ متحدہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر تھے - اس وقت الیسٹ پاکستان اسمبلی ممبران کا رویہ کیا ہوتا تھا۔

ج :- ۶۲ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو اسمبلی بنی۔ اس میں ہم ۴۹ ممبران اپوزیشن بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ ان میں سے ۳۸ ایسٹ پاکستانی تھے۔ میں اپوزیشن لیڈر تھا۔ نواب زادہ نصراللہ خاں عوامی لیگ کے لیڈر تھے۔ انہوں نے وہاں میری بڑی مدد کی۔ کیونکہ بنگالیوں کو سنبھالنا کارے دارد تھا۔ نواب زادہ صاحب نے ان کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ وہ انہیں جانتے تھے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں بھی ارباب عبدالغفور خاں کی طرح بڑے انتھک آدمی ہیں - یہ دونوں کچھ ایک ٹائپ کے ہیں۔ نواب زادہ صاحب ۲۴ گھنٹے ان کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی کے دل میں کیا آجائے۔ انہیں اس بات کی تو پرواہ نہیں تھی کہ پارٹی مؤقف کیا ہے۔ نواب زادہ صاحب ان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ انہیں منانے کے لئے، قائل کرنے کے لئے۔ پھر وہ انہیں ساتھ لاتے تھے۔ یہ نواب زادہ نصراللہ خاں ہی کر سکتے تھے۔ بڑا کام کیا انہوں نے۔ ویسے میں گورنمنٹ سرکل والوں کا بھی ہمیشہ مشکور رہا۔ ملک قاسم وغیرہ کا۔ انہوں نے میری بڑی عزت کی۔ لیکن مجھے اپنے بنگالیوں پر کبھی اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ پتہ نہیں کب میرے مؤقف کی تردید کر دیں۔ آدمی کیا کہے۔ بڑے مشکل لوگ تھے۔

س :- مسلم لیگ کے جو ایسٹ پاکستانی ممبران تھے۔ ان سے بھی یہی خطرہ رہتا تھا۔

ج :- مسلم لیگ والے تو بڑے اچھے تھے۔

س :- نواب زادہ نصراللہ خاں سے آپ کا اچھا قرب رہا۔

ج :- ہاں، وہ میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ اس کوٹھی میں جہاں آپ بیٹھے ہیں۔ قائداعظمؒ کے سوا تقریباً ہر بڑی شخصیت نے قیام کیا ہے یا دعوت اٹنڈ کی ہے۔ میرے والد کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی - مثلاً لیاقت علی خاں - نواب بہادر یار جنگ - چوہدری خلیق الزمان نواب اسماعیل خاں اور نواب زادہ نصراللہ خاں وغیرہ پیر مانکی شریف بھی یہاں آتے تھے۔ جب

سرحد میں ریفرنڈم ہوا ہے تو یہیں سے والنٹیرز کام کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

س :۔ نواب زادہ نصراللہ کی بات ہو رہی تھی۔

ج :۔ نواب زادہ نصراللہ خاں بڑے ہی اچھے آدمی ہیں۔ بڑے ہی دیانتدار۔ بڑے مخلص۔ بڑے ہی انتھک۔ بڑے سیاسی۔ بڑے ہی پاکستانی۔ بڑے ہی محب وطن۔ کوئی ایسی خاصیت نہیں جو ان میں نہ ہو۔ یہ اور ارباب عبدالغفور خاں، دونوں فنانی اللہ ہیں۔ جنہوں نے اسلام اور پاکستان کے لئے اپنی جان وقف کر رکھی ہو۔ ٹھیک ہے نواب زادہ صاحب کبھی احرار میں رہے ہوں گے۔ لیکن وہ ایک بڑی ماضی کی بات ہے۔

س :۔ ذہنی تبدیلی بھی تو بہت بڑی بات ہے۔

ج :۔ ہاں۔ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ بڑے ہی بہادر ہیں۔ کسی چیز سے پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ مجھے تو ان دونوں کی دوستی پر بڑا فخر ہے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں اور ارباب عبدالغفور خاں۔ چوہدری فضل الٰہی بھی ہمارے ساتھ اسمبلی میں تھے۔ یو این او میں بھی ہم اکٹھے گئے۔ وہیں ہماری ان سے دوستی ہو گئی۔ چوہدری صاحب اچھے آدمی تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

س :۔ جمہوریت اور آمریت میں آپ کیا فرق کریں گے۔ کتابی تعریف کے لحاظ سے نہیں عملی صورت میں

ج :۔ عملی صورت میں یہ فرق ہے کہ ۷۱ء میں جب ایسٹ پاکستان میں جنگ ہو رہی تھی تو ہم نورالامین کے پاس گئے۔ راولپنڈی میں پشاور روڈ پر جہاں سپریم کورٹ ہے۔ وہاں ان کا بنگلہ تھا۔ قیوم خان تھے، غلام محمد خان لوندخوڑ تھے، میں تھا۔ کوئی پندرہ بیس آدمی تھے۔ نورالامین نے بتایا کہ ہم پریذیڈنٹ جنرل یحییٰ خاں سے مل کے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ امریکہ سے ساتواں بحری بیڑہ آ رہا ہے۔

میرا بھتیجا فوج میں تھا۔ وہ بھی ایسٹ پاکستان محاذ پر تھا۔ ۱۶ دسمبر ۷۱ء کو اس نے ہمارے ساتھ ٹیلی فون پر بات کی کہ حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ ہم انشاءاللہ جیتیں گے۔ یہی جیسے آج کل ہو رہا ہے۔ فرمان علی وغیرہ۔ یہی تو وہاں تھے۔ لوگ حالات سے بے خبر تھے۔ انہوں نے شاید فوج والوں کو خود ہی کہہ دیا ہو کہ چینی پیراٹروپر آ رہے ہیں۔ جب پیراٹروپر اترے تو ہماری فوج نے مزاحمت ہی نہیں کی۔ انہوں نے انہیں پکڑ لیا۔ کیونکہ وہ ہندوستانی پیراٹروپر تھے۔ ڈکٹیٹرشپ میں بڑی ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مارشل لاء تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

سیکنڈ ورلڈ وار میں میں انگلینڈ میں تھا۔ لیبیا میں انگریزوں کو بڑی شکست ہوئی۔ اپوزیشن نے کہا کہ اس پر بحث ہونی چاہیئے کہ یہ شکست کیوں ہوئی۔ پھر انہوں نے ایک ایک چیز بتائی کہ ہمارے ٹینک خراب تھے۔ ان میں ائرکنڈیشنر نہیں تھے۔ ایک ایک تفصیل انہوں نے بتائی۔ یہاں تک کہ چرچل جھنجھلا اٹھا۔ لیکن اگلی دفعہ انہوں نے سب غلطیوں کو ٹھیک کر لیا۔ جرمنی میں

ایسی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہٹلر تو کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ڈکٹیٹر تو تنقید سے بالا ہوتا ہے۔ بالآخر وہ مارا گیا۔

جس زمانے میں حسین شہید سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ یہ کابل گئے۔ وہاں وزیر اعظم افغانستان سردار داؤد سے ان کی ملاقات تھی۔ مجھے فارن آفس والوں نے بتایا کہ جب باتیں شروع ہوئیں تو سہروردی صاحب کے سامنے داؤد بول نہیں سکا تھا۔ سہروردی صاحب دلائل ہی ایسے دیتے تھے کہ داؤد کی زبان بالکل ہی بند ہو جاتی تھی۔ عوام کے منتخب نمائندے اور غیر منتخب نمائندے کے درمیان یہ فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ سہروردی صاحب بظاہر متاثر کن شخصیت نہیں تھے۔

س :- قیوم خان کے ساتھ آپ کے اختلافات بھی رہے۔ بقول آپ کے انہوں نے آپ سے زیادتیاں بھی کیں۔ ۷۰ء کے ضمنی انتخاب میں آپ انہی کی مسلم لیگ کے امیدوار بنے۔ یہ تبدیلی کیسے آئی۔

ج :- ۷۰ء کے عام انتخابات میں میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کرک کے علاقے سے کھڑا ہوا ایک ملاں صاحب تھے جن کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ جیت گئے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر میری خدمات کا یہی اعتراف ہے تو ٹھیک ہے۔ یعنی ایک ہی مرتبہ میں دل شکستہ ہوا۔ قیوم خاں کے ساتھ میری اُس زمانے سے لے کر اب تک کوئی بات ہی نہیں تھی۔ قیوم خاں اس الیکشن میں تین سیٹوں پر کھڑے ہوئے تھے اور جیت گئے تھے۔ پشاور کی سیٹ وہ چھوڑ رہے تھے۔ ان کے آدمی میرے پاس آئے کہ اس سیٹ کے لئے ہمارے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جو نیپ والوں کا مقابلہ کرے۔ اپنے منہ سے تعریف اچھی نہیں لگتی۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی ہو جس کا کہ بے داغ کیرئر ہے اور یہ سیٹ تم ہی جیت سکتے ہو۔ وہ چار روز تک میرے پاس آتے رہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ لوگ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے بڑا ہی مجبور کیا۔ میرا تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے کہا تم کہو گے کہ سیٹ کے لالچ میں آ گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ بات نہیں۔ ہم پاکستان کی خاطر آپ کے پاس آئے ہیں۔ تو پھر میں متحدہ مسلم لیگ کا امیدوار ہوا اور جیت گیا۔ یہ دو تین باتیں ہیں جنہیں میں مرتے دم تک اپنے لئے باعثِ فخر سمجھوں گا۔ ایک یہ کہ میں پاکستان مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ جب مشرقی پاکستان بھی ساتھ تھا۔ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ میں ان کا جانشین بنا۔ دوسرے میں متحدہ پاکستان کی سنٹرل اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوا۔ تیسری یہی کہ کونسل مسلم لیگ اور قیوم مسلم لیگ، دونوں کے لوگ میرے پاس آئے کہ تم ہی موزوں ترین آدمی ہو۔ یہ اعزازات میری زندگی کا سرمایہ افتخار ہیں اور مجھے کیا چاہیئے۔ مجھ جیسے ایک عاجز آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اتنے اعزازات بخشے۔

س :- پھر بھٹو صاحب کے ساتھ قیوم مسلم لیگ شریکِ اقتدار ہو گئی۔ آپ بھی اس میں

شامل تھے - وہ کیا مجبوری تھی -

ج :- کوئی مجبوری نہیں تھی - حالات ہی ایسے تھے جنھوں نے ہمیں یہ قدم اُٹھانے پر مجبور کیا - کیونکہ اس وقت یہ سرخپوش کھڑے ہوگئے تھے - انہوں نے دھماکے وغیرہ شروع کر دیئے تھے - یہاں بھی - بلوچستان میں بھی - بڑے جارحانہ انداز میں انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا - اس میں بھٹو صاحب بھی ان کے مخالف تھے - ہم بھی ان کے مخالف تھے - ان کے ساتھ ہماری کولیشن ہوئی - ہم نے اس پر اکٹھے کام کیا -

س :- تخریب کار افغانستان سے آرہے تھے یا ان کے آدمی تھے -

ج :- افغانستان سے آرہے تھے - ان کی ہمدردیاں تو وہاں تھیں - کارمل حکومت کے وزیر ان کو (ولی خاں) طورخم بارڈر پر چھوڑنے نہیں آئے اور پھر وہاں کارمل ولی بھائی بھائی کے نعرے نہیں لگے - یہ تو ابھی کی بات ہے -

س :- تخریب کاروں کو ختم کرنے میں آپ کامیاب ہوگئے ؟

ج :- پھر تو وہ ختم ہوگئے -

س :- بھٹو صاحب کے ساتھ یہ تعاون آپ گورنمنٹ میں شمولیت کے بغیر بھی کر سکتے تھے ؟

ج :- بھٹو صاحب بڑی واضح اکثریت لے کر آئے تھے - ہم نے کسی غیر جمہوری حکومت کے ساتھ شرکت نہیں کی تھی -

س :- بھٹو صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وزیروں کے ساتھ ان کا رویہ بڑا تذلیل آمیز ہوتا تھا ؟

ج :- نہیں نہیں -

س :- پراپیگنڈہ ہی ہے ؟

ج :- ہم نے تو نہیں دیکھا - پیپلز پارٹی والوں کے ساتھ ہوتا ہو تو اور بات ہے -

س :- وہ اپنی بات ٹھونستے تھے ؟

ج :- ایک مرتبہ بات ہو رہی تھی کہ ملک کی مالی صورتِ حال بڑی خراب ہے - میں نے کہا کہ سعودی حکومت کو اپروچ کرنا چاہیئے - پھر میں نے کہا کہ ہمیں یہ کچھ کہنا چاہیئے - بھٹو صاحب کو میری بات اتنی پسند آئی کہ کہا - اچھا پھر تم ہی جاؤ اور ان کے ساتھ اسی طریقے سے بات کرو جس طریقے سے یہاں کر رہے ہو - پھر انہوں نے سعودی حکومت کو لکھا کہ وزیر اعظم کا خصوصی نمائندہ آرہا ہے - ابھی پروگرام بن ہی رہا تھا کہ شاہ فیصل شہید کر دیئے گئے -

س :- ابھی وہ اقتدار میں ہی تھے کہ آپ مستعفی بھی ہوگئے ؟

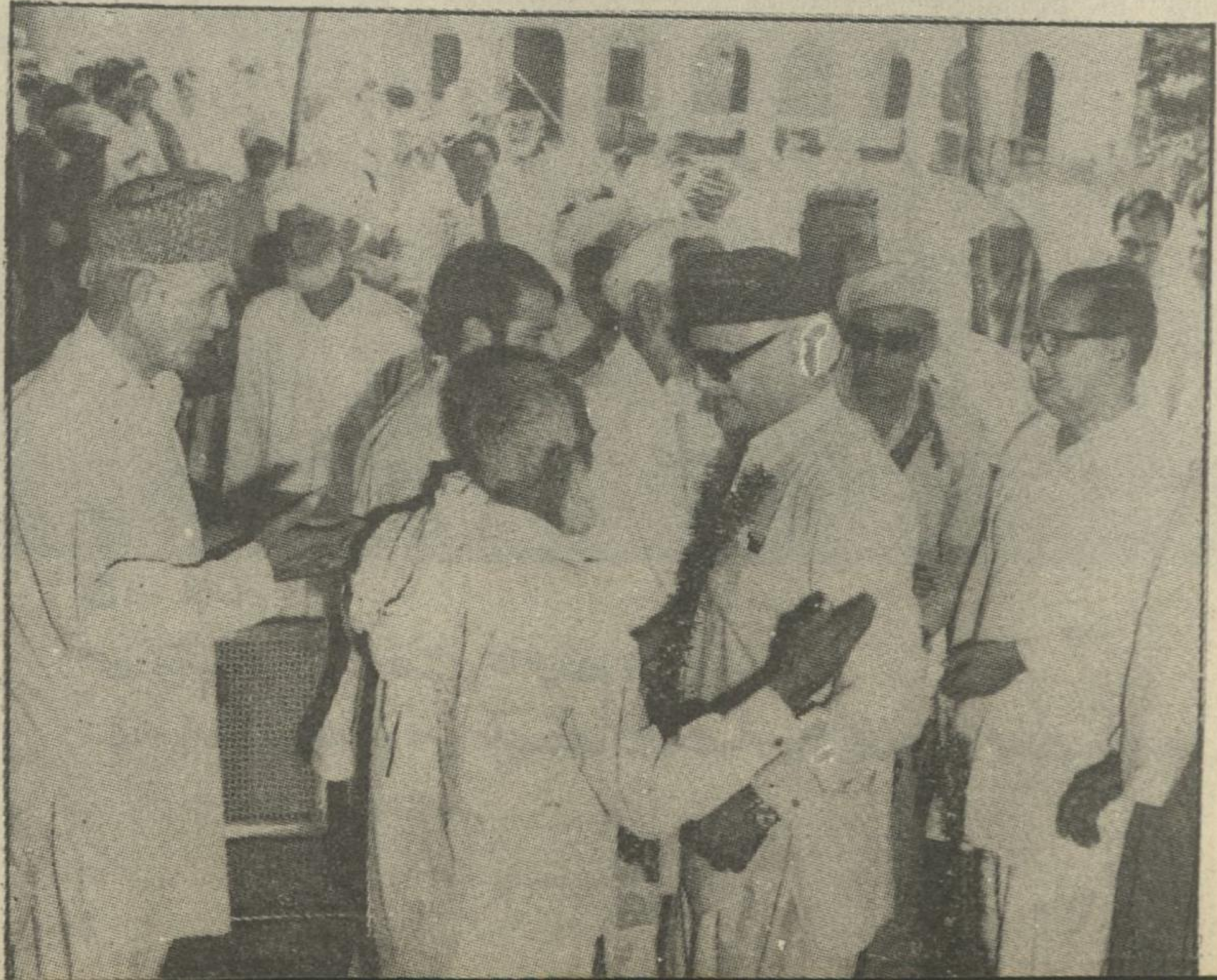
ج :- ہم نے دو دفعہ ریزائن کیا - ایک دفعہ ۱۸/ اگست ۱۹۷۶ء کو - دوسری مرتبہ تو پھر ہم چل ہی پڑے -

س :- ۱۸/ اگست ۷۶ء کو کیوں مستعفی ہوئے ؟



یو این او ۱۹۵۲ء - ایک جھوٹر کر، بیگم جسٹس طیب جی، بیگم رعنا لیاقت علی، اکبر طیب جی، شاہ فیصل (تب امیر فیصل وزیر خارجہ سعودی عرب) مسز اکبر طیب جی، یوسف خٹک۔

۳۰ - اگست ۱۹۷۹ - یوسف خٹک تخت نصرتی (ضلع کرک) میں مقامی لوگوں کے ساتھ۔



ج :- قیوم خان کے جلسے میں گڑ بڑ ہوئی تھی ۔

س :- پیاسی والوں نے جو کراچی میں کیا تھا ۔

ج :- ہاں۔ ہم نے استعفا دے دیا تھا۔ بھٹو صاحب جتنی بھی منتیں ہماری کر سکتے تھے۔ انہوں نے کیں۔ ہم حیران ہو گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم استعفا دیں گے۔ کچھ وہ کہیں گے۔ کچھ ہم کہیں گے اور پھر ہم آ جائیں گے۔ لیکن ان کے تو ہوش و حواس ہی اُڑ گئے۔ کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا ہو گیا؟ میں آپ کو کبھی نہیں جانے دوں گا۔ پلیز۔ عینکیں ان کی سامنے پڑی تھیں۔ ڈھونڈنے لگے کہ میری عینکیں کہاں گئیں۔ کیونکہ انہیں ہمارے استعفوں کی توقع نہیں تھی۔ ہم نے کہا آپ کی عینکیں یہ پڑی ہیں ۔

س :- آپ ان کی کابینہ میں رہے۔ ان کی شخصیت پر کیا روشنی ڈالیں گے؟

ج :- بھٹو صاحب کی اپنی شخصیت تھی۔ انہوں نے اچھے کام بھی کئے۔

س :- مثلاً

ج :- مثلاً شملہ کانفرنس۔ اب کچھ لوگوں نے انہیں شملہ کانفرنس کا کریڈٹ نہیں دیا۔ تین تحصیلیں اور ہمارے ۹۰ ہزار فوجی انڈیا کی قید میں تھے۔ اِن کے پاس کیا تھا۔ یہ تو وہاں ایک شکست خوردہ وزیر اعظم کی حیثیت سے گئے تھے۔ سارے فوجی آزاد کرائے۔ تینوں تحصیلیں چھڑائیں۔ کشمیر کا یہ تھا کہ اس کے خود ارادیت کی بات کی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شملہ معاہدہ بھٹو صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔

س :- پریذیڈنٹ صاحب اسے اندرا گاندھی کا کارنامہ کہتے ہیں ؟

ج :- یہ تو نہیں کہتے کہ پاکستان کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ یہی کہتے ہیں ناں کہ ایک اچھا فیصلہ ہوا ہے۔ وہ تو ہم بھی کہتے ہیں کہ بڑا اچھا فیصلہ ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو صاحب کا بڑا کارنامہ شملہ کانفرنس ہے۔

س :- اسلامی سربراہی کانفرنس اور ری پراسیسنگ ؟

ج :- کام تو وہ بہت کرتے تھے۔ انہوں نے اچھے کام بھی کئے تھے۔ باقی ایسے غیر جمہوری انداز تو تھے ان کے۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتے گئے کہ آخر میں ان کو ہاتھ دھونا پڑے۔ لیکن آئے وہ جمہوری عمل کے ساتھ تھے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیئے۔

س :- اور گئے ؟

ج :- اور گئے غیر جمہوری عمل کے ساتھ اُس وقت اگر پھر الیکشن ہو جاتے تو جیت جاتے۔

س :- اب بھی یہی کیفیت ؟

ج :- اچھا۔

س :- آپ بھی تو شملہ وفد میں شامل تھے ؟

ج :- ہاں۔ میں تھا۔ ارباب سکندر خاں خلیل تھے۔ شیرپاؤ تھے۔ عزیز احمد تھے۔ رفیع رضا



۳ جولائی ۱۹۷۲ء ذوالفقار علی بھٹو (تب صدر پاکستان) اور مسز اندرا گاندھی (تب وزیر اعظم بھارت) شملہ معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد ہاتھ ملا رہے ہیں۔

تھے۔ غلام مصطفےٰ جتوئی تھے۔ ڈاکٹر غلام حسین تھے۔ بڑے پُروقار طریقے سے ہم وہاں گئے۔

س :- ان دنوں ہم نے سُنا تھا کہ اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کے دوران میں ڈیڈلاک بھی پیدا ہو گیا تھا۔

ج :- پہلے تو انڈیا نے بڑی ہی INSULTING TERMS (توہین آمیز شرائط) رکھیں اور یہ ڈیڈلاک تین دفعہ پیدا ہوا۔ تینوں دفعہ ہمیں کہا گیا کہ سامان پیک کر لو۔ ہم نے تینوں دفعہ اپنا سامان پیک کر لیا۔ لیکن پھر اندرا گاندھی مان جاتی تھیں۔

س :- تینوں دفعہ مان گئیں؟

ج :- تینوں دفعہ مان گئیں۔

س :- تینوں دفعہ تین مختلف مسائل پر ڈیڈلاک پیدا ہوا؟

ج :- ہاں تینوں دفعہ تین مختلف مسائل پر ڈیڈلاک پیدا ہوا؟

س :- وہ کیا شرائط تھیں؟

ج :- یاد نہیں۔

س :- مفہوم ہی سہی؟

ج :- بالکل یاد نہیں۔ کچھ فوج وغیرہ کے متعلق تھا۔

س :- کیا؟

ج :- یاد نہیں۔

س :- کچھ ہلکا پھلکا تو؟

ج :- اندرا نے فوج وغیرہ کے متعلق کچھ توہین آمیز باتیں کیں کہ اتنی فوج رکھو۔ ایسی شرائط تھیں کہ یہ قبول نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھٹو صاحب نے اپنے وفد کی میٹنگ بلائی۔ بات چیت تو یہی کرتے تھے۔ لیکن وفد والوں کے ساتھ مشورہ تو کرتے تھے۔

س :- اندرا نے کہا۔ فوج کم رکھو۔ بھٹو صاحب نہیں مانتے تھے؟

ج :- مجھے تفصیل یاد نہیں۔ لیکن جو بھی شرائط تھیں۔ بڑی توہین آمیز تھیں۔

س :- ملک و قوم کے خلاف جاتی تھیں؟

ج :- ہاں، ملک و قوم کے خلاف جاتی تھیں۔ بھٹو صاحب نے کہا یہ ہم نہیں کریں گے۔ پھر اندرا مان گئی۔

س :- سُنا تھا کہ اندرا کو منوانے کے لئے روس نے بھی مداخلت کی؟

ج :- وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔ پرابلم تو بڑا تھا۔ مذاکرات ناکام ہوتے تو STATE OF WAR (جنگ کی کیفیت) رہتی۔ روس بھی نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان بالکل ختم ہو جائے۔ امریکہ اور روس دونوں نہیں چاہتے تھے۔

س :- اور اب؟

ج :- اب معلوم نہیں کہ روس کیا چاہتا ہے۔ اب تو حالات اور ہیں۔ پرابلمز اور آگئی ہیں۔ اب تو روس کے ارادے اور ہیں۔

س :- کیا ارادے ہیں ؟

ج :- یہی خلیج کی طرف جانے کے۔ افغانستان تک تو وہ نہیں رہنا چاہتے۔ گرم پانی کی طرف جانا چاہتے ہیں۔

س :- سرحد میں مقامی لوگوں اور افغان مہاجرین کے درمیان کوئی نفرت ہے ؟

ج :- نہیں نفرت تو نہیں ہے۔ لیکن ایک پرابلم تو ہے۔ ہماری معیشت پر بوجھ ہے۔ کیونکہ انہوں نے واپس جانا نہیں۔ کیسے جائیں گے۔ روس افغانستان نہیں چھوڑے گا۔ یہ جائیں گے نہیں۔ اس لئے ان کی بحالیات کا کوئی طریقہ کرنا چاہیئے۔

س :- کہتے ہیں کہ یہ پشاور میں ٹرانسپورٹ اور دوسرے کاروبار پر قابض ہو رہے ہیں؟

ج :- نہیں۔ کوئی ایسا زیادہ نہیں۔

س :- اے بی اعوان کہتے ہیں کہ کل کو یہ ہمارے لئے پرابلم بن سکتے ہیں؟

ج :- اس لئے ان کی بحالیات کا کچھ کرنا چاہیئے۔ پھر پرابلم نہیں بنیں گے۔ بلوچستان وغیرہ میں بڑی زمینیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہاں اگر انہیں بحال کر دیا جائے تو بلوچستان کی فوڈ پرابلم بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گی۔ ان کو عزتِ نفس بھی مل جائے گی کہ ہماری کوئی جگہ ہے۔ لیکن اگر یہ ایسے ہی چلتی پھرتی آبادی کے طور پر رہے تو پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں۔

س :- انہیں بکھیر کر آباد کرنا چاہیئے یا ایک ہی جگہ ؟

ج :- جیسے بھی کریں۔ ایک جگہ بھی کر دیں تو کیا ہو جائے گا۔

س :- کل کو اس سرزمین سے ان کی وفاداری ہو گی ؟

ج :- جہاں سے کھائیں گے۔ وہاں سے وفاداری بھی ہو جائے گی۔

س :- اس مسئلے پر دو موقف ہیں۔ ایک ولی خان کا ہے۔ وہی پنجاب کے عوام کا ہے۔ اگرچہ وہ ولی خان کی وجہ سے نہیں؟

ج :- پنجاب میں تو بہت کم آئے ہیں۔

س :- نہیں۔ ویسے ہی وہ کہتے ہیں کہ روس کے ساتھ کوئی بات چیت ہونی چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی سیاستدان ہوتا تو اس مسئلے کو بات چیت سے کب کا حل کر چکا ہوتا۔ وہ ہیں دراصل بھٹو صاحب کے عقیدت مند۔ آپ کو پتہ ہے کہ پنجاب و سندھ میں وہ بے پناہ اکثریت میں ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اس وقت بھٹو ہوتا تو وہ ماسکو میں بیٹھا ہوتا۔ دوسرا موقف جماعت اسلامی کا ہے۔ گورنمنٹ کا موقف بھی یہی ہے۔ لیکن اسے پبلک سپورٹ حاصل نہیں۔ آپ کس موقف کے حامی ہیں ؟

ج :- اب وہ آگئے ہیں۔ کسی نے انہیں بلایا تو نہیں اور بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ وہ

کیسے جائیں گے۔ جب تک کہ روس اس کے لئے تیار نہ ہو۔

س :۔ "روس کو تو ہم نے شروع سے ہی ناراض کر لیا جب ہمارے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں روس کی بجائے امریکہ چلے گئے جبکہ دعوت نامہ دونوں ملکوں سے آیا تھا" ایک یہ بھی نقطہ نظر ہے۔ آپ نے لیاقت علی خاں سے کبھی اس موضوع پر گفتگو کی۔ کیونکہ یہ اسی زمانے سے زیر بحث ہے؟

ج :۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ لوگ کہتے ہیں۔ آپ روس کیوں نہیں گئے۔ امریکہ کیوں چلے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ "روس اور امریکہ دونوں جگہ سے دعوت تھی۔ لیکن تاریخ مقرر نہیں تھی۔ میں نے دو مرتبہ روس گورنمنٹ سے پوچھا کہ ہمیں دورے کی تاریخ سے آگاہ کریں۔ دونوں مرتبہ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگر وہ تاریخ مقرر کر دیتے تو میں روس چلا جاتا لیکن امریکہ نے تاریخ مقرر کر دی۔ میں وہاں چلا گیا"

س :۔ کوریا کی جنگ کے سلسلے میں امریکہ لیاقت علی خاں سے ناراض بھی ہوا؟

ج :۔ کوریا کی جنگ میں امریکہ ملوّث تھا۔ انڈیا نے انہیں ریڈ کراس کا ایک پورا ہسپتال بھیجا تھا۔ پاکستان نے یہ بھی نہ کیا تو لیاقت علی خاں پر امریکہ نے بڑا زبردست پریشر ڈالا کہ آپ ٹوکن فورس کے طور پر ہمیں ایک بریگیڈ فوج ہی بھیج دیں۔ لیاقت علی خاں آمادہ نہ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ کچھ نفری ہی بھیج دو۔ لیاقت علی خان نے مجھے بتایا کہ "میں نے امریکہ کو کہا تھا ہماری فوجی نفری تو پہلے ہی کم ہے۔ ہم ایک بریگیڈ بھی بھیج دیں تو ہماری فوج اتنی کم ہے کہ اگر ہندوستان ہم پر حملہ کر دے تو پھر ہم کیا کریں گے۔ آپ ہمیں یقین دلائیں کہ اگر ہم آپ کو فوج بھیجیں اور ہندوستان ہم پہ حملہ کر دے تو آپ ہماری مدد کو آئیں گے۔ امریکہ نے کہا کہ ہم آپ کو یقین دہانی نہیں کرا سکتے۔ لیکن ہندوستان آپ پر حملہ نہیں کرے گا۔ میں نے کہا کہ یہ یقین دہانی ہمارے لئے کافی نہیں۔ ان حالات میں ہم کچھ نہیں کر سکتے"۔

لیاقت علی خان نے تو بالکل واضح پالیسی اختیار کی تھی۔ ایک طرف نہ دوسری طرف۔ وہ نیوٹرل پالیسی پر چل رہے تھے۔ وہ کسی بلاک میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس وقت بلاک بن تو چکے تھے۔ لیکن زیادہ اجاگر نہیں ہوئے تھے۔

س :۔ وہ آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہتے تھے؟

ج :۔ وہ آزاد خارجہ پالیسی جو پاکستان کے حق میں ہو۔

س :۔ کہتے ہیں کہ وہ مسلم بلاک بنانے کی طرف بھی توجہ دے رہے تھے؟

ج :۔ مجھے اس کا ذاتی علم نہیں۔ لیکن سُنا ہے کہ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۱ء والی تقریر میں وہ عالمِ اسلام کو ایک پیغام دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر شروع بھی ان الفاظ سے کی۔ برادرانِ اسلام" یہ لفظ ادا ہوئے ہی تھے کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔

س :۔ وہ اپنی ہر تقریر ان الفاظ سے شروع کرتے تھے یا انہوں نے اسی تقریر کے لئے

یہ آغاز منتخب کیا تھا؟

ج :۔ تقریر میں تو میں نے ان کی بہت سنی ہیں۔ لیکن اس وقت خیال نہیں آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہی تقریر انہوں نے برادرانِ اسلام کے الفاظ سے شروع کی تھی۔

س :۔ ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ شہید ہو گئے۔ اس لئے وہ الفاظ یاد رہ گئے؟

ج :۔ ہاں۔

س :۔ اگر اس وقت روس لیاقت علی خاں کے دورے کی تاریخ مقرر کر دیتا تو ہمارے لئے اچھا نہ ہوتا۔ کیونکہ جغرافیائی طور پر ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں؟

ج :۔ افغانستان کے بھی روس کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے۔ افغانستان غیر جانبدار ملک بھی تھا۔ بے حد اچھے تعلقات کے باوجود روس وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ افغانستان اپنے سارے کیڈٹ تعلیم کے لئے روس بھیجتا تھا۔ انھی کیڈٹوں نے پھر انقلاب کیا۔

س :۔ اگر امریکہ لیاقت علی خاں کو یہ یقین دلا دیتا کہ پاکستان پر حملے کی صورت میں ہم آپ کی مدد کو آئیں گے تو پھر لیاقت علی خاں فوجی بریگیڈ یا کچھ نفری بھیج دیتے؟

ج :۔ بھیج دیتے یا نہ بھیج دیتے کے مفروضے میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سیاستدان ایک بات کرتا ہے تو کئی پہلو اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ لیاقت علی خاں کو معلوم تھا کہ امریکہ ایسی یقین دہانی نہیں کرائے گا۔ لیاقت علی خاں بڑے معاملہ فہم آدمی تھے۔ اگر امریکہ یقین دہانی کرا بھی دیتا تو وہ اسے ایسا باندھتے کہ پاکستان پر حملہ امریکہ پر حملہ تصور ہوتا۔ اس قسم کی گارنٹی پر کہ پاکستان پر حملہ امریکہ پر حملہ ہو گا۔ وہ فوجی نفری بھیج دیتے۔ کیوں نہ بھیجتے۔

س :۔ سٹیٹسمین تو وہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں؟

ج :۔ اگر وہ اس طرح پاکستان کے لئے بہت بڑی امداد لے لیتے تو میں کہتا ہوں۔ لیاقت علی خاں کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہوتا۔

س :۔ لیاقت علی خاں کے بعد ہمارے تین بڑے بیوروکریٹ۔ غلام محمد، سکندر مرزا اور چوہدری محمد علی ہمارے سیاسی افق پر آ گئے۔ لیاقت علی خاں کی زندگی میں بیوروکریسی کا کیا رویہ تھا؟

ج :۔ لیاقت علی خاں کے زمانے میں کوئی بیوروکریسی نہیں تھی۔ بیوروکریسی کو لوگ برا بھلا کہتے ہیں۔ اگر سیاسی عمل مضبوط ہو تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جب پولیٹیکل پراسیس مضبوط نہیں ہو گا تو پھر ہر ایک آ کے سواری کرے گا۔ بھٹو صاحب کی حکومت مضبوط حکومت تھی۔ سیکرٹری وغیرہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ان سے بیوروکریسی بڑا ڈرتی تھی۔ بڑی تابع فرمان تھی۔ خود جنرل ضیاء الحق صاحب ان کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ کہ آپ نے کمال کر دیا۔ بڑے باادب کھڑے رہتے تھے۔ انہیں تو ۵ اجرنیلوں سے اوپر بنایا تھا۔

س :۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ جنرل صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ بھٹو صاحب آ گئے۔

انہوں نے جلتا ہوا سگریٹ جیب میں ڈال لیا۔

ج :۔ کیا ہوگا۔ میرے سامنے نہیں ہوا۔ ضرور کیا ہوگا۔ وہ جی پرائم منسٹر تھا۔ بڑے دبدبے والا پرائم منسٹر تھا۔ اب آدمی خود کام نہ کرسکے۔ اور کہے اُن کی غلطی ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

س :۔ سُنا ہے بھٹو صاحب سگریٹ نکالتے تھے تو جنرل صاحب ماچس نکال کر ان کا سگریٹ سلگاتے تھے۔

ج :۔ یہ نہیں پتہ۔

س :۔ اور یہ بات بھی زبان زدِ عام ہے کہ جنرل صاحب بھٹو صاحب کو شراب کا گلاس پیش کرتے تھے۔

ج :۔ نہیں۔ یہ زیادتی ہے۔ ایسا کوئی بھی نہیں کرتا۔

س :۔ آپ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب سے بیوروکریسی بڑا ڈرتی تھی۔ بڑی تابع فرمان تھی۔ بھٹو صاحب کے سامنے بیوروکریسی کا یہ حال تھا تو لیاقت علی خانؒ کے سامنے کیا کیفیت ہوگی؟

ج :۔ جب راولپنڈی سازش پکڑی گئی ہے تو پنجاب میں الیکشن کی سرگرمی تھی۔ لیاقت علی خاں سپیشل ٹرین پر سرگودھا گئے ہوئے تھے۔ ان کا ایک انداز تھا کہ بیڈروم میں ہی شیو کرلیتے تھے۔ وہیں ٹرے میں شیو کا سامان اور چھوٹا سا شیشہ آجاتا تھا۔ سکندر مرزا اس وقت ڈیفنس سیکرٹری تھا۔ وہ اور جنرل ایوب خاں سات بجے صبح اسی پلیٹ فارم پر پہنچے۔ دو گھنٹے تک وہیں پھرتے رہے۔ جب تک کہ لیاقت علی خاں تیار نہیں ہوگئے۔ انہیں نہیں ملے۔

س :۔ یہ دونوں بتانے آئے تھے کہ سازش پکڑی گئی ہے؟

ج :۔ ہاں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

س :۔ بیوروکریسی کو انہوں نے اس کے مقام پر رکھا تھا۔ اس وقت اس کا سیاست پر کوئی ہولڈ نہیں تھا؟

ج :۔ بالکل نہیں۔ ان کی تو جان جاتی تھی۔ ایوب خان لیاقت علی کے سامنے بڑا باادب کھڑا ہوتا تھا۔ جیسے معمولی سپاہی۔ بالکل اٹنشن۔ اردلی کا لفظ میں نے استعمال نہیں کیا۔ لیاقت علی خاں کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑا رعب تھا۔ وہ اپنی ہی ٹائپ کے آدمی تھے۔

س :۔ سکندر مرزا بھی لیاقت علی خاں کے سامنے اسی طرح کھڑا ہوتا تھا۔ جس طرح کہ ایوب خاں؟

ج :۔ بالکل۔

س :۔ سات بجے سے نو بجے تک یہ دونوں وہاں ٹہلتے رہے۔ جب تک کہ لیاقت علی خاں تیار نہیں ہوگئے۔ اس دوران میں انہیں ان کے سیلون کا دروازہ بھی کھٹکھٹانے کی جرأت نہ ہوئی؟

ج :۔ نہیں نہیں جی۔ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

س :۔ ان لوگوں کا پھر قائداعظمؒ کے سامنے کیا حال ہوتا ہوگا؟

ج :۔ وہاں اور بھی بُری حالت ہوتی ہوگی۔ نہیں صاحب کوئی بھی سیاسی پارٹی آئے۔



۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء — وزیراعظم بھٹو مصری فوج کے چیف آف سٹاف اور ملٹری وفد کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل محمد علی فہمی سے پرائم منسٹر ہاؤس راولپنڈی میں باتیں کر رہے ہیں۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق بھی موجود ہیں۔

ان کے سامنے سبھی ایسے ہوتے ہیں۔ سول سروس جیسا بزدل آدمی تو دنیا میں کہیں ہے نہیں۔

س :۔ مارشل لا میں ان کی خوب موج ہے ؟

ج :۔ ظاہر ہے۔ فوجیوں سے انہیں زیادہ سمجھ ہوتی ہے۔ یہ پھر ان کو چلاتے ہیں۔ اگر کسی منسٹر کو کسی چیز کی سمجھ ہی نہ ہو۔ نہ وہ آرڈر لکھ سکے تو بیوروکریٹ اس پر سوار ہوگا۔ لیکن جسے سمجھ ہو اس پر بیوروکریٹ کیا کر سکتا ہے۔ اگر آپ ایک ان پڑھ وزیر بھیج دیں تو قدرتی طور پر بیوروکریٹ اس پر سوار ہوں گے۔

س :۔ بیوروکریسی کو یہ صورتِ حال سوٹ بھی کرتی ہے ؟

ج :۔ ہاں، بالکل۔

س :۔ یہیں سے لوگ قیاس کرتے ہیں کہ بیوروکریسی جوڑ توڑ کر کے فوج کو اقتدار میں لاتی ہے ؟

ج :۔ جب آپ خود کمزور ہوں گے تو پھر اوروں پر الزام کیا لگانا۔

س :۔ سکندر مرزا کے متعلق آپ کیا کہیں گے ؟

ج :۔ پشاور میں ڈپٹی کمشنر رہا۔ ڈپٹی کمشنر لیول پر ٹھیک تھا۔ یہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ ملک کا پریذیڈنٹ ہو کے اتنے سارے معاملات سلجھا سکتا۔ یہ پاکستان کا پریذیڈنٹ تو بن گیا لیکن کام ڈی سی کے لیول کے کرتا رہا۔

س :۔ جمہوری عمل کو بھی نقصان پہنچایا۔

ج :۔ بہت، مارشل لا تو اسی نے لگایا۔ کہتا تھا کہ میں نے ایوب خاں کو مارشل لا لگانے کا کہہ تو دیا اور جب مارشل لا لگ گیا تو تین منٹ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے شدید غلطی کرلی ہے۔ یہ اتنا بیوقوف تھا کہ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس آئین کی وجہ سے ہی یہ پریذیڈنٹ ہے۔ جب آئین چلا جائے گا تو پھر حکومت فوج کے کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں آجائے گی پھر تم کہاں رہو گے۔ پھر تم کچھ نہیں ہو۔ لیکن یہ اتنی سی بات کو نہ سمجھ سکا۔ اس لئے کہ ڈی سی لیول کا تھا۔

س :۔ اس پر برطانوی ایجنٹ ہونے کا الزام بھی لگا۔

ج :۔ ہمارے ہاں یہ نظریہ عام ہے کہ دنیا کے سارے ملک پاکستان کے معاملات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ برطانیہ کو کیا تھا کہ یہاں اپنا ایجنٹ رکھتا۔ کیا کرنا چاہتا تھا وہ۔ یہاں سے تو وہ چلے گئے۔ فلاں ایجنٹ ہے۔ فلاں فلاں کا ایجنٹ ہے۔ فلاں سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ یہ باتیں یہاں عام ہیں۔ خواہ اُن ملکوں اور سی آئی اے کو اپنے ایجنٹ کا خود علم نہ ہو۔

س :۔ تحریک بحالِ جمہوریت کی موجودہ تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج :۔ تخریب کاری بذاتِ خود بڑی بُری چیز ہے۔ اس سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مزید اُلجھ جاتے ہیں۔ ہمیں بھی ضیاء الحق سے بہت ہی اختلاف ہے۔ لیکن یہ اختلاف اس حد تک

نہیں پہنچ سکتا اور نہ پہنچنا چاہیئے کہ ملک میں تخریب کاری ہو اور علاقائی اور صوبائی عصبیتیں پھیلیں یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔ حکومت کو اس کا تدراک کرنا چاہیئے۔ وہ اس طرح کہ سیاسی عمل پر ایک دفعہ پھر اور پورے طریقے سے عمل درآمد کیا جائے۔ اگر کسی علاقے کے لوگ واقعی غلط راہ پر چل نکلے ہوں تو انہیں لوگ جا کے سمجھا سکتے ہیں کہ یہ غلط بات ہے۔ لیکن اگر یہ علیحدگی کی موومنٹ ہے تو بڑی غلط بات ہے۔ مارشل لا کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ تخریب کاری یا علیحدگی کی کسی موومنٹ کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ مارشل لا تو ایک نہ ایک دن جائے گا ہی۔ چلو دس سال بعد ہی چلا جائے گا۔ لیکن ملک کو اگر کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کی تلافی کیا ہوگی؟

س :۔ اسے علیحدگی کی موومنٹ تو نہیں کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اخبارات کے مطابق علیحدگی پسندوں نے اسے مسترد کیا ہے اور جو لوگ جلسہ و جلوس نکالتے ہیں۔ وہ پیپلز پارٹی کے جھنڈے اٹھائے ہوتے ہیں اور وہ نعرے بھی جمہوریت اور بھٹو کے حق میں لگاتے ہیں؟

ج :۔ ہم وہاں گئے تو نہیں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں علیحدگی کا عنصر شامل ہے۔

س :۔ اگر سندھ میں مرتکز رہی تو پھر یہ منفی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ یا پھر فی الفور سیاسی عمل بحال کیا جائے۔ عام انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی جائے؟

ج :۔ بالکل۔ پنجاب کا فرض ہے کہ وہ اس تاثر کو دھو ڈالے اور سندھیوں سے کہے کہ تم اکیلے نہیں ہو۔ ہم سب ایک سیاسی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جس میں انشاءاللہ ہماری جیت ہوگی۔ لوگوں کو ان کے حقوق مل کے رہیں گے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر یہ موومنٹ سندھ تک محدود رہی تو اس سے خطرناک صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔

س :۔ آپ سیاسی عمل کو ہر قومی درد کی دوا قرار دے رہے ہیں۔ حکومت سے بات کرو تو وہ کہتی ہے۔ کیا انڈیا میں الیکشن نہیں ہوتے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ سری لنکا میں الیکشن نہیں ہوتے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

ج :۔ کیا ہو رہا ہے؟

س :۔ ہنگامہ آرائی۔

ج :۔ ہنگامہ آرائی تو نہیں ہوئی۔ وہاں تو جدا جدا اِشو ہیں۔ سکھ، سکھ سٹیٹ چاہتے ہیں۔ اگر سکھ سٹیٹ نہیں چاہتے تو وہ ایسی مراعات چاہتے ہیں۔ جو مذہبی بھی ہیں اور پانی کی تقسیم کے متعلق بھی ہیں۔ آسام میں وہ لوگ کہتے ہیں کہ بنگالیوں کو ووٹ مت دو۔ لیکن ہندوستان میں لوگوں سے ووٹ کا حق تو نہیں چھینا گیا۔ پھر تو اندرا گاندھی وہاں ایک دن بھی نہ رہے۔

س :۔ آپ کے خیال میں کسی بھی صورت میں ووٹ کا حق نہیں چھیننا چاہیئے۔

ج :۔ ایوب خاں نے ووٹ کا حق چھین کے بی ڈی سسٹم نافذ کر دیا تھا۔ ان کو جانا پڑا۔ ان کے برخلاف یہی بات تھی کہ انہوں نے عوام سے ان کا ووٹ کا حق چھین لیا تھا۔ حالانکہ بہت باتیں ایوب خاں کے زمانے میں اچھی بھی تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگوں کی عزت نفس اس ووٹ

میں ہے ۔ اگر ان کے پاس ووٹ کا حق ہے تو پھر بڑے سے بڑا آدمی بھی غریب سے غریب آدمی کی جھونپڑی میں جائے گا اور اگر وہ کسی وڈیرے یا کسی خان سے ناراض بھی ہو جائے تو کہتا ہے کہ اچھا ووٹ لینے کے لئے تو آئے گا۔ پھر میں اسے دیکھوں گا۔ ووٹ اس کی تمام عزتِ نفس کا مرکب ہے اور آپ اس سے اس کی عزتِ نفس چھین لیتے ہیں۔ اس سے بڑا کوئی جُرم نہیں ہو سکتا۔ کہ لوگوں سے ووٹ کا حق چھین لیا جائے۔ کسی کو احساسِ شرکت ہی نہ رہے۔ ایک گورنر ہوتا ہے۔ چند ایک رفقائے کار ہوتے ہیں۔ اچھے کام کئے یا بُرے۔ کوئی جواب دہی نہیں۔ اب کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سال اور دو، تین مہینے تو گزر گئے۔ بھئی آپ نے ساڑھے چھ سال میں نہیں کیا۔ اب کیا کرو گے۔

س :۔ پریذیڈنٹ نے بعض سیاسی پارٹیوں سے مذاکرات کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

ج :۔ آج (۲۳ اکتوبر) پروفیسر غفور کا بیان ہے کہ ایم آر ڈی والوں سے وہ از خود بات کریں گے۔ ابھی تو ڈیڑھ مہینہ بات چیت اور چلے گی۔ یہ ڈیڑھ مہینہ تو بہت مخدوش ہے۔ اس دوران میں پتہ نہیں کہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ کچھ نہ ہو۔ لیکن یہ وہی عرصہ ہے جس کے متعلق اندرا گاندھی نے چند لوگوں سے کہا ہے۔ پتہ نہیں کن لوگوں سے کہا ہے۔ لیکن اس سے یہ بات منسوب ہے کہ وہ اُن کی مدد کے لئے پاکستان پر حملہ کریں گے۔ لیکن اگر کوئی بات نہ بھی ہو تو بھی اس بات کو یونہی نہیں چھوڑ دینا چاہیئے کہ سندھی اپنے آپ کو الگ تصور کریں۔ اس کے نتائج بڑے ہی دور رس ہو سکتے ہیں۔ ایسی چھوٹی موومنٹ میں آہستہ آہستہ بڑھتے رہنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کا یہی علاج ہے کہ صدر سیاسی عمل بحال کر دیں اور ووٹ کی صورت میں لوگوں کی عزتِ نفس بھی بحال کریں۔

س :۔ بھٹو صاحب نے ۷۰ء کے انتخابات سے پہلے متناسب نمائندگی کا تذکرہ چھیڑا تو باقی تمام جماعتوں نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت نے بھی ان کی بات تسلیم نہ کی۔ اب معاملہ برعکس ہے۔ اب وہی جماعتیں متناسب نمائندگی چاہتی ہیں اور پیپلز پارٹی نہیں چاہتی۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

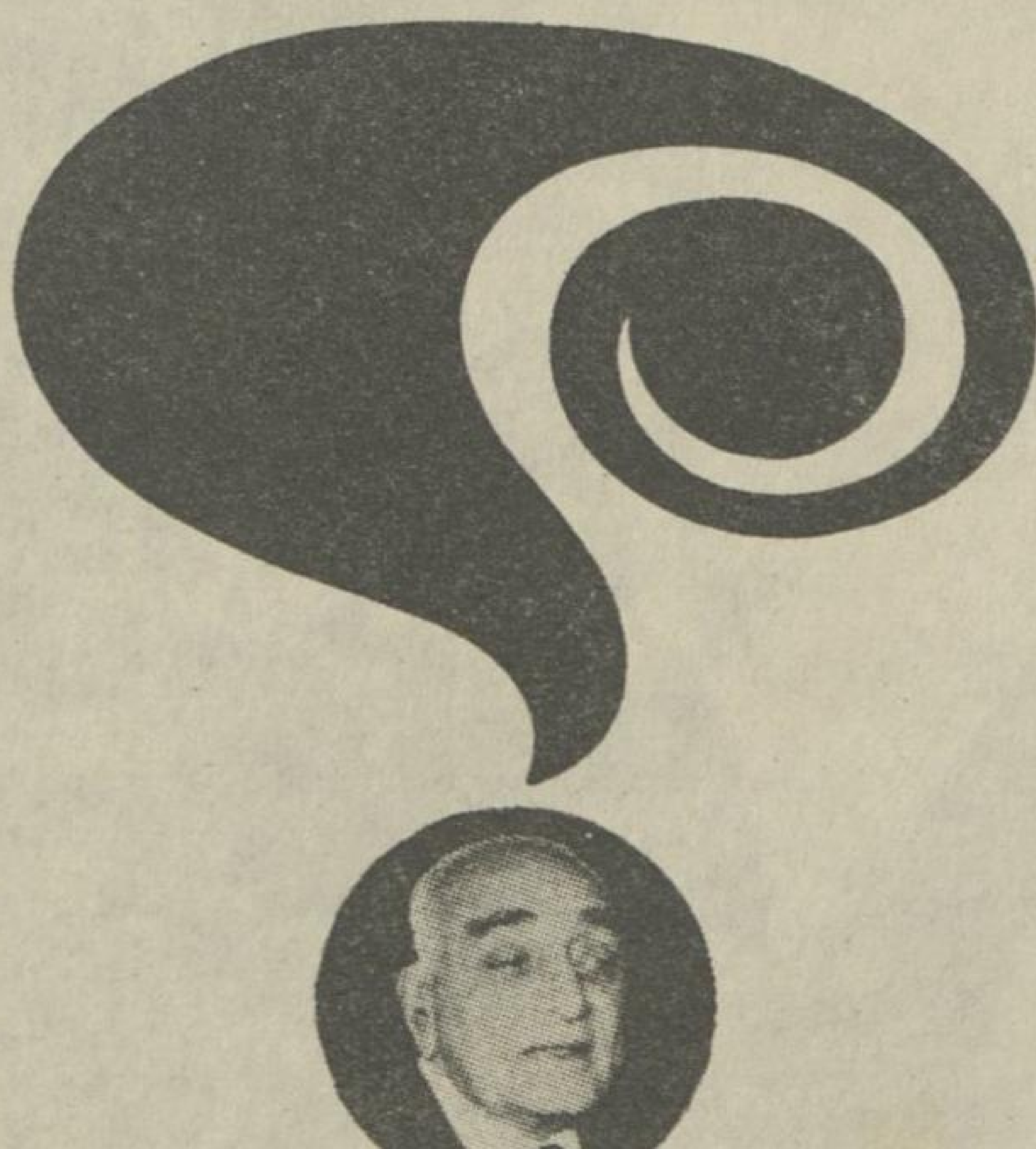
ج :۔ میں سمجھتا ہوں کہ متناسب نمائندگی اس ملک میں چل ہی نہیں سکتی۔ یہ ان ملکوں میں چل سکتی ہے۔ جہاں پارٹی کو واقعی پارٹی سمجھا جاتا ہو۔ یہاں پارٹی کو تو کوئی ووٹ ہی نہیں دے گا۔ ووٹ تو یہاں آدمی کو دیتے ہیں۔ جب پارٹی کو ووٹ ملیں گے۔ پھر خدا جانے کیا تماشا ہو گا۔ کون آئے گا۔ کون نہیں آئے گا۔ کوئی ورکر کام بھی کرے گا کہ نہیں۔ عام ورکر جس میں کھڑا ہونے کی استطاعت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہو بھی سکتا ہوں۔ لیکن متناسب نمائندگی میں پارٹی کے چند عہدیدار ہی الیکٹ ہوں گے۔ یہ تو جب تک پارٹی سسٹم مضبوط جڑیں نہ پکڑ لے اور لوگ بھی اتنے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں کہ انہیں پتہ ہو کہ وہ اس پارٹی یا انسٹی ٹیوشن کو ووٹ دے رہے ہیں۔ اس وقت تک یہ سسٹم چل ہی نہیں سکتا۔ (نومبر ۱۹۸۳ء)



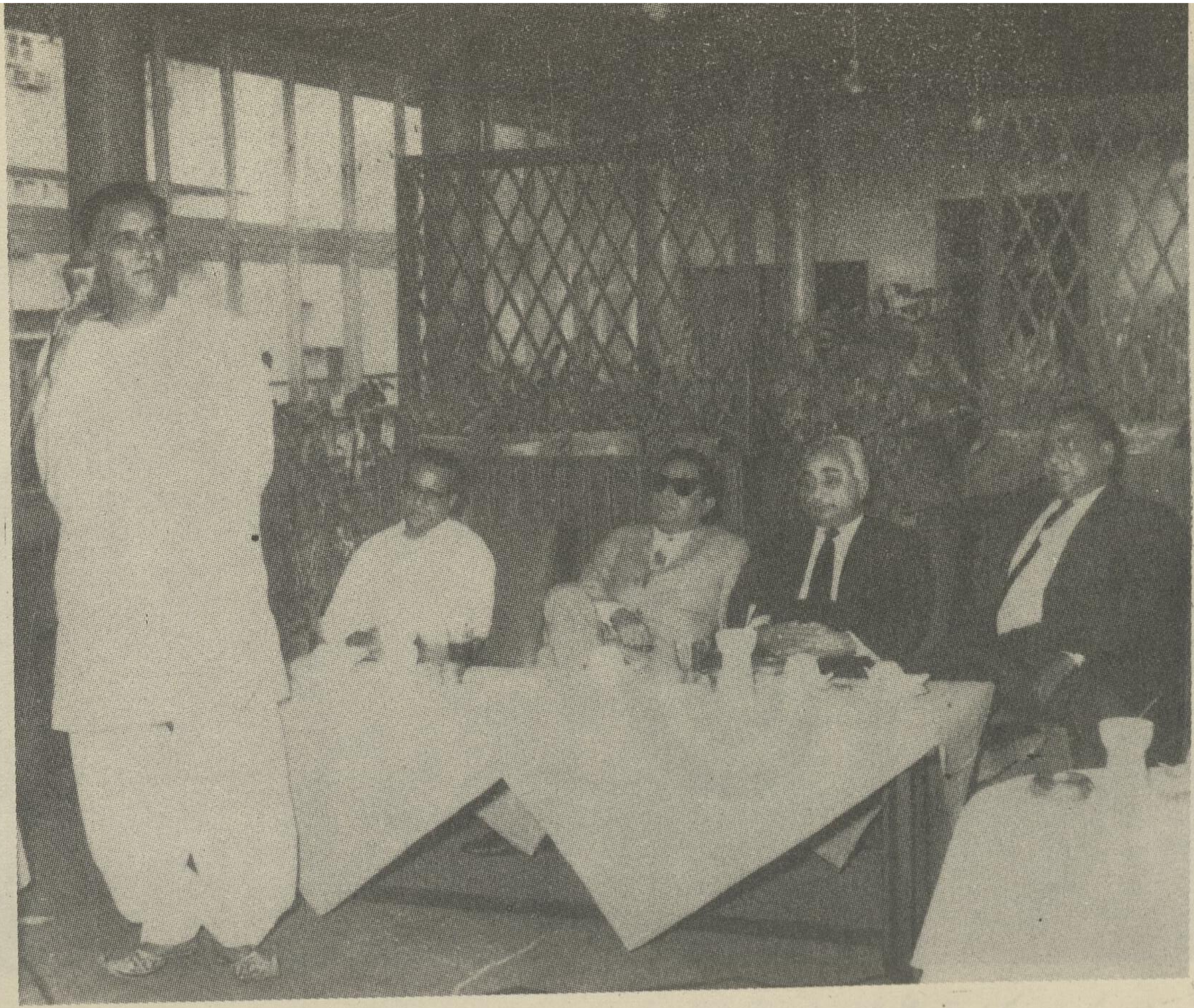
دسمبر ۱۹۵۲ء - یو این او میں - یوسف خٹک ، ایک چھوڑ کر اکبر طیّب جی ، سر ظفر اللہ خاں (تب وزیر خارجہ پاکستان)



۱۹۵۰ء کے سیلاب کے بعد وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خاں سیالکوٹ کے دورے کے دوران سمبڑیال میں۔ چودھری سرفراز، سید مرید حسین
(ہاتھ ملاتے ہوئے) اور احمد نواز وزیراعظم کا استقبال کر رہے ہیں۔



سیّد مرید حسین سے انٹرویو



کراچی:۔ میرپولس ، سید مرید حسین ، لطیف ابراہیم جمال ، خواجہ صفدر (مائیک پر)

سوانحی خاکہ

میں ۳ ستمبر ۱۹۱۶ء کو تحصیل سیالکوٹ کے گاؤں بھڑتھ (چھاؤنی) میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام شاہ حسین اور دادا کا نام مہر شاہ تھا۔ والد فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے میرے ماموں نے میری پرورش کی، وہ سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے میں مختلف جگہوں پر زیرِ تعلیم رہا۔ تاہم میں نے میٹرک سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ شہر سے ۱۹۳۲ء میں کیا۔ ایف اے مرے کالج سیالکوٹ سے ۱۹۳۴ء میں، بی اے ایف سی کالج لاہور سے ۱۹۳۶ء میں کیا اور یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۴۰ء میں مَیں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جائن کی۔ ۴۱ء میں لاء کا امتحان پاس کر کے سیالکوٹ چلا آیا۔ یہاں پریکٹس شروع کی اور ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ ۴۳ء میں میں نے ائیر فورس جائن کی۔ میں اس کی اے اینڈ ایس ڈی برانچ میں تھا۔ میری غیر حاضری میں میرے بھائی اقبال حسین ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہو گئے۔ سال بعد میں واپس آگیا اور پھر جنرل سیکرٹری ہو گیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا وائس پریذیڈنٹ اور پھر پریذیڈنٹ بھی رہا۔ لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا میں شروع سے ممبر رہا۔ تاہم پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں مجھے، ناصر شاہ اور پنڈی کے محمود احمد منٹو کو خصوصی دعوت پر بلا لیتے تھے۔ ۴۶ء کے الیکشن کے بعد پنجاب کے یونینسٹ وزیراعظم سر خضر حیات ٹوانہ کے خلاف موومنٹ چلی تو اس میں ہم نے بھی حصہ لیا۔ اور گرفتار ہوئے۔

۱۹۵۱ء میں میں پنجاب اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا۔ خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں میں پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا رکن رہا۔ اس وقت پنجاب سے ورکنگ کمیٹی کے تین ممبر تھے۔ فیروز خاں نون چیف منسٹر پنجاب، سردار امیر اعظم مرکزی وزیر اور میں۔

۶۲ء میں قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا۔ مجھے گورنمنٹ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر چنا گیا۔ میرے علاوہ سندھ سے ذوالفقار علی بھٹو اور سرحد سے عبدالغفور ہوتی ڈپٹی لیڈر تھے۔ ۶۵ء میں میں دوبارہ قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اس دوران میں لا اینڈ پارلیمنٹری افیئرز کی سٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین رہا۔ روس اور ایران میں جو پارلیمانی وفد گئے، میں ان کا ممبر تھا۔ اسمبلی میں تقریباً ہر اہم سپیشل کمیٹی کا میں ممبر ہوتا تھا۔

ایوب صاحب کے جانے کے بعد جب فضل القادر چودھری پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) کے صدر ہوئے تو میں سینئر وائس پریذیڈنٹ اور ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔ کچھ سال پہلے میں پنجاب بار کونسل کا ممبر تھا۔



۶ مارچ ۱۹۶۳ء: پریذیڈنٹ ہاؤس ڈھاکہ: عبدالغفور ہوتی، غلام مصطفےٰ جتوئی، ایک چھوڑ کر سیف اللہ خان، اسلم قریشی، ذوالفقار علی بھٹو۔
غلام رسول شاہ، غلام محمد دستان، چوہدری سرفراز، سید مرید حسین (دائرے میں) حنیف خان، ایک چھوڑ کر ملک مظفر خان۔



س :۔ شاہ صاحب، سیالکوٹ مختلف قومی تحریکوں کا گڑھ رہا ہے۔ آپ اپنی یادداشت کے حوالے سے ان تحریکوں پر سرسری روشنی ڈالیں گے؟

ج :۔ یوں تو سیالکوٹ نے انگریز کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی میں بھی بہت حصہ لیا تھا۔ انگریز تو اسے غدر کہتا تھا۔ گورا کیپٹن وزیر آباد سے اپنی فورس لے کے آیا۔ اس زمانے میں وزیر آباد اور سیالکوٹ کے درمیان تانگے چلتے تھے۔ بلکہ ہمارے بچپن میں جو چھاؤنی میں بڑا نے تانگے چلانے والے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ وہ وزیر آباد اور سیالکوٹ کے درمیان دو پڑاؤ کر کے پہنچتے تھے۔ گورے بھی تانگوں پہ آتے تھے یا پھر آرمی آفیسر گھوڑوں پر آتے تھے۔ تو جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں دیسی سپاہیوں نے انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد کی تو اس میں سیالکوٹ چھاؤنی میں بھی بڑا سخت ہنگامہ ہوا۔ مجاہدین پر قابو پانے کے لیے وزیر آباد سے گورا کیپٹن اپنی فورس لے کے پہنچا۔ یہاں اس نے مجاہدین کو کنٹرول کیا۔ پھر سمری ٹرائل کر کے گھنٹوں کے اندر مجاہدین کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

خلافت موومنٹ جب چلی تو اس میں بھی سیالکوٹ نے حصہ لیا تھا۔ میرا خیال ہے سیالکوٹ میں خلافت موومنٹ کے لیڈر آغا صفدر مرحوم تھے۔

ڈاکٹر جمال بھٹہ کے بھائی شیدائی اقبال شیدائی ترکِ موالات میں افغانستان گئے۔ پھر وہ کچھ عرصہ سیالکوٹ میں بھی رہے ہیں۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ کس طرح انہیں ملک بدر کیا گیا۔ بڑے جانباز قسم کے آدمی تھے۔ اس موومنٹ میں بھی سیالکوٹ نے حصہ لیا۔

شروع میں کانگریس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ خال خال مسلمان اس میں تھے۔

پھر تیسری دہائی میں احرار آئی۔ اس نے ۱۹۳۱ء میں جو کشمیر ایجی ٹیشن چلائی۔ دور کے دیہات کا تو پتہ نہیں شہر کے اردگرد کے دیہات میں شاذ ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں سے کوئی آدمی قید نہ ہوا ہو۔ اس وقت میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

س :۔ سیالکوٹ میں کانگریس کے سلسلے میں آغا صفدر اور میاں فضل حسین کا بھی ذکر آتا ہے۔

ج :۔ سر فضل حسین بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ صوبائی کانگریس کے پریذیڈنٹ یا جنرل سیکرٹری تھے۔ بڑی شان سے یہاں پریکٹس کرتے تھے۔ گھوڑے انہوں نے

رکھے ہوئے تھے۔ کاریں انہوں نے رکھی ہوئی تھیں۔ بڑی رئیسانہ زندگی تھی۔ رئیس تو خیر وہ تھے ہی۔ خاندانی لحاظ سے بہت بڑے زمیندار تھے۔ قابلیت کے اعتبار سے بڑی نمایاں شخصیت تھے۔ اسی زمانے میں اپنی سیاسی بصیرت کے تحت انہوں نے فیصلہ کیا کہ گورنمنٹ کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ گورنر کے ساتھ ان کی اپوائنٹمنٹ ہو گئی۔ ڈرائیور سے انہوں نے کہا کہ سویرے صبح جلدی چلنا ہے۔ وہ علی الصبح اٹھے۔ ڈرائیور گاڑی چلاتا رہا۔ یہ پیچھے سوئے رہے۔ گورنر سے ملاقات کی۔ پھر یہ گورنمنٹ میں چلے گئے۔ اس وقت اسمبلی میں ڈیارکی تھی۔ دو سسٹم تھے۔ کچھ منسٹر نامزد ہوئے تھے۔ کچھ الیکٹڈ لوگوں میں سے لیے جاتے تھے۔ جس طرح کے اپل گایا گے والد ہر کرشن لال گابا وزیر رہے تھے۔ بہر حال سر فضل حسین منسٹر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان پسماندہ ہیں۔ انہیں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کو تو انگریزوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم ہوئے ہیں۔ ان کے تحت وہ ایک دبی ہوئی قوم ہیں۔ انہیں معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ہندوؤں کے برابر لانے کے لیے سابقہ ناانصافیوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کا طریق کار یہ تھا۔ کہ تحصیل داروں کی بھرتی ہوئی تو سارے ہندو سکھ رکھ لیے۔ اس کے بعد پی سی ایس افسروں کو رکھنا تھا۔ تو کہا چونکہ مسلمان محروم رہے ہیں۔ اس لیے سارے مسلمان رکھ لیے۔ اس پر اعتراض ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ میں نے تحصیل داری کے لیے، جو آدمی قابل دیکھے، وہ رکھ لیے۔ اب پی سی ایس کے لیے جو مجھے قابل نظر آئے، وہ رکھ لیے ہیں۔ سر فضل حسین آل ان آل تھے۔ سیانے آدمی تھے۔ بڑے زیرک، انگریزوں سے جس طرح چاہتے تھے، کرا لیتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ تھے۔ گورنمنٹ کے ساتھ مل کے انہوں نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔ ان کا نقطۂ نظر تھا کہ مسلمان پسماندہ قوم ہیں تعلیمی اور مالی اعتبار سے ہندو کے برابر لانے کے لیے انہیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انہوں نے تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے لیے سیٹیں مخصوص کرائیں۔

یہ سب سر ظفر اللہ خاں، سر فیروز خاں نون، سر شہاب الدین اور سر سکندر حیات انہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ آغا صفدر بھی کانگریس میں تھے۔ انہیں سر فضل حسین نے لاہور میونسپل کمیٹی کا سیکرٹری بنوا دیا تھا۔ غالباً ان کی کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار تنخواہ رکھی گئی۔ یہ ان کے لیے خاص طور پہ کیا گیا۔ آغا صفدر سیالکوٹ کے رؤسا میں سے تھے۔ شہباز خاں کے بیٹے تھے۔ جن کے نام پر سیالکوٹ میں اڈا شہباز خاں ہے۔ آغا حیدر اور آغا صفدر سگے بھائی تھے۔ آغا حیدر سیالکوٹ میونسپلٹی کے پریذیڈنٹ رہے ہیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ کے بھی پریذیڈنٹ رہے ہیں، حتیٰ کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ جب میں چوتھی پانچویں جماعت میں تھا۔ یہ اس وقت بڑے امپارٹنٹ (اہم) لوگ تھے۔

س: سکول میں ہم پڑھتے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں ضلع سیالکوٹ کے فلاں گاؤں میں پیدا ہوئے؟ اب سنتے ہیں کہ وہ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔

ج: ممکن ہے۔ اس وقت ان کا گاؤں ضلع سیالکوٹ میں ہو۔

س: ان سے ملاقات رہی؟

ج: میں نے انہیں دیکھا ہے۔ میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں چھاؤنی میں پڑھتا تھا۔ میرا بھائی اسلامیہ ہائی سکول

سیالکوٹ شہر میں پڑھتا تھا۔ اس مناسبت سے میں بھی انجمن اسلامیہ کے اُس سالانہ اجلاس میں سامع تھا جہاں بڑا ہنگامہ رہا۔ انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کا جلسہ بڑا زوردار ہوتا تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول کے کمپاؤنڈ میں ہوتا تھا۔ پروفیسر دل محمد صاحب تقریر کر رہے تھے کہ ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا: میں ہندو ہوں۔ میں دین اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ وہ شخص اچھے لباس میں تھا۔ اس کا اسلامی نام دین محمد تجویز ہوا۔ اس جلسے میں پھر بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کے بعد مولانا ظفر علیخاں کی تقریر تھی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں اس نومسلم کے متعلق کہا، اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس لیے اب یہ میرا بھائی ہے۔ اگر اس کے اعمال اچھے ہوئے تو یہ بڑا اچھا مسلمان ہو سکتا ہے۔ یہ سب مسلمانوں سے اچھا ہو سکتا ہے۔ یہ پیر جماعت علی شاہ سے اچھا مسلمان ہو سکتا ہے۔ پیر صاحب کا نام آیا تو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ پیر صاحب کی بڑی مقبولیت تھی۔ پھر مولانا وہابی تھے۔

س: علمائے دیوبند سے متاثر تھے۔

ج: لوگوں نے کہا مولانا کو روکا جائے۔ مولانا تو بڑے سخت آدمی تھے۔ انہوں نے پھر کہا میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پیر جماعت علی شاہ سے اچھا مسلمان بن سکتا ہے۔ پیچھے سے ایک بابا اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹی تھی۔ مولانا کو مارنے کے لیے اس نے سوٹی اگری کہ آغا صفدر مرحوم خدا انہیں غریق رحمت کرے انہوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لیکن اتنا ہنگامہ ہوا کہ لوگوں نے کہا کہ مولانا کو سٹیج سے اتار دیا جائے۔ اور انہیں جلسے میں سے نکال دیا جائے۔ ورنہ ان کی جان کی خیر نہیں۔ مولانا کو جانا پڑا۔

اسی دن مولانا نے جموں میں ایک جلسے سے خطاب کرنا تھا۔ لوگوں نے جموں کی گورنمنٹ کو تاریں دے دیں۔ انہوں نے مولانا کو جموں میں داخل ہی نہ ہونے دیا۔ سچیت گڑھ روک لیا۔

اچھا، مولانا کو ایک تو میں نے انجمن اسلامیہ سیالکوٹ والی اُس میٹنگ میں دیکھا تھا۔ دوسری دفعہ میں نے انہیں لاہور ریزولیوشن والی کانفرنس (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) میں دیکھا۔ یہ نیلی پوش تھے۔ انہوں نے چوغہ سا پہن رکھا تھا، غالباً سٹیج پر سے، یا سٹیج کے قریب سے اُٹھ کے چلے تو پیچھے پیچھے ان کا ایک رضاکار تلوار ہاتھ میں لیے چل رہا تھا۔ مولانا کا وجود بھی بھاری تھا، اور تلوار والا رضاکار بھی بھاری تھا۔ بڑا عجیب سا منظر تھا۔

س: ۱۹۳۱ء کی کشمیر ایجی ٹیشن میں احرار نے بڑی قوت پکڑ لی تھی۔

ج: برٹش گورنمنٹ کشمیر کو ہندوستان کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔ تاکہ ان کا سلسلہ چین کی سرحد تک ہو جائے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے ساتھ حکومت بات چیت کرتی رہی لیکن وہ تیار نہ ہوا۔ وہ بڑا ڈپلومیٹ آدمی تھا۔ وہ بے اولاد تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ہری سنگھ کشمیر کا مہاراجہ بنا تو انگریزوں نے اس خیال سے کہ یہ اتنا ساؤنڈ آدمی نہیں۔ اس کے ساتھ بات شروع کی کہ ہم آپ کو کشمیر کے بدلے میں شملہ ہلز دے دیتے ہیں۔ وہ تیار نہ ہوا تو حکومت نے مہاراجہ کے خلاف احرار سے ایجی ٹیشن شروع کرا دی۔

س: کوئی ثبوت؟

ج: فضل الٰہی پراچہ پرانے پی سی ایس ہیں۔ جن دنوں احرار موومنٹ چلی ہے وہ پنجاب سیکرٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جب مہاراجہ ہری سنگھ شملہ ہلز کے عوض سٹیٹ سرنڈر کرنے کے لیے آمادہ

نہ ہوا تو حکومت نے احرار سے یہ ایجی ٹیشن چلوا دی۔

س :۔ تاکہ مہاراجہ کو تخت سے الگ کیا جا سکے۔

ج :۔ نہیں، اسے بے حوصلہ کرنے کے لیے

س :۔ مہاراجہ پھر حوصلہ ہار گیا ؟

ج :۔ جب موومنٹ کا ٹیمپو بن گیا تو مہاراجہ حوصلہ ہار گیا۔ وہ شملہ ہلز کے ساتھ سٹیٹ کے تبادلے پر تیار بھی ہو گیا کہ موومنٹ سبوتاژ ہو گئی۔

س :۔ بقول آپ کے انگریز حکومت کی شہ پر احرار نے یہ ایجی ٹیشن چلائی۔ مہاراجہ حوصلہ بھی ہار گیا پھر سبوتاژ کیسے ہو گئی ؟

ج :۔ نواب سر مہر شاہ بڑے نوان پڑھ آدمی، لیکن اونچی سیاست کھیلتے تھے۔ گھاگ آدمی تھے۔ انہوں نے مہاراجہ سے کہا۔ آپ پیسے دیں۔ میں احرار والوں کو رشوت دے کر آپ کی جان چھڑا دوں گا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کو آسرا مل گیا۔ پیسے نے احرار والوں کو ڈھیلا کر دیا۔ انہوں نے معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ موومنٹ دب گئی، مہاراجہ پھر قائم ہو گیا۔

س :۔ احراری لیڈروں نے معافیاں مانگیں ؟

ج :۔ جی۔ یہ لوگ صرف ریاست جموں کشمیر کی جیلوں میں نہیں تھے۔ برٹش انڈیا کی جیلوں میں بھی تھے۔ کیونکہ ریاست کی جیلوں میں اتنی گنجائش نہیں تھی جس وقت انہوں نے معافیاں مانگیں عوام نے ان کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا۔ یہ لوگ معافیاں مانگ کے، رہا ہو کے، واپس سیالکوٹ آ رہے تھے۔ راستے میں ہمارے گاؤں کے پاس نالہ پلکھو ہے۔ یہ اس کے کنارے آ بیٹھے کہ لوگ تو ان کے معافیاں مانگنے پر سخت نالاں ہیں۔ اگر ہم واپس گئے تو لوگ لعنت ملامت کریں گے۔ چنانچہ یہ لوگ وہیں سے واپس چلے گئے۔ موومنٹ پھر شروع ہو گئی۔

س :۔ لیکن اب مہاراجہ اُس طرح بے حوصلہ نہ ہوا۔

ج :۔ نہیں۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں، پتہ نہیں

س :۔ ایجی ٹیشن کرنے والوں کو انگریز گورنمنٹ نے بھی دبایا ؟

ج :۔ انگریز گورنمنٹ نے تو یہ ایجی ٹیشن شروع کرائی تھی۔ اسے دبانا اس کے مفاد کے خلاف تھا۔

س :۔ فضل الٰہی پراچہ اس ایجی ٹیشن کو پبلسٹی دینے کے لیے آتے تھے۔

ج :۔ نہیں۔ اس وقت پبلک انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نہیں تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ ہوتا تھا۔ پراچہ صاحب چند ایک سینئر ترین پی سی ایس افسران میں سے تھے۔ وہ ہر روز سیالکوٹ معلومات اکٹھی کرنے کے لیے آتے تھے۔ کیونکہ اس ایجی ٹیشن کا گڑھ سیالکوٹ تھا۔ یہیں سے قافلے چلتے تھے۔ سچیت گڑھ پہنچتے تھے تو گرفتار ہو جاتے تھے۔

س :۔ ہم تو یہ سُنتے آئے ہیں کہ مہاراجے کے ہاں قرآن کریم کی بے حُرمتی کی گئی۔ تو یہ موومنٹ شروع ہو گئی۔

ج :۔ سنا یہ تھا کہ کوئی قیدی جیل میں قرآن کریم پڑھ رہا تھا، شاید داروغہ جیل نے آ کے قرآن کریم کو چھڑا اُتارا۔

س :۔ فضل الٰہی پراچہ کے حوالے سے آپ کا کہنا ہے کہ یہ موومنٹ انگریز نے مہاراجہ ہری سنگھ سے اپنی بات منوانے کے لیے چلوائی تھی۔ اگر یہ بات تھی تو پھر ممکن ہے انگریز حکومت نے مسلمانوں کے جذبات مشتعل کرنے

کے لیے یہ واقعہ گھڑا ہو۔

ج :۔ ممکن ہے گھڑا ہو۔

س :۔ احرار کی ہائی کمان گورنمنٹ سے ملی ہوئی تھی ؟

ج :۔ پراچہ صاحب کا کہنا ہے کہ احرار سے یہ ایجی ٹیشن حکومت نے شروع کرائی تھی اور اس کے لیے مجھے روزانہ سیالکوٹ جانا پڑتا تھا۔ جس طرح مسجد شہید گنج والا واقعہ تھا۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ سر فضل حسین نے شروع کرایا تھا۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت الیکشن ہونے والے تھے۔ میاں سر فضل حسین چیف منسٹر بننا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی ممبرشپ چھوڑ آئے تھے۔ سر فیروز خاں نون کو انہوں نے ہائی کمشنر لندن بنوادیا۔ سر سکندر حیات کو ڈپٹی گورنر ریزرو بنک آف انڈیا بنوا کے بمبئی بھجوا دیا۔ اس طرح وہ یہاں اکیلے رہ گئے۔ اب عوام میں جس پارٹی کے لیے اپیل تھی وہ احرار تھی۔ کشمیر ایجی ٹیشن کی وجہ سے وہ اتنے پاپولر ہو گئے تھے کہ انہیں کوئی شکست ہی نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ میاں صاحب نے مسجد شہید گنج کا قصہ شروع کرادیا۔ احرار نے اس میں حصہ نہ لیا تو ان کے بارے میں یہ تاثر ابھرا کہ یہ گورنمنٹ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ احرار کا جو انجام ہونا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن ابھی الیکشن نہیں ہوئے تھے کہ سر فضل حسین انتقال کر گئے۔

س :۔ ٹھیک ہے مسجد شہید گنج کے قضیئے سے احرار کو خاصا دھچکا تھا۔ لیکن سیالکوٹ میں پھر بھی اس کا گڑھ رہا۔ ان حالات میں آپ لوگوں کو مسلم لیگ آرگنائز یا ری آرگنائز کرنے میں خاصے کٹھن حالات کا سامنا رہا ہوگا۔

ج :۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں ہم نے اسلامیہ کالج لاہور میں 'پاکستان سیشن' کیا اس میں میری حیثیت نمایاں ہی تھی۔ سیالکوٹ سے جو مسلم لیگی وہاں آئے۔ انہوں نے مجھے سرگرم عمل دیکھا۔ ریسپشن کمیٹی نے پنڈال کا کنٹرول میرے سپرد کیا ہوا تھا۔ اسی سال میں لا کر کے سیالکوٹ آ گیا۔ ابھی پریکٹس شروع نہیں کی تھی۔

چودھری محمد سرفراز سے میرے تعلقات تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ تھے۔ اس وقت وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے۔ سب رجسٹرار بھی تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رنگ پورہ بھوکی کے سامنے مکان لے رکھا تھا۔ جو خان بہادر مرزا محمد دین کا تھا۔ وہیں مسلم لیگ کی میٹنگیں وغیرہ ہوتی تھیں۔ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری شفیع رشید تھے۔ وہ گریجوایٹ تھے۔ کلوتھنگ فیکٹری (چھاؤنی) میں انہوں نے ملازمت کر لی۔ وہ چلے گئے تو ان کی جگہ مجھے جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ ایک روز بازار میں فاروق رحمت اللہ نے مجھے روک لیا اور بتایا کہ میں مسلم لیگ کا کارکن ہوں۔ میں نے آپ کو پاکستان سیشن میں دیکھا تھا۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ وہ ڈسٹرکٹ اور سٹی مسلم لیگ، دونوں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ سٹی مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ آغا حیدر تھے۔ اور جنرل سیکرٹری سید ظہیر شاہ تھے۔ ظہیر شاہ سے میری پہلی ملاقات لائل پور پراونشل مسلم لیگ کے سیشن (۱۸ نومبر ۱۹۴۲ء) کے موقعہ پر ہوئی تھی۔ جب ہم سیالکوٹ کے لوگ واپسی پر ٹرین میں بیٹھے تو ظہیر شاہ نے غالباً اقبال حیمہ سے کہا کہ ہمارا ان سے تعارف کرادیجئے۔ اس وقت مجھے ان کا پتہ چلا۔ ویسے میں ان کے چھوٹے بھائی انور شاہ کو جانتا تھا۔ وہ میرے کالج میں مجھ سے تین سال سینئر تھے۔ ان کے بھائی ناصر شاہ سے میری ملاقات سیالکوٹ ریلوے سٹیشن پر ہوئی۔ احرار کا زمانہ تھا۔ میں انجمن شیعہ اثنا عشریہ کے زیر اہتمام سیالکوٹ میں ہونے والی

کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کا چیئرمین تھا۔ ہم نے نواب محمد علی قزلباش کے لڑکے نواب نوازش علی کو صدارت کے لیے بلایا تھا۔ ہم انہیں لینے ریلوے سٹیشن پر گئے۔ تو وہاں ناصر شاہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ بعد میں جب مسلم لیگ زیادہ پاپولر ہوگئی تو ظہیر شاہ کی جگہ ناصر شاہ جنرل سیکرٹری ہو گئے۔ آغا حیدر کے انتقال کے بعد ناصر شاہ سٹی مسلم لیگ کے صدر ہو گئے۔

س :۔ جب تک قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ میں نئی روح نہیں پھونک دی مسلم لیگ پر خان بہادر ٹائپ لوگ ہی غالب رہے؟

ج :۔ حالت یہ تھی کہ جس زمانے میں لاء کر کے میں سیالکوٹ آ گیا ہوں اور یہاں مسلم لیگ میں سرگرم عمل ہوا ہوں۔ دستور یہ تھا کہ اضلاعی نمائندے صوبائی مسلم لیگ کونسل بناتے تھے اور یہی صوبے کے لیے پریذیڈنٹ جنرل سیکرٹری اور دوسرے عہدیداروں کا چناؤ کرنے جمع ہوجاتے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری خان بہادر رمضان علی تھے۔ یہ ریٹائرڈ ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ میاں انور علی جو مغربی پاکستان کے آئی جی رہے ہیں۔ ان کے والد۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس لیے تو اُسے خان بہادروں اور نوابوں کی جماعت کہا جاتا تھا۔ سر سکندر حیات پرائم منسٹر پنجاب مسلم لیگ کے معاملات میں بہت انجیڈ تھے۔ غالباً ۴۲ء میں جنرل سیکرٹری کا چناؤ ہوتا تھا۔ شیخ ظفر حسین وغیرہ نے پلان کیا کہ خان بہادر رمضان علی کی جگہ سید خلیل الرحمن کو جنرل سیکرٹری چنا جائے۔ ظفر حسین تعلیم کے زمانے سے میرے واقف تھے۔ ادھر سر سکندر حیات وغیرہ کی کوشش تھی کہ خان بہادر رمضان علی ہی رہیں یا پھر وہ شخص منتخب ہو جسے وہ چاہتے ہوں۔ صورت حال یہ تھی کہ جدھر ہم نوجوان ہو جائیں۔ وہ سائڈ بھاری ہو جاتی تھی۔

موچی دروازے کے باہر برکت علی محمڈن ہال میں میٹنگ تھی۔ سر سکندر حیات، راجہ غضنفر علی اور سید امجد علی۔ یہ سب آئے ہوئے تھے۔ خان بہادر رمضان علی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پچھلی کارروائی پڑھ کر سنائیں، تو ان کے پاس کوئی کاغذ ہی نہیں تھا۔ کہنے لگے رجسٹر گھر رہ گیا ہے۔ ہم نے کہا، یہ غلط بات ہے۔ چنانچہ ان کے خلاف تقریریں ہوئیں کہ یہ تو کچھ نہیں کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ چناؤ کیا جائے۔ صدر تو شاہنواز ممدوٹ متفقہ طور پر منتخب ہو گئے۔ جنرل سیکرٹری کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو انہوں نے خان بہادر صاحب کے حق میں بڑی تقریریں جھاڑیں۔ خود سر سکندر حیات نے وہاں تقریر کی۔ راجہ غضنفر علی نے کی۔ دوسرے بھی کرتے رہے۔ ہم کوئی سرکاری آدمی تو تھے نہیں۔ ہم پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ سید خلیل الرحمن جنرل سیکرٹری کا الیکشن جیت گئے۔ اور بڑی شان سے۔ جیتے سید محمد علی جعفری بھی ان کے امیدوار تھے۔

(س) وہی جنہیں بابا جعفری کہتے تھے۔

(ج) ہاں وہی جنہیں بابا جعفری بھی کہتے تھے۔ وہ غالباً پبلسٹی سیکرٹری تھے۔ سر سکندر حیات کی گورنمنٹ چاہتی تھی۔ کہ وہ دوبارہ منتخب ہوں جعفری صاحب کے خلاف بھی بہت تقریریں ہوئیں۔ وہ کہنے لگے، یہ بزرگ ہیں انہیں الیکٹ کر لو۔ ہم نے کہا۔ اچھے پبلسٹی سیکرٹری ہیں کہ لاہور سے باہر کسی جگہ گئے ہی نہیں، ان پر اس قسم کی تنقید ہوتی رہی۔ راولپنڈی کے غلام مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی کہنے لگے۔ یہ جو میرے ساتھیوں نے، بھائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ جعفری صاحب میں اتنی اہلیت ہی نہیں اور وہ لاہور سے باہر گئے ہی نہیں، یہ بالکل غلط بات ہے۔ میرے ذاتی علم میں ہے کہ وہ لاہور سے باہر گئے ہیں۔ یہ وزیر آباد گئے تھے۔ یہ درست ہے کہ مسلم لیگ کے کسی کام کے سلسلے میں نہیں گئے تھے۔ اپنے صاحبزادے جو وہاں ایگزیکٹو انجینیئر ہیں، اس سے ملنے کے

بلیے گئے تھے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ جعفری صاحب لاہور سے باہر نہیں گئے۔

محمد علی جعفری کے بڑے بیٹے حسن جعفری وزیر آباد میں ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ سرکاری وکیل بھی رہے ہیں۔ اب گوجرانوالہ میں ہیں۔ جسٹس یعقوب علی کے والد بھی وزیر آباد میونسپلٹی کے سیکرٹری رہے تھے۔ یعقوب علی صاحب وزیر آباد پڑھتے رہے ہیں۔

س :۔ سید خلیل الرحمٰن نے جنرل سیکرٹری شپ سے استعفا کیوں دیدیا۔

ج :۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ بعض معاملات کے سلسلے میں وہ قائد اعظمؒ سے ملنے کے لیے دہلی جایا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ میں گیا تو قائد اعظمؒ کسی زیادہ ضروری کام میں مصروف تھے۔ فوراً وقت نہ دے سکے۔ میرے پیسے ختم ہو گئے۔ صرف کرایہ رہ گیا۔ اس کے بعد یہ استعفے چلے کہتے تھے کہ مالی طور پر میں چل نہیں سکتا۔ کیونکہ کبھی بمبئی میں میٹنگ ہوتی ہے۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں۔ یہ دراصل کرنال رہتک کے رہنے والے تھے۔ لاہور میں سیٹل ہو گئے تھے۔ ان کے والد غالباً سیشن جج تھے۔ کمیونسٹ مُطلبی فریدآبادی سید خلیل الرحمٰن کا بہنوئی تھا۔

ساہیوال ڈسٹرکٹ میں ان کے پاس پانچ سات مربعے زمین تو تھی۔ اس وقت یہ تصور ہی نہیں تھا کہ بددیانتی بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے مالی طور پر پریشان ہو کر سید خلیل الرحمٰن نے استعفیٰ دے دیا۔

س :۔ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔

ج :۔ بڑا۔ دیکھیں ہمیں کونسل کی میٹنگ اٹنڈ کرنے کے لیے دہلی بھی جانا پڑتا تھا۔ لاہور سے رات کو فرنٹیئر میل چلتی تھی۔ سیکنڈ کلاس میں سونے کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔ ہمارے جیسے آدمی بڑا ہی کڑوا گھونٹ کر کے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے تھے۔ چوبیس روپے تھا بلکہ ایک دفعہ مجھے یاد ہے۔ بڑی امپارٹمنٹ میٹنگ تھی۔ سیٹ نہ ملے۔ سید (کرنل) عابد حسین میرے کلاس فیلو رہے تھے۔ اس وقت وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے۔ کہنے لگے۔ بھائی جی اخیر کے ڈبے میں ایک فسٹ کلاس کی سیٹ ہے۔ گارڈ کو کہو کہ وہ آپ کو لے دے۔ اس کو کیا پتہ تھا کہ میں فسٹ کلاس ایفورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے پھر ڈیڑھ دو دن جانے والی گاڑی میں سیکنڈ کلاس مل گئی۔ انبالہ جا کے میں نے گاڑی بدل لی۔ کافی مشکل وقت ہوتا تھا۔

س :۔ سید خلیل الرحمٰن کے بعد ممتاز دولتانہ منتخب ہوئے۔

ج :۔ پہلے تو شیخ ظفر حسین قائم مقام جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے پھر سیالکوٹ میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (۱۹۴۴ء) ہوا۔ دولتانہ جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔

س :۔ وہ کہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ کے حکم پر میں جنرل سیکرٹری ہوا۔

ج :۔ قائد اعظمؒ انہیں میرٹ پر پسند کرتے تھے۔ دولتانہ لائق آدمی تو تھے۔

س :۔ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں "احرار" کو خاصا دھچکا لگا۔ لیکن سیالکوٹ پھر بھی اس کا گڑھ رہا۔ ایک یہ عنصر تھا۔ دوسرے صوبے میں یونینسٹوں کی حکومت تھی۔ دونوں قیام پاکستان یعنی مسلمانوں کی آزادی کے سخت دشمن۔ ان لوگوں نے آپ کی راہ میں جو مشکلات پیدا کیں۔ ذرا ان کا بھی ذکر ہو جائے۔

ج :۔ اس سلسلے میں کافی دقتیں تھیں۔ ایک تو وہاں خواجہ حاکم دین والا عنصر تھا۔ دوسرے دیوبندی مولوی تھے۔ قائد اعظمؒ نے تو اسلام کو سٹڈی کیا تھا۔ اور یقیناً وہ اس میسیج سے انسپائرڈ تھے۔ وہ تو احرار کے سارے مولوی

مل کر بھی ان کی جرأت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ احراری مولویوں کا چلن یہ تھا کہ جہاں قوم ذبح ہو رہی ہو، سمندر میں گر رہی ہو۔ وہاں یہ اعانت کرنے والے تھے۔ دھکا دینے والے تھے۔ پل ایک پر ایک مولوی منظور ہوتا تھا۔ دیوبندی تھا۔ احراری تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی اور مسجد میں کھڑا ہو کے قائداعظمؒ کو گالیاں نکالنا شروع کر دے۔ پھر وہ اڈہ پسروریاں کے قریب لاؤڈ سپیکر پہ آیا کئی روز تک قائداعظمؒ کو گالیاں دیتا رہا۔ اتنی غلیظ گالیاں کہ جن کا کوئی حساب ہی نہیں۔ تنگ آ کر ظہیر شاہ نے بھی مقابلے میں لاؤڈ سپیکر لگا لیا۔ ظہیر شاہ جواب میں شروع ہو گیا۔ اس نے مولوی منظور کو خوب گالیاں دیں۔ سیدھی گالیاں، ماں بہن کی گالیاں۔ پھر مولوی منظور نے پیغام بھیجا کہ یار یہ تو حد سے بات بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے جواب بھیجا۔ قائداعظمؒ کی شان میں تیری گستاخی ہم نے اتنی دیر برداشت کی۔ تجھے کس نے کہا تھا۔ کہ اس طرح کر۔ دیکھیں نا، کوئی آدمی تقریر کرے۔ دلیل دے۔ اس کا انسان جواب دے سکتا ہے۔ جو سیدھا گالیوں پر ہی شروع ہو جائے۔ اس کا آپ کیا جواب دے سکتے ہیں۔ پھر یہی مولوی منظور نارووال شفٹ کر گیا۔ وہاں اس نے شیعہ سنی مسئلے پر اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

جب الیکشن آئے۔ احراریوں اور یونینسٹوں نے دیکھا کہ مسلمان تو مسلم لیگ کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ انہوں نے انتظامیہ سے مل کر شیعہ سنی فرقہ واریت کو ہوا دینے کی کوششیں شروع کر دیں۔ دسویں محرم کے موقعہ پر سنکھترہ سے اس کا آغاز ہوا۔ مولوی منظور کے ساتھ سنکھترہ کا مولوی محمد شفیع ہوتا تھا۔ وہ بھی اسی ٹائپ کا آدمی تھا۔ لیکن اس کا ناچ زیادہ ساؤنڈ تھا۔ میچور آدمی تھا۔ اس شیعہ سنی فساد میں وہ مولوی صاحب ملوث تھے۔ حکومت نے اس کی بہت مدد کی۔ دونوں طرف کے پانچ پانچ چھ چھ آدمی پکڑے گئے۔ متعلقہ مجسٹریٹ یونینسٹ تھا۔ واں بھچراں کا تھا۔ بڑا خراب آدمی تھا۔ میں اسے کہوں کہ یہ ٹرائل شروع نہ کریں۔ یہ تو مسلمانوں کی اندر انتشار پیدا کرنے کی ایک چال ہے۔ اس وقت سیالکوٹ میں ہم ۱۹ مسلمان وکیل تھے۔ ہم انیس کے انیس اس کی منتیں کرنے والے تھے کہ مسلمانوں پر یہ ظلم نہ کرو۔ ہم نے ان کی صلح بھی کرا دی ہے۔ لیکن اس کا رویہ بُرا رہا۔ اس نے کیس سٹارٹ کر دیا۔

دوسرا شیعہ سنی نفاق چہلم کے موقعہ پر قلعہ سوبھا سنگھ میں پھیلایا گیا۔ دونوں طرف سے ستر ستر یا پچھتر پچھتر آدمی پکڑ لیے گئے۔ راجہ غضنفر علی نواب سر مہر شاہ کے ماموں تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ بھی زندہ نہیں رہی تھی۔ نواب سر مہر شاہ کے لڑکے صاحبزادہ مسعود احمد کو انہوں نے اپنے کوٹے میں پی سی ایس نامزد کر دیا تھا۔ مسعود احمد ان دنوں سیالکوٹ میں مجسٹریٹ تھے۔ انہوں نے ہماری خاصی مدد کی۔ قلعہ سوبھا سنگھ والا کیس ان کے پاس لگ گیا۔ پھر مولوی منظور اور مولوی محمد شفیع دونوں آ گئے۔ یہ دریدہ دہن لوگ تھے۔ کہیں کہ تم مسلمان وکیل بنے بیٹھے ہو۔ تمہیں وکیل کوئی کرتا نہیں۔ اس قسم کے معاملات میں ہم پر معتبریاں کرنے آ گئے ہو۔ مجسٹریٹ انہیں سارا دن بٹھا دیا کرے۔ چار بجے تک کچہریوں کا ٹائم ہوتا تھا۔ چار بجنے میں پانچ منٹ رہ جاتے تو اس نے کہنا، لائنیں لگا کے ان کی حاضریاں لگاؤ۔ اور ہفتے کی تاریخ دے دینی۔ پھر وہ غیر حاضر ہونا شروع ہو گئے۔ صاحبزادہ مسعود احمد کا ہمارے ساتھ کافی رابطہ تھا۔

س:۔ ان جگہوں کے علاوہ۔

ج:۔ دو جگہ پر تو ہو گیا۔ پھر ہم بھی محتاط ہو گئے۔ اور کسی جگہ ہم نے انہیں بہانہ نہ بنانے دیا۔
قائداعظمؒ کو یہ احراری کافر کہتے تھے کہ انہوں نے رتن بائی سے سول میرج کی ہے۔ ہم سنس سول اینڈ



دورۂ روس کے دوران، سید مرید حسین اور اورنگ زیب

ملٹری گزٹ کے چیف رپورٹر تھے۔ انہوں نے ہمیں کرانیکل کے پرانے شماروں سے خبریں نکالیں اور شائع کر دیں کہ کس طرح ڈنشا پیٹیٹ کی لڑکی رتن بائی نے اسلام قبول کیا۔

پھر قائداعظمؒ سے ان کے نکاح کی خبر تھی۔ ہم نے ان خبروں کا اردو ترجمہ کر کے ایک اشتہار بنایا۔ اس کا عنوان تھا۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ نیچے اس کی تفصیل دی اور شہر میں یہ پوسٹر بے حساب لگا دیا۔

شہر کی نشست پر مسلم لیگ کے امیدوار شیخ کرامت علی تھے۔ وہ شیعہ تھے۔ احرار کا امیدوار مولوی مظہر علی اظہر تھا۔ وہ بھی شیعہ تھا۔ احراریوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ کرامت علی تو رافضی ہے۔ یہ صحابہؓ کو گالیاں دیتے ہیں۔ مولوی مظہر علی اظہر کا یہ نہ بتائیں نہیں کہ وہ بھی شیعہ ہیں۔

بظاہر احراری، مرزائیوں کے کس قدر مخالف ہیں۔ بلکہ احرار اینٹی مرزائی موومنٹ شروع کر کے ہی نمایاں ہوئے تھے۔ پاکستان دشمنی میں انہوں نے مرزائیوں سے بھی اتحاد کر لیا تھا۔ کیونکہ مقصد مشترکہ تھا۔ نارووال کی سیٹ پر ممتاز دولتانہ کے مقابلے میں خان بہادر نواب محمد دین کھڑا ہوا تھا۔ یہ مرزائی تھا، سارے احراری اور یونینسٹ اس کی سپورٹ کر رہے تھے۔ یہ حلقہ پسرور اور نارووال کی تحصیلوں پر مشتمل تھا۔ ڈسکہ اور پسرور کے کچھ حصے پر جو حلقہ بنایا گیا۔ وہاں مسلم لیگ کے امیدوار چودھری سرفراز تھے۔ ان کے مقابلے میں احرار کی طرف سے صاحبزادہ فیض الحسن تھے۔ سر ظفر اللہ خاں کا بھائی چودھری شکر اللہ صاحبزادہ فیض الحسن کا ورکر تھا۔ بلکہ وہاں یہ تھا کہ عبدالسلام بٹ کا منشی ہے جھمبلہ میں وہ بڑا پکا احراری تھا۔ چودھری غلام رسول سنراہ والا یونینسٹ تھا۔ اور چودھری شکر اللہ مرزائی یہ تینوں اپنی اپنی جماعت کے علاقائی لیڈر تھے۔ اور تینوں مسلم لیگ کے امیدوار چودھری سرفراز کے خلاف متحد تھے۔

چودھری ناصر دین والا حلقہ انتخاب وہی تھا جو تحصیل سیالکوٹ، تحصیل ڈسکہ کے کچھ حصے اور سمبڑیال تھانے پر مشتمل تھا۔ چودھری صاحب مسلم لیگ کے امیدوار تھے۔ ان کا مقابلہ رسول پور بھلیاں کے ذیلدار غلام جیلانی سے تھا۔ وہ یونینسٹوں کا امیدوار تھا۔ اسے بھی مرزائیوں، احراریوں اور یونینسٹوں کی سپورٹ حاصل تھی۔ اس طرح چاروں سیٹوں پر ان کا یہی رویہ تھا کہ مرزائی، احراری اور یونینسٹ ایک دوسرے کو سپورٹ کرتے تھے۔

س :۔ یہ تو رہا مفادات کا سودا، پولنگ کے دوران میں پریذائیڈنگ افسروں اور دوسرے عملے کا رویہ کیا رہا۔ کیونکہ یہ لوگ سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ اور سرکار اس وقت یونینسٹ گورنمنٹ کی تھی۔

ج :۔ بارہ دن پولنگ ہوتی رہی اور بارہ دن ہی ہنگامہ رہا۔ احراریوں نے بہت ہنگامہ کیا۔ دوسری طرف انتظامیہ بھی ہمارے امیدواروں کے خلاف پوری طرح سرگرم عمل تھی۔ مثال کے طور پر میں پہلے دن تو چھاؤنی میں تھا۔ وہاں پریذائیڈنگ آفیسر ہندو تھا۔ کیپٹن کر کے کچھ تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ آپ کسی اور خیال میں ہیں۔ آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ رولز کے مطابق چلیں۔ اور رولز یہ ہیں۔ آپ رولز کی خلاف ورزی کس طرح کر سکتے۔ اس نے دیکھ لیا کہ یہ تو نہیں چھوڑتا۔ پھر معاملہ ٹھیک سے چلتا رہا۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ دوپہر کو جب انٹرول ہوا تو شیخ کرامت علی، چودھری غلام عباس اور کیپٹن نصیر الدین، کیپٹن صاحب جموں کے رئیس آدمی تھے۔ بہت خوشحال تھے۔ وہ ڈپلومیٹک سروس میں رہے۔ بعد میں آزاد کشمیر میں منسٹر ہو گئے تھے۔ ایران پاکستان بونڈری کمشن کے ممبر بھی رہے۔ بہت ممتاز آدمی تھے۔ پورن نگر (سیالکوٹ)، آ کے آباد ہو گئے تھے۔

۴۸۶

سیّد الاحرار خلیفہ قادیان کے قدموں پر

چند روز ہوئے گوجرانوالہ مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں حضرت علامہ میر محمد ابراہیم سیالکوٹی نے یہ انکشاف فرمایا تھا۔ کہ احرار جن احمدیوں کی مخالفت کا ڈھول پیٹا کرتے تھے۔ اب ان کے سامنے ووٹوں کے حصول کیلئے ناک گھسنیاں کر رہے ہیں اور ماتھے رگڑ رہے ہیں۔ چنانچہ اس امر کی تصدیق روزنامہ "الفضل" قادیاں کی تازہ ترین اشاعت کی مندرجہ ذیل خبر سے ہوتی ہے۔

"ایک ضروری اعلان

تحصیل ڈسکہ کی تمام جماعتوں کو اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ تمام احمدی ووٹنیز ان کے زیر اثر ووٹ صاحبزادہ فیض الحسن صاحب آلومہار کے حق میں گذاریں۔

ناظر امور عامہ"

(روزنامہ "الفضل" صفحہ ۱۲ کالم ۱ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء)

اب صاف ظاہر ہو گیا ہے۔ کہ مجلس احرار نے مرزائیوں کی مخالفت کا ڈھونگ بعض مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کیلئے رچایا ہوا ہے۔ وگرنہ وہ اندرونی طور پر مرزائیوں سے شیر و شکر ہے۔

اِدھر کبھی اُدھر کے ریاکارانہ پروپیگنڈا سے بچیں!

اور

اپنے ووٹ مسلم لیگ کے نمائندہ شیخ کرامت علی کو دیں

شعبہ نشر و اشاعت گوجرانوالہ مسلم لیگ

۱۹۴۶ء کے الیکشن کے موقعہ پر گوجرانوالہ مسلم لیگ کی طرف سے شائع کردہ ایک اشتہار

فوت ہو چکے ہیں۔ موٹر شو ٹر ان کے پاس ہوتی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس موٹریں کہاں ہوتی تھیں۔ انٹرول کے وقت میں پارک کمیٹی میں بیٹھا تھا تو یہ تینوں آ گئے۔ میرا گاؤں ساتھ ہی تھا۔ میرا کھانا وہاں سے آ گیا تھا۔ شیخ کرامت علی کہنے لگے کھانا کھانے ہی ہم آئے ہیں۔ آپ والا ہی نہ کھا لیں۔

بہر حال، وہاں سے نبٹا کے دوسرے دن میں دھاروال کے پولنگ سٹیشن پر گیا۔ تالاب شیخ مولا بخش کے سامنے جہاں اب فضل کریم اینڈ سنز کا کارخانہ ہے۔ وہ کھلی جگہ تھی۔ وہاں مسلم لیگ کا کیمپ لگا تھا۔ وہاں سے ووٹر پرچی لے کے چلتا تھا تو پولنگ بوتھ دھاروال سکول کے اندر تھا۔ انہوں نے اپنے آدمی راستے میں کھڑے کیے ہوئے تھے۔ وہاں سے آدمی چلتا تو وہ شور مچانا شروع کر دیتے۔ "جعلی اوئے، جعلی اوئے، جعلی اوئے" ووٹر بیچارے نے دھاروال سکول تک پہنچتے پہنچتے کنفیوز ہو جاتا۔ اندر احاطے میں فیروز بوداں اور دوسرے تیسرے پھر رہے ہیں۔ فیروز بوداں گورے رنگ کا اونچا لمبا جوان تھا۔ بوداں اس کی ماں کا نام تھا۔ یہ آغا ممتاز (چھاؤنی) کا ماموں تھا۔ فیروز بوداں اور اس قسم کے کئی احاطے کے اندر سرگرم تھے۔ سو سے زیادہ ہی تھے۔ ہمارے ووٹر نے سکول کے احاطے میں داخل ہونا تو انہوں نے بھی باہر والوں کی طرح غل مچانا "جعلی اوئے، جعلی اوئے، جعلی اوئے"۔ میں وہاں گیا تو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، پریذائیڈنگ افسر تھا۔ سکھ تھا۔ میں نے کہا۔ پہلے یہ چیز تو بند کریں اور یہ بتائیں کہ ان میں پولنگ ایجنٹ کون ہے۔ کہنے لگا۔ نہیں نہیں۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے کہا ہر چیز ٹھیک ٹھاک نہیں۔ مجھے بتائیں کہ ان میں پولنگ ایجنٹ کون ہے۔ باقی کو باہر نکالیں۔ وہ لوگ بھی وہاں آ گئے۔ "کوئی گل نئیں شاہ جی۔ کوئی گل نئیں شاہ جی"۔ میں نے کہا کوئی گل تو بعد میں دیکھی جائے گی۔ پہلے میں اصل گل کر لوں۔ دس منٹ کے اندر اندر سب کلیئر ہو گیا۔ فالتو آدمی نکال دیئے گئے۔ ماحول ہی بدل گیا۔ ان کے نکلتے ہی امن ہو گیا۔

دو چار آدمی آئے۔ ان کے کوائف غلط تھے۔ ایک لڑکا آیا۔ اس کی ذات نائی لکھی تھی۔ تھا وہ کشمیری۔ میں نے اعتراض کیا۔ پرچیاں پٹواری وغیرہ اشو کرتے تھے۔ یہ مسلمان تھے۔ انہوں نے جا کے پریذائیڈنگ افسر کو بتایا کہ انہوں نے یہ اعتراض کیا ہے۔ اس نے کہا۔ جی اس میں کیا ہے۔ میں نے کہا۔ جی آپ کے نزدیک تو کوئی بات نہیں جبکہ تصحیح کے لیے تاریخیں مقرر تھیں۔ اس کے کوائف میں کچھ غلطی تھی تو موقعہ تھا کہ یہ درست کروا لیتے۔ پھر میں ووٹر سے مخاطب ہوا۔ کیوں بھئی تو نائی ہے۔ اس نے کہاں تسلیم کرنا تھا۔ اس قسم کے پانچ سات کیس میں نے پکڑے کسی کو معاف نہ کیا تو وہ سمجھ گئے کہ اب کام نہیں چلے گا۔ پھر سارا دن معاملہ ٹھیک سے چلتا رہا۔

بارھویں دن مرزا گورائیہ میں پولنگ تھا۔ وہاں احراریوں کا کوئی ووٹ نہیں تھا۔ ساری مسلم لیگ کے ووٹ تھے۔ وہاں ہم تانگوں پر گئے راستے میں ہم نے دیکھا کہ سکھ بڑی بڑی ڈانگیں (لاٹھیاں) پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ وہ تو ساری ذیل ہی مسلم لیگ کی تھی۔ اس لیے مخالفین نے تاخیری حربے اپنا رکھے تھے۔ وہ یوں کہ پولنگ سٹیشن تک انہوں نے چھ سٹاپ بنائے ہوئے تھے۔ ووٹروں کی ایک ٹولی آ رہی ہے تو وہ انہیں چھ جگہ روک لیتے تھے۔ اس طرح پانچ سات منٹ میں ایک ووٹ پول ہوتا تھا۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو اندر چلا گیا۔ وہاں وہی سکھ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز پریذائیڈنگ آفیسر تھا جو دھاروال پولنگ سٹیشن پر بھی تھا۔ میں نے کہا سردار جی اتنی جلدی آپ میں یہ فرق آ گیا۔ اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ میں بڑا غیر جانبدار ہوں

میں نے کہا۔ آپ کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ آپ کا رویہ بڑا خراب ہے۔ اس کے بعد وہ ٹھیک چلا۔ لیکن پھر ہنگامہ ہو گیا۔ اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ عبدالغنی گھمن بھی وہاں موجود تھا۔ وہ دراصل غنی کو ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ غنی کا بھائی محمد الٰہی گھوڑے پر بیٹھ کے آدمی لا رہا تھا۔ وہ سو فی صد مسلم لیگ کے ووٹ تھے۔ اس نے آکر بتایا کہ ان پر فائرنگ ہوئی۔ اور یہ فائرنگ تھانیدار نے کی ہے۔ اور لاٹھیاں چلی ہیں۔ وہ پھر گھوڑے پر بیٹھ کے پولنگ سٹیشن سے جانے لگا۔ میں نے اسے اتار دیا کہ چوہدری صاحب! آپ تو سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مخالفین نے پلاننگ کی ہوئی ہے۔ وہ آپ کو کچھ کر دیں گے۔ میں ڈپٹی کمشنر کو صورتِ حال سے انفارم کرنے کے لیے وہاں سے چلا، بلکہ راستے میں ہماری موٹر (کار) بھی خراب ہو گئی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پولنگ میں آدھا گھنٹہ رہتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نکل سین ہندو تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کا ممبر تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی دونوں ان معاملات میں ملوث تھے۔ ایس پی کا نام بونٹ تھا۔ یہودی تھا۔ میں ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچا تو وہ اپنے کورٹ روم کے باہر کھڑا تھا۔ مجھے کہتا ہے۔ میں سمجھا تھا کہ ہمارے ضلع میں پولنگ بڑا پر امن ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔ پر امن یہی ہے کہ آپ کی ساری انتظامیہ ہمارے مخالفین کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

جس جس پولنگ اسٹیشن پر میں تھا ہم انہیں اس لیے کنٹرول کر لیتے تھے کہ ہمارے پاس سارے رولز تھے۔ ہم ان پر حاوی تھے۔ جبکہ پریذائیڈنگ افسروں کے پاس صرف تعصب تھا۔ پھر لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم احراریوں، ہندوؤں، سکھوں، یونینسٹوں اور انتظامیہ کے لوگوں کو کنٹرول کر لیتے تھے۔ ہم نے اپنے آدمیوں سے کہا ہوا تھا کہ ان سے کلیم کرنا کہ جب تک پولنگ ایجنٹ نہیں آئے گا۔ اس وقت تک آپ ہمارے ووٹ پر مارک نہیں کریں گے۔ اگر وہ پھر بھی مارک کرنے کی کوشش کریں تو ان کا ہاتھ پکڑ لیں۔ بیشک ان سے لڑ پڑیں۔ ہنگامہ کرنا پڑے تو ان سے ہنگامہ کر دیں۔ ہم سنبھال لیں گے۔ مخالفین اور انتظامیہ جب یہ دیکھتی کہ اس میں کامیابی والی کوئی صورت نہیں تو معاملہ سموتھ ہو جاتا تا۔ بارہ دنوں کے دوران میں جتنے پولنگ سٹیشنوں پر میں رہا ہوں۔ وہاں پر تو میں نے ان کی نہیں چلنے دی۔ یہ تو میں دوسرے حلقوں کا بتا رہا ہوں۔ اپنے حلقے میں ہمیں لڑنا پڑا۔ یہ تو جہاں ہمارے ورکر ٹھیک نہیں تھے۔ وہاں ہم مار کھا گئے۔

س :۔ مثلاً

ج :۔ مثلاً جس جس پولنگ سٹیشن پر اقبال چیمہ تھے۔ وہاں ہم سے بڑی زیادتی ہوئی۔ کیونکہ اقبال چیمہ رزسٹ نہیں کرتے تھے۔ پاپولر آدمی تھے۔ دونوں طرف کو خوش رکھتے تھے۔

س :۔ آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو بڑے ہی کٹھن حالات درپیش تھے۔

ج :۔ بڑے جی مسلم لیگ کی مخالفت میں انہوں نے ہر حربہ اختیار کیا۔ ہم احرار والوں کو اپنے زور سے شکست دیتے تھے۔ ورنہ غنڈہ گردی میں تو ہم میں وہ عنصر نہیں تھا۔ اس وقت ہم میں بڑا جوش اور ولولہ تھا۔ ہم بہت سرگرم تھے۔ لوگ ہمارے ساتھ تھے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا ہو گیا۔

اب ہر کوئی کہتا ہے کہ ہم نے مسلم لیگ بنائی تھی۔ ایسے دعویدار اُس وقت تو ہم نے کہیں دیکھے نہیں تھے۔ یہ مسلم لیگ کو کم نمایاں کرتے تھے۔ اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اور جو اصلی ورکر تھے مثلاً آغا ذوالفقار تھے یا جو لوگ بھی تھے۔ وہ تو "نکرے" لگے ہوئے ہیں۔

ابھی حال ہی کی بات ہے۔ چند ماہ ہوئے۔ ایک دن ڈپٹی کمشنر (سیالکوٹ) کا سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا۔ کہ پریذیڈنٹ کی چٹھی آئی ہے کہ ہمیں پرانے مسلم لیگیوں کی فہرست دی جائے بلکہ ہوا یوں تھا کہ ہندوستان میں کوئی پرانا کانگرسی لیڈر بیاور کر مرچکا تھا۔ اس کی فیملی ابتلا میں تھی۔ اندرا گاندھی کو پتہ چلا تو اس نے اس فیملی کو بڑا سپورٹ کیا۔ پھر انہوں نے ایسے افراد کی فہرستیں مانگیں جن کے حالات اچھے نہیں رہے تھے۔ تاکہ انہیں سپورٹ کیا جائے۔ اس سے متاثر ہو کر صدر ضیاء نے بھی ایسے لوگوں کی امداد کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنروں سے ایسے افراد کی فہرستیں مانگی تھیں۔ ڈی سی کا سپرنٹنڈنٹ مجھے کہنے لگا۔ ہم نے انٹلی جنس والوں سے اور دوسری پولیس سے پوچھا ہے۔ انہیں تو کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی کوئی دلچسپی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ایسا ریکارڈ نہیں۔ اس لیے شاہ صاحب! آپ مہربانی کریں۔ میں سٹینو گرافر بھیج دوں گا۔ آپ ایسے لوگوں کے نام لکھوا دیں۔ میں نے کہا جن افراد کا مجھے پتہ ہے۔ وہ میں لکھوا دیتا ہوں۔ آپ آغا ذوالفقار سے پوچھ لیں۔ وہ بھی پرانے آدمی ہیں۔ جس وقت ایجی ٹیشن ہوئی اور لوگ قید ہوئے اور جو کھلم کھلا پاکستان کی حمایت میں نکلے مجھے وہ سارے نام یاد تھے۔ میں نے انہیں وہ لکھوا دیئے۔ وہ ایک سو کچھ آدمی تھے۔ میں نے کہا ان سب ناموں کے آگے بریکٹ لگا کے لکھ لیں کہ یہ حکومت مدد کر سکتے ہیں۔ انہیں حکومت سے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس وقت انہوں نے اپنا فرض پہچانا۔ انہیں آپ کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ قید بھی ہوئے۔ چندہ بھی دیتے رہے۔ پاکستان کے قیام کی خاطر ہر کوشش کرتے رہے۔ ہنگامہ کرنا پڑا تو اس سے بھی گریز نہ کیا۔

اور ایسے ایسے واقعات ہوئے ہیں منیر صاحب۔ ایسے ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ جن کا لوگوں کو پتہ ہی نہیں۔ لوگوں نے اپنی جانیں دیدیں۔ چودھری سرفراز کے حلقے (ڈسکہ) کا واقعہ ہے۔ موضع تلہاڑا میں ایک بڑا نمایاں آدمی تھا۔ وہ یونینسٹ چودھریوں کے ساتھ پھرنے والا تھا۔ اس کے اپنے مفادات تھے۔ وہ پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ میرا تو ووٹ نہیں۔ لیکن تو نے مسلم لیگ کو ووٹ دینا ہے۔ اس نے کہا میں مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دوں گا۔ ووٹ گورنمنٹ کو دینا چاہیئے۔ میاں بیوی کی آپس میں تکرار ہوتی رہی۔ آخر بات یہاں تک پہنچی کہ اس نے کہا۔ اگر تو نے مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیا تو میں پھاہ لے لوں گی۔ جس روز پولنگ ہوا۔ میاں شام کو واپس آیا۔ بیوی نے پوچھا۔ مسلم لیگ کو ووٹ دیا؟ اس نے کہا۔ نہیں، میں نے مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیا۔ بیوی نے گلے میں پھندا ڈالا اور جان دیدی۔

س:۔ اللہ اکبر۔ کس قدر عظیم عورت تھی وہ۔ کس قدر عظیم عورت تھی وہ۔ ٹھیک، خودکشی حرام ہے۔ لیکن اس کے جذبۂ صادق کو دیکھیں۔ وطن کے لیے اس کے جذبات کو دیکھیں۔ واہ واہ۔

ج:۔ بس اس پر اثر تھا۔ اچھا چودھری سرفراز ممبر ہو گئے۔ اس گاؤں میں ایک دن کسی موقعہ پر وہی آدمی سرفراز کے بڑا قریب ہو کر بیٹھے۔ جن لوگوں نے سرفراز کی مدد کی تھی، وہ بڑا پیچ و تاب کھائیں، وہ قتل ہو گیا۔ اس کے قتل میں یہ ایلیمنٹ بھی تھا۔ جنہوں نے قتل کیا میں ان کا وکیل تھا۔ یہ محرک نہ پیش آیا۔ وہ بچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا چھ ماہ بعد قدرتی موت مر گیا۔

بعض واقعات بظاہر معمولی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کا قوموں کی تاریخ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جس طرح سر شفاعت احمد والا قصہ ہے۔ ہوا یوں کہ انگریزوں نے عبوری حکومت بنانا تھی۔ انہوں نے کانگریس کو بھی فردی

اور مسلم لیگ کو بھی آفر دی۔ کانگریس نے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے قبول کر لیا۔ لیکن گورنمنٹ بیک آؤٹ کر گئی۔ انہوں نے پھر فیصلہ کیا کہ حکومت میں خالصتہً کانگریس کو شامل کر لیتے ہیں۔ مسلمانوں میں سے ان کو لے لیتے ہیں جو مسلم لیگ میں نہیں لیکن حکومت کے لیس مین ہیں۔ انہوں نے ابتداً سر شفاعت احمد کو نامزد کیا۔ بھلا اس پر مسلمانوں کا ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا نام مولوی اے کے فضل الحق کا اناؤنس کرنا چاہتے تھے۔ ابھی اعلان نہیں ہوا تھا کہ ایک روز خبر آئی کہ سر شفاعت احمد شملہ کے مال روڈ پر بیہوش پائے گئے ہیں انہیں کسی نے چھرا گھونپ دیا ہے۔ شملہ گرمائی دارالحکومت ہوتا تھا۔ تفتیش ہوئی تو پتہ چلا کہ امرتسر کے دو مسلمان لڑکے سیکرٹریٹ میں کلرک تھے۔ سر شفاعت مال روڈ پر شام کو سیر کرتا تھا۔ وہ لڑکے اسے دیکھ رہے تھے اور پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ یہ مسلمانوں کو لے بیٹھے گا۔ جس وقت تھوڑا سا اندھیرا ہوا۔ انہوں نے اسے چھرا گھونپ دیا۔ ساری رات یہ وہیں پڑا رہا۔ اس واقعہ کا پریس میں شور مچ گیا۔ گورنمنٹ نروس ہو گئی۔ اس نے دوسرا اعلان جو مولوی فضل الحق کے متعلق تھا، روک لیا۔ ان دونوں لڑکوں کے خلاف ٹرائل شروع ہو گیا۔

ان دنوں شملہ کے ڈپٹی کمشنر شیخ فضل الٰہی پراچہ تھے۔ خواجہ حبیب علی وہاں فسٹ کلاس مجسٹریٹ تھے۔ خواجہ صاحب مولانا الطاف حسین حالی کے خاندان سے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے وہ بہنوئی تھے۔ فضل الٰہی پراچہ نے مجھے بتایا کہ میرا کورٹ روم فسٹ فلور پر تھا۔ خواجہ حبیب علی میرے ٹریژری آفیسر تھے۔ جس روز ان لڑکوں کی تاریخ ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ان کے لیے جلوس آرگنائز کرتے تھے۔ اور وہ لڑکے جلوس کی صورت میں کورٹ تک آتے تھے۔ پراچہ صاحب خواجہ حبیب علی کی بہت تعریف کرتے تھے کہ میں اپنے کمرے میں سے یہ سارا منظر دیکھا کرتا تھا کہ یہ شخص کس قدر بیباک اور دلیر ہے کہ سرکاری ملازم ہے۔ لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ڈسمس ہو جاؤں گا یا مجھ پر مقدمہ بن جائے گا یا یہ کہ میں حکومت کی نظروں میں آ رہا ہوں۔

ان دو لڑکوں نے سر شفاعت احمد پر حملہ کر کے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ورنہ تاریخ مختلف ہوتی۔

س:۔ اتنا کچھ ہو رہا تھا۔ ہندو اور ہندوؤں کے ہمنوا اگر سیاسی بصیرت سے عاری بعض نام نہاد مسلمان لیڈروں کو پھر بھی یقین نہیں تھا کہ بن کے رہے گا پاکستان۔

ج:۔ جب عبوری حکومت بنی ہے۔ ایگزیکٹو کمیٹی کا پریذیڈنٹ وائسرائے تھا۔ وائس پریذیڈنٹ جواہر لال نہرو تھا۔ ایک طرح سے وہ پرائم منسٹر تھا۔ ہندوؤں کا اس قدر خراب رویہ تھا جس کا کوئی حساب نہیں۔ وہ کہتے تھے: حکومت ہماری بن ہی گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہم ان پر حکومت کریں گے۔ مجھے یاد ہے انہی دنوں ایک روز میرا ایک عزیز بشیر حسین شاہ اور میں اتفاق سے لاہور سے سیالکوٹ آنے والی لاری میں اکٹھے ہو گئے۔ اس میں کچھ شوخ سے ہندو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی سیالکوٹ کے تھے۔ انہوں نے بڑی چبھتی ہوئی باتیں کیں۔ ایمن آباد ابھی نہیں آیا تھا کہ بشیر شاہ اس پہ برس پڑا۔ کہنے لگا۔ باؤ! یہ جو باتیں آپ کر رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کہیں ہم آپس میں لڑ ہی نہ پڑیں اور فیصلہ ہو جائے۔ بہرحال وہ لڑکے دب گئے۔

میں بتا یہ رہا ہوں کہ اس قسم کا ماحول بن چکا تھا۔ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان والی تے گل شل کوئی نئیں۔ ہندوستان کے ہم تو مالک بن گئے ہیں۔ ہمارا وزیر اعظم تو بن ہی گیا ہے۔ وہ تو پھر نہرو کا سرحد کا دورہ ناکام ہوا حالانکہ سرحد میں ڈاکٹر خان کی منسٹری تھی۔ نہرو نے دیکھا کہ یہ مسلمان جنہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہیں۔ جن پر ہم انحصار کرتے

ہیں۔ لوگ نوان کے ساتھ نہیں۔ اس طرح مردان کے ہوئی بازار میں سے گاندھی کا جلوس گزرا۔ وہ سارا ہی بڑے گوشت کا بازار تھا۔ انہوں نے سالم گائیں لٹکا رکھی تھیں۔ گاندھی کو یہ بات بہت ناگوار لگی۔ اس پر اس کا بڑا سخت ردعمل ہوا۔ اس کا اس نے اظہار بھی کیا۔ اس قسم کے واقعات سے ہندو کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو ہم کنٹرول نہیں کر سکتے۔ یہ الگ ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ پاکستان ان سے چلنا تو ہے نہیں۔

م ۔ش نے مردان کے لیے نہرو کا دورہ کور کیا تھا۔ وہ رپورٹنگ مجھے یاد ہے ممکن ہے ان کی یادداشت وہ نہ ہو۔ کیونکہ ایک دو بار میں نے ان کے آرٹیکل پڑھ کے محسوس کیا ہے کہ وہ تفصیل کے متعلق غلطی کھا جاتے ہیں۔ بہرحال م ۔ش کا رپورٹنگ میں بڑا اہم رول ہے۔ بہت بڑی پرفارمنس (کارکردگی) ہے۔ م ۔ش میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب ابھی پاکستان ریزولیوشن نہیں ہوا تھا۔ یہ ہم سے سینئر تھے میں ایف سی کالج میں بی اے میں تھا یہ ایم اے میں تھے۔ میں بوئنگ ہال میں رہتا تھا۔ یہ علامہ اقبالؒ کے پاس بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ علامہ کی زندگی میں ہی انہوں نے اقبال ڈے کرنا تھا۔ انہوں نے انٹر کالجیٹ برادرہڈ بنائی ہوئی تھی۔ اس کے پریذیڈنٹ حمید ملک تھے جو میڈیکل کے سٹوڈنٹ تھے۔ بعد میں انہوں نے سکن سپیشلسٹ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ فوت ہو گئے ہیں۔ م ۔ش اسی تنظیم کے سیکرٹری تھے۔ یہ اقبال ڈے کے لیے مسلمان لڑکوں سے چندہ اکٹھا کرنے بوئنگ ہال میں بھی آئے۔ میں نے کہا۔ آپ جو حکم کریں انہوں نے جو کچھ کہا۔ میں نے وہ پیش کر دیا۔ انہیں وہ واقعہ آج تک یاد ہے ہمیشہ ذکر کرتے ہیں۔ ہم پنجاب اسمبلی میں اکٹھے ممبر بھی رہے ہیں۔ اس وقت بھی کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب آپ محدود وسائل کے باوجود ہماری بڑی مدد کرتے تھے۔ میں کہتا تھا۔ یہ تو آپ کی مہربانی تھی کہ سٹوڈنٹ ہوتے ہوئے آپ اتنا وقت دیتے تھے میں انہیں اکثر چندہ دیتا رہا۔

مال روڈ پر جہاں اب بنک سکوائر ہے۔ اس جگہ ایف سی کالج تھا۔ جی پی او کے سامنے جو سڑک نیلا گنبد کو نکلتی ہے۔ اس پر کالج کا گیٹ کھلتا تھا۔ پرنسپل کی کوٹھی کا گیٹ مال روڈ پر تھا۔ یہ کوٹھی دو کنال میں تھی۔ جب ایف سی کالج کو نہر کے پار شفٹ کرنے کا پروگرام بنا تو یہ زمین لوگوں کے پاس بیچ دی گئی۔ پرنسپل کی کوٹھی ڈیڑھ لاکھ میں بکی۔ اس وقت اس پر بڑے تبصرے ہوئے کہ دیکھو یہ زمین کتنی مہنگی ہے جہاں اب میو ہسپتال کی نرسیں رہتی ہیں۔ یہ نیوٹن ہال تھا اس پر ۱۹۰۲ کا سال درج ہے۔ اس سے آگے ڈاکٹر ایبک کی کوٹھی کے ساتھ مڑیں جہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی لڑکیوں کا ہوسٹل ہے۔ کینیڈی ہال تھا۔ یہ دونوں ہوسٹل میو ہسپتال نے لے لیے تھے۔ بوئنگ ہال، اس کے پیچھے ٹینس گراؤنڈ اور اس کے آگے قبرستان۔ یہ کالج نے اپنے پاس رکھے۔ ۱۹۳۶ء میں ہم نے کالج کی اس پرانی بلڈنگ سے بی اے کیا۔ ہماری کانووکیشن یہیں ہوئی تھی۔ اس سے اگلی کانووکیشن میرا خیال ہے نئی بلڈنگ میں ہوئی تھی۔

س : قیام پاکستان کے موقعہ پر سیالکوٹ بھی تو ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ابتدا کس طرف سے ہوئی تھی۔

ج : خضر حیات ٹوانہ کے خلاف مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی تحریک میں ہم لوگ گرفتار ہوئے۔ ہمیں سیالکوٹ جیل میں رکھا گیا۔ جلوس آیا تو لوگ سیالکوٹ جیل کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ پولیس نے ان پر فائرنگ کی اور ان لوگوں پر پرچے بھی کر دیا۔ پھر انہوں نے ہمیں سیالکوٹ جیل سے ٹرانسفر کر دیا۔ ہم گورداسپور جیل سے رہا ہو کے آئے۔ ایک

دوروز میں اپنے گاؤں بھرٹھ میں رہا، کچہری نہ آیا۔ اگلے روز پتہ چلا کہ فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ جس سے پانچ سات ہندو سکھ مر گئے ہیں۔ ایک سکھ پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔ وہ قلعے کی سبزی منڈی والی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ لوگوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ یہ دراصل ایک تو دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کا ردِ عمل تھا۔ دوسرے یہ تھا کہ جو مسلمان پیرس روڈ پر سرِ شام گذرتا، راشٹریہ سیوک سنگھ والے اسے چھرا گھونپ دیتے تھے۔ پھر ایک واقعہ کچہری روڈ کے سینما (اس وقت روز اب نشاط) کے باہر ہوا۔ وہاں میانہ پورہ کے ایک مسلمان لڑکے کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ اس میں آسودہ خاندانوں کے سترہ اٹھارہ ہندو لڑکے ملوث تھے۔ وہ سب بھاگ گئے۔ ان پر پرچہ ہو گیا۔ حاجی شاہ محمد سٹی انسپکٹر پولیس تھا۔ اس نے انہیں بڑا سخت ہاتھ ڈالا۔ وہ بڑا ہی سخت ایماندار پولیس افسر تھا۔ پیسے نہیں لیتا تھا۔ بڑے اچھے کردار کا آدمی تھا۔ بڑی نادر قسم کی شخصیت تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس کے دل میں بہت درد تھا۔ بہرحال اس لڑکے کو بیہوشی کے عالم میں سول ہسپتال لایا گیا۔ اگلے روز پتہ چلا کہ اقبال چیمہ اسے جا کے پھل وغیرہ دے آیا ہے۔ ہم نے اس قسم کے متاثرین کے لیے وکیلوں کی ایک کمیٹی بنائی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کا ممبر تھا۔ خواجہ صفدر اس کے کنوینیر تھے۔ مجھے کہا گیا کہ اس کا کیس آپ لڑیں گے۔ اے ڈی ایم بڑا متعصب ہندو تھا۔ اس کی کچہری میں مقدمہ لگا۔ کچھ مسلمان پیش ہوئے، وہ انہوں نے بھگا دیئے تھے۔ پی ایس آئی بھی ہندو تھا۔ ان کا وکیل سی رائے تھا۔ شہر کا ٹاپ موسٹ وکیل تھا۔ آج کل سیشن جج اس کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ میں پیش ہونے کے لیے گیا۔ تو ایک ملزم غیر حاضر تھا تاکہ مقدمہ کی سماعت نہ ہو سکے۔ اس دوران میں وہ لوگ گواہوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ اے ڈی ایم کہہ رہا تھا۔ فلاں سیکشن نکالو۔ فلاں سیکشن نکالو۔ میں نے کہا، میں آپ کی گیم سمجھ گیا ہوں پھر کیوں خواہ مخواہ قانونی بحث کر رہے ہو، میں باہر آیا۔ اس لڑکے کی ماں بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ وہ دیکھو جی میرے لڑکے کو رے گئے ہیں۔ مجھے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا، اچھا مائی آپ مجھے بات سمجھائیں۔ اس نے بتایا کہ میرے لڑکے کو انہوں نے کہیں چھپا رکھا تھا۔ اس کا بیان کرانے کے لیے لاتے ہیں کہ کہہ دے مجھے انہوں نے نہیں مارا۔

دوسری پیشی پر میں عدالت میں جا رہا تھا کہ حاجی شاہ محمد بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ حاجی صاحب میں آپ کی مدد کے لیے وکیل ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ٹھیک ہے شاہ صاحب آپ ہمارے وکیل ہیں۔ لیکن یہ جو اقبال چیمہ ہے۔ اس نے ہمارے مستغیث کو بھگا دیا ہے۔ میں تو حیران ہی رہ گیا۔ میں اقبال کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ میری بڑی عزت کرتا تھا۔ میں نے کہا، حاجی صاحب آپ نے بڑا سخت الزام لگایا ہے۔ حاجی صاحب کہنے لگے۔ آواز لگی ہے۔ آپ اندر ہو آئیں پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔ میں آیا تو انہوں نے مجھے ساری بات بتائی کہ اس لڑکے کو انہوں نے بہت رشوت دی۔ اور اقبال چیمہ نے اس میں حصہ لیا۔ یہ نہیں کہ اقبال چیمہ کی انہیں صرف ہمدردی تھی۔ بلکہ ایکٹو سپورٹ حاصل تھی۔ بہرحال وہ کیس بیچ میں ہی رہا کہ پاکستان بن گیا۔ ان سارے واقعات کا ردِ عمل تھا کہ وہ پانچ سات ہندو سکھ قتل ہو گئے۔

حتیٰ کہ ڈپٹی کمشنر نکل سین کے متعلق سیکرٹ رپورٹ یہ تھی کہ وہ آر ایس ایس کی میٹنگیں اٹنڈ کرتا تھا۔ وہ تو تبدیل ہو گیا۔ اس کی جگہ راجہ افضل آیا۔ وہ سات ماہ رہا۔

بڑی بدقسمتی ہماری یہ ہے کہ ہماری لیڈر شپ نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ پاکستان بننے کے فوراً

بعد انہوں نے ایم ایم احمد کو جو مرزائی تھا، سیالکوٹ کا ڈپٹی کمشنر لگا دیا۔ حق نواز ٹوانہ جو یونینسٹ خضر حیات ٹوانہ کا کزن تھا۔ اسے ایس پی لگا دیا۔ لاہور میں مسلم لیگ کا ایک جلوس گذر رہا تھا۔ ایک موٹر آئی۔ اس میں سے پاکستان کے لیے نکلنے والے اس جلوس پر اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ کر کے وہ موٹر نکل گئی۔ جس شخص نے فائرنگ کی وہ ایک مراسی تھا سیف علی۔ اسے بندوق علی کہتے تھے۔ پاکستان بنا تو اس نے سیالکوٹ میں پناہ لی۔ تین چار اور بڑے خبیث قسم کے آدمی تھے۔ جنہیں پاکستان میں کوئی جگہ برداشت نہیں کرتی تھی۔ انہوں نے سیالکوٹ آ کے پناہ لی۔ وہ تو ہم نے شور و ور مچایا تو وہ بھاگ گئے۔ پھر انہوں نے الاٹمنٹوں میں مرزائیوں کی اتنی سرپرستی کی کہ اس سے مسلم لیگی ورکروں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ کیونکہ مرزائی تو یقیناً پاکستان کے خلاف تھے۔

س: مسلم لیگ میں بھی تھے؟

ج: نہیں۔ ان کا ایک ہی امیدوار کامیاب ہوا تھا۔ بٹالہ کے حلقے سے جہاں قادیان بھی تھا۔ وہ فتح محمد سیال تھا۔ وہ اس لیے جیت گیا کہ مسلم لیگ نے اس کی مخالفت نہ کی۔ کیونکہ سٹنگ ممبر بدر محی الدین جو شمیم حسین قادری کی فیملی سے تھا۔ وہ یونینسٹ تھا۔ الیکٹ ہونے کے بعد فتح محمد سیال مسلم لیگ اسمبلی پارٹی جائن کرنا چاہتا تھا۔ سر جمال خاں لغاری اور نواب عاشق حسین قریشی یونینسٹ حکومت میں منسٹر رہے تھے۔ پھر دونوں نے مسلم لیگی امیدوار کو ہرا دیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے مسلم لیگ جائن کرنے کی درخواست کی۔ ان دونوں کو تو اجازت مل گئی۔ فتح محمد سیال کو مرزائی ہونے کی وجہ سے اجازت نہ ملی۔ معاملہ قائداعظمؒ تک گیا۔ قائداعظمؒ نے کہا: ٹھیک ہے، وہ ہمدرد رہے۔ اسے اجازت نہیں دی جا سکتی۔

س: میں نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نام جو سیاسی خطوط پڑھے ان میں مولانا پر بعض علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ آپ مسلم لیگ کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ جبکہ اس جماعت میں مرزائی بھی ہیں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ مرزائی مسلم لیگ میں نہیں تھے۔

ج: ممکن ہے ایسا ہو، لیکن سیالکوٹ میں تو وہی صورت تھی۔ جو میں نے بیان کر دی۔

س: آپ نے کہا ہے کہ انہوں نے ایم ایم احمد (ڈی سی) اور حق نواز ٹوانہ (ایس پی) کو سیالکوٹ تعینات کر دیا۔ "انہوں نے" سے آپ کی مراد؟

ج: ممتاز دولتانہ۔ اسی نے یہ آدمی پوسٹ کرائے۔ یونینسٹوں اور مرزائیوں کو جو سیالکوٹ والا فائدہ پہنچا اس کا باعث دولتانہ تھا۔

س: اس میں ممتاز دولتانہ کا کیا مفاد تھا۔

ج: اس میں ان کا یہ مفاد تھا کہ وہ انہیں ساتھ ملا کے ان کی سپورٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان تو بن گیا۔ اب پارٹیاں معاشی بنیادوں پر بنیں گی۔

س: دولتانہ کے متعلق یہ آپ کا قیاس ہے یا انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ "اب پارٹیاں معاشی بنیادوں پر بنیں گی"۔

ج: قائداعظمؒ مسلم لیگ کی کونسل کو "پارلیمنٹ آف دی نیشن" کہا کرتے تھے۔ جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا پلان پیش کیا تو قائداعظمؒ نے کہا کہ میں کونسل کا اجلاس بلاتا ہوں۔ یہ تجویز اس

کے سامنے رکھوں گا وہ اگر قبول کرے گی تو ٹھیک ہے۔ غالباً، جون تھی جب دہلی کے امپیریل ہوٹل میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ خیر، وہ پلان لمبی چوڑی بحث کے بعد کونسل نے قبول کر لیا۔ نواب ممدوٹ اور دولتانہ راجہ غضنفر علی صاحب کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کو میں اور چودھری سرفراز انہیں ملنے کے لیے گئے۔ ہم دولتانہ صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مجھے تجسس یہ تھا کہ پاکستان کا آئین کیا ہوگا۔ دولتانہ صاحب سے میں نے پوچھا۔ میاں صاحب پاکستان کا آئین کس قسم کا ہوگا۔ کہنے لگے۔ اس پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو قائداعظم رح کو پتہ ہے۔ لیکن اس بات کا مجھے پتہ ہے کہ مسلم لیگ کا مشن پورا ہو گیا ہے۔ مستقبل میں پارٹیاں مذہبی نہیں، معاشی بنیادوں پر بنیں گی، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا، ضروری نہیں کہ میں اور ممدوٹ ایک پارٹی میں رہ جائیں۔ دولتانہ صاحب کی یہ بات مجھے پوری طرح یاد ہے۔ اس لیے بھی کہ میں نے یہ یاد رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ یہ ان کے خیالات کی بنیاد ہے۔ یہ ان کا نظریہ ہے، جس کی ہمیں سزا یا جزا بھگتنی پڑی۔ اب جو دولتانہ صاحب کہتے ہیں کہ قیام پاکستان کا محرک اسلام نہیں معیشت تھی۔ دراصل اس وقت بھی ان کے نظریات کمیونسٹک اور سوشلسٹک تھے۔ کیونکہ جب وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری (۱۹۴۴ء) ہوئے ہیں تو لاہور جا کے انہوں نے جو سیکرٹریٹ اسٹیبلش کیا۔ اس میں کمیونسٹ بھرتی کر لیے۔ مثلاً دانیال لطیفی، عبداللہ ملک اور عطاء اللہ جہانیاں وغیرہ۔ چونکہ آدمی سیانا تھا۔ بعد میں جب اس نے دیکھا کہ یہاں کمیونزم والی کوئی بات نہیں تو اس نے اپنے آپ کو چیلنج کر لیا۔

راجہ صاحب کے ہاں دولتانہ صاحب سے ملنے کے بعد ہم نشتر صاحب سے ملنے کے لیے چلے گئے۔ میری تجویز پر سیالکوٹ والے سیشن ۱۹۴۴ء کی انہوں نے صدارت کی تھی۔ میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ ان سے پاکستان کے آئین کے متعلق پوچھا۔ کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا۔ سب کا قائداعظم رح پر تکیہ تھا۔

س: آپ نے کہا ہے کہ دولتانہ صاحب کے نظریے کی وجہ سے ہمیں سزا یا جزا بھگتنا پڑی۔ وہ سزا یا جزا کیا تھی؟

ج: سزا ہی بھگتنا پڑی وہ میں نے بتایا ناں کہ انہوں نے ایم ایم احمد کو ڈپٹی کمشنر اور حق نواز ٹوانہ کو ایس پی لگوا دیا۔ بھئی ہم آپ کی خاطر لڑتے رہے، تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ آپ ہمیں پوچھیں، کون آدمی غدار ہے۔ ہم آپ کو بتائیں کہ اس ٹیسٹ میں کون کون آدمی صحیح نکلا ہے۔ ایسے افراد کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ جنہوں نے تمہاری مدد کی۔ جنہوں نے پاکستان کے نظریے کو سپورٹ کیا۔ لیکن جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی انہیں آپ نواز رہے ہیں۔

س: مسلم لیگ کے زوال کے اسباب میں یہ بھی تو ایک سبب نہیں کہ اصل ورکروں کو نظر انداز کیا گیا۔

ج: بالکل، میں آپ کو بتاؤں۔ ۴۸ء - ۴۹ء میں مسلم لیگ کے الیکشن ہونا تھا۔ مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن تو یہ کہتی تھی کہ ہر گاؤں میں مسلم لیگ بن سکتی ہے۔ پتہ نہیں پانچ سو یا ایک ہزار ممبرز پر ایک کونسلر اور پھر ایک ہزار یا دو ہزار پر دو کونسلر اور اس سے آگے جتنی تعداد ہو گی۔ اس میں آپکے زیادہ سے زیادہ تین کونسلر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ میں جائیں گے جو اپنا پریذیڈنٹ اور دوسرے آفس ہولڈر الیکٹ کریں گے۔ دولتانہ صاحب نے احمد سعید کرمانی کو ہمارے پاس الیکشن آفیسر بنا کے بھیجا۔ اس نے ابھی سٹوڈنٹ لائف ختم ہی کی تھی۔ اس نے ہمیں کہا اگرچہ کانسٹی ٹیوشن یہ کہتی ہے کہ گاؤں میں پرائمری لیگ بنا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے مینڈیٹ یہ ہے کہ آپ گاؤں کی بجائے

ذیل میں پرائمری مسلم لیگ بنا سکتے ہیں۔ اس میں سے آپ زیادہ سے زیادہ تین نمائندے بھیج سکتے ہیں۔ ایک ذیل میں چالیس چالیس۔ ستر ستر۔ اسی اسی گاؤں تھے۔ ہمیں جب یہ مینڈیٹ ملا تو ہم نے گاؤں کی بجائے ذیل کی بنیاد پر لیگیں بنائیں۔ دوسری طرف عبدالغنی گھمن نے گھوینکے ذیل کے ہر گاؤں میں مسلم لیگ بنا لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کونسلر سارے ضلع سے آئے۔ اتنے کونسلر اکیلا غنی اپنی ذیل میں سے لے کے آ گیا۔ دوسرے بھلو والی میں بھی اتنے ہی گاؤں تھے۔ بھلو والی غنی کا ڈسٹرکٹ بورڈ کا حلقہ تھا۔ وہاں کا ذیلدار چودھری رحمت خاں اور غنی گہرے دوست تھے۔ وہاں سے وہ کتنے سو لے آیا۔ اتنے سارے ضلع میں بھی نہیں تھے۔ ضلع اقلیت میں ہو گیا۔ غنی اکثریت میں ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ یہ آپ نے مینڈیٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ لیکن آپ آئین کی خلاف ورزی تو نہیں کر سکتے۔ آئین کے مطابق گاؤں بنیادی یونٹ ہے۔ ذیل نہیں۔ دراصل دولتانہ صاحب غنی کے ساتھ اندر سے ملے ہوئے تھے۔ ہمیں انہوں نے یہ مینڈیٹ دیا کہ ذیل بنیادی یونٹ ہوگا۔ اُدھر غنی سے کہا کہ تم گاؤں کی بنیاد پر کونسلر بھیجدو۔ اس وقت ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ چوہدری سرفراز تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی وہی چیئرمین تھے جو بائی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ غنی ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی نے چودھری سرفراز کو زیر کر دیا۔ لیکن دا اچھا نال۔

غنی ذیلدار تھا۔ کافی موثر تھا۔ غریب بہت تھا۔ مالی طور پر اس کی کوئی حالت ہی نہیں تھی۔ اگر اتنا غریب نہ ہوتا تو شاید اتنی چیخ نہ مارتا۔ اسی لیے اس نے عزت نہیں پائی۔ اس نے عزت والا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اُسے کامیابی کی ضرورت تھی، بس۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر کیسے الیکٹ ہوا۔ یہ بھی ایک کہانی ہے۔ اس وقت ہندو مسلمان کا سوال تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سیالکوٹ کے گھمن، چیمے، باجوے، ہندوؤں سکھوں میں بھی تھے۔ ان کی تیسری چوتھی پشت جا ملتی تھی۔ اُدھر چوہدری شاہنواز سے اس کا تعلق تھا۔ وہی شاہنواز جو اب شیزان کے مالک ہیں۔ وہ وکیل تھے۔ غنی انہیں مقدمے لا کے دیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن میں غنی نے گھوینکے ذیل سے اپنے اور شاہنواز کے کاغذات نامزدگی داخل کرائے۔ خود یہ بیٹھ گیا۔ اور شاہنواز کو بلا مقابلہ جتوا دیا۔ گوہد پور والے حلقے میں میجر احمد علی امیدوار تھا۔ وہ اس وقت وکیل تھا۔ ارائیں تھا۔ ارائیوں نے میٹنگ کر کے اسے کھڑا کیا تھا۔ لیکن وہ سیاست میں امیچور تھا۔ وہاں جالوں کے بھی ووٹ تھے۔ غنی نے وہاں آ کے خوب پراپیگنڈہ کیا۔ احمد علی حوصلہ ہار گیا جب وہ حوصلہ ہار گیا تو غنی نے اسے کہا: ہم دونوں مسلمان ہیں۔ یا تو ہوگا، یا میں ہوں گا۔ نہ تیرے پلے کچھ ہے۔ نہ میرے پلے کچھ ہے۔ خواہ مخواہ ہم دونوں اُجڑ جائیں گے۔ ایسا کرتے ہیں کہ قرعہ ڈال لیتے ہیں۔ جس کا نام نکل آیا وہ امیدوار ہوگا۔ احمد علی کو اتنا تجربہ نہیں تھا۔ وہ تیار ہو گیا۔ قرعہ تو غنی کے نام ہی نکلنا تھا۔ کیونکہ دونوں پرچیوں پر اسی کا نام تھا۔ غنی منتخب ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی وہ ممبری اس نے ۱۷ سال چلائی۔ کیونکہ جنگ چھڑ گئی تھی۔ الیکشن نہ ہوا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ ۱۹۵۴ء میں کہیں جا کے الیکشن ہوئے۔

س:۔ آپ نے بتایا کہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے الیکشن میں دولتانہ غنی سازش نے آپ کو اندھیرے میں رکھا۔ غنی اپنی ذیل میں سے اتنے نمائندے لے آیا کہ وہ پورے ضلع پر حاوی تھے۔ آپ نے اس دھاندلی کے خلاف مسلم لیگ کی ہائی کمان کے آگے احتجاج کیا؟

ج:۔ ہم نے مرکزی مسلم لیگ کے پاس اپیل کردی۔ ٹربیونل بنا جس میں محمود ہارون، فدا محمد خان اور میر قادر بخش زہری تھے۔ زہری ٹربیونل کا پریذیڈنٹ تھا۔ ٹربیونل میں میں نے فدا محمد خاں کو ایڈریس کیا کہ انہوں نے ہمیں یہ مینڈیٹ دیا تھا۔ ہم اسے ڈیفائی نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ یہ زیادتی کی ہے۔ آپ کسی ایک بنیاد پر الیکشن کرالیں۔ اس میں اگر یہ جیت جائیں تو ٹھیک ہے۔ فدا محمد خاں نے جواب دیا۔ "بھئی ہم یہ نہیں کریں گے۔" قادر بخش زہری مجھے کہتا ہے:۔ "آپ یہی کہیں گے ناں کہ ہم بے ایمان ہیں۔ وہ تو ہم ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم بے ایمان ہیں۔" میں نے کہا، آپ نے بڑی شرمناک بات کی ہے۔ آپ نے بڑی گھٹیا بات کی ہے۔ اس کرسی پر بیٹھ کے آپ کو یہ بات نہیں کرنی چاہیئے۔ کہتا ہے۔ "آپ آکے اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔" میں نے کہا۔ "اس کرسی پر میں ہزار لعنت بھیجتا ہوں۔ آپ کو کیا پتہ اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔ جہاں تک ہمارے ضلع کا تعلق ہے، مسلم لیگ ختم۔ آپ تو اس قابل نہیں۔" پھر کہتا ہے۔ "اچھا تو تم آکے اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں بیٹھوں تو یہاں کی صورت ہی اور ہو۔" اس نے ہمارے خلاف فیصلہ دیدیا۔ ہم آگئے۔ ہم نے کہا لعنت بھیجو۔ ہم نے کوئی عہدوں کے لیے تو کیا نہیں تھا۔ ہم نے پاکستان کے لیے کیا تھا۔ مقصد حاصل ہوگیا۔ زہری بالکل بیوقوف قسم کا آدمی تھا۔ اس جیسے آدمی ہی مسلم لیگ کو تباہ کرنے والے ہیں۔

اسی الیکشن میں خواجہ صفدر سٹی مسلم لیگ میں صدارت کے امیدوار تھے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ سید حامر کز کے پاس کراچی چلا گیا۔ انہوں نے وہاں ناکر بندی نہیں کی تھی۔ چنانچہ خواجہ صاحب سٹی مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ ہوگئے۔

س:۔ یہ جوڑ توڑ ابتدا میں ہی شروع ہوگیا۔

ج:۔ بالکل۔

س:۔ اُس طرح دولتانہ ممدوٹ چپقلش کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

ج:۔ کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ نواب صاحب تو بالکل صاف بات کردیا کرتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے کہ اب حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ مجھے اقتدار میں نہیں رہنا چاہیئے۔ جب چیف منسٹر تھے، تب کی بات ہے، کہنے لگے۔ بات یہ ہے کہ ایک ریفیوجی کونسل بنی تھی۔ اس وقت وزیر مہاجرین راجہ غضنفر علی تھے۔ وہ اس کے ممبر تھے۔ پنجاب کا چیف منسٹر ہونے کی وجہ سے میں اس کا ممبر تھا۔ کیونکہ پنجاب کی زیادہ پارٹیشن ہوئی تھی۔ تیسرے وزیر اعظم لیاقت علی خاں بھی اسی کے ممبر تھے۔ کہنے لگے میں چار مربعوں کے لیے بیٹھا ہوں۔ آئندہ زمین اس کی ہوگی جو اسے کاشت کرے گا۔ ایک سال کے بعد ہوجائے، دس سال کے بعد ہو جائے۔ دنیا میں یہ رجحان شروع ہوچکا ہے۔ بہرحال جتنی دیر یہ نہیں ہوتا، اتنی دیر میں اس لیے بیٹھا ہوں کہ مہاجرین کے مفادات کی دیکھ بھال کرسکوں۔ ورنہ حالات ایسے نہیں کہ میں چیف منسٹر رہوں۔ نہ ہی مجھے شوق ہے۔ پھر انہیں چیف منسٹری کی قیمت بھی بڑی ادا کرنی پڑی۔ ڈسمس ہوئے پروڈا کا مقدمہ بنا ٹرائل ہوتا رہا۔ ہم ان کی پیروی کرتے آتے رہے۔ سہروردی صاحب ان کا کیس کر رہے تھے۔

س:۔ وہ کیس صحیح تھا یا ویسے ہی۔

ج:۔ بالکل ہی غیر منصفانہ تھا۔ انہوں نے اتنا کچھ ضائع کیا تھا کہ اگر کچھ لے بھی لیتے تو ان کا حق تھا۔ وہ کیس

حکومت نے بنایا تھا۔ ڈپٹی کمشنر منٹگمری (اب ساہی وال) راجہ حسن اختر کو حکومت نے گواہ بنانا چاہا۔ وہ اس پر تیار نہ ہوئے تو انہیں نوکری سے نکال دیا۔ وہ کیس اس طرح تھا کہ منٹگمری میں سر جگندر سنگھ کا اقبال نگر فارم تھا الزام یہ تھا کہ ممدوٹ صاحب نے اس کے ساتھ کچھ جائیداد ایکسچینج کی ہے یعنی انہوں نے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ الاٹمنٹ کی کوئی دستاویز مکمل نہیں تھی۔ کیس ثابت نہ ہو سکا پہلے جسٹس منیر اسے خود ٹرائی کر رہا وہ ممدوٹ کے خلاف تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور جج تھا۔ دونوں میں اتفاق نہ ہوا۔ پھر قواعد یہ تھے کہ تیسرے جج کو ریفر ہوتا تھا۔ پھر جسٹس خورشید الزماں کے پاس گیا۔ پیچھے وہ ضلع سیالکوٹ کے قصبے ظفروال کے تھے۔ انہوں نے سماعت کی جسٹس منیر ان پر اثر انداز ہونے کے لیے ان کے گھر چلا جاتا اور کہتا۔ "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اس طرح کا فیصلہ کرتا"۔ جسٹس خورشید الزماں نے اس کی بات نہ مانی اور صحیح فیصلہ دیا۔ جو نواب ممدوٹ کے حق میں جاتا تھا۔ ٹھیک ہے فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ لیکن انھیں جو کھجل خرابی ہوئی۔ اس کا کیا جواز تھا۔ وکیلوں کی فیسیں ادا کیں۔ مہاجر آدمی۔ پلے کچھ بھی نہیں اور ساری مسلم لیگ وہی چلاتے تھے۔

س : پنجاب میں۔

ج : ہاں۔ قائداعظم انہی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ پھر ۴۶ء والے الیکشن میں انگریز اور یونینسٹ گورنمنٹ نے ایک سردار بوڑلا ہے۔ اسے نواب صاحب کے خلاف کھڑا کیا۔ ابھی زندہ ہے۔ ڈیرہ غازی خاں میں ہے۔ وہ فیروزپور ڈسٹرکٹ کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ بوڑلا کو تو گورنمنٹ کی امداد تھی۔ نواب صاحب کے لاکھوں روپے خرچ ہو گئے۔ بوڑلا کو شکست ہو گئی۔ ان دنوں ایسے امیدوار بھی تھے جو الیکشن نہیں لڑ سکتے تھے لیکن مسلم لیگ کے اچھے کارکن تھے۔ مثلاً مولانا عبدالستار نیازی قسم کے آدمی مسلم لیگ نے فنڈ قائم کیا۔ اس زمانے میں نواب صاحب ممدوٹ نے اس میں ستر ہزار روپیہ دیا۔ یہ سب سے زیادہ تھا۔ اس کے بعد دولتانہ نے دیا تھا۔ پچاس ہزار۔ اور بھی درجہ بدرجہ تھے۔

س : یہ ستر ہزار مسلم لیگ کی اس امداد کے علاوہ ہے جو وہ کرتے رہے۔

ج : جی ہاں۔

س : ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلم لیگ کو چندہ کس نے دیا۔

ج : سب سے زیادہ راجہ صاحب محمود آباد نے۔ اس کے بعد نواب صاحب ممدوٹ نے۔

س : اور جائیداد کی بھی پرواہ نہ کی۔

ج : نواب ممدوٹ کی جلال آباد سٹیٹ فیروزپور تحصیل میں تھی۔ ۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی جس میں کونسل نے فیصلہ کیا کہ خطابات واپس کر دیئے جائیں۔ غالباً اس کے محرک سہروردی تھے۔ میں اس اجلاس میں نہیں جا سکا۔ اتنا ہمارے پاس کرایہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ سب نے خطابات واپس کر دیئے۔ نواب ممدوٹ نے ابھی خطاب واپس نہیں کیا تھا۔

۴۴ء کے سیالکوٹ سیشن کے بعد میری یہ پوزیشن بن گئی تھی کہ پراونشل مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں مجھے خصوصی دعوت پر بلا لیتے تھے۔ نواب ممدوٹ پسند بھی کرتے تھے اس جلسے میں افطاری تھی۔ ملک فیروز خاں نون بھی تھے۔ وہ مسلم لیگ میں اتنے ممتاز آدمی تو نہیں تھے۔ ہائی کمان میں نہیں آتے تھے۔ گورنر وائسرائے کی

ایگزیکٹو کونسل میں ڈیفنس کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ اسی عہدے سے ریزائن کرکے انہوں نے مسلم لیگ جائن کی تھی۔ یہ حکومت کے اندر تھے۔ اس لیے انہیں پتہ چل جاتا تھا کہ اب کچھ ہونے والا ہے۔ اس کا انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ اُس طرح یہ اتنا دور اندیش آدمی نہیں تھا۔ بہر حال نواب صاحب ممدوٹ سے نون نے کہا۔ میں نے دہلی جانا ہے۔ ابھی سامان بھی پیک کرنا ہے۔ میری تقریر پہلے کرالیں۔ اس وقت فرنٹیر میل رات ۹ بجے چلتی تھی۔ یہ دراصل نون اور شوکت حیات پلان کرکے آئے تھے۔ نون نے تقریر کی اور چلا گیا۔ بعد میں شوکت حیات اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا ہم سے تو قربانیاں مانگتے ہو۔ خود تم لوگوں نے خطاب بھی سنبھال رکھے ہیں۔ جب قربانی کا وقت آئے ہمیں کہتے ہو ا چڑھ بچہ سُولی۔ اس کے یہ لفظ مجھے یاد ہیں۔ نواب ممدوٹ نے بالکل جواب نہیں دیا۔ بڑے حوصلے والا آدمی تھا۔ بڑا ہی ٹھنڈا آدمی تھا۔ اس کی کوئی بات ہی نہیں۔

اسی رات یا اس سے اگلی رات موچی دروازے میں جلسہ تھا۔ نواب صاحب ممدوٹ پان بہت کھاتے تھے۔ پان کھاتے ہوئے آئے اور جلسہ عام میں نوابی کا خطاب چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ ایک لاکھ کچھ ہزار سالانہ کی ان کی جاگیر متحدہ پنجاب میں سب سے بڑی تھی۔ نوابی کے ٹائٹل کے ساتھ انہیں جو مراعات تھیں سب چھوڑنا پڑیں۔ انہیں سول جج اور مجسٹریٹ فسٹ کلاس کے اختیارات ہوتے تھے۔

س :۔ شوکت حیات نے کہا "ہمیں کہتے ہو چڑھ بچہ سولی" اس سے ان کی کیا مراد تھی۔

ج :۔ پہلے تو پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہیں ہوتی تھی۔ مسلمان ممبر یونینسٹ پارٹی کے ممبر ہوتے تھے۔ یہ دراصل نواب ممدوٹ نے موومنٹ چلائی کہ ہماری اسمبلی میں خاصی تعداد ہے۔ لیکن وہاں ہماری کوئی پارٹی نہیں۔ شوکت حیات وزیر تھے۔ انہوں نے استعفا دیدیا۔ یونینسٹ گورنمنٹ نے ان کا استعفا تسلیم کرنے کی بجائے بہانہ ڈال کے انہیں ڈسمس کر دیا تاکہ اس کا امیج نہ بنے۔ لیکن ان کا امیج تو بہت بنا شوکتِ پنجاب، کہلائے۔ شوکت حیات کا اشارہ اس طرف تھا کہ ہم سے تو قربانی مانگتے ہو۔ خود خطاب نہیں چھوڑتے ہو۔

س :۔ لوگ ایک مرلہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے ممدوٹ صاحب متحدہ پنجاب کی سب سے بڑی جاگیر چھوڑ دی۔ پاکستان کی خاطر۔ بہت بڑی قربانی ہے۔

ج :۔ ان کی سٹیٹ جلال آباد فیروز پور میں تھی۔ جب فیروز پور بھارت کو مل گیا۔ دولتانہ صاحب سے ہم نے ممدوٹ صاحب کے متعلق پوچھا کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔ کہنے لگے۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ اس کے پلے کچھ نہیں رہا۔ سوائے ممدوٹ ولا کے یا پاکپتن میں جو زمین ہے۔ اس کے باوجود وہ مطمئن اور پر سکون ہے۔ میرے ساتھ اس کا دسواں حصہ بھی ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ اس کے بعد ہم اُٹھ کے ممدوٹ صاحب کے پاس گئے۔ ان سے پوچھا۔ نواب صاحب آپ کی تو بڑی قربانی ہے۔ آپ کی تو ساری سٹیٹ ہی گئی۔ اب آپ کے پاس پاکپتن والی زمین اور یہ کوٹھی ہی رہ گئی۔ کہنے لگے۔ پاکپتن والی زمین میرے بھائیوں کی ہے۔ اور یہ کوٹھی بھی میری نہیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ مجھے رہنے دیتے ہیں۔ میرے پاس جو جائیداد تھی۔ وہ اُدھر ہی رہ گئی۔ نواب صاحب ممدوٹ کی جائیداد بھی ساری جاتی رہی۔ چار دن چیف منسٹری ملی تو اس کی یہ قیمت ادا کرنا پڑی کہ اتنا سخت مقدمہ۔

س :۔ اس مقدمے میں دولتانہ کا بھی ہاتھ تھا۔

ج :۔ وہ تو اس سازش میں شامل تھے۔

س :۔ نواب ممدوٹ چیف منسٹر تھے اور دولتانہ ان کے وزیرِ خزانہ تھے، کہتے ہیں کہ سارے اختیارات انہی کے ہاتھ میں تھے۔ کرتا دھرتا یہی تھے۔

ج :۔ سب کچھ ہی یہی تھا۔ لا اینڈ آرڈر اور ایڈمنسٹریشن، پوسٹنگ، ڈپٹی کمشنر کو بدلنا وغیرہ، یہ چیف منسٹر کا سبجیکٹ تھا، یہ بھی دولتانہ ہی کرتے تھے۔ پھر یہ اور شوکت حیات مل چکے تھے۔ شیخ کرامت علی نواب صاحب کا آدمی تھا۔ اس کے بارے میں غلط فہمی پیدا کی کہ آپ بدنام بہت ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس کو چھوڑ دیں۔ پھر اس کی جگہ میاں افتخار الدین آئے۔ وہ بھی دولتانہ اور شوکت حیات سے ملے ہوئے تھے۔

س :۔ بقول آپ کے دولتانہ صاحب نے جون ۱۹۴۷ء میں ہی کہہ دیا تھا کہ "ضروری نہیں کہ میں اور ممدوٹ ایک پارٹی میں رہ جائیں"۔ یہ بات قیامِ پاکستان کے جلد ہی بعد درست ثابت ہوئی۔ لیکن دولتانہ صاحب نے مسلم لیگ نہیں چھوڑی جبکہ ممدوٹ صاحب نے اپنی پارٹی بنالی۔

ج :۔ ایک ملک عبدالعزیز ہوتے تھے، اور اصلی وہ مزنگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ لیکن گورداسپور میں پریکٹس کرتے تھے۔ وہاں کی ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ نارووال کی مہاجر سیٹ سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ ایک وہ اور دوسرے خواجہ صفدر، نواب صاحب ممدوٹ کی کوٹھی میں ان سے میٹنگیں کرتے تھے۔ اور نواب صاحب کو قائل کرتے تھے کہ آپ اپنی جماعت بنائیں۔ ہم نواب صاحب کی مخالفت کرتے تھے کہ آپ مسلم لیگ نہ چھوڑیں۔ آپ سے جماعت نہیں بنے گی۔ یہ بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ آپ بھی بڑے ہیں لیکن اس طرح کے نہیں کہ پارٹی بنا سکیں۔ قائداعظمؒ اور گاندھی جیسے لیڈر پارٹیاں بناتے ہیں۔ آپ سے پارٹی تو بنے گی نہیں۔ لیکن ہم جن کا آپ سے ایک تعلق ہے۔ بغیر لیڈر کے رہ جائیں گے۔ لیکن نواب صاحب نے ہمیں لفٹ نہیں کرائی۔ حالانکہ خواجہ صفدر کا نواب صاحب ممدوٹ سے میں نے ہی تعارف کرایا تھا۔

س :۔ ایک سازش کے تحت ان سے پارٹی بنوائی گئی؟

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ کس کی پلاننگ تھی۔

ج :۔ دولتانہ کی پلاننگ تھی۔ دولتانہ نے ہی خواجہ صفدر اور ملک عبدالعزیز کو نواب صاحب کے پاس اس مشن پر بھیجا کہ انہیں مسلم لیگ چھوڑنے پر آمادہ کریں۔ کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ اگر نواب صاحب ممدوٹ مسلم لیگ میں رہتے ہیں۔ تو ان کا بڑا مضبوط گروپ ہے اور یہ ان کے لیے دردِ سر بنے رہیں گے۔ یہ دونوں نواب صاحب سے کہتے تھے۔ آپ پارٹی بنائیں۔ ہم بھی مسلم لیگ چھوڑ دیں گے۔ ان کا مشن مکمل ہو گیا۔ نواب صاحب نے مسلم لیگ چھوڑ دی۔ لیکن یہ حضرات مسلم لیگ میں ہی رہے۔ نواب صاحب نے جناح مسلم لیگ بنائی۔ سہروردی صاحب نے عوامی مسلم لیگ بنائی تھی۔ پھر یہ دونوں مدغم ہو کے عوامی جناح مسلم لیگ ہو گئیں۔

س :۔ آپ مسلم لیگ میں ہی رہے۔

ج :۔ جی ہاں ۔

س :۔ حالانکہ بقول آپ کے، آپ کے خلاف بھی دولتانہ صاحب نے ہاتھ کیا تھا ۔

ج :۔ پھر انہوں نے ہماری منتیں کیں ۔ ۱۹۵۱ء کا الیکشن آیا تو کرمانی وغیرہ سیالکوٹ گئے۔ مجھ پر بڑا سخت دباؤ ڈالا۔ ویسے بھی ہم مسلم لیگ کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے نزدیک تو نواب صاحب ممدوٹ نے مسلم لیگ کو چھوڑ کر پہاڑ جتنی غلطی کی تھی۔ ہم تو وہ غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ہی ہماری دلچسپی تھی۔ پھر دولتانہ خاص طور پر سیالکوٹ آئے ۔

س :۔ آپ کو منانے کے لیے ۔

ج :۔ انہوں نے گلوشاہ میں جلسہ کرنا تھا۔ عبدالغنی گھمن جسے انہوں نے ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا پریذیڈنٹ بنایا تھا۔ اور دوسرے بھی کہنے لگے ۔ دوپہر کا کھانا آپ کی طرف سے ہو گا۔ میں نے کہا۔ نہ میرا گاؤں نہ میرا ڈسٹرکٹ بورڈ کے اس میلے کے ساتھ کوئی تعلق۔ گلوشاہ میں ہر سال منڈی لگتی ہے ناں ۔ میں نے کہا۔ کھانا انہوں نے کھانا ہے تو میں شہر یا اپنے گاؤں میں رہتا ہوں وہاں آئیں۔ دولتانہ نے کہا نہیں ۔ گلوشاہ میں ہی کھائیں گے۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے گلوشاہ میں کھانے کا انتظام کیا ۔ اس کے بعد دولتانہ کہنے لگے۔ ہمارے ساتھ آ جائیں۔ میں نے کہا۔ اگر آپ کے ساتھ فٹ ان کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو چھوڑیں کیوں امتحان میں پڑتے ہو۔ کہنے لگے "یار اغنی کا تیرے متعلق کیا خیال ہے"۔ میں نے کہا یہ غلط بات ہے۔ اگر میں نے غنی کی مہربانی یا سرپرستی میں مسلم لیگ میں آنا ہے۔ تو غنی تو اس جماعت میں تھا ہی نہیں۔ آپ بھی ہمارے بعد آئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ بڑے آدمی ہیں۔ بہر حال ہو گیا سلسلہ مسلم لیگ کے ساتھ ہی ۔

س :۔ نواب ممدوٹ نے لاہور کے علاوہ سیالکوٹ سے بھی الیکشن لڑا تھا، خواجہ صفدر کے مقابلے میں ۔

ج :۔ جی ہاں ۔ سیالکوٹ نواب صاحب خواجہ صفدر کو شکست دینے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔ وہ نواب صاحب کو قائل کرتے رہے کہ آپ مسلم لیگ چھوڑ دیں۔ نئی پارٹی بنائیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ نواب صاحب نے جناح مسلم لیگ بنائی۔ خواجہ صفدر ساتھ نہ گئے۔ اس لیے انہوں نے سیالکوٹ سے الیکشن لڑا۔ نواب صاحب لاہور اور سیالکوٹ دونوں سیٹوں سے جیت گئے ۔

س :۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پہلا صوبائی الیکشن تھا۔ اس میں بھی دھاندلی ہوئی ۔

ج :۔ جی ہاں ۔

س :۔ اس دھاندلی میں دولتانہ کا نام لیا جاتا ہے ۔

ج :۔ جی ہاں ۔

س :۔ لیکن دولتانہ تو اس وقت چیف منسٹر نہیں تھے ۔

ج :۔ لیاقت علی خاں نے اسے سامنے رکھ کے الیکشن کرائے تھے۔ ایس ایس جعفری اس وقت لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اُسے دولتانہ جو کچھ حکم دیتا تھا۔ وہ اسی طرح کرتا تھا ۔

چوہدری محمد حسین چٹھہ فنانشل کمشنر اور دوسروں نمبروں کو آرڈر دیتے تھے۔ عملی طور پر اقتدار انہی لوگوں کے پاس تھا۔ دوسرے تو برائے نام تھے۔ صوبائی حکومت کو حکم تھا کہ جو کچھ یہ کہیں وہ کرنا ہے ۔ کرمانی جبر لوکے

ذریعے جیتے تھے۔ انہیں جعفری برانڈ کہتے تھے۔ ہم ممبر ہو کے لاہور گئے۔ وہاں پہلی میٹنگ بھی ہوگئی۔ ابھی اس وقت ان کی کاؤنٹنگ ہو رہی تھی۔ دوبارہ، سہ بارہ۔ ہر بار مرزا ابراہیم کے ووٹ بڑھ جاتے تھے۔ یہ پھر ملا دیتے تھے۔

س:۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم اس وقت گورنر پنجاب تھے۔ اس دھاندلی میں ان کا کوئی رول تو نہیں؟

ج:۔ نہیں بالکل نہیں۔ ——— یہ بڑی شرمناک بات ہوئی تھی۔ ویسے بھی مسلم لیگ نے جیت جانا تھا۔ سترہ اٹھارہ سیٹوں کے لیے مسلم لیگ کی اتنی بدنامی ہوئی کہ بیڑہ ہی غرق ہوگیا۔ جس طرح بھٹو پارٹی اگر دھاندلی نہ کرتی تو انہوں نے بھی الیکشن جیت جانا تھا۔

س:۔ آپ نے کہا کہ سترہ اٹھارہ سیٹوں کے لیے مسلم لیگ کی اتنی بدنامی ہوئی۔ گویا یہ جھرلو لاہور تک محدود نہیں تھا۔ صوبہ گیر تھا۔

ج:۔ یہ جھرلو صوبہ گیر نہیں تھا۔ اور جگہ اور طرح کی دھاندلیاں ہوئی تھیں۔

س:۔ مثلاً۔

ج:۔ مثلاً عبدالغنی گھمن گھوئینکے اور سیالکوٹ کی دیہی سیٹ پر کھڑا ہوا۔ دونوں جگہ جیت گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کی صندوقچیوں میں سے ووٹاں دیاں تھدیاں دیاں تھدیاں نکلیں۔ گھوئینکے والی سیٹ پر اس کے مقابلے میں ستراہ والا چودھری غلام رسول تھا۔ وہ پہلے بھی ممبر رہا تھا۔ غنی نے ان لوگوں کے ووٹ بھی بھگتا دیے جو مر چکے تھے۔ چودھری غلام رسول کی طبیعت میں مزاح بہت تھا۔ پولنگ کے دوران میں وہ قبرستان کے قریب کھڑا ہو کے مُردوں سے مخاطب ہوا۔ وہاں تو آپ ووٹ دے رہے تھے: یہاں آ کے پھر لیٹ گئے ہو۔ چونکہ غنی دونوں سیٹوں سے جیت گیا۔ اس لیے سیالکوٹ والی دیہی سیٹ اس نے چھوڑ دی۔ ضمنی الیکشن میں نصیر ملہی مسلم لیگ کا امیدوار تھا۔ مقابلے میں جناح مسلم لیگ کا چودھری ناصر دین تھا۔ ہم مسلم لیگ کے بارہ امیدوار جیت چکے تھے۔ اس ضمنی انتخاب میں آخری روز ملکاں کلاں میں پولنگ تھا۔ وہاں ہم بارہ ممبران کے ورکر تھے۔ صوفی عبدالحمید صاحب آ کے سول ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ چھٹہ صاحب بھی غالباً آئے تھے۔ یہ تو ریسٹ ہاؤس میں تھے۔ ہم سب پولنگ پر تھے۔ ہمارے ووٹ میجارٹی میں تھے۔ دیکھو بارہ ممبر ایک پارٹی کے ہوں۔ تیرھویں کو وہ کرا نہ سکیں اس کا مطلب ہے کہ وہ پارٹی شارٹی کوئی نہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے امیدوار کو ذلیل کرنے کے واسطے ضرور بیچ میں گند کرنا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت تو نہ تھی۔ غنی والوں نے جعلی ووٹ بھگتانے کے لیے شہر سے بدمعاش ٹائپ عورتیں لے جا کر قبرستان میں بٹھا دیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا اسسٹنٹ سیکرٹری، پریذائیڈنگ افسر تھا۔ انٹرول کے بعد پریذائیڈنگ افسر نے مجھے پیغام بھیجا کہ شاہ جی میری بات سن جائیں۔ میں گیا۔ کہنے لگا خطرہ ہے۔ پولیس کا انتظام کریں۔ میں نے کہا، تجھے کیا خطرہ ہے۔ یہ سارے دیہات ہمارے اپنے ہیں۔ کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کوئی حرکت کریں۔ ان بیچاروں کی کیا جرأت ہے۔ کیا طاقت ہے۔ دراصل رتیاں رسیداں سارا گاؤں ہمارے ساتھ تھا۔ ملکاں کلاں میں اعوان برادری مسلم لیگ میں تھی۔ وہ لوگ اس گاؤں میں میجارٹی میں تھے۔ وہاں چودھری امین

ایڈووکیٹ چوہدری ناصر دین کو سپورٹ کرتے تھے۔ بہرحال ملکاں کلاں میں آدھے سے زیادہ ہمارے ووٹ تھے۔ میں نے پریذائیڈنگ افسر کو ٹال دیا۔ کوئی پون گھنٹہ گذرا۔ کہ انسپکٹر پولیس راجہ فضل داد پولیس لے کے وہاں آ گئے۔ آپ کے انفارمیشن منسٹر نہیں، راجہ ظفر الحق، راجہ فضل داد ان کے والد تھے۔ وہ آ گئے انہوں نے اپنی جیپ پرے ہی کھڑی کی۔ انہوں نے مجھے اور ناصر دین کو پیغام بھیجا کہ میری بات سن جائیں۔ ہم گئے۔ ساری پولیس انہوں نے کھیتوں میں کھڑی کی ہوئی تھی۔ وہ شو آف فورس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا آپ کس لیے تشریف لائے ہیں۔ کہنے لگے آپ دونوں شریف آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ معزز ہیں۔ لڑنے جھگڑنے والے نہیں مجھے پریذائیڈنگ افسر کی طرف سے اطلاع گئی تھی کہ یہاں خطرہ ہے۔ میں نے کہا۔ راجہ صاحب اُس نے آپ کو غلط لکھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جائیں، میں دیکھ بھال کر لوں گا۔ راجہ فضل داد بڑے اچھے آدمی تھے۔ دلیر۔ ایماندار۔

میں نے ناصر دین سے پوچھا، کیا اطلاع بھیجی تھی۔ کہنے لگا میں نے تو نہیں بھیجی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ یہ جعلی ووٹ بھگتانے کے لیے عورتیں لائے تھے۔ ہم نے یہ کیا تھا کہ جب کوئی عورت جعلی ووٹ بھگتنے آئے۔ تو وہ اپنے آپ کو جس شخص کی بیوی ظاہر کرے وہ اسے وہیں بازو سے پکڑ لے گا کہ تو تو میری بیوی ہے، چل میرے ساتھ۔ بہرحال وہ عورتیں ڈر گئیں کہ گاؤں میں بات نہیں بنے گی۔ چنانچہ انٹرول کے بعد کوئی ووٹ ہی پول نہ ہوا۔ مرد سارے پہلے بھگت چکے تھے۔ جب گنتی کے لیے پول بند ہوا۔ صندوقچی میں سے ڈھائی سو ووٹوں کی تھدی کی تھدی نکل آئی۔ اسی طرح جس طرح اس میں پھینکی تھی۔ جتنے ووٹ پول ہوئے تھے۔ ان سے ڈھائی سو ووٹ بڑھ گئے۔ ہم نے تو سیریل نمبر نوٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک پٹواری سے بھی دوسرے سے بھی۔ دراصل جب پریذائیڈنگ افسر نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ پولیس بلائی جائے، خطرہ ہے۔ اس وقت اس نے ڈھائی سو پرچیاں نصیر ملّھی کے حق میں ڈال دی تھیں۔ ڈال تو اس نے دیں لیکن ڈر گیا۔ کیونکہ چوہدری ناصر دین بھی ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر تھا۔ وہ وہاں بڑی پرجوش تقریریں کیا کرتا تھا۔

بہرحال جب ڈھائی سو کی تھدی کی تھدی نکلی تو چوہدری ناصر دین پریذائیڈنگ افسر سے کہنے لگا۔ تو نے اگر پرچیاں ڈال ہی دی تھیں، مجھے بھی بتا دینا تھا۔ ناصر دین اسے اس طرح ڈھیٹ کر رہا تھا جیسے چوہڑوں کو کرتے ہیں۔ منیں چِی ہیںوں تے زمین وِرل نہ دیوے۔ بڑی شرمندگی کہ ووٹ تو ہمارے بیچارے ٹی میں تھے۔ پھر انہوں نے یہ حرکت کیوں کی۔ چوہدری ناصر دین ہار گیا۔ نصیر ملّھی جیت گیا۔ لارڈ نصیر ملّھی جیھڑے ہن پتاں پار ہو کے ٹر دے نیں۔ گلاں کر دے نیں۔ یہ ساری باتیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے کی ہیں۔ پہلے حدود کے اندر تھیں۔ اب حدود سے تجاوز کر گئی ہیں۔

س :۔ انہوں نے دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کا ایک ارتقائی عمل تو شروع کر دیا۔

ج :۔ جی ہاں۔ ایک ارتقائی عمل تو شروع کر دیا۔ جنرل الیکشن ہم جیت چکے تھے۔ یہ تو ایک ضمنی انتخاب تھا۔ یہ بھی جیت جاتے لیکن انہوں نے گند کھولنا تھا۔ کھول دیا۔

س :۔ ممدوٹ نے سیالکوٹ والی سیٹ چھوڑ دی۔ ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا تو وہاں ایسا گند کھولا گیا کہ پولنگ کے بغیر ہی خواجہ صفدر جیت گئے۔

ج :۔ غلطی ممدوٹ صاحب سے یہ ہوئی کہ انہیں لاہور والی سیٹ خالی کرنی چاہیے تھی۔ انہوں نے سیالکوٹ والی سیٹ خالی کی اور خواجہ صفدر کو موقع فراہم کر دیا۔

س :۔ خواجہ صفدر کیسے الیکٹ یا سیلیکٹ ہوئے۔

ج :۔ خواجہ صفدر یوں الیکٹ ہوئے کہ انہیں حکومت کی لینٹ پناہی حاصل تھی۔ اس لیے ان کے مخالف امیدوار نصر اللہ خاں کے نامی نیشن پیپرز ہی مسترد کر دیئے گئے۔

س :۔ اس کے لیے کیا جواز ڈھونڈا گیا۔

ج :۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ۱۹۴۱ء میں جو پاکستان سیشن کیا تھا جس میں قائداعظمؒ تشریف لائے تھے۔ نصر اللہ خاں استقبالیہ کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ وہ نارووال کا تھا، پرانا مسلم لیگی تھا۔ اس سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے صرف ایک نامی نیشن پیپر فائل کیا۔ متبادل امیدوار کوئی نہ رکھا۔ اس نے تجویز کنندہ اور تائید کنندہ کے جو ووٹ نمبر دیئے۔ انتظامیہ نے ان میں راتوں رات رد و بدل کر دیا۔

ڈی سی آفس میں نامی نیشن پیپرز کے ساتھ جو آدمی متعلق تھا۔ وہ گاڈن روڈ پر کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام امجد ہے۔ اگلے روز وہ میرے پاس بیٹھا بتا رہا تھا۔ ''نامی نیشن پیپرز وصول کرنے کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ لیکن خواجہ صفدر کے مقابلے میں کسی نے کاغذات داخل نہ کرائے۔ ڈپٹی کمشنر انوار الحق صاحب بڑے مطمئن تھے کہ چلو اس امتحان سے بچ گئے۔ آخری وقت پر انہوں نے مجھے بلا لیا کہ کاغذات تو آ گئے ہیں'' وہ کہتا ہے ''پھر جو گورنمنٹ چاہتی تھی۔ ہم نے اس کے مطابق کیا۔''

س :۔ کیا کیا؟

ج :۔ وہ بتاتا ہے کہ ہم رات کے وقت جا کے نصر اللہ خاں کے کاغذات میں رد و بدل کرتے رہے۔

س :۔ نصر اللہ خاں نے اپیل وغیرہ نہیں کی۔

ج :۔ اس وقت اپیل والی پروویژن نہیں تھی۔ یہ تھا کہ اگر کسی امیدوار کے نامی نیشن پیپرز ریجیکٹ ہو جائیں، الیکشن پٹیشن منظور ہو تو پھر الیکشن ہوتا تھا۔

س :۔ انہوں نے الیکشن پٹیشن نہیں کی۔

ج :۔ نہیں جب اتنا کچھ ہو گیا تو کیا کرتا۔ ڈپٹی کمشنر انوار الحق پر بڑا دباؤ تھا۔ امینہ غنی، اس وقت تو یہ ابھی امینہ قریشی تھیں۔ اور بھی بڑی طرف سے دباؤ تھا۔ جانے دیں۔

س :۔ یہ وہی انوار الحق ہیں۔ جو بھٹو کی پھانسی کے وقت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ انہوں نے سیالکوٹ کے ڈی سی کے طور پر جو دباؤ قبول کیا وہ مرکزی حکومت کی طرف سے تھا۔

ج :۔ لوکل زیادہ تھا۔ گورنمنٹ کی تو شاید وہ اتنی نہ مانتے، کیونکہ پرانے افسر تھے، اپنی بھی بڑی اینٹھ رکھتے تھے۔ لیکن وہ بیوی کی بڑی مانتے تھے۔ ان کی بیوی پسرور کے خان بہادر رحمت اللہ خاں کی بیٹی ہے وہ ککے زئی ہیں۔

اس طرح انوار الحق صاحب کی ہمدردیاں نواب صاحب ممدوٹ کے ساتھ تھیں۔ وہ ذاتی طور

پر ممدوٹ کو پسند کرتے تھے۔

س :۔ وجہ۔

ج :۔ دولتانہ اور شوکت حیات آئی جی پنجاب قربان علی خاں کو چاچا کہا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت انوارالحق صاحب ڈپٹی کمشنر راولپنڈی تھے۔ تو ان کا قربان علی خاں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

س :۔ کیوں ؟

ج :۔ راولپنڈی میں جو کوٹھی بعد میں فضل الٰہی چودھری کا پریذیڈنٹ ہاؤس بنی وہ سردار سوہن سنگھ اور سردار موہن سنگھ کی کوٹھی تھی۔ سیالکوٹ میں بھی ان کی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ کروڑ پتی، ارب پتی لوگ تھے۔ آپ وہ کوٹھی دیکھ لیں جس طرح کسی راجے کی ہو۔ قربان علی خاں نے پولیس کے ذریعے اس کوٹھی کی لوٹ مار شروع کرا دی۔ فرنیچر، قالین وغیرہ۔ اس وقت کشمیر والے سلسلے میں قبائلی راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر انوارالحق نے انہیں بلہ شیری دی کہ لوٹ لو۔ ہندوؤں کا مال ہے۔ اور آپ کے لیے مالِ غنیمت ہے۔ اُدھر پولیس آئی جی قربان علی خاں کے لیے لوٹ مار کر رہی تھی جب یہ ہوا تو ہنگامہ ہو گیا۔ لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن گیا۔ قربان علی خاں کو پتہ چل گیا کہ ڈپٹی کمشنر نے میرے آپریشن میں خلل ڈالا ہے۔ اس نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ انوارالحق کا مخالف ہو گیا۔ وہ اسے زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ بلکہ جب یہ سیالکوٹ ڈپٹی کمشنر ہو کے آئے ہیں۔ تو نارووال میں شیعہ سنی ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۱ء والے الیکشن سے پہلے کی بات ہے۔ لیکن ممدوٹ کو ہٹا کے گورنر راج کر دیا گیا تھا۔ جب گورنر راج ہوا تو ڈیمانڈ شروع ہو گئی کہ الیکشن کراؤ یا پھر مسلم لیگ کو کسی صورت میں حکومت کے ساتھ ایسوسی ایٹ کرو۔ اسمبلی تو تھی نہیں۔ اس لیے منسٹر تو نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ انہوں نے گورنر کے ایڈوائزر مقرر کر دیے۔ میر احمد شاہ کیمبل پور میں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ زندہ ہیں۔ شیخ صادق حسن تھے۔ نسیم حسن تھے۔ چیف ایڈوائزر ملک انور تھے۔ اس وقت میاں عبدالباری صاحب پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ ہو گئے تھے۔ ان سب افراد کو بطور مشیر میاں صاحب نے ریکمینڈ کیا تھا۔

نارووال سے کسی آدمی نے عزاداری کا جلوس نکالنے کے لیے لائسنس مانگا۔ جس دن واقعہ کربلا ہوا تھا۔ دیسی سال کے حساب سے ۱۸ جیٹھ بنتی ہے۔ اس شخص نے اپنی درخواست میں لکھا کہ میں گورداسپور میں بھی لائسنسی تھا۔ اس لیے مجھے لائسنس دیا جائے۔ وہاں ایک پولیس انسپکٹر تھا قمر الدین اور تحصیل دار تھا ذکاء اللہ دونوں سنیوں کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ریکمینڈ نہ کیا۔ شیخ انوارالحق کو ڈپٹی کمشنر کا چارج لیے چار پانچ روز ہی ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے ریمارکس پر درخواست مسترد کر دی۔ انہیں مقامی حالات کا علم نہیں تھا۔ وہ شخص شیعہ کا وفد لے کے ڈپٹی کمشنر کے پاس آیا۔ اس وفد میں نارووال میونسپلٹی کا وائس پریذیڈنٹ شیخ بالا بھی تھا۔ بڑا غیر ذمہ دار تھا۔ اور سپیکر کوئی سا اس نے کہا۔ آپ نے نامنظور کیا ہے۔ جلوس تو پھر نکلے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے اسے بہت محسوس کیا اور کہا۔ اچھا، آپ جلوس نکالیں۔ میں اسے روکوں گا۔

اسی دوران میں سیالکوٹ میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہم پانچ سات آدمی تھے۔ کچھ جنرل اس کے محرک تھے کہ گورنمنٹ لیول پر حفیظ جالندھری کی جوبلی منائی جائے۔ یا پھر اسے حکومت کی اشیرباد حاصل ہو۔ تیاریوں کے متعلق وہ میٹنگ انہوں نے قلعے پر رکھی۔ انوارالحق صاحب بھی ادبی آدمی تھے سیشن جج شیخ

مجید اصغر صاحب شاعر تھے۔ یہ سارے اکٹھے ہوئے۔ میں ان کے بڑا قریب تھا، بڑے پرانے تعلقات تھے۔ کہنے لگے قلعے پر اس میٹنگ میں ضرور چلنا ہے۔ ایک ہندو وہاں رہ گیا تھا لالہ بیلی رام۔ سٹوڈنٹس اسے ملے اور اس سے پیسے لیے جلیل جاوید اور اختر شاہ اس پروگرام کے لیے بڑے ایکٹو تھے۔ اختر شاہ ان دنوں سندھ میں پی ڈی ایس پی ہے۔ ہم میٹنگ کے لیے قلعے پر گئے تو شیخ انوار الحق صاحب نے ان لڑکوں سے کہا، آپ دن مقرر کریں۔ لیکن فلاں فلاں تاریخ کو نہ رکھیں۔ پوچھا کہ ان تاریخوں کو کیا ہے۔ کہنے لگے: "تارووال کے لوگوں نے مجھے چیلنج دیا ہے۔ اور میں نے وہ چیلنج قبول کر لیا ہے۔" میں تو پریشان ہو گیا۔ واپسی پر ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر خان بہادر ملک عبدالقدوس اور شیخ مجید اصغر صاحب میری موٹر میں تھے خان بہادر ملک عبدالقدوس صاحب ملک قاسم کے ماموں تھے۔ ان کے انوار الحق صاحب کے ساتھ ویسے ہی بڑے تعلقات تھے۔ چلتے ہی میں نے کہا۔ "میں تو پریشان ہو گیا ہوں!" کہنے لگے "کیوں"؟ میں نے کہا، یہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ اس میں کبھی ایڈمنسٹریشن یا حکومتیں نہیں جیتیں۔ جنونی لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے جیتنا ہوتا ہے۔ یہ کلیش ہو گیا تو اس کے نتیجے میں ہم اتنا اچھا ڈپٹی کمشنر ضائع کر دیں گے۔ اس وقت ابھی خواجہ صفدر والا الیکشن نہیں ہوا تھا۔ میں نے ملک صاحب سے کہا، آپ کے ان کے تعلقات ہیں، میں شیعہ ہوں۔ میں نے کہا، تو غلط فہمی پیدا ہو گی۔ وہ سمجھیں گے۔ شاید مجھے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حوالے سے میری تو کوئی حیثیت نہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں تو کسی طرح اس معاملے کو سلجھا دیں۔ چار پانچ جلوس پہلے ہی نکلتے ہیں۔ ایک اور نکل گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ اسے وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ چنانچہ بات چیت شروع ہوئی۔ ان مذاکرات میں ہم بھی شامل ہوئے۔ بڑی کوشش کی۔ بڑے دن صرف کیے۔ لیکن کچھ نہ بنا اس وقت پسرور اور نارووال کے درمیان تین چار میل کا ٹوٹا چھوڑ کر باقی سڑک کچی تھی۔ میری نئی موٹر اس مومنٹ کی نذر ہو گئی۔ برباد ہو گئی۔ ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ ہزاروں افراد قید ہوئے۔ جن میں حافظ کفایت حسین اور شیخ ہدایت علی بھی تھے۔

پیرس روڈ سیالکوٹ پر ہمیں دیکھ کر قیدیوں کی بس رک گئی جس میں یہ سب تھے۔ حافظ کفایت حسین مجھے کہنے لگے۔ ہندوستان کے اخباروں کو خبر دے بھیجئے کہ یہاں شیعوں کا یہ حال ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، حافظ صاحب آپ کو سیاست کی اب کا بھی پتہ نہیں۔ بھلا یہ خبر ہندوستان کو دینے والی ہے۔

اب ڈپٹی کمشنر ہماری منتیں کرے کہ انہیں کسی طرح بند کراؤ۔ میں نے کہا۔ اب یہ ہماری دسترس سے باہر ہیں، ایجی ٹیشن کرنے والوں نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا ہے۔ کہ جس گفتگو میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔ خواہ سارا ملک اکٹھا ہو جائے۔ وہ گفتگو ہمیں قابلِ قبول نہیں ہو گی۔

بالآخر ایک روز چیف ایڈوائزرز ہاؤس لاہور سے مجھے اور خواجہ صفدر کو سیالکوٹ فون آیا کہ اتنے بجے رات میٹنگ ہے۔ آپ پہنچیں۔ ڈپٹی کمشنر کو پتہ چل گیا۔ اس نے ہمیں پیغام بھیجا کہ مجھے ملے بغیر لاہور نہیں جانا۔ ہم شام کے وقت ان کے پاس پہنچے، وہ کہنے لگے، آپ دونوں میٹنگ میں نہ جائیں۔ جلوس ہی نکلوانا ہے ناں۔ میں صبح جلوس نکلوا دوں گا۔ میں انہیں لائسنس بھی دے دوں گا۔ ہم نے کہا جناب ہمیں وارے ہی نہیں آتا کہ ہم آپ کو ضائع کر دیں۔ ہمارے ضلع کا معاملہ ہے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ وہاں، یہاں کا کوئی آدمی ہی نہ ہو۔ ہم چلے گئے۔ وہ ایک ہائی لیول میٹنگ تھی جس میں گورنر کے چیف ایڈوائزر ملک انور چیف

سیکرٹری حافظ مجید، کمشنر سید فدا حسن اور آئی جی پنجاب قربان علی تھے۔ شیعہ کی طرف سے سید مراتب علی، جمیل حسین رضوی کرنل عابد حسین، میجر مبارک علی شاہ اور ہادی علی شاہ بھی موجود تھے۔ آئی جی قربان علی خاں انوار الحق پر خوب برسا، کہا۔ ڈپٹی کمشنر انوار الحق قصوروار ہے۔ سب کچھ وہی کروا رہا ہے۔ ایڈمنسٹریٹر کے طور پر وہ فیل ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا، جناب آپ یہاں کوئی فیصلہ کریں اور ہمیں آپ منوا بھی لیں۔ وہ جو جیل کے اندر ہیں انہیں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ نہ ایجی ٹیشن کرنے والوں کو۔ پر تو آپ کو وہاں جا کے انہیں قائل کرنا پڑے گا۔ پھر وہ آپ کا فیصلہ مانیں گے۔ ورنہ وہ ایجی ٹیشن بند نہیں کریں گے معطل بھی نہیں کریں گے۔ ٹسیو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ میرے تجویز کرنے پر یہ سارے شیعہ لیڈر تیار ہو گئے۔ ان سب نے جا کر قیدیوں سے ملاقات کی انہیں منایا منوایا میرے گھر پر کھانا کھایا۔ پھر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا، میں انہیں لائسنس دے دیتا ہوں۔ آپ سب ڈیکلیئر کر دیں کہ ایجی ٹیشن ختم کی جاتی ہے۔ ہم جانے لگے تو انہوں نے چائے منگوائی۔ سب چائے پینے لگے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ میں اپنے ہائی آفس کو انفارم کر دوں۔ انہوں نے ملک انور کو ٹیلی فون کیا۔ تھوڑی دیر بات کی اور ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگے۔ گورنر کے چیف ایڈوائزر کہتے ہیں کہ گورنمنٹ کے وقار کا سوال ہے۔ پہلے ایجی ٹیشن ختم کریں، پھر ہم غور کریں گے۔ سر مراتب علی تو بالکل ہی اپ سیٹ ہو گئے۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا، شیخ صاحب یہ ٹیلی فون مجھے دیں۔ انہوں نے ملک انور سے کہا، آپ نے ہمیں خراب کیوں کیا۔ اگر آپ کے وقار کا سوال تھا تو آپ نے ساری رات ہمیں جگائے کیوں رکھا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں لوگوں کی بہتری کے لیے یہاں آ گیا تھا۔ آپ کو اپنی بات پر قائم رہنا چاہیئے تھا۔

سو گنڈے وی کھادے، سو جُتیاں وی کھادیاں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ واقعات ہوتے رہے ہیں۔ یہ جو میں نے آپ کو اتنی لمبی کہانی بیان کی ہے۔ سطحِ آب کے اوپر اور نیچے یہ چیزیں چلتی رہیں۔ جن سے ملکوں کے حالات پر اثر پڑتا ہے۔

س :۔ ایجی ٹیشن پھر چلتی رہی۔

ج :۔ بڑی زبردست، پھر میاں عبدالباری نے مداخلت کی تو معاملہ رفع دفع ہوا۔ اور لائسنس مل گیا۔ بلکہ ظفروال اور قلعہ سوبھا سنگھ والوں کو بھی لائسنس مل گئے۔ جب گرفتار شدگان کی رہائی ہونے لگی۔ تو ہم مقامی مسلم لیگی لیڈروں خواجہ صفدر اور غنی گھمن کو جیل کے دروازے پر لے گئے۔ جہاں رہائی پانے والوں نے مسلم لیگی لیڈروں کا شکریہ ادا کیا۔

پھر ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں انوار الحق صاحب نے بطور ریٹرننگ آفیسر نامی نیشن پیپرز قبول یا مسترد کرتے تھے۔ نارووال مسلم لیگ کے صدر شیخ ہدایت علی شیعہ تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ ڈپٹی کمشنر زخم خوردہ ہے۔ اس لیے اس کے کاغذات مسترد ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو شیعہ جیل میں تھے۔ وہ تبرے تو ڈپٹی کمشنر کو ہی بولتے تھے۔ وہاں سے آواز آتی تھی۔ وہ تو پیٹنا ہی شروع کر دیتے تھے۔ یہ تو ان کے پاس ہتھیار ہے ہی۔ موسم بے موسم۔ رات کو انہوں نے ڈپٹی کمشنر کے خلاف شروع ہو جانا۔ ان کی آوازیں ان کے نوحے۔ ان کے نعرے، ان کی گالیاں سب ڈپٹی کمشنر کے گھر میں سنی جاتی تھیں۔ بہرحال شیخ ہدایت علی کے کاغذات مسترد نہ ہوئے۔ شیخ صاحب کی طرف سے میں ہی وکیل تھا۔ ان کے مقابلے میں مولوی منظہر علی اظہر کا سالا غلام محمد تھا۔ مولوی منظہر علی اظہر شیعہ

تھا۔ غلام محمد سنی تھا۔ شیخ ہدایت علی جیت گیا۔ غلام محمد ہار گیا۔ بہرحال اس قسم کا قصہ تھا۔ غلام محمد بھی شیعہ تھا۔ لیکن سیاست میں سُنی ہوگیا تھا ورنہ زنجیروں سے ماتم کیا کرتا تھا۔ وہاں شیخ غضنفر ہے۔ وہ کہتا تھا، او چاچا بے غیرتا، اپنے منڈے دی کنڈ نوں کرتا نے اٹھوا "چھریوں کے نشان تو نہیں ناں مٹنے جی۔

لوگ سیاست میں بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ اب دیکھیں ناں، مولوی منظور حسن نے نارووال میں شیعہ سنی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ وہ میونسپل کمشنر ہوگیا۔ شیعہ بڑے نٹ کھٹ تھے۔ تین چار سیٹیں ان کے پاس تھیں۔ بیلنس ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے جا کے مولوی منظور سے بات کی۔ کہنے لگے۔ غلام محمد کا کوئی ٹھیکہ ہے۔ مولوی منظور کی رال ٹپک پڑی۔ یہ پاکستان بننے کے بعد جو پہلے الیکشن ہوئے ہیں، ان کی بات ہے۔ شیعہ نے مولوی منظور کو ووٹ دے کے میونسپلٹی کا چیئرمین بنوادیا۔ یہ اُن کے نیچے لگ گیا۔ اس کی شیعوں کی مخالفت والی اہمیت نہ رہی جس بنا پر اس نے مخالفت شروع کی تھی۔ وہ تو بنیاد ہی بدل گئی۔ لوگ اس کے ساتھ نہ رہے یہ پھر چھوڑ ہی آیا۔

۱۹۵۳ء والے ہنگامے میں جب خواجہ صفدر کا منہ کالا کیا گیا۔ علامہ خالد محمود کو بھی پکڑ لیا گیا۔ ان کی الاٹمنٹس بھی کینسل ہوگئیں۔ میں اس وقت ممبر تھا۔ یہ میرے پاس آ گئے۔ میں ان کے متعلق نہیں جانتا تھا۔ اس کا باپ ابھی زندہ تھا۔ اس نے آگے مجھے بتایا کہ میں شیعہ ہوں۔ اس نے مجھے نادِ علی پڑھ کے سنایا۔ میں نے کہا۔ آپ مجھے حکم کریں۔ پھر میں نے ان کی الاٹمنٹیں بھی بحال کرائیں۔ علامہ خالد محمود کی ضمانت کرائی۔ باہر نکلا۔ کیس تو قائم تھا۔ پیشی بھی گئے تو کیس شروع ہونے لگا۔ اس نے کہا، شاہ جی تاریخ لے لیں۔ میں نے کہا۔ کیوں؟ کہتا ہے۔ میرے کوئی کاغذ آتے ہیں۔ میں نے کہا، کوئی گل ای نئیں۔ ایہہ کوئی کیس ای نئیں۔ آپ کو انشاءاللہ بری کرائیں گے۔ پتہ چلا کہ وہ تو معافی کے کاغذات تھے۔ بندے مروا دیئے اور معافی مانگ لی۔

مولانا محمد علی کاندھلوی کی میں عزت کرتا ہوں۔ وہ کھرے کھرے آدمی ہیں۔ عالم بھی ہیں۔ میں تو ویسے بھی ان کی عزت کرتا ہوں کہ جن کی لوگ عزت کرتے ہیں۔ آخر وہ ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ میں نہیں پڑھتا تو میرے اور مسلمان بھائی پڑھتے ہیں۔

س :۔ اُن انتخابات کے نتیجے میں دولتانہ نے صوبے میں منسٹری بنائی۔ پھر ۱۹۵۳ء والی اینٹی قادیانی موومنٹ چلی جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں کہ فلاں نے معافی مانگی۔ فلاں کا منہ کالا کیا گیا۔ یہ موومنٹ کس نے چلوائی تھی۔

ج :۔ دولتانہ نے۔

س :۔ ان کا کیا مفاد تھا۔

ج :۔ اس میں ان کا مفاد یہ تھا کہ وہ خواجہ ناظم الدین کو فیل کر کے خود وزیراعظم بننا چاہتے تھے لیکن بڑی جلدی۔

س :۔ وہ جلدی الٹی پڑ گئی۔

ج :۔ بس۔

س :۔ خواجہ صفدر کا منہ کیوں کالا کیا گیا؟

ج : دولتانہ صاحب کے ساتھ تو ان کا بڑا تعلق ہوگیا تھا۔ میں نے بتایا ناں کہ نواب صاحب ممدوٹ کو مسلم لیگ چھوڑنے اور نئی پارٹی بنانے کے سلسلے میں خواجہ صاحب نواب صاحب کو ترغیب دیتے رہے لیکن جب نواب صاحب نے جناح مسلم لیگ بنائی تو خواجہ صاحب اس میں شامل نہ ہوئے۔ اس طرح یہ دولتانہ صاحب کے قریبی اور اندرونی حلقے میں آگئے۔ ۵۳ء میں جب اینٹی قادیانی موومنٹ شروع کی گئی لوگ کہتے تھے کہ دولتانہ صاحب اس موومنٹ کا رخ مرکز کی طرف موڑنا چاہتے ہیں تاکہ خواجہ ناظم الدین کی جگہ وہ پاکستان کے وزیراعظم بن جائیں۔ ہنگامے ہو رہے تھے کہ ایک روز میں اتفاق سے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں گیا۔ پتہ چلا کہ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ شہر کے ممتاز لوگوں کی میٹنگ ہے۔ خواجہ صفدر بھی ان میں شامل ہیں۔ مجھے بڑا بڑا محسوس ہوا کہ ہم بھی مسلم لیگ کی طرف سے اسمبلی کے ممبر ہیں۔ لیکن میٹنگ میں صرف خواجہ صاحب کو بلایا گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ میٹنگ میں خواجہ صفدر نے کہا تھا کہ جو موومنٹ چلا رہے ہیں انہیں مارو۔ یہ غدار ہیں۔ ملک کے دشمن ہیں۔ انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ جو مولوی صاحبان میٹنگ میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ ساری باتیں سنی تھیں۔ اُدھر پولیس علامہ یعقوب کو پکڑنے کے لیے گئی تو علامہ صاحب نے دارالشہابیہ میں پناہ لی۔ ایک اے ایس آئی بڑا حرامزادہ قسم کا آدمی تھا وہ علامہ صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے اندر گیا۔ وہاں اس نے علامہ یعقوب کو بے عزت کیا۔ شاید مارا بھی۔ داڑھی کی بے حرمتی کی۔ اس سے لوگ مشتعل ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ غلام سرور خاں۔ ایس پی میر قائم حسین اے ایس پی صاحبزادہ رؤف علی اور مجسٹریٹ ج ک خالد اس وقت دارالشہابیہ کے باہر کھڑے تھے۔ ان کی گاڑیاں بھی وہیں تھیں۔ لوگوں نے مشتعل ہو کر ان پر خشت باری کی اور ان کی گاڑیوں کو آگ لگا دی۔ ہجوم میں سے کوئی ڈپٹی کمشنر پر چھرے سے حملہ آور ہوگیا۔ ڈپٹی کمشنر کے اردلی محمد شفیع نے حملہ آور کو لات ماری۔ وہ پرے جا گرا۔ اور اس نے اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔ اس طرح ڈپٹی کمشنر کی جان بچ گئی۔ بہرحال وہ سارے زخمی ہو چکے تھے اس پر انہوں نے فائرنگ کا حکم دیدیا۔ اس سے دو یا تین آدمی مر گئے۔ لوگ ان کی لاشیں چارپائیوں پر ڈال کے مسلم لیگ کے دفتر (اردو بازار) کی طرف چل پڑے وہاں پہنچ کے انہوں نے خواجہ صفدر کو باہر نکال لیا۔ اس کے منہ پر کالک مل دی۔ پھر آگے لگا لیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ شکر اللہ بٹ کے پٹرول پمپ پر پہنچے تو وہاں فوج آگئی۔ فوجیوں نے خواجہ صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ پھر کرفیو لگ گیا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح ہوا۔ تحصیل بازار میں فائرنگ ہوئی۔ وہاں دو چار آدمی مر گئے۔ تیسرے دن پھر بھی ہوا۔ پھر میں نے کوٹلی بہرام جا کے سلطان سوپ فیکٹری سے دولتانہ کو ٹیلی فون کیا۔ محمد حسین چٹھہ اس وقت منسٹر تھے۔ وہ کیبنٹ میٹنگ میں سے اٹھ کے آئے۔ میں نے کہا جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے۔ کہنے لگے ہاں۔ میں نے کہا۔ یہاں سچوایشن کو غلط انداز میں ہینڈل کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر اب تک کئی موومنٹس چل چکی ہیں۔ لیکن جو اب ہو رہا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ چونکہ اس معاملے میں مقامی انتظامیہ خود ملوث ہو چکی ہے۔ اس لیے آپ یہاں آئیں۔ کہنے لگے۔ ہم میں سے کوئی آ جائے گا۔ چنانچہ قلعہ پر سٹی تھانے میں میٹنگ بلائی گئی جس میں کمشنر لاہور آئی یو خاں اور ڈی آئی جی ایس این عالم کے علاوہ مقامی لوگ بھی تھے۔ میں بھی تھا۔ فوج کی طرف سے بریگیڈیئر اکبر علی عابد یا عابد علی اکبر تھے۔ اس وقت سیالکوٹ چھاؤنی میں جرنیل نہیں۔ بریگیڈیئر ہوتا تھا خیر باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے کہا جناب یہاں موومنٹیں چلتی رہی ہیں۔ لیکن

جو کچھ اب ہو رہا ہے۔ ایسا حشر کبھی نہیں ہوا۔ آئی یو خاں کہنے لگا، ہم ملتان میں تھے تو وہاں لوگوں نے تھانے کو آگ لگا دی تھی۔ ہم نے اسی طرح گولی چلا کے کنٹرول کیا تھا۔ میں نے کہا، شروع تو گولی سے نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ سپاہی اندر آیا کہ ایس پی صاحب کا فون ہے۔ قائم حسین فون سننے کے لیے گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کے۔ ڈی آئی جی ایس این عالم سے کہا، سر لاہور سے آپ کی کال ہے۔ پھر ڈی آئی جی فون سن کے آیا اور کہا: "سارے مجھے فوری طور پر لاہور بلایا گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کر ڈی ایس پی فردوس شاہ مسجد وزیر خاں میں قتل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں مارشل لاء لگ گیا۔ یہ سارا قصہ ڈرامائی ہے خیر،

اسی میٹنگ میں میں نے پھر آئی یو خان سے کہا، یہاں گولی چلی ہے جس سے آدمی مرے ہیں۔ آپ گولی نہ چلانے کا تجربہ تو کر کے دیکھیں۔ جلوس کو بلا روک ٹوک گذرنے تو دیں۔ سیلاب کے آگے دیواریں تو نہیں بنائی جا سکتیں اس کا رُخ موڑا جا سکتا ہے۔ آپ بھی اس کا رُخ موڑیں۔ اسے روکیں نہیں۔ یہی ہوا دوسرے دن جلوس نکلا۔ تیسرے دن بھی نکلا۔ گورنمنٹ نے گولی نہیں چلائی، کچھ بھی نہ ہوا۔

س :۔ کہتے ہیں کہ خواجہ صفدر کو جوتوں کا ہار بھی پہنایا گیا اور گدھے پر سوار بھی کیا گیا۔

ج :۔ سارا کچھ ہی ہوا۔ اُن کے بس میں جو تھا۔ خواہ جوتوں کا ہار ڈال لیتے۔ خواہ کھوتے پر بٹھاتے۔ حالت یہ تھی کہ مارشل لاء کے دوران میں کرمانی کسی کی سفارش کرنے گیا۔ انہوں نے وہیں پکڑ لیا۔ اسی وقت ٹرائل کر کے سات سال سزا سنا دی۔ مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار خاں نیازی کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔

س :۔ اور دولتانہ؟

ج :۔ دولتانہ صاحب ہیرو بن گئے۔

س :۔ ہیرو؟

ج :۔ ہاں، ختم نبوت کا سارا کریڈٹ انہیں مل گیا تھا۔ لیکن انہوں نے غلطی یہ کی کہ بیان دے دیا۔ اور وہ بیان دے کے ہیرو کیا جو بھی نہ رہا۔ ان کے بارے میں لوگوں کی جو پسندیدگی تھی۔ وہ صفر ہو گئی۔

س :۔ انہوں نے کیا بیان دیا؟

ج :۔ بیان کی تفصیل یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ان کے پہلے سٹینڈ کے برعکس تھا۔

س :۔ بیان کیوں دے دیا؟

ج :۔ سکندر مرزا اور جی احمد وغیرہ لاہور آئے۔ انہوں نے ان سے بیان دلوا دیا۔ میں نے سیالکوٹ سے ٹیلی فون کیا۔ میاں صاحب آپ نے کیا کیا۔ کہنے لگے "او یارا، تو لاہور آ جا، ٹیلی فون پر تو بات نہیں ہو سکتی"۔ میں نے کہا، وہاں آنے کا کیا فائدہ، وہاں تو کرفیو ہے۔ کہنے لگے۔ آپ آئیں اور ساتھ صفدر کو بھی لیتے آئیں۔ آپ کو سٹیشن پہ کرفیو پاس مل جائیں گے۔ وہاں ٹرانسپورٹ بھی ہو گی۔ ہم گئے۔ دولتانہ صاحب نے بتایا کہ میں بیان نہ دیتا تو وہ مجھے پکڑنے لگے تھے۔ میں نے کہا میاں صاحب وہ آپ کو پکڑ لیتے آپ تو ہیرو تھے۔ کوئی آپ کی طرف انگلی نہیں کر سکتا تھا لوگوں کے جذبات تو یہ تھے۔ آپ نے یہ کیا کیا۔

س :۔ پکڑے جانے سے ڈر گئے؟

ج :۔ ہاں۔ پھر ہم بابو ٹرین سے سیالکوٹ واپس آ گئے۔ ریلوے سٹیشن پر ہو کا عالم تھا۔ پلیٹ فارم پر کسی آدمی نے خواجہ صاحب کو بڑی سی گالی دی۔ میں نے ان سے کہا، میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔ کہنے لگے، نہیں مجھے دفتر تک چھوڑ دیں۔ وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔
پھر گورنمنٹ نے خواجہ صفدر کو بڑا مقام دیا۔

س :۔ مثلاً۔

ج :۔ مثلاً یہ کہ انہیں یو نائیٹڈ نیشنز میں بھیجا۔ بعد میں سیالکوٹ سیلاب آیا تو چھاؤنی میرا حلقہ تھا۔ جو بہت متاثر ہوا۔ کئی لوگ پانی میں بہہ گئے۔ ان کے مکان سیلاب کی نذر ہو گئے۔ ہمیں متاثرین کی بحالی وغیرہ کے لیے ڈپٹی کمشنر وغیرہ کے پیچھے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا جبکہ خواجہ صاحب کو بڑے اختیارات تھے۔ پھر تو انہوں نے اپنے مخالفین کو جو ممدوٹ صاحب کے سپورٹر تھے۔ تنگ کیا۔ فیروز جراح، مغل سائیکل ورکس والا۔ اور خواجہ لطیف صاحب کو جیل بھجوا دیا۔ اس وقت میاں امیر الدین کے بھائی میاں امین الدین گورنر پنجاب تھے۔ خواجہ لطیف صاحب کا سگا بھتیجا گورنر کی ہمشیرہ کے ساتھ بیاہا ہوا تھا۔ اتنی قریبی رشتے داری تھی، لیکن گورنر ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

س :۔ خواجہ صاحب اتنے با اثر ہو چکے تھے؟

ج :۔ ڈپٹی کمشنر جو ان کے ساتھ شامل تھا۔ اور ڈپٹی کمشنر کا یہ تھا کہ بعد میں آپ اسے بیشک نوکری سے نکال دیں۔ لیکن ان کے کیے کو بدل نہیں سکتے تھے۔ خواجہ لطیف صاحب ۳۳، ۱۹۳۴ء میں مرے کالج میں میرے بھی اُستاد رہے تھے۔ وہ سیالکوٹ میونسپلٹی کے پریذیڈنٹ بھی رہے تھے۔

س :۔ یہ آپ ۱۹۵۳ء کی باتیں بتا رہے ہیں۔ جبکہ ممدوٹ کے ساتھ ان کا الیکشن ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا۔

ج :۔ خواجہ صفدر نے ذہن میں بات رکھی۔ جب موقعہ ملا چوٹ لگا دی۔ ۱۹۵۱ء میں ان لوگوں کو گرفتار کرانے والی کوئی وجہ نہیں تھی۔ موقعہ بنا تو خواجہ صاحب نے اپنا انتقام لے لیا۔ اب دیکھیں، بار ایسوسی ایشن کا الیکشن کیا ہوتا ہے۔ اکیڈمک الیکشن ہے کہ چلو آدمی اپنی برادری میں ذرا نمایاں ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بار کے الیکشن میں کھڑے ہوئے۔ جنہوں نے ووٹ نہ دیئے ان کے ساتھ دشمنی رکھی۔

س :۔ اس موومنٹ کے نتیجے میں دولتانہ کو جب وزارت اعلیٰ سے ہٹایا گیا۔ اس وقت آپ بھی ممبر تھے۔ ان کے ساتھ اسمبلی کی اکثریت نہیں رہی تھی۔

ج :۔ دولتانہ صاحب کے خلاف مہم خواجہ شہاب الدین نے شروع کی۔ وہ اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ پنجاب اسمبلی کا بجٹ سیشن ہو رہا تھا۔ گروپنگ ہو چکی تھی۔ دولتانہ صاحب کی جگہ فیروز خاں نون وزیر اعلیٰ ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر تھے۔ یہ میٹنگ اسمبلی ہال کے میٹنگ روم میں ہو رہی تھی، جہاں اب کیفے ٹیریا ہے۔ وہ بڑی پرجوش میٹنگ تھی۔ ایگزیکٹو سپیکر کے پاس سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم تو کسی گروپ میں نہیں تھے۔ میں نے کہا ہمیں بحیثیت ورکر تکلیف ہوئی ہے جب ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ ہمارا نیا خصم بنا رہے ہیں۔ ہمارا لیڈر منتخب ہونا ہے اور ہمیں پتہ ہی نہیں۔ دولتانہ صاحب مجھے کہنے لگے۔ مرید ایسے آگے گل کریں۔ میں نے کہا، میں نے یہ بات کی ہے کہ ہمارا لیڈر تو ہمارے ووٹوں کے ساتھ منتخب ہونا چاہیے ہمارے اعتماد کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس سے پھر کراس ٹاک شروع ہو گئی۔ یہاں یہ کیا جاتا ہے۔ یہاں وہ کیا

کیا جاتا ہے۔ شور مچ گیا۔ جیسے بارود پھٹ گیا ہو۔ ہم تو حیران ہی رہ گئے۔ بعد میں یہ تبصرہ بھی کرتے رہے۔ کہ تو نے بات کر کے فساد ہی کرا دیا ہے۔ اس کے بعد دولتانہ صاحب نے کہا کہ میں اس پارٹی کی لیڈر شپ سے استعفا دیتا ہوں۔ ان کے حق میں بہت زیادہ لوگ ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا ہم آپ کا استعفا بالکل قبول نہیں کرتے نہ ہم اس کی اجازت دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں استعفا دیتا ہوں۔ اور یہ بھی کہا کہ میرے ذمے ایک اور فرض بھی لگایا گیا ہے کہ میں آپ کے آنے والے لیڈر کا نام تجویز کروں۔ وہ ملک فیروز خاں نون ہیں۔

س :۔ "میرے ذمے یہ فرض بھی لگایا گیا ہے کہ میں آپ کے آنے والے لیڈر کا نام تجویز کروں۔ وہ ملک فیروز خاں نون ہیں"۔ انہوں نے ایک طرح سے کہہ ہی دیا کہ میں مجبور ہوں۔

ج :۔ بالکل صاف واضح تھا۔

س :۔ وہ زمانہ وزارتی اکھاڑ بچھاڑ کا تھا۔ آپ کا کام نہیں بنا؟

ج :۔ نون کے بعد جب سردار عبدالحمید دستی وزیر اعلیٰ پنجاب ہوئے ہیں تو انہوں نے میرے پاس علمدار حسین گیلانی کو بھیجا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا! دستی صاحب کہتے ہیں آپ آئیں اور وزارت کے لیے حلف لیں۔ میں نے انہیں کہا۔ شاہ صاحب میں تو آپ پر حیران ہوں کہ آپ کے ساتھ دولتانہ نے قرآن پاک پر وعدہ کر کے آپ کو وزارت نہ دی۔ فیروز خاں نون آیا۔ اس نے آپ کو وزیر بنا دیا۔ آپ نے دولتانہ سے مل کے اسے لیٹ ڈاؤن کیا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہنے لگے۔ ایمانداری دی گل ایہہ وے بھائی صاحب توں آپ ٹوڈی مارک نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ جس نے آپ جیسے وزیر بنائے۔ وہ آپ ٹوڈی مارک، بلقینا" نہیں تھا۔ لیکن، آپ ہم سے یہ توقع نہ رکھیں۔ اب مجھے یہ قیمتاً منسٹری دے رہے ہیں، کہ میں قزلباش کو ووٹ نہ کروں۔ دراصل اس وقت دستور ساز اسمبلی کا الیکشن ہونا تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ممبرز منتخب کرتے تھے میں نے علمدار سے کہا کہ میں تو بڑی شخصیتوں کو انکار بھی کر چکا ہوں۔ کسی دوست کو لیٹ ڈاؤن کرنے کے لیے یہ بڑی چھوٹی سی قیمت ہے۔ اس کے بعد دستی صاحب نے مجھے براہِ راست ٹیلی فون کیا۔ کہنے لگے۔ تجھے عبدالحمید دستی نے تو نہیں بلایا تھا۔ تجھے احمد حمید دستی کے والد نے بلایا تھا۔ اُن کا لڑکا احمد حمید جو اَب مجلس شوریٰ کا ممبر ہے۔ ہم لاء کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔ ہمارا بڑا پیار تھا۔ ہم بڑے گہرے دوست تھے۔ دستی صاحب کو پتہ تھا۔ میں نے کہا اچھا میں نواب صاحب سے اجازت لے لوں پھر میں آجاؤں گا۔ میں نے نواب قزلباش کو ٹیلی فون کیا۔ کہ یہ بات انہوں نے کی ہے۔ ویسے مجھے ان کے پاس جانا چاہیئے۔ جہاں میں بیٹھا ہوں۔ وہ مجھے بلا تو نہیں سکتے۔ نواب صاحب نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں گیا، سیکرٹریٹ میں دستی صاحب نے دروازہ بند کر لیا۔ کہنے لگے تیرے پاس علمدار کو بھیجا تھا تو آیا نہیں، میں نے کہا چھوڑیں اس بات کو آپ نے یہ کیا تجارت شروع کر رکھی ہے۔ آپ بزرگ ہیں، آپ کی ایسی باتوں پر ہمیں کوفت ہوتی ہے۔ کہنے لگے، "ہن وعظ چھڈ تے گل کر"۔ میں نے کہا یہ نیچے سفے کی جو بادشاہی ہے ایہ مجھے آپ دے رہے ہیں کہنے لگے، نہیں، ون یونٹ بنتا ہے۔ اس میں تو نے اگر کچھ بننا ہے تو میرے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس چل۔ گورمانی گورنر تھا۔ ان کا آپس میں بڑا ساتھ تھا۔ میں نے کہا دستی صاحب جانے دیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں اگر میرا اس قسم کا کردار ہو گا تو آپ مجھ پر فخر تو نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے، چھڈ توں وعظ کرنا ایں

توں رُسناوی ایں۔ پالیٹکس میں روٹھا نہیں کرتے۔ وعظ بھی نہیں کیا کرتے چل میرے ساتھ۔ میں نے کہا۔ پھر مجھے سوچ لینے دیں۔ یہ کہہ کے میں نکل گیا۔ پھر ان کے نزدیک نہیں گیا۔

منیر صاحب بڑے ہی مواقع آئے جنہیں لوگ عزتیں سمجھتے ہیں۔ بالکل راہ میں تھیں۔ لیکن وہ وقت ایسا ہوتا تھا۔ حالات ہی ایسے ہوتے تھے کہ طبیعت پر ایک بوجھ سا تھا کہ اس دنیاوی چیز کے لیے عارضی چیز کے لیے ان لوگوں کو ہم ناپسند کرتے ہیں۔ جن کا تاریخ میں ایسا کردار ہے۔ ہم بڑے چھوٹے آدمی ہیں۔ بڑے معمولی آدمی ہیں۔ لیکن پیمانہ تو ایک ہی ہوتا ہے ناں۔

میرے پاس تو کوئی آفس نہیں تھا۔ میرے پاس کبھی کوئی نامی نیشن (نامزدگی) نہیں رہی جتنی دفعہ آیا ہوں۔ الیکشن کے ذریعے آیا ہوں۔ جس وقت مجلس شوریٰ بنی۔ سیالکوٹ کے سارے امیدوار میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ خواجہ صفدر پر بڑا ناراض ہوگا۔ کہ اسے ممبر نہیں بنایا۔ باتیں کرتے رہے میں سنتا رہا۔ کہنے لگے۔ آپ کا حق تھا۔ خواجہ صفدر آپ سے جونیئر ہے۔ میں نے کہا۔ یار ایک تو مجلس شوریٰ کی ممبر شپ کونسی قابل فخر چیز ہے۔ ہمارے پاس اسمبلی ممبر شپ اتنی دیر رہی ایک ٹرم اور ہو جائیں گے۔ کیا فرق پڑے گا۔ یا میں نے ڈپٹی کمشنر کا نامزد ہونا تھا۔ یا خواجہ صفدر کا ہونا تھا۔ میرے واسطے دونوں باتیں قابل عزت نہیں میں نے کہا۔ اللہ نے اتنی بڑی عزتیں دے رکھی ہیں۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہم نے اپنی زندگی بڑی باعزت گذاری ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی ممبر شپ میں نے صدقہ و خیرات ہی لینی تھی۔ صدقہ و خیرات تو سیدوں پر حرام ہے۔ میں نے کہا۔ میری ساری زندگی کا تجزیہ کر لیں۔ میں نے کوئی پریٹیکل خیرات نہیں لی نہ پریٹیکل صدقہ نہ کوئی الاٹمنٹ نہ کوئی اور چیز اللہ نے مجھ پر اپنی جناب سے ہی کرم کیا ہے۔ میری زندگی گزر رہی ہے۔

س:۔ دولتانہ نے قرآن پاک پر علمدار حسین گیلانی کو وزیر بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل؟

ج:۔ دولتانہ کے تعلقات تھے۔ دراصل گردیزیوں کے ساتھ۔ علی حسین گردیزی کو اس نے منسٹر بھی لیا تھا۔ ملتان شہر اور ضلع دونوں جگہ گیلانیوں کا اثر تھا۔ کیونکہ میونسپلٹی میں ڈپٹی کمشنر پریذیڈنٹ ہوتا تھا۔ پتہ نہیں۔ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ء کی بات ہے کہ انگریز ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس وقت ہندو سکھ بھی ممبر ہوتے تھے۔ حامد رضا گیلانی کے والد نے ڈپٹی کمشنر کو شکست دیدی۔

ان کے پاس ہمیشہ دو تین ممبریاں رہیں۔ سنٹرل اسمبلی میں بھی صوبائی اسمبلی میں بھی۔ صوبائی اسمبلی میں ہمارے ساتھ دو توق بھائی ممبر تھے۔ علمدار حسین گیلانی اور اس کا چھوٹا بھائی۔ اس سے پہلے مخدوم ولایت حسین علمدار ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین رہے تھے۔ وہ پہلی اسمبلی میں بھی تھے۔ اس میں بھی تھے۔ پھر مخدوم ولایت حسین فوت ہو گئے۔ تو علمدار کا چھوٹا بھائی رحمت حسین گیلانی الیکٹ ہوا۔ پھر دولتانہ نے ان کے ساتھ علی حسین گردیزی کے انتخاب کے لیے معاہدہ کیا۔ غالباً شہر والی سیٹ سے الیکٹ ہوئے تھے۔ وعدہ یہ کیا کہتے ہیں۔ قرآن پاک پر لکھ کے دیا کہ میں آپ کو وزیر لوں گا۔ یہ ان سے سودے بازی کی۔ لیکن اسے وزیر نہیں لیا۔ گردیزی کو لے لیا۔ گردیزی ویسے اچھا آدمی تھا۔ دولتانہ نے وہ وعدہ خلافی کی۔ اس کا ذکر ہوتا تھا علمدار حسین گیلانی بھی کہا کرتے تھے کہ دولتانہ نے قرآن پاک پہ لکھ کے وعدہ کیا کہ آپ سپورٹ کریں میں آپ کو وزیر لوں گا۔

دولتانہ بھٹو سے بھی زیادہ لائق آدمی ہے۔ بے انتہا قابل۔ پھر اتنے روابط کہ پنجاب کے ہر ضلع

میں وہاں کی ٹاپ موسٹ پولیٹیکل فیملی کے ساتھ رشتے داری تھی۔ یا ان کے فدائی قسم کے آدمی تھے۔ جیسے سیالکوٹ میں ہمیں پتہ ہے کہ اس قسم کے بھی آدمی تھے کہ ان کے کہنے پر کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا دیتے۔ پھر مالی طور پر اتنا مضبوط آدمی، اتنا صاحب جائیداد آدمی۔ ہر قسم کا میرٹ اس میں تھا۔

س: مار کیسے کھا گئے؟

ج: بس یہی ہے، کہ اچھائی پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ داؤ پیچ مارنے میں بہتری ہوتی ہے حالانکہ اس قسم کی حرکت کو کوئی ضابطہ جائز قرار نہیں دیتا۔

س: دولتانہ اور ممدوٹ میں قصور کس کا تھا۔ ویسے دولتانہ نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے۔

ج: یہ کہہ دینے سے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ بات ختم نہیں ہو جاتی۔

س: فیروز خان نون نے وزارت بنائی۔ تو سنا ہے کہ دولتانہ صاحب کے خلاف پروڈا کا کیس بھی تیار ہونے لگا تھا جس میں ان پر یہ الزام بھی تھا کہ انہوں نے اپنے ورکروں کو نوازا ہے۔ مربعے الاٹ کیے ہیں

ج: آٹھ آٹھ مربعے کے پلاٹوں کی ایک سکیم تھی۔ وہ مربعے جو ابھی ڈویلپ نہیں ہوئے تھے۔ جو لینا چاہے وہ اپنے خرچے پر ڈویلپ کرے تو آدھی زمین گورنمنٹ لے لے گی۔ ہمیں بھی آفر ہوئی تھی کچھوں نے لیے بھی۔ وہ سکیم دراصل اسمبلی ممبران کے لیے تھی۔ عطاء اللہ جہانیاں ان کا ایک ورکر تھا۔ وہ اسمبلی ممبر نہیں تھا۔ ٹریڈ یونین ورکر تھا۔ کوآپریٹو بنکوں میں سب انسپکٹر تھا۔ بعد میں شائد چھوڑ گیا یا نکال دیا گیا۔ اسے مختلف ناموں سے ۶۵ مربعے دیئے گئے تھے۔ اس لیے جب فیروز خاں نون کی گورنمنٹ بنی ہے۔ تو دولتانہ صاحب کے خلاف الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ یہ جو اس کا ورکر تھا۔ اس نے اس کو پیٹرونائز کیا ہے۔ بغیر جواز کے اور حکومت کی پالیسی کے خلاف اس کو ۶۵ مربعے دیے ہیں۔ میرا خیال ہے اسمبلی میں سوال ہوا تھا۔ اس وقت نواب مظفر علی قزلباش وزیر مال تھے۔ دولتانہ صاحب کے خلاف ایبڈو کا سلسلہ جو بننا تھا۔ اس میں ان کے خلاف یہ میٹریل تھا۔ پھر جب ری پبلکن پارٹی بنی ہے تو عطاء اللہ جہانیاں اپنی وہ جائیداد بچانے کے لیے ری پبلکن میں چلے گئے۔ سیالکوٹ کے شیخ مولا بخش تالاب میں جلسہ ہوا تھا۔ کرنل عابد حسین نے بھی تقریر کی جس پر خواجہ صفدر نے انہیں نوٹس دے دیا تھا کہ اس نے قتل پر اکسایا ہے۔ کرنل عابد حسین کچھ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ بات کر گئے تھے۔ اس جلسے میں عطاء اللہ جہانیاں نے بھی تقریر کی تھی۔

س: مجھے بھی وہ یاد ہے۔ میں سکول میں پڑھتا تھا میرے والد صاحب مجھے سائیکل پر بٹھا کے لے گئے تھے۔ مجھے صرف ڈاکٹر خان صاحب کا جلسہ یاد ہے۔ سفید کپڑے اور سفید ٹوپی تھی جب وہ مائیک پر آئے تو میرے قریب کے ایک آدمی نے ان پر یہ تبصرہ کیا۔ "اوئے ایہہ تے بڈھا بکرا اے"۔

ج: ہم نے وہ جلسہ تالاب کے باہر کی سڑک پر کھڑے ہو کر سنا تھا۔

س: دولتانہ صاحب کے خلاف پروڈا کا آپ کہہ رہے تھے۔

ج: جو گورنمنٹ ہٹتی تھی اسے بدنام کرنے کے لیے کرتے تھے۔ اس قسم کے میٹریل آتے تھے۔ یہاں سے صوبائی اسمبلی کا ایک ممبر ہوتا تھا۔ ملک فیض۔ دولتانہ صاحب نے رائے ونڈ کولڈ سٹوریج اسے الاٹ کیا تھا۔ اس کا بھی اسمبلی میں سوال ہوا تھا۔ حالانکہ نواب صاحب قزلباش اس کا بڑا مہربان تھا۔ انہوں نے جواب

دیا۔ ٹھیک ہے دولتانہ نے کیا ہے۔ اس کے بعد ملک فیض نے نواب صاحب سے گلہ کیا۔ انہوں نے کہا، حقائق تو ماننا پڑتے ہیں۔

س :۔ دولتانہ صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے کھایا نہیں۔ آپ کی معلومات کی روشنی میں یہ لوگ اگر خود نہیں کھاتے رہے، لیکن کھلاتے رہے ہیں،

ج :۔ جی ہاں۔ یہ تو اس سے پہلے بھی تھا۔ یہ تو یونینسٹ کے زمانے میں تکنیک تھی۔ انگریزوں کی بھی یہ پالیسی تھی، ہمارے ضلع کے ذیلدار بڑے کمزور آدمی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ، ایکڑ ان کی زمین ہوتی تھی۔ گذارا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہاں پانچ پانچ مربع جینرل گرانٹس ملی تھیں۔ ذیلداروں کو بھی اور بہت ساروں کو بھی جب حکومتوں کے مفادات ہوتے تھے۔ وہ پیپرز نائز تو کرتی تھیں۔ وہ نواب بھی ہوتا ہے۔ جرنیل صاحب جرنیلوں کو۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان خلفاء بھی کرتے تھے۔

س :۔ اسی راستے سے پھر ملوکیت آئی۔

ج :۔ جی ہاں، ہسٹری تو یہی ہے۔

س :۔ ہمارے ہاں کی ملوکیت جو غلام محمد، سکندر مرزا کی صورت میں رونما ہوئی وہ کس راستے سے آئی ؟

ج :۔ غلام محمد اور گرمانی میں بڑا تعلق تھا۔ وہ تو ڈرامہ ہوا تھا۔ کرنل عابد حسین، میجر مبارک علی شاہ، مشتاق احمد گورمانی۔ آپس میں بڑے پرانے دوست تھے۔ چیفس کالج میں بھی اکٹھے پڑھتے تھے۔ ۱۹۲۶ء سے پنجاب اسمبلی کے ممبر چلے آ رہے تھے۔ جب غلام محمد گورنر جنرل تھے۔ ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ گرمانی ان کی جگہ لینے کے لیے بڑی آرزو رکھتا تھا۔ وہ اسے اس پوائنٹ پر لے آیا کہ آپ چھٹی پر چلے جائیں اور مجھے ایکٹنگ گورنر جنرل بنا دیں۔ یہ بات پھر مجھے نواب قزلباش نے بتائی کہ یہ راز کرنل عابد حسین اور مبارک علی شاہ پر لیک آؤٹ ہو گیا۔ ان کے سکندر مرزا کے ساتھ بھی تعلقات تھے۔ انہوں نے اسے بتا دیا۔ محمد علی بوگرہ اس وقت پرائم منسٹر تھے۔ ایوب خاں ڈیفنس منسٹر تھے، کمانڈر انچیف بھی تھے۔ انہوں نے میٹنگ بلائی کہ یہ ہو رہا ہے۔ اگر گرمانی ایک بار گورنر جنرل بن گیا۔ تو وہ کسی کے قابو نہیں آئے گا۔ فیصلہ ہوا کہ غلام محمد سے کہا جائے کہ آپ کی صحت اچھی نہیں۔ آپ علاج کرانے کے لیے چلے جائیں۔ یہ فیصلہ کر کے انہوں نے بوگرہ کو استعفیٰ لکھ دیا کہ اسے بتا دے کہ کیبنٹ کا فیصلہ ہے۔ اور اس پر دستخط کرا لائیں۔ پیچھے انہوں نے اپنی میٹنگ جاری رکھی۔ بوگرہ وہاں سے واپس آیا۔ اس سے پوچھا، دستخط کرا لائے ہو۔ اس نے کہا، ہاں کرا لایا ہوں دستخط! پوچھا، کیا مطلب ؟ کہنے لگا۔ میں نے اسے آپ کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ چھڑی اس کے پاس تھی۔ اس نے مجھے گالی دی اور پانچ سات سوٹیاں بھی جڑ دیں۔ انہوں نے کہا۔ کہ یہ تو بڑی خراب بات ہے۔ انہوں نے پھر ایوب خاں کو بھیجا۔ انہوں نے وردی پہنی اور گئے۔ واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ میں نے اسے کہا تھا کیبنٹ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ اس پر دستخط کر دیں۔ غلام محمد نے کہا، "تو بھی یہ بات کہتا ہے"۔ میں نے کہا، ہاں میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوں۔ پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں بیٹھا رہا، پھر میں نے کہا، اب آپ اس پر دستخط کر دیں۔ اس پر اس نے کہا، میرا تو ہاتھ بھی کام نہیں کرتا۔ میں نے کہا، میں سہارا دیتا ہوں۔ پھر اس سے زبردستی دستخط کرائے"۔

پھر انہوں نے سکندر مرزا کو گورنر جنرل بنانے کا فیصلہ کیا جس روز حلف اٹھانے کی تقریب تھی غلام محمد گورنر جنرل ہاؤس میں تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کا اعتبار نہیں۔ وہاں سلطے سے ڈپلومیٹ اور دوسرے تیسرے بھی ہوں گے وہ کہیں اُٹھ کے تقریب میں ہی نہ آ جائے اور کہہ دے کہ میرے ساتھ انہوں نے زبردستی کی ہے۔ اب یہ اسے کہیں کہ گورنر جنرل ہاؤس سے چلا جا۔ وہ جاتا نہیں تھا۔ پھر اسے زبردستی اٹھا کے سمندر کے کنارے کسی تفریحی مقام پر چھوڑ آئے۔ اس کے بعد سکندر مرزا کے حلف اٹھانے کی تقریب ہوئی۔

س :۔ پھر یہ بات ٹھیک ہوئی کہ ایوب خاں، غلام محمد کے زمانے سے ہی اپنی راہ تراش رہے تھے۔

ج :۔ سکندر مرزا کے لیے انہوں نے جا کے دستخط کرائے ناں جی

س :۔ یہ شریک رہے ناں۔ جوڑ توڑ کے اس سارے عمل میں جس کا منطقی نتیجہ ملک کی بربادی تھا۔

ج :۔ ہاں جی، وہ سکندر مرزا کے ساتھ تھے۔

س :۔ زمین ہموار کرتے رہے کہ کب آؤں؟

ج :۔ اس وقت سیاست بیوروکریٹس کے پاس چلی گئی تھی۔ غلام محمد بھی تو بیوروکریٹ تھا چودھری محمد علی بھی بیوروکریٹ تھا۔ سکندر مرزا بھی بیوروکریٹ تھا۔ یہ سب تھے۔

س :۔ تب ایوب خاں نے سوچا کہ طاقت تو ہمارے پاس ہے۔ ہم کیوں نہ آ جائیں۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ ایوب خاں کہا کرتے تھے کہ غلام محمد نے انہیں ۱۹۵۴ء میں ٹیک اوور کرنے کو کہا تھا۔ لیکن انہوں نے نہ کیا۔

ج :۔ ہوئی ہوگی کوئی اس قسم کی بات۔

س :۔ اس وقت انہوں نے اسے موزوں نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ کسی مناسب کرائسز کے انتظار میں ہوں گے۔

ج :۔ اس وقت ایوب صاحب کو پتہ تھا کہ لوگ انہیں قبول نہیں کر سکیں گے۔ دیکھو جی، معاشرے کی کیفیت ہوتی ہے جس طرح اب ہے۔ اب کوئی بات اچھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے لوگوں کو اس قدر دبا لیا ہے جس کا کوئی حساب ہی نہیں۔ ہر چیز کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ بجٹ میں قیمت نہیں بڑھائیں گے۔ بعد میں بڑھا دیں گے۔ لوگ تو کراہ رہے ہیں جس آدمی نے اپنی زندگی میں چودہ آنے گیلن پٹرول لیا ہو، اسے ۳۳ روپے دینے پڑیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے چودہ آنے گیلن پٹرول لیا ہے۔ اب ہم ۲۳ روپے کچھ آنے دیتے ہیں۔ لاہور جانے کے لیے سو روپے کا پٹرول ڈلوانا پڑتا ہے۔ اُس وقت ہم ڈھائی تین روپے میں پہنچ جاتے تھے۔ کوئی تناسب تو نہیں ناں جی۔ آپ بڑی مشکل سے اپنا بجٹ بناتے ہیں۔ اگلے مہینے سارا درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کی پروڈکشن اور ڈسٹری بیوشن گورنمنٹ کر رہی ہے۔ بعض ممالک ایک آنے کی مزید ٹیکسیشن برداشت نہیں کرتے، حکومت الٹ جائے گی۔ ایک کیفیت ہوتی ہے ناں، اس طرح اس وقت ایوب صاحب کا خیال تھا کہ اگر فوج آ کے قبضہ کر لے تو لوگ برداشت نہیں کریں گے۔ لیکن آہستہ آہستہ سیاستدانوں کے ہاتھوں بیوروکریسی نے مینیج کیا کہ زیادتیاں ہوئیں۔ لوگوں کی توقعات کے محل مسمار ہوئے۔ تو لوگ سیاسی جماعتوں کے بھی خلاف ہو گئے۔ مجھے یاد ہے۔ میں کسی کے سلسلے

میں کراچی گیا تھا۔ نواب قزلباش کامرس اور انڈسٹری کے منسٹر تھے۔ وہاں افراطِ زر کی یہ کیفیت تھی کہ میرا تو دم ہی گھٹنے لگا اور گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل تھی۔ یعنی اسی ہزار روپے میں شیورلیٹ موٹر ملتی تھی۔ بلیک مارکیٹ میں اس کی دگنی قیمت تھی۔ میں نے موٹر لینی تھی۔ ماڈرن موٹرز والے سیالکوٹ کے ہی ہیں۔ میں نے ان کے مینیجر سے کہا، اس نے مجھے کہا کہ نواب صاحب پرمٹ بھی دیتے ہیں پرمٹ مجھے دے جائیں۔ کار مفت لے جائیں۔ اس لیے کہ بلیک مارکیٹ میں وہ دگنی قیمت پر بکتی تھی۔ یہ حالت ہو چکی تھی جس وقت مارشل لاء لگا تھا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

س : ایسی حالت پیدا کردی گئی کہ جب مارشل لاء لگایا جائے تو لوگ سکھ کا سانس لیں۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ اس میں ایوب خاں اور بیوروکریسی دونوں شامل تھے؟

ج :۔ سارا کچھ بیوروکریسی کرتی ہے۔ موجودہ پریذیڈنٹ کے بھی یہ وفادار نہیں میرا نہیں خیال کہ صدر ضیاء ساری باتوں کے ذمہ دار ہیں۔

س :۔ سکندر مرزا نے ایوب خاں کے آنے کا عمل اور تیز کر دیا تھا کیونکہ اس کی انٹریگز (سازشوں) نے خاصی افراتفری پیدا کر دی تھی۔

ج :۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں رہا تھا۔ اس کا سبجیکٹ ہی انٹریگ تھا۔ اپنے آقاؤں کو بھی داؤ لگا جاتا تھا۔ سیاسی رشوتیں دینا ہوتی تھیں۔ کھانے کا بڑا کھلا سکوپ تھا۔ اور جوڑ توڑ بھی کرنا اس لیے یہ سارے اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔

س :۔ حتیٰ کہ گورمانی اور دولتانہ بھی۔

ج :۔ دیکھو جی، گورمانی کا پلان یہ تھا کہ غلام محمد کو چھٹی پر بھیجو، ایکٹنگ گورنر جنرل ہو۔ پھر اس دوران میں اُسے سمجھا دوں گا کہ دوسرے جنہیں آپ پسند نہیں کرتے۔ وہ آجائیں گے۔ اس لیے رہنے دو۔ اس کے مائنڈ میں یہ بات تو تھی۔

س :۔ یا پھر لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ان دونوں کے مابین باری باری اقتدار کے مزے لوٹنے کا طے ہو گیا ہو۔

ج :۔ بہت ممکن ہے۔ بہرحال، سکندر مرزا اس معاملے میں بہت ہوشیار تھا۔ سہروردی جیسے آدمی کو اُوپر نیچے کر گیا۔

س :۔ حالانکہ سہروردی بڑے سیاستدان تھے۔

ج :۔ حالانکہ سہروردی بڑے سیاستدان تھے۔ انہوں نے بطور پرائم منسٹر دورہ شروع کیا تاکہ عوام کے ساتھ ان کا براہِ راست رابطہ ہو۔ وہ روزانہ جلسے کرتے تھے۔ عوامی جلسے۔ سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی۔ میرا خیال ہے انہوں نے بطور وزیرِاعظم آخری جلسہ ایبٹ آباد میں کیا تھا۔ شائد کاکول اکیڈمی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ سکندر مرزا نے انہیں خاص طور سے واپس بلایا اور استعفیٰ لے لیا۔

س :۔ کہ یہ زیادہ ہی پاپولر ہوتا جا رہا ہے۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ سردار عبدالحمید دستی راوی ہیں کہ انہیں سکندر مرزا نے بتایا کہ جب سہروردی سے استعفا کی بات ہوئی تو وہ رو پڑے ۔

ج :۔ نواب قزلباش لاہور آئے ہوئے تھے ۔ گلستانِ فاطمہ میں ایک استقبالیہ تھا ۔ وہاں انہوں نے سہروردی کے خلاف باتیں کیں ۔ کہ وہ سپورٹ تو ری پبلکن سے حاصل کرتے تھے ۔ اور انہی کی جڑیں کاٹتے تھے ۔ عوام میں انہیں کنڈیم کرتے تھے ۔ انہیں یہ تو حق حاصل نہیں تھا ۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مجھے بتایا کہ میں گیا تو سہروردی نے کہا ۔ نواب صاحب آپ لوگوں کو یہ کچھ بتاتے رہے ۔ نواب صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کہا ۔ لیکن میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ تو رونا بھی رہا ۔ نواب صاحب نے مجھے بتایا کہ جب سہروردی سے استعفا لیا گیا ۔ تو یہ رونے لگے ۔ میں نے کہا ۔ آپ تو بڑے مضبوط آدمی مشہور ہیں ۔ پرائم منسٹری یا چیف منسٹری تو آنی جانی چیز ہے ۔ سہروردی نے کہا ۔ میں اس لیے نہیں روتا کہ پرائم منسٹری جا رہی ہے ۔ میں اس لیے روتا ہوں کہ کشمیر ہمیشہ کے لیے گیا ۔

ڈاکٹر حسین کمشنر کے والد عباس علی نے اس بات کی تائید کی ۔ وہ اس طرح کہ وہ ایس ایس پی تھے کشمیر افیئرز میں بڑی دیر رہے تھے ۔ بڑے لائق آدمی تھے ۔ ان کی ریکمینڈیشن پر بھی وزارت امور کشمیر بدلتی رہی ہے ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سہروردی کشمیر پر حملہ کرنے کا پلان بنا رہے تھے کہ نکل گئے ۔ میں نے انہیں کہا عباس صاحب اب تو مارشل لا ہے ۔ ملٹری حکومت (ایوب خاں کی) آ گئی ہے ۔ یہ تو زیادہ اس پوزیشن میں ہو گی کہنے لگے اس قسم کے بے دھڑک اقدام سیاستدان ہی کر سکتا ہے ۔ فوج والے تو ٹیکنیکل لوگ ہوتے ہیں ۔ انہوں نے ماپنا ہوتا ہے ۔ دشمن سے اتنے گنا زیادہ طاقت ہو تو قدم اٹھانا چاہیئے ۔ اس لیے اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

س :۔ وہ اسی لیے روئے ۔

ج :۔ ان کی جو پلاننگ تھی ۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ ہو سکتا ہے ، بعد میں آنے والا ان خطوط پر کام نہ کرے سہروردی دلیر آدمی تھے ۔ اس وقت ہمارے پاس اس قسم کے آدمی تھے ۔ لائق بہت تھے ۔ بہت لائق آدمی تھے ۔

س :۔ ان کی موت میں کہتے ہیں ایوب خاں کا ہاتھ تھا ۔

ج :۔ میرا خیال ہے یہ بات غلط ہے ۔ ڈھاکہ سیشن ہو رہا تھا ۔ مسیح الرحمان تقریر کر رہا تھا ۔ ساتھ رو رہا تھا کہ حکومت نے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ انہیں ملک سے باہر جانا پڑا ۔ اس کو گورنمنٹ نے مروایا ہے ۔ مسیح الرحمٰن اس کی پارٹی میں تھا ۔ اس کا مداح تھا ۔ سہروردی مرحوم دلیر بہت تھے ۔

س :۔ ری پبلکن پارٹی کا ملک کی تعمیر یا بربادی میں کیا رول رہا!

ج :۔ کچھ بھی نہیں ۔ بربادی والی تو کوئی خاص بات نہیں تھی ۔ سوائے اس کے کہ جب صوبائی حکومت ڈولتی تو وہ اسمبلی حیران کن غلط انعامات دیتے تھے ۔ یہ ساری اسمبلیوں میں رہا ہے ۔

س :۔ مسلم لیگ کو تو نقصان پہنچا ۔

ج :۔ گروپ ہی اس قسم کے ہو گئے تھے ۔ جو اس میں گئے ۔ وہ ویسے ہی بیزار تھے ۔

س :۔ آپ گئے ۔

ج :۔ نہیں میں نہیں گیا ۔ ری پبلکن باہر تو کوئی پارٹی نہیں تھی ۔ اسمبلی میں ہی تھی ۔ جس طرح یونینسٹ تھی ۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس کا کوئی خاص فرق نہیں پڑا ۔

س :۔ ری پبلکن بھی سکندر مرزا کا ایک شو تھا۔ وہ سب کو نچاتے رہے۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ اور خود ایوب خاں کے ہاتھوں ناچ گئے۔

ج :۔ مارشل لاء لگنے کے بعد سکندر مرزا نے موسیٰ خاں سے کہا تھا کہ تیاری کریں اور ایوب کو ہٹائیں۔ اغلباً شیعہ کر کے اس نے موسیٰ خاں سے بات کی۔ لیکن موسیٰ خاں ایوب صاحب کا وفادار تھا۔ اس نے انہیں جا بتایا۔ ایوب خاں سے اس موضوع پر میری بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ سچوایشن یہ تھی کہ دو آدمی پستول لیے کھڑے ہیں۔ کون پہلے فائر کرتا ہے۔ میں نے پہلے فائر کر دیا۔

س :۔ ایوب خاں کی ہوسِ اقتدار ہمیں لے ڈوبی۔ ورنہ فروری ۵۹ء میں ۵۶ء کے آئین کے تحت الیکشن ہو رہے تھے۔

ج :۔ اس وقت دراصل سکندر مرزا وغیرہ نے مارشل لاء پلان کیا ہوا تھا۔ نواب قزلباش کی خاطر میں نے وزارت چھوڑی تھی۔ وہ بھی عزت کرتے تھے۔ اور کئی دفعہ بات کر جاتے تھے۔ پورا تو نہیں بتلاتے تھے۔ جب یہ مغربی پاکستان کے چیف منسٹر تھے تو ایک رات میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے یک لخت انہوں نے موضوع بدلا اور کہنے لگے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں کچھ ہونے والا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بہت بڑی بات ہوگی۔ لیکن وہ میں بتا نہیں سکتا کہ کیا ہوگا۔

دوسرا یہ ہوا کہ جرنشوا افضل وین ان کا ڈپٹی منسٹر تھا۔ کرسچین تھا۔ وہ سیالکوٹ گیا۔ تو ہیڈ ماسٹر نصیر کے ہاں ٹھہرا۔ نصیر صاحب بھی کرسچین تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہو گئے تھے۔ میں ان دنوں سیالکوٹ سے باہر تھا۔ واپس آیا تو نصیر نے مجھے بتایا۔ جرنشوا صاحب آئے ہوئے تھے۔ آپ کا بار بار پتہ کرتے رہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ آئیں گے۔ ورنہ میں نہ جاتا۔ میں نے پوچھا کیا باتیں کرتے رہے۔ نصیر نے بتایا۔ الیکشن کے انعقاد کے متعلق انہیں شک ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ انتخابی حلقے بن چکے ہیں۔ حکومت تیاریاں کر رہی ہے۔ اس قسم کے واقعات ہوتے رہے۔ نواب صاحب کی بات، جرنشوا کی بات، چونکہ ہم چاہتے تھے کہ الیکشن ہوں۔ اس لیے اُس طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا تھا۔

س :۔ اس سارے قصے کے باوجود آپ نے ایوب خاں کو جائن کر لیا۔

ج :۔ ۶۲ء کے الیکشن میں گوجرانوالہ میں چودھری جلیل اور انور بھنڈر ایک حلقے سے منتخب ہوئے تھے۔ جلیل قومی اسمبلی کے لیے ہوئے تھے۔ اور انور بھنڈر صوبائی اسمبلی کے لیے۔ انور بھنڈر کا بھائی چودھری اکرم میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ جو سیکرٹری فوڈ سے ریٹائر ہوا ہے۔ ان کے والد خان بہادر چودھری محمد حسین سے بھی ہمارے پرانے تعلقات تھے۔ چودھری سرفراز کے بھی ان کے ساتھ بڑے پُرانے تعلقات تھے۔ خان بہادر صاحب اور چودھری صاحب اسمبلی میں اکٹھے ممبر رہے تھے۔ ہمارے ایک دوست سردار عبدالحمید کے بھی خان بہادر صاحب کے بڑے کلوز تھے۔ یہ دونوں پیر بھائی تھے۔ سردار عبدالحمید کا گاؤں پتوکی کے پاس ہے۔ ان کے بزرگ رنجیت سنگھ کی رائل فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ سردار صاحب کا دادا مسلمان ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ ہم ایک ہی گروپ میں رہے۔ جلیل، انور بھنڈر، سردار عبدالحمید اور چودھری سرفراز، یہ سب مل کے میرے پاس سیالکوٹ آئے کہ صوبے میں ہمارا کوئی

منسٹر نہیں ہوا۔ نواب کالا باغ کے پاس جا کے انور بھنڈر کے متعلق کہا جائے کہ وہ اسے منسٹر لے لیں۔ ہم کالا باغ کے پاس چلے گئے۔ انور بھنڈر کو انہوں نے وزیر تو نہ لیا، بعد میں ویسٹ پاکستان اسمبلی کا سپیکر بنا دیا۔

نیشنل اسمبلی میں ریزولیوشن بلیٹ میں نکلنا تھا جو نکل آنا تھا۔ اس پر نان آفیشل بزنس ڈے پر بحث ہو جاتی تھی۔ نیشنل اسمبلی کا پہلا ہی سیشن تھا کہ مشرقی پاکستان کے تمام ممبرز نے ایک ہی ریزولیوشن دے دیا کہ اس میں سے کوئی تو نکلے گا۔ اس ریزولیوشن میں انہوں نے کہا کہ ہم ڈیفنس فورسز میں بھی پیریٹی (برابری) چاہتے ہیں۔ کیونکہ ڈیفنس فورسز پر بجٹ زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ یہ ہلا دینے والی بات تھی۔ اس پر انہوں نے تقریریں بھی تیار کی ہوئی تھیں ادھر سے کوئی ڈیفینڈ کرنے والا نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے اس سیشن میں پریذیڈنٹ گیلری میں کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ خاں اور جنرل برکی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈسکشن ہوتی جائے اور ان کی ہوائیاں اڑتی جائیں۔ گن کا تو یہ مقابلہ کر سکتے تھے۔ رائے عامہ کا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو انہوں نے تصور ہی نہیں کیا تھا کہ اس طرح اوپنلی تنقید ہو گی۔ بنگالیوں نے بڑی سخت تقریریں کیں۔

اس کے فوراً بعد حکومت نے سوچا کہ پارٹی ہونی چاہیئے۔ اسمبلی بغیر پارٹی کے ان کے وارے نہیں آئے گی۔ ہمارے پاس عبداللہ روکڑی اور مسعود صادق آئے کہ پارٹی جائن کرو۔ جلیل نے ناں کر دی اور سرفراز نے بھی ناں کر دی میرے ساتھ انہوں نے بات کی تو میں نے پوچھا۔ یہ بات کون کہتا ہے کہ ہم پارٹی جائن کر لیں۔ انہوں نے بتایا کہ نواب صاحب (کالا باغ) کہتے ہیں۔ وہ پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ میں نے جلیل اور سرفراز سے کہا کہ آپ سب مل کے میرے پاس آئے تھے۔ اور ہم سب گورنر کے پاس گئے تھے۔ اس نے ہماری بات مانی یا نہ مانی۔ بہر حال، ہم اس کے پاس امید لے کر گئے تھے۔ اُسے بھی تو حق حاصل ہے کہ ہمیں یہ بات کہے۔ اگر تو آپ بڑے خود دار ہیں آزادانہ فیصلہ لینا ہے۔ تو پھر اسے نہ ملیں اور نہ کبھی اپنی کوئی پرابلم بتانا۔ پچھلی ملاقات کی بھی معذرت کر دینا۔ اگر یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ آپ کو ویلکم کرے، پھر آپ کو اس کی بات سننا پڑے گی۔ کوئی ہرج نہیں چلیں اس کے ساتھ بات تو کریں۔ ہم گئے۔ پوچھا۔ نواب صاحب واقعی آپ نے پیغام بھیجا تھا۔ کہنے لگے۔ صدر صاحب ان پارٹیوں کے خلاف تھے۔ لیکن اب انہوں نے محسوس کیا ہے کہ انھیں خواہ ہم خیال لوگوں کا اجتماع کہہ لیں۔ انہیں پارٹی کہہ لیں۔ انہیں لوگ کہہ لیں۔ اس کے بغیر نہ اسمبلی چلتی ہے نہ گورنمنٹ۔ یہ صدر صاحب کی طرف سے تحریک ہے۔

اس طرح اسمبلی کے اندر گورنمنٹ پارٹی کی تشکیل ہوئی تھی۔

(س) اس کے بعد عہدیداروں کا چناؤ وغیرہ ہوا ہو گا۔

ج: منعم خاں مرکز میں منسٹر تھے۔ وہ گورنر ایسٹ پاکستان ہو چکے تھے۔ لیکن وہ کوٹھی انہوں نے ابھی نہیں چھوڑی تھی۔ اسمبلی کے اندر پارٹی بنانے کے سلسلے میں وہیں پہلی میٹنگ ہوئی۔ وہ ڈنر میٹنگ تھی محمد علی بوگرہ لیڈر منتخب ہو رہے تھے۔ سیکرٹری کے لیے میرا نام تجویز ہوا تھا۔ میرے مخالف چودھری ظہور الٰہی تھے نوجوان ممبر میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے ہی میرا نام تجویز کیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوششیں کی گئیں مجھے بھی قابو کرنے کی کوشش ہوئی۔ میں نے کہا، آپ میں کونسا "وادا" ہے۔ آپ تو اب ممبر ہو کے آئے ہیں۔ میں کئی ٹرم ہو چکا ہوں۔ آپ کوئی پڑھے لکھے بھی نہیں۔ یہ سارے نوجوان بیرسٹر ہیں۔ یہ آپ کو کیسے برداشت کریں گے۔ مسعود صادق تھے تو مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر، لیکن ان کی کوشش تھی کہ چودھری ظہور الٰہی سیکرٹری منتخب نہ ہوں۔ وہ چودھری صاحب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ادھر

چوہدری محمد حسین ان کے زخم خوردہ تھے۔ کیونکہ کالا باغ نے پر دگریسو پیپرز لمیٹڈ ان سے چھین کے چودھری ظہور الٰہی کو دلوا دیا تھا۔ لیکن چودھری محمد حسین اندر سے ڈرتے بھی تھے۔ انہوں نے ہی مجھے کہا۔ شاہ جی آپ کا نام تجویز ہوا ہے لیکن میں تو لاہور چلا ہوں۔ کیونکہ مجھ سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ دراصل چودھری ظہور الٰہی ان کے گلے پڑتا تھا۔ میں غالباً مسنز ڈیویز ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ملک قاسم اور چودھری ظہور الٰہی آ گئے۔ کہنے لگے۔ سیکرٹری شپ میں کیا رکھا ہے کیبنٹ بننے گی۔ اس میں تو سیع ہوگی۔ وزارت تو کوئی چیز ہے۔ میں نے کہا مجھے یہ سمجھائیں کہ مجھ میں کیا خامی ہے اور آپ میں کیا کوالیفکیشن ہے۔ پھر وہ مجھے عبدالغفور ہوتی کے پاس ہوٹل انٹر کانٹیننٹل میں لے گئے۔ وہ کہنے لگا بھائی فیصلہ ہو چکا ہے پریذیڈنٹ ہاؤس سے لسٹ آگئی ہے۔ میں نے کہا ہم آپ کی وجہ سے ممبر نہیں ہوئے۔ نہ پریذیڈنٹ صاحب نے ہمیں ممبر کرایا ہے۔ چونکہ ہم پریذیڈنٹ کے ساتھ وفادار ہیں۔ اگر وہ بلا کے حکم کر دیں تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کے کہنے سے تو ہم نہیں کریں گے۔ یہ سب پریشان کہ ہم نے تو سمجھا تھا کہ یہ کوئی شے ہی نہیں۔ ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ رات کو منعم خاں کے گھر ڈنر میٹنگ پہ گئے تو میں نے نور حیات نون اور حامد رضا گیلانی سے ذکر کیا کہ یہ اس طرح کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس ان پڑھ آدمی کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جا کے شور مچا دیا کہ سیکرٹری شاہ جی ہوں گے۔ پھر محمد علی بوگرہ نے مجھے کہا کہ ہم نے تو متفقہ بنایا تھا۔ یہاں مقابلہ ہونے لگا ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سیکرٹری شپ اتنی چیز نہیں ہوتی جبکہ ڈپٹی لیڈر کی ہاؤس میں ایک پوزیشن ہوتی ہے۔ آپ دونوں آپس میں ایڈجسٹ کر لیں۔ میں نے کہا۔ میں نے تو خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر چوہدری ظہور الٰہی متفقہ طور پر سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ اور میں ڈپٹی لیڈر منتخب ہو گیا۔ پنجاب سے میں تھا۔ سندھ سے بھٹو صاحب اور سرحد سے عبدالغفور ہوتی تھے۔

س :۔ اس طرح ایوب خاں کو منتخب اسمبلی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا۔

ج :۔ انہوں نے اسمبلی ممبران کو بڑا مقام دیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سے پہلے جو اسمبلیاں تھیں، انہیں کسی ہیڈ آف دی سٹیٹ نے وہ مقام نہیں دیا تھا۔ جس وقت ہم پہلے سیشن میں شرکت کے لیے راولپنڈی پہنچے۔ ہماری گاڑیوں سے مجسٹریٹوں نے سامان اتارا۔ پھر انہوں نے ہمیں اکاموڈیٹ کیا۔ ہوسٹل تو ابھی بنا نہیں تھا۔ منسٹر بھی ابھی اپوائنٹ نہیں ہوئے تھے۔ ان کی کوٹھیاں خالی تھیں۔ کیونکہ منسٹر بننے سے سیٹ چلی جاتی تھی۔ کوئی منسٹر بننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ انہوں نے چھ چھ، سات سات، آٹھ آٹھ ممبرز کو ان کوٹھیوں میں ٹھہرایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فسٹ کلاس سے لے کر درجہ دوم تک تمام ہوٹل ریزرو کرا لیے۔ ٹرانسپورٹ کا بندوبست کیا گیا۔ غیاث الدین کمشنر راولپنڈی تھے۔ چھٹی کے روز وہ اپنی ٹیم کے ساتھ جا کے وزٹ کرتے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ پہلے ۲۵ روپے ڈیلی الاؤنس تھا۔ پھر پچاس روپے کرایا۔ ہمارے اعزاز میں بڑے استقبالیے دیئے گئے جن میں حاضری بھی بہت تھی پہلے تو راولپنڈی کارپوریشن کی طرف سے بڑا اچھا فنکشن ہوا۔ اس میں فارن ڈپلومیٹ بھی تھے۔ اسی وقت علی اصغر شاہ وائس چیئرمین تھے۔ دوسرا فنکشن سہگلوں نے اپنے گیسٹ ہاؤس میں کیا۔ بڑا اوڈا فنکشن سی۔ راول ڈیم کا افتتاح ہوا نیشنل اسمبلی کے ممبران کے اعزاز میں فنکشن ہوا۔ وہاں گانے سننے کا پروگرام بھی تھا۔

س :۔ آپ نے کہا کہ ۶۲ء والی اسمبلی کے انتخابات کے بعد کوئی ممبر منسٹر بننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا

کیوں؟

ج: ۶۲ء کے آئین کی رو سے اگر اسمبلی ممبر منسٹر بن جائے تو وہ ممبر شپ سے محروم ہوجاتا تھا۔ اس لیے ممبر منسٹر نہیں بن رہے تھے۔ محمد علی بوگرہ کی گورنمنٹ سے انڈر سٹینڈنگ تھی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ تو نہیں مان رہے اس لیے آپ آئین میں ترمیم کردیں کہ اگر کسی اسمبلی ممبر کو وزیر بنایا جائے تو اس کی سیٹ ضائع نہیں جائے گی۔ پھر صبور خاں، منعم خاں اور فضل القادر چوہدری منسٹر ہوئے۔

دلچسپ قصہ یہ ہوا کہ بھٹو تو مارشل لاء کے بالکل آغاز سے ہی منسٹر چلا آرہا تھا۔ ۶۲ء کا الیکشن آیا، تو بھٹو شاید پریذیڈنٹ کو اپنی ہر دلعزیزی بتانے کے لیے ممبر بھی منتخب ہونا چاہتا تھا۔ قاضی فضل اللہ اور ایوب کھوڑو کا بھی وہی حلقہ تھا۔ اس نے ان کے ساتھ بات کی کہ آئین یہ ہے کہ جب کوئی ممبر وزیر بن جائے تو اس کی سیٹ خالی ہو جاتی ہے۔ میں منسٹر تو ہوں ہی۔ میرے ممبر منتخب ہونے سے میری ذرا گراؤنڈ بن جائے گی۔ یہ سیٹ خالی ہوجائے گی۔ اس وقت آپ اپنا آدمی کرالینا۔ کیونکہ قاضی فضل اللہ اور ایوب کھوڑو خود تو ایبڈو تھے۔ لیکن آئین میں پریذیڈنٹ کی اس ترمیم کے بعد کہ منسٹر کی سیٹ ضائع نہیں جائے گی بھٹو نے سیٹ نہ چھوڑی۔ کھوڑو صاحب پنڈی پہنچ گئے کہ آپ نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ اب ریزائن کریں۔ کھوڑو صاحب اسمبلی کی گیلری میں آکے بیٹھ جایا کریں۔ بھٹو نے کھوڑو صاحب کو ڈرایا کہ آپ ایبڈو ہیں۔ آپ تو عملی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔ آپ کو حکومت پکڑ لے گی۔ کھوڑو صاحب پھر وہاں سے چلے گئے۔

پھر یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے ڈھاکہ ہائی کورٹ میں رٹ کردی کہ آئین میں پریذیڈنٹ نہیں اسمبلی کی دو تہائی اکثریت ہی ترمیم کرسکتی ہے۔ ڈھاکہ ہائی کورٹ نے پریذیڈنٹ کی اس ترمیم کو غیر آئینی قرار دیدیا۔ گورنمنٹ نے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ وہاں بھی گورنمنٹ ہار گئی۔ پھر ان وزیروں کی سیٹیں خالی ہوگئیں۔

س: مسلم لیگ کو نقصان اسی وقت پہنچا جب ایوب خاں نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

ج: ہمیں بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ہم اخبار پڑھ کے چل پڑے کہ ہم نے گورنمنٹ پارٹی جائن کی ہے۔ ہمارے بغیر کیسے ہوگا۔ وزیر آباد ہم نے گاڑی تبدیل کی۔ صبح کا پہر تھا۔ اخبار دیکھی تو اس میں جو لسٹ تھی۔ اس میں اور ہی آدمیوں کے نام تھے۔ لیکن ہم تو ٹکٹ لے کے چل پڑے تھے۔ کراچی پہنچ گئے۔ وہاں کنونیشن میں بھی چلے گئے۔ سمندر کے کنارے کوئی جگہ تھی جہاں میٹنگ تھی۔ میں ذرا لیٹ تھا۔ میں گیا تو کرمانی نکل کے آرہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے۔ کہنے لگا۔ دیکھ لیں۔ اس کے گلے پر رگڑیں لگی ہوئی تھیں۔ کالر کھچے ہوئے تھے۔ دراصل اسے دولتانے نے وہاں شور و ورچانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے شور مچایا تو لوگوں نے اس کے ساتھ کھینچا تانی کی۔ خیر ہم گئے۔ وہاں تقریریں ہوتی رہیں، سارا کچھ ہوا، لیکن دل پسند بات کوئی نہیں تھی۔

س: مسلم لیگ کو سب سے زیادہ نقصان اس موقع پر پہنچا جب یہ دو ہوگئیں کونسل مسلم لیگ اور کنونیشن مسلم لیگ۔

ج: یقیناً ہوا۔

س: محمد علی بوگرہ کی اچانک وفات کے بعد بھٹو صاحب وزیر خارجہ ہوئے۔ بوگرہ مرحوم کی بجائے وہ چین گئے: اس زمانے میں یہ تاثر بڑا عام تھا کہ چین اور پاکستان کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھٹو صاحب

نے بڑا رول ادا کیا۔ اس وجہ سے بھی وہ امریکہ کی نظر میں کھٹکتے تھے۔

ج :۔ قومی اسمبلی میں چین بھارت جنگ پر بحث ہو رہی تھی۔ محمد علی بوگرہ لیڈر آف دی ہاؤس تھے۔ وزیر خارجہ بھی تھے۔ امریکی ان کے بارے میں بڑے حساس تھے۔ بلکہ وہ ہمیں بھی لابنگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے اسمبلی ممبران کے اعزاز میں مری میں فنکشن رکھا۔ ہمیں ہدایت آئی کہ وہ اٹنڈ نہیں کرنا اور انہیں یہ بھی نہیں کہنا کہ ہم نہیں آرہے۔ ہم اس فنکشن میں نہ گئے۔ اس کے بعد اسمبلی کے اختتامی اجلاس میں محمد علی بوگرہ نے اختتامی تقریر کی تھی۔ وہاں لابی میں امریکن بھی آ گئے۔ حالانکہ غیر ممبر وہاں نہیں آتے، لیکن وہ آ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ بوگرہ بڑی زوردار تقریر کریں گے۔ لیکن انہوں نے ایسی تقریر نہ کی تاہم امریکیوں کو وہ تقریر پسند نہ آئی۔ انہوں نے وہیں کھلے بندوں کہنا شروع کر دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ شخص اس قسم کی تقریر کرنے کے بعد چین جا سکے گا۔

He will not go to China our man Bhutto will go.

(یہ نہیں بلکہ ہمارا آدمی بھٹو چین جائے گا)

س :۔ آپ نے خود انہیں یہ کہتے سنا۔

ج :۔ جی ہاں۔ ہمارے ساتھ ہی تو باتیں کرتے تھے۔

س :۔ یہ کس لیول کے امریکی تھے۔

ج :۔ ان کے ڈپلومیٹک مشن کے آدمی تھے۔

س :۔ بات تو صحیح نکلی۔ بوگرہ کی جگہ بھٹو ہی گئے۔

ج :۔ جس روز راولپنڈی میں اسمبلی کا سیشن ختم ہوا ہے۔ اگلے روز بوگرہ نے ڈھاکہ جانا تھا۔ وہاں سے چین کے لیے روانگی کا پروگرام تھا۔ اللہ کو ہی منظور نہیں تھا کہ وہ چین جاتے۔ جہاز پر ہی انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ بیہوشی ہی میں تھے کہ انتقال کر گئے۔

س :۔ امریکنوں کو پتہ تھا کہ بوگرہ انتقال کر جائیں گے۔ اور پھر ان کی جگہ بھٹو جائیں گے۔

ج :۔ خدا جانے۔

س :۔ کہیں بوگرہ کی موت کا باعث امریکہ ہی نہ ہو۔

ج :۔ ممکن ہے۔ میں اس وقت جاگ رہا ہوں۔ اور بقائمی ہوش و حواس یہ فقرہ دہرا رہا ہوں۔ جو امریکیوں نے بوگرہ کے متعلق کہا تھا "وہ نہیں، ہمارا آدمی بھٹو چین جائے گا" اس وقت بھٹو ان کا آدمی تھا۔

س :۔ بوگرہ کی تقریر امریکہ کے خلاف تھی؟

ج :۔ خلاف بھی اتنی نہیں تھی۔ دراصل امریکی چاہتے تھے کہ چین کے خلاف انڈیا کو سپورٹ کیا جائے۔ اس وقت تو وہ چین کا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ اور بوگرہ چین جا رہے تھے۔ دوسرے ہی دن ہم نے پڑھ لیا کہ بوگرہ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور پھر انتقال کر گئے۔

س :۔ اُس طرح تو لیاقت علی خاں کے قتل کو بھی انٹرنیشنل سازش کہا جاتا ہے۔

ج :۔ انٹرنیشنل کا تو پتہ نہیں ، لیکن سازش ضرور ہے۔ میں ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ میرے ایک ماموں آرمی میں تھے ہم دونوں کی عمر میں اتنا فرق نہیں جب کراچی دارالحکومت تھا تو وہ وہاں بیس کمانڈر تھے۔ اس کی ایک گارد غلام محمد کی قبر پر پہرہ دیتی تھی۔ میں کراچی گیا تو دیکھا کہ وہ چیک کرنے بھی جاتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ اس کی قبر پر گارد کیوں لگا رکھی ہے۔ کہنے لگے۔ کراچی کے لوگ اس کی قبر اکھاڑنے آگئے تھے۔ کہ یہ لیاقت علی کا قاتل ہے۔ پولیس سے کنٹرول نہ ہوا تو یہاں آرمی گارد لگادی گئی۔

س :۔ ایوب خاں کے دور میں بظاہر محسوس یہ ہوتا تھا کہ روس کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے نہیں تو نارمل ہو رہے ہیں۔

ج :۔ روس کی دعوت پر ایک پارلیمنٹری ڈیلیگیشن وہاں گیا۔ اس میں میں بھی تھا، فضل القادر چودھری ڈیلیگیشن کے لیڈر تھے۔ وہاں پاکستانی سفیر اطہر اقبال ہمارے استقبال کے لیے موجود نہیں تھا۔ اس نے کوئی بہانہ کر دیا تھا۔ لیکن روسی گورنمنٹ نے ہماری بہت آؤبھگت کی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ عوام کے نمائندے ہیں۔

س :۔ یہ تو آپ کوئی بیس برس پرانی بات کر رہے ہیں۔ اس وقت معلوم نہیں کیا پوزیشن تھی جبکہ آج پورا مغرب یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ روس کو وہاں کے مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ اس وقت آپ کو ایسی چیزیں نظارہ کرنے کا موقعہ ملا جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہاں کے مسلمانوں میں اسلامی سپرٹ ابھی تک موجود ہے۔

ج :۔ اس خطرے کے پیش نظر روسیوں نے انہیں دبایا ہوا تھا۔ سمرقند و بخارا وہ علاقے ہیں جو کبھی دنیا کی سب سے بڑی تہذیب تھی۔ روحانی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز تھی۔ اب تو انہیں دوسرے درجے کا شہری بھی نہیں کہنا چاہیے۔ تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہاں ردعمل ہوگا۔

س :۔ مسلمانوں میں اسلامی جذبہ آپ نے دیکھا؟ یہ بتائیں۔

ج :۔ وہاں مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ مذہب پر عمل کرنے کی اجازت تھی۔ مثلاً آپ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے منع کرنے کے باوجود فضل القادر چودھری مسجدوں میں چلے جاتے تھے۔

س :۔ روسی حکام آپ کو مسجدوں میں جانے سے روکتے تھے۔

ج :۔ منع کرنے کا مقصد یہ ہے ٹالنے کی کوشش کرتے تھے۔ سمرقند سے تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر امام بخاریؒ کی قبر ہے۔ ہم وہاں گئے تو موٹریں دیکھ کے پیچھے آگئے۔ وہ سب سفید روسی تھے۔ وہاں ایک مسجد تھی۔ جو تقریباً کھنڈر ہی تھی۔ وہاں انہوں نے ایک داڑھی والا آدمی بٹھا دیا ہوا تھا۔ کہ یہ مولوی ہے۔ ہمارے لیے چائے شائے بنائی گئی۔ ہماری وجہ سے امام بخاریؒ کی قبر پر تازہ تازہ سفیدی کی گئی تھی۔ قبر پکی تھی، قبہ کوئی نہیں۔ تعویز لگا تھا۔ وہ بھی نیا تھا۔ ایوب خاں کے داماد اورنگ زیب کے پاس بہت معلومات تھی۔ اس نے دنیا پھری تھی۔ ہم نے تو وہ تعویز پڑھ لیا تھا۔ اورنگ زیب نے انہیں چیک کرنے کے لیے مولوی صاحب سے کہا۔ یہ تعویز پڑھیں۔ ان مولوی صاحب سے وہ تعویز نہیں پڑھا گیا۔ فارسی رسم الخط میں تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ محمد بن اسمٰعیل بخاری، تاریخ وفات بھی لکھی تھی۔

سمرقند میں ہی ہم امیر تیمور کا مقبرہ بھی دیکھنے گئے۔ اورنگ زیب نے بتایا شاہ جی، یہ بڑے لوگوں کی قبریں کھودتے تھے۔ ان کی ہڈیاں ترتیب دیکر دیکھتے تھے کہ ان کی شکلیں کیسی ہوں گی، پھر یہ آرٹسٹ سے تصویر

بتواتے تھے۔

امیر تیمور کی قبر پر لکھا تھا۔ جو مجھے ڈسٹرب کرے گا۔ وہ چین سے نہیں بیٹھ سکے گا۔ دوسری جنگِ عظیم لگی تھی، جب روسیوں نے امیر تیمور کی قبر کھودی۔ اس کے ایک دو روز بعد جرمنی نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے پھر بند کر دی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں نے گائیڈ سے پوچھا، کیا یہ بات صحیح ہے۔ اس نے کہا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ اس نے انکار نہیں کیا، نہ تائید کی۔

ہم تاشقند میں نماز پڑھنے کے لیے گئے۔ وہ غالباً مسلمانوں کا ہی محلہ تھا جہاں وہ قرآن رکھا ہوا تھا جو حضرت عثمان رضؓ شہادت کے وقت تلاوت کر رہے تھے۔ اس پر خون کے دھبے بھی تھے۔ جب ایوب صاحب وہاں گئے تھے تو انہوں نے اس کی ایک فوٹوسٹیٹ انہیں دی تھی۔ وہاں ایک میوزیم سا بنا رکھا تھا۔ اس میں پرانے کتابی نسخے رکھے ہوئے ہیں، وہیں وہ قرآن رکھا ہوا ہے۔ ہم نماز پڑھنے گئے تو نماز میں شامل ہونے والوں میں کوئی نوجوان نہیں تھا۔ پچاس پچاس سال کی عمر کے لوگ تھے حتیٰ کہ اس مسجد کے خطیب مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کے لڑکے بھی نماز میں شامل نہیں ہوئے۔ سامنے ایک مسجد تھی۔ جہاں انہوں نے ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہاں وہ ہمیں سَروْ کرنے کے لیے موجود تھے لیکن انہوں نے نماز میں شمولیت نہیں کی۔

جب ہم بخارا گئے تو وہاں انہوں نے نوجوان لائن میں کھڑے کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ سروں پر بخارا والی ٹوپیاں تھیں۔ اورنگ زیب نے انہیں کہا۔ سورۂ فاتحہ سنائیں۔ تو وہ ہٹر بٹر دیکھنے لگے، انہیں الحمد نہیں آتی تھی۔

ہم آذربائیجان کے دارالحکومت باکو گئے۔ وہاں کے پریذیڈنٹ کا نام سکندروف تھا۔ وہاں ڈنر تھا اور کلچرل شو بھی۔ چار چار افراد کے لیے ایک میز تھی۔ ہر میز پر دو ہمارے آدمی اور دو ان کی اہم شخصیتیں بیٹھیں۔ میں اور اورنگ زیب ایک میز پر تھے۔ ہمارے ساتھ بھی دو ان کے آدمی تھے۔ اورنگ زیب کہتا ہے۔ شاہ جی شیعوں کے بارہ اماموں کے نام کیا تھے۔ میں نے نام بتانا شروع کر دیئے۔ ان دونوں روسیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ایک مجھ سے پوچھتا ہے "شیعہ"؟ میں نے کہا۔ "ہاں شیعہ"! کہنے لگا۔ "میں بھی شیعہ ہوں۔ ہمارے پریذیڈنٹ سکندروف بھی شیعہ ہیں"۔ دراصل باکو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ آذربائیجان کچھ صدیاں پہلے ایران کے ساتھ تھا۔

اگلی صبح ہم وہاں کے اہم مقامات دیکھنے کے لیے گئے۔ پریذیڈنٹ کا قریبی سیکرٹری ہماری موٹر میں بیٹھا۔ زبان کی مشکل تو تھی۔ اس کے ساتھ پھر اشاروں سے باتیں ہوتی رہیں۔ علی اصغر شاہ بھی شیعہ تھے۔ اکرم بوس کی زیادہ تر فیملی شیعہ ہے۔ وہ پھر اشاروں سے اس سے پوچھتے رہے کہ محرم ہوتا ہے؟ آپ ماتم بھی کرتے ہیں؟ اس نے بتایا کہ گھروں کے اندر ہی کر لیتے ہیں۔

س :۔ اور دسویں محرم کا جلوس؟

ج :۔ یہ ہم نے ان سے نہیں پوچھا کہ جلوس نکالتے ہو کہ نہیں۔ بہرحال، آذربائیجان میں شاید سارے شیعہ ہی ہیں۔ اگر سارے نہیں تو ان کی غالب اکثریت شیعہ ہے۔ یہ جھلکیاں ہیں جو کچھ ہم نے وہاں دیکھا۔

س :۔ جس زمانے کی آپ یہ جھلکیاں سنا رہے ہیں۔ تقریباً اسی زمانے میں یونیورسٹی میں ہمیں بتایا جاتا تھا کہ روس میں نجی ملکیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔

ج :- جب ہم گئے ہیں تو ہر شخص وہاں پراپرٹی نہیں رکھ سکتا تھا۔ رہنے کے لیے مکان وہ افرادِ خاندان کی تعداد کے مطابق دیتے تھے۔ وہاں بڑے بڑے زرعی فارم ہیں۔ جتنے بھی افسر انہیں کنٹرول کرنے پر مامور ہیں۔ وہ سفید روسی ہیں۔ مسلمان علاقوں مثلاً تاشقند وغیرہ میں فیکٹریاں بھی سفید روسی کنٹرول کرتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں انگریز ہوتے تھے۔ چھوٹی ملازمتیں ہمارے پاس بڑے عہدے ان کے پاس۔

انہوں نے یالٹا میں ہمارے لیے ایک کلچرل سا فنکشن ہولڈ کیا۔ اس میں ایک ڈانس بھی تھا۔ رقاصہ عورتوں نے جو لباس پہن رکھے تھے۔ وہ اتنے باریک تھے کہ ان کی چھاتیاں نظر آرہی تھیں۔ اورنگ زیب انہیں چھیڑتے کہ آپ تو اس معاملے میں امریکہ والوں کے نزدیک تر پہنچ رہے ہیں۔ انہی کی کاپی کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح کے چٹکلے کرتا رہتا تھا۔

س :- وہاں دو چیزیں تھیں جن کے خلاف انقلاب آیا تھا۔ ایک مذہب دوسرے جاگیرداری نظام کی سیاسی قوت جو اس وقت اپنی بدترین صورت میں وہاں موجود تھی۔ آپ نے اس دورے کے دوران میں اس حوالے سے روسی معاشرے کو سٹڈی کیا۔

ج :- ہم نے وہاں سارا کچھ ہی دیکھ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں وہاں انقلاب آیا تھا۔ ہم ۶۴ء میں وہاں گئے۔ اس وقت تک فصل پک چکی تھی۔ اور اتنے عرصے میں کمیونزم یا سوشلزم کے نتائج برآمد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس وقت اس کے فوائد و نقصانات سامنے آگئے تھے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ان کے حالات ہی اس قسم کے تھے۔ ممکن ہے ان کا یہی حل ہو۔ لیکن آپ اسے دوسرے ملکوں میں منتقل نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہر پودا ہر آب و ہوا میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح پولیٹیکل سسٹم ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ وہاں کمیونزم انقلاب دو چیزوں کے خلاف آیا تھا۔ ایک مذہب تھا ماسکو میں جو گرجے ہیں۔ دنیا میں ایسے گرجے کہیں نہیں ملیں گے۔ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ حکمران اپنی بادشاہت برقرار رکھنے کے لیے مذہب کو ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ اس لیے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے فیوڈلزم (جاگیرداری) کی سیاسی قوت اپنی بدترین صورت میں وہاں موجود تھی۔ فیوڈلزم کس قسم کا تھا، یہ ہمیں وزیراعظم خروشیف نے بتایا، کہنے لگے۔ میرا دادا کسی کا مزارع تھا۔ میرا باپ کان میں کام کرتا تھا۔ میں جب تین جماعتیں پڑھ چکا تو مجھے بھی انہوں نے کام کرنے کے لیے کان میں بھیج دیا۔ ملک کا قانون یہ تھا کہ ہمارے دادا کی فیملی اس زمیندار کی ملکیت تھی، جس طرح وہ گائیں بھینسیں اس کی ملکیت تھیں وہ انہیں رکھ سکتا تھا، بیچ سکتا تھا۔ اسی طرح وہ زمیندار قانوناً ہماری فیملی کے افراد کو رکھ سکتا تھا، بیچ سکتا تھا، ہمیں ہلاک کر سکتا تھا۔ جو مرضی وہ ہمارے ساتھ کرے۔ یہ ملک کا قانون تھا۔ یہ میری تعلیم ہے اور اب یہ میری کیفیت ہے۔ پھر اس نے اشارہ بھی دے دیا، "یہ نہیں کہ میں وزیراعظم ہو گیا ہوں۔ اور میں نے یہاں اینٹ لگالی ہے۔ دوسروں کو بھی آنا چاہیے۔" اسے تو پتہ ہی ہوگا کہ وہ جا رہا ہے۔ کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ چلا گیا۔

س :- آپ فخر کر رہے تھے کہ روسی حکومت نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی، لیکن ۔۔۔۔

ج :- ہم سترہ دن وہاں رہے۔ جہاز پر سے اترنے سے لے کر واپسی تک کی انہوں نے ہماری فلم بنائی۔ جہاں بھی ہم جاتے تھے۔ فلم بنانے والی ٹیم ساتھ جاتی تھی۔ ایک ایک قدم اور ایک ایک موقعہ کو انہوں نے فلمایا۔ وہ فلم ہم نے جی ایچ کیو ہال میں دیکھی۔ ہمارے بعد ایوب صاحب دو مرتبہ روس گئے۔ اورنگ زیب بھی ان

کے ساتھ گیا۔ واپس پہنچ کر وہ خاص طور پر میرے پاس آیا۔ یہ بتلانے کے لیے "شاہ جی، جو انہوں نے ہمیں عزت دی تھی، وہ پریذیڈنٹ کو بھی نہیں ملی"

س :۔ لیکن ماسکو میں پاکستانی سفیر آپ کے استقبال کو نہ پہنچا۔

ج :۔ ہاں۔ اس نے کوئی بہانہ کر دیا۔

س :۔ کوئی خاص وجہ تھی۔

ج :۔ فضل الٰہی درچودھری کی بھٹو صاحب سے لگتی تھی۔ بھٹو صاحب فارن منسٹر تھے۔ اس لیے۔

س :۔ ایک زمانے میں تو ان میں بڑی گہری چھنتی تھی۔

ج : بھٹو، فضل الٰہی درچودھری سے کالاباغ کے خلاف کام لیتا رہا۔ کیونکہ کالاباغ بھٹو کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ کسی بھی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا تھا جو پریذیڈنٹ کے قریب ہو۔ ایسے شخص کو وہ اپنی سوکن سمجھتا تھا۔ بھٹو صاحب بھی پریذیڈنٹ کے بہت قریب تھے۔ اس لیے کالاباغ انہیں ناپسند کرتا تھا۔ ایک نیشنل اکنامک کونسل تھی۔ دونوں گورنر بھی اس کے ممبر تھے۔ کچھ وزیر بھی تھے۔ فضل الٰہی درچودھری کے پاس ان دنوں زراعت کا محکمہ تھا۔ یہاں تو بھٹو گورنر کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ اکنامک کونسل میں وہ فضل الٰہی درچودھری سے یہ کہتا تھا کہ کالاباغ دے گل پے۔ چودھری صاحب میں یہ بات تو تھی۔ وہ کالاباغ کے گلے پڑ جاتے تھے۔ کالاباغ ان کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتا تھا۔ اس طرح بھٹو کالاباغ کی بے عزتی فضل الٰہی درچودھری سے کروایا کرتا تھا۔

س : بھٹو صاحب کا پھر چوہدری صاحب سے اختلاف کیسے ہوا؟

ج :۔ محمد علی بوگرہ اسمبلی میں لیڈر آف دی ہاؤس (قائد ایوان) تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ نئے لیڈر کا چناؤ ہونا تھا۔ اگلا سیشن ڈھاکہ میں ہوا۔ البتہ پاکستان میں نیشنل اسمبلی کا یہ پہلا اجلاس تھا۔ اس سے پہلے وہاں تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ہمیں لکھ بھیجا کہ کہاں کہاں ٹھہرنا پسند کرو گے۔ ہوٹل تو وہاں ایک ہی کام کا تھا۔ شاہ باغ۔ ہم نے لکھ بھیجا۔ جس وقت ہم ڈھاکہ ائیرپورٹ پر اترے۔ رانا عبدالحمید منسٹر تھے۔ وہ ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ٹرانسپورٹ وغیرہ آئی ہوئی ہے۔ آپ کے لیے ہوٹل میں نہیں، الگ انتظام ہو گیا ہے۔ انہوں نے وہاں ۳۵ دن میں ایک ریسٹ ہاؤس تعمیر کیا تھا۔ اس میں ۲۵ سوئٹ تھے۔ سارے پنجابیوں کو انہوں نے وہاں ٹھہرایا۔ ان میں نواب بہاولپور بھی تھا۔ محمد عباس عباسی، جو آج کل مذہبی امور کا منسٹر ہے۔ ایک روز ایک کرنل ہمیں ملنے کے لیے آگیا۔ اس کا باپ کبھی سیالکوٹ میں افسر مال رہا تھا۔ اس کے چودھری سرفراز کے ساتھ زیادہ تعلقات تھے۔ میرے ساتھ صرف واقفیت تھی۔ وہ کہنے لگا۔ آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ میں نے کہا ہم نے سنا تھا۔ کہ آپ کی پوسٹنگ ڈھاکہ چھاؤنی میں نہیں، کسی اور چھاؤنی میں ہے۔ کہنے لگا بس ہم یہیں کیمپ میں ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ وہ کھانا کیا تھا۔ بہت بڑا فنکشن تھا۔ خٹک ڈانس، دوسرے ڈانس، بڑا اعلیٰ گلا۔ بہت بڑا سلسلہ۔ ادھر سے تو ہم تین چار ہی تھے۔ جن کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔ بعد میں بھی وہ ہمیں ملتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ آپ یہاں کیمپ میں ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہم آپ کے لیے آئے ہیں۔ گورنر (مشرقی پاکستان) نے حکومت سے کہا تھا۔

I can't take the responsibility of Panjabis. (میں پنجابیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا)

اسی واسطے آپ کے لیے یہ ریسٹ ہاؤس تعمیر ہوا۔ اور ہم آپ کی حفاظت کے لیے یہاں کیمپ لگائے ہوئے ہیں۔

س :۔ یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ اس وقت ایسٹ پاکستان میں یہ صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی کہ سول ایڈمنسٹریشن کی بجائے آپ لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری ملٹری کو سونپی گئی؟

ج :۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ اسمبلی کی کبھی اس قدر عزت نہیں ہوئی تھی، جتنی کہ ایوب خاں نے راولپنڈی میں کی تھی۔ جس کا میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔ اور اس میں ایسٹ پاکستانیوں کی اتنی اہمیت تھی، جس کا کوئی حساب ہی نہیں۔ اچھا تو جب ہم ڈھاکہ سیشن میں گئے ہیں، تو لال میاں اور دوسرے تیسرے جو پرانے پولیٹیکل ورکر تھے۔ انہوں نے بھی اتنے ہی فنکشن کیے۔

س :۔ میں نے بھٹو فضل القادر اختلافات کا پوچھا تھا؟

ج :۔ پارلیمنٹ کے اندر پارٹی (کنونیشن مسلم لیگ) کی یہ ایگزیکٹو تھی چیف وہپ، سیکرٹری، لیڈر آف دی ہاؤس اور تین ڈپٹی لیڈر۔ لیڈر آف دی ہاؤس میں نے بتایا کہ محمد علی بوگرہ انتقال کر گئے تھے۔ ان کی جگہ نیا لیڈر چننا تھا۔ تو فضل القادر چودھری کنویسنگ کے لیے ریسٹ ہاؤس میں آ گئے جہاں سارے پنجابی ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے اس روز بخار تھا۔ یہ سارے ڈرائنگ روم سا جو تھا۔ اس میں اکٹھے ہو گئے، وہ سارے میرے پاس آ گئے کہ چودھری صاحب ووٹ کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا، نوازش آپ نے پوچھ لیا۔ کہنے لگے۔ نہیں آپ ہمارے لیڈر ہوئے، آپ کے بغیر ہم نہیں چل سکتے۔ میں اسمبلی میں پنجاب کی طرف سے ڈپٹی لیڈر رہا تھا۔ میں نے کہا آپ جو فیصلہ کریں، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ کہنے لگے۔ ہم نے یہی طے کیا ہے کہ چودھری صاحب کو ووٹ دیں۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ کہنے لگے۔ پھر آپ پریذیڈنٹ صاحب کو جا کر کہیں کہ وہ پارٹی الیکشن میں دخل نہ دیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں نے کہا۔ اس وقت مجھے بخار ہے۔ کہنے لگے۔ بہرحال ہمارا پیغام آپ ہی نے جا کر دینا ہے۔ میں اٹھا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ ٹیلی فون کیا۔ جنرل رفیع پریذیڈنٹ کے پولیٹیکل اسسٹنٹ تھے۔ وہ آل ان آل تھے۔ وہ پریذیڈنٹ ہاؤس میں ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں گیا۔ میں نے پریذیڈنٹ کو بتایا کہ ان ممبرز نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہنے لگے۔ ٹھیک ہے میں دخل نہیں دیتا۔

اتفاق سے حروف ابجد کے حساب سے اسمبلی میں میں اور کالا باغ کا لڑکا ملک مظفر اکٹھے بیٹھتے تھے۔ پھر جب میں ڈپٹی لیڈر ہو گیا تو پارٹی کی ایگزیکٹو میں آ گیا۔ اور ایگزیکٹو والے وزیروں سے بھی سینئر بیٹھتے تھے۔ نواب کالا باغ صاحب کے ساتھ ہمارے تعلقات ٹھیک تھے۔ ہم نے ایک دفعہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے ساتھ ہر وقت تو رابطہ نہیں ہو سکتا۔ جب ایسی صورت ہو کہ آپ کا کیا پروگرام ہے تو کس سے پوچھا کریں۔ انہوں نے کہا مظفر سے پوچھ لیا کرو۔ تو فضل القادر صاحب کے معاملہ میں میں نے مظفر سے پوچھ لیا تھا۔ لیکن بعد میں مظفر کا ٹیلی فون آیا۔ ٹھہرے تو وہ بھی وہیں تھے۔ لیکن ٹیلی فون پر بات کرنے لگے۔ "شاہ جی رات والد صاحب نے کہلا بھیجا ہے کہ فضل القادر نیشنل اکنامک کونسل میں میری بڑی بے عزتی کرتا ہے۔ اس سے میں بڑی نفرت کرتا ہوں۔ اسے پنجابیوں کے ووٹوں کے ساتھ تو نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے مظفر سے کہا، میں نے آپ سے پوچھ لیا تھا۔ آپ نے کہا تھا۔ کوئی بات نہیں، آپ اپنی مرضی کریں۔ بتائیں آپ نے مجھے اس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ شاہ جی اپنی مرضی کریں۔ کہنے لگا۔ اُس وقت تک کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "زندگی میں کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہم پولیٹیکل ورکر ہیں۔ ہمارا اور طریقہ ہوتا ہے۔ پالیٹکس چھوڑ دینا دوسری بات ہے"۔ میں نے کہا، "میرے اس میں جذبات بھی ہیں۔ اس کا مذہبی پہلو بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی معاملات میں

وعدہ خلافی کر کے ساری قوم کو قتل کرنے والی بات ہے۔ میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ ووٹ کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔ ووٹوں کے ذریعے ہی پاکستان بنا تھا۔ ووٹوں کے ذریعے ہی حکومتیں بنتی بگڑتی ہیں۔ سارے پنجابی ممبرز مل کے آئے تھے۔ سب کا فیصلہ تھا۔ اور آپ سے میں نے پوچھ لیا تھا۔ ورنہ فضل القادر سے میرا کوئی تعلق نہیں بنتا۔ وہ ایسٹ پاکستان کے بھی اُس گوشے (چٹاگانگ) میں رہتا ہے۔ برما کے نزدیک، سارا ہندوستان گزر کے، پھر سارا ایسٹ پاکستان گذر جائیں تو چٹاگانگ پہنچتے ہیں۔ گورنر صاحب (کالا باغ) ویسے بھی ہمارے لیڈر ہیں۔ ہم اُن سے ہدایات وصول بھی کرتے ہیں، سارا کچھ کرتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ میں نے آپ سے پوچھ لیا تھا۔ کہنے لگا، نہیں انہوں نے حکم دیا ہے۔ میں نے کہا میری طرف سے انہیں معذرت کر دینا کہ اس بار تو مجھے معافی دیں۔

پھر نواب صاحب کے جو بڑے پروردہ تھے۔ مجھے کہنے لگے۔ آپ نواب صاحب سے خود بات کر لیں۔ میں نے کہا: میں نواب فضل القادر کو ہی ووٹ دوں گا۔

اُدھر بھٹو صاحب نے فضل القادر کی مخالفت کی اور صبور خاں کا ساتھ دیا۔ کیونکہ دونوں ہم پیالہ، ہم نوالہ تھے۔ فضل القادر شرابی نہیں تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا۔ سیاسی طور پر کریکٹر بڑا اچھا تھا۔ مذہبی آدمی تھا۔ بہرحال یہ سلسلہ بن گیا۔

پارٹی میٹنگ ہوئی۔ پارٹی میٹنگ کو پریذائڈ کرنا ہوتا تھا۔ فضل القادر چودہری نے مجھے کہا کہ شاہ جی آپ پریذائیڈ کریں۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ بھٹو کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس میٹنگ میں ہم نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وزراء ووٹ دے سکتے ہیں کہ نہیں۔ کیونکہ وزیر اسمبلی کے ممبر نہیں تھے۔ لیکن بھٹو صاحب نے رولنگ دے دی کہ وزیر ووٹ دے سکتے ہیں۔ یہ حکومت نے طے کر لیا ہوا تھا کہ فضل القادر کو ووٹ نہیں دینا۔ وزیروں کے ووٹ بھی خلاف گئے۔ قبائلی علاقوں کے ممبرز، بھٹو صاحب کے سندھی ممبرز اور بھی مغربی پاکستان سے ممبرز تھے۔ جو چودھری صاحب کے خلاف گئے۔ پھر بھی ایک دو ووٹوں کا فرق پڑا۔ صبور خاں الیکٹ ہو گئے۔ فضل القادر ہار گئے۔ پھر تو بھٹو اس کا اتنا دشمن ہوا کہ جس کا حساب ہی نہیں۔ آخری دم تک ایک دوسرے کو بے عزت بھی کرتے تھے۔ بھٹو بھی اسے بڑا بے عزت کرتا تھا۔ ہاؤس میں غلط رویہ بھی اپناتا تھا۔

س: پریذیڈنٹ ایوب نے بھی اس الیکشن میں مداخلت کی۔

ج: کی۔

س: اس یقین دہانی کے باوجود کہ وہ اس پارٹی الیکشن میں مداخلت نہیں کریں گے۔

ج: اور یہیں سے ان کا اور فضل القادر کا کلیش شروع ہوا۔

س: اگر یہ بات تھی تو پھر اس کے بعد چودھری صاحب قومی اسمبلی کے سپیکر کس طرح منتخب ہو گئے۔

ج: چودہری صاحب وزیر تو چلے آ رہے تھے۔ ان کی جو سیٹ خالی ہوئی تھی۔ اس پر ابھی ضمنی انتخاب نہیں ہوئے تھے۔ لیڈر آف دی ہاؤس کے الیکشن میں ہم کلوز ہو گئے تھے۔ بہت ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں تو گورنمنٹ کا ملازم ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں پبلک کا آدمی ہوں۔ لیکن ممبری رہی نہیں۔ مولوی تمیز الدین خاں سپیکر نیشنل اسمبلی تھے۔ وہ فوت ہو گئے۔ تو ہم راولپنڈی میں چودھری صاحب کے ہاں افسوس کے لیے اکٹھے ہوئے۔ میں نے کہا، سپیکر کی سنیئر پوسٹ ہے۔ آپ کا ضمنی الیکشن ابھی ہونے والا ہے۔ آپ الیکشن کیوں نہیں لڑتے۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ جب ہم اُٹھنے لگے تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگے۔ مجھے ظہیرالدین لال میاں کے گھر چھوڑ دیں۔ میں انہیں ویسپر جیں لال میاں کے گھر چھوڑ کے واپس آگیا۔ یہ امیدوار بن گئے۔ پریذیڈنٹ کا خیال تھا کہ یہ دھوبیا آدمی ہے، ہاؤس کو کیا کنٹرول کرے گا۔ تمیز الدین خاں کی تو بڑی عزت تھی۔ وہ تگڑا آدمی تھا۔ بہرحال چودھری صاحب اپنی ہی سیٹ سے دوبارہ الیکٹ ہو گئے۔

س :۔ گورنمنٹ نے کوئی مداخلت نہیں کی؟

ج :۔ گورنمنٹ نے مداخلت نہیں کی، بلکہ گورنمنٹ تو اب انہیں چاہتی تھی۔ یہ دوبارہ ان کے پروگرام میں فٹ ان، ہو گئے تھے۔ گورنمنٹ انہیں لیڈر آف دی ہاؤس نہیں چاہتی تھی کیونکہ مشکل آدمی تھے۔ چنانچہ یہ سپیکر ہو گئے۔

س :۔ کہتے ہیں کہ اپنی سپیکرشپ کے دوران میں صدر کی غیر موجودگی میں یہ قائمقام صدر بنے تو انہوں نے پوری طرح صدارت کی۔

ج :۔ پریذیڈنٹ باہر گئے تو انہوں نے پوری صدارت کی۔ جب مولوی تمیز الدین خاں ایکٹنگ پریذیڈنٹ (قائمقام صدر) ہوتے تھے۔ وہ چونکہ رحمدل آدمی تھے۔ انہوں نے سزائے موت کی رحم کی اپیلیں منظور کر لیں۔ بلکہ سیکرٹریٹ والے، سیکرٹری وغیرہ نے جنہیں سپرڈ ماٹر کرنا ہوتا تھا۔ ان کی اپیلیں اس طرح بھیج کر دیتے تھے۔

جب فضل القادر ایکٹنگ پریذیڈنٹ ہوتے تھے تو پہلے وہ گورنمنٹ ہاؤس میں شفٹ ہوئے۔ پھر باقاعدہ کیبنٹ میٹنگ بلائی۔ شائد بھٹو کی تذلیل کرنے کے لیے کہ آپ مجھ سے جونیئر ہیں۔ ہمیں انہوں نے انٹرویو کے لیے بھی بلایا۔ ہمیں جو ان کا قریبی حلقہ تھا، ڈنرز پر بھی بلاتے رہے۔ انہوں نے صدر کی ساری شرطیں پوری کیں۔ ایسٹ پاکستان گئے۔ تو باپ کی قبر پر بھی گئے۔ اور ایوب خاں کو یہ بھی رپورٹ ہوئی کہ یہ باپ کی قبر پر جا کر روتا رہا ہے کہ "ابا دیکھو میں کیا ہو گیا ہوں"۔ ان کا والد پولیس انسپکٹر تھا۔

س :۔ انہوں نے یہ بات کہی۔

ج :۔ کہا بھی ہو گا۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پاکستان کا ہیڈ ہوں گا۔

س :۔ سنا ہے اس دوران میں بیورو کریسی کو بھی جھاڑتے رہے۔

ج :۔ وہ تو ہمیشہ جھاڑتے تھے۔

س :۔ نظام سقے کی طرح پورا سکہ چلایا۔

ج :۔ بالکل چلایا، بلکہ پریذیڈنٹ واپس آنے والے تھے تو ایک دو دن پہلے انہوں نے پانچ چھ آدمیوں کو ڈنر پر بلایا۔ میں تھا حامد رضا گیلانی تھے۔ ان کے ساتھ بھی ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ کہنے لگے۔ آپ کو زحمت دی کہ بیٹھ کے گپ شپ لگائیں۔ کل یہ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔

پریذیڈنٹ واپس آئے تو بھٹو وغیرہ نے ان کے کان بھرنا شروع کر دیئے کہ اگر کوئی شخص آپ کو کرسی سے اتارے گا، تو وہ یہی فضل القادر ہے۔

س :۔ ایوب خاں کے دور میں مشرقی پاکستان کے اندر جو احساسِ محرومی بڑھ رہا تھا۔ اس حوالے سے ایک مشرقی پاکستان کا قائمقام ہی سہی، مگر با اختیار پریذیڈنٹ ہونا مفید نہیں تھا۔

ج :۔ بڑا ہی مفید تھا۔ اتنا ضروری تھا جس کا کوئی حساب نہیں۔

س :۔ ایوب خاں کو پھر خوش ہونا چاہیئے تھا۔

ج :۔ لیکن حسد کا کیا کیا جائے۔ دنیا میں بیشتر خرابیاں حسد کی وجہ سے ہیں۔ دیکھو جی، میں ایک آدمی ہوں۔ میں خواہ کتنا ہی برا ہوں۔ کتنوں کے ساتھ برائی کروں گا۔ سو کے ساتھ کروں گا۔ دو سو کے ساتھ کروں گا۔ جو لاکھوں کی تعداد میں میرے مخالف ہیں۔ وہ تو حسد کی وجہ سے ہیں۔ دیکھ نہیں سکتے کہ اس کے اچھے حالات ہوں۔ ہم نے کوشش کی کہ اگر ہو سکے تو اپنی طرف سے نیکی کریں۔ کسی کا برا کرنے سے پہلو ہی بچایا۔ اس کے باوجود دیکھا ہے۔ کہ ہر دوسرا آدمی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ پھر یہی سمجھا کہ یہ صرف حسد ہے۔

س :۔ وہ جو آپ نے ذکر کیا تھا کہ روس گئے تو وہاں پاکستانی سفیر ہمارے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ کیونکہ وفد کے قائد فضل القادر چودہری تھے۔ وہ اس وجہ سے ہی کہ بھٹو صاحب سے ان کا کلیش ہو گیا تھا۔

ج :۔ بھٹو ارینج کر دیا کرتا تھا کہ سفیر چودھری صاحب کے لیے احترام کا وہ مظاہرہ نہ کریں جو پارلیمانی وفد کے لیے کیا جاتا ہے۔ بھٹو تو ان کا اتنا دشمن ہو گیا کہ جس کا کوئی حساب ہی نہیں۔ آخری دم تک بھٹو اسے بڑا بے عزت کرتا تھا۔ ہاؤس میں غلط رویہ اپناتا تھا۔ بخشنے والا تو فضل القادر بھی نہیں تھا۔ ہر جگہ اس کی بے عزتی کرتا تھا۔ دونوں کی لگی شروع ہو گئی جس کے بڑے سخت نتائج برآمد ہوئے مضر۔ بہت مضر نتائج نکلے۔

س :۔ کیا ہوا؟

ج :۔ بھٹو صاحب اگر باہر ڈیلیگیشن لے کے جاتے تو وہاں کی ایمبیسی کے ذریعے پریذیڈنٹ کو اس طرح کی رپورٹیں بھجواتے کہ مستقبل میں کسی نے آپ کے مقابل اٹھنا ہے۔ تو اسی نے اٹھنا ہے۔ یہاں بھی انٹلی جنس سے وہ اسی طرح کی رپورٹیں کراتے کہ ایسٹ پاکستان سے یہی آدمی ہے جو پریذیڈنٹ کے خلاف کھڑا ہو گا۔ اور تو کوئی آدمی جرأت کرنے والا نہیں۔

منیر صاحب! بڑے واقعات ہیں جن کی اصلیت سامنے نہیں آتی۔ جن کی اصل وجوہ سامنے نہیں آتیں۔

س :۔ ہمارے ملک میں؟

ج :۔ ممکن ہے اور ملکوں میں بھی ایسا ہو۔ امریکہ وغیرہ کو تو کوئی "دلستی چڑھی" ہے ہی نہیں۔ وہاں تو کسی کو معاف نہیں کرتے وہاں صحیح پتہ لگ جاتا ہے، بلکہ کچھ زیادہ ہی۔

س :۔ یہ ساری صورتِ حالات پھر اس بات پر منتج ہوئی کہ فضل القادر چودھری کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایوب خاں ان کے اس قدر درپے ہو گئے تھے کہ ایک بار غالباً اسمبلی میں، تنگ آکر انہوں نے اس طرح کی بات کی تھی کہ ایوب خاں مجھے گولی کیوں نہیں مروا دیتے۔

ج :۔ بہرحال وہ ہاؤس تو چلتا رہا۔ پھر جس وقت دوسرا الیکشن ہوا۔ ۶۵ میں۔ یہ پھر اسمبلی کے ممبر الیکٹ ہو گئے۔ پہلے سیشن میں حلف اٹھانے کے بعد سپیکر کا الیکشن ہوتا ہے۔ یہ سپیکر نہیں ہوئے۔ عبدالجبار خاں کو سپیکر بنا یا گیا اس دوران میں بھٹو کی مخالفت میں کالا باغ اور فضل القادر چودھری کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ ہو گیا تھا۔

س :۔ دوسری بار ان کے سپیکر نہ ہو سکنے کی کیا تفصیل ہے؟

ج :۔ مجھے سیالکوٹ صبور خاں کا ٹیلی فون آیا۔ شاہ جی میرا ٹیلی گرام مل گیا۔ میں نے کہا جی مل گیا۔ کہنے لگا۔ آپ کل مجھے ملیں۔ پنڈی پہنچ کے میں نے ٹیلی فون کیا۔ میں آگیا ہوں۔ کہنے لگا۔ آپ بھٹو صاحب سے مل لیں۔ میں بھٹو صاحب کے گھر چلا گیا۔ پنڈی میں پنجاب ہاؤس کے سامنے لین میں ان کی کوٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ بھٹو صاحب میں آگیا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ تو پریذیڈنٹ ہاؤس جا رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ ابھی بات کرتے ہیں، چائے وغیرہ منگوائی۔ تاخیر کرتے جائیں۔ بات نہ بتائیں۔ حتیٰ کہ ان کے پریذیڈنٹ ہاؤس جانے کا ٹائم ہو گیا۔ کہنے لگے۔ شاہ جی آپ بھی میرے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس چلیں۔ میں سمجھ گیا کیا بات ہے۔ پریذیڈنٹ صاحب نے کچھ سلیکٹڈ لوگوں کی اپنے گھر میں میٹنگ رکھی ہوئی تھی، اس بات پر غور کرنے کے لیے کہ کون اگلا سپیکر ہو۔ اس میں دونوں گورنروں کو بلایا ہوا تھا۔ کالا باغ نواب بوجہ کے غیر حاضر تھا۔ وہاں عبدالجبار خاں بھی تھے۔ عبدالمنعم خاں (گورنر مشرقی پاکستان) بھی تھے۔ صبور خاں بھی تھے۔ بغرضیکہ فضل القادر چودھری کے سارے مخالف وہاں جمع تھے۔ ان میں میں اکیلا تھا۔ جو ان کا مخالف نہیں تھا۔ خیر، بات شروع ہوئی۔ پریذیڈنٹ صاحب نے کہا، آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ کل الیکشن ہونا ہے۔ کون سپیکر ہونا چاہیے۔ منعم خاں نے کہا کہ فضل القادر چودھری یوں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو سربراہ مملکت پوز کرتا ہے۔ اس قسم کی باتیں صبور خاں نے بھی کیں۔ بھٹو صاحب نے بھی دو چار جملے کہے۔ میں خاموش رہا۔ بھٹو مجھے ہتھلیں دے کہ بولو۔ کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ ویسٹ پاکستان میں سے کسی آدمی نے فضل القادر کے حق میں بات کرنی ہے تو وہ تنہا مرید حسین ہے۔ یہی اسے تجویز کرے گا۔ وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ اس کے دل میں جو بات ہو یہ کرتا ضرور ہے۔ بھٹو مجھے کہے۔ پریذیڈنٹ چاہتے ہیں کہ آپ بولیں۔ میں نے کہا، اتنے بڑے معاملے میں میری کیا حیثیت ہے، نہ تیرہ میں نہ تین میں۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ آپ کو خاص طور سے اس مقصد کے لیے بلایا گیا ہے۔ پھر میں اٹھا۔ میں نے کہا "ہم نے آپ کو ووٹ دے کر پریذیڈنٹ بنایا۔ ہم نے آپ کو ووٹ کے ذریعے اپنا لیڈر تسلیم کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی سوچ اور معاملات میں جو آدمی موزوں بیٹھتا ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے ساتھ معاندانہ رویہ کیوں رکھیں۔ جبکہ آپ ملک کے لیے کام کر رہے ہیں۔ افراد قربان کیے جا سکتے ہیں۔ خواہ کتنا ہی امپارٹنٹ آدمی ہو، قومی مفاد میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ٹھیک ہے آپ جو بھی فیصلہ کریں۔ وہ (فضل القادر) آپ کے ساتھ ٹھیک کام نہیں کر سکتا یا آپ اس کے ساتھ نہیں چل سکتے، لیکن اس کی وفاداریوں میں تو کوئی شک نہیں۔ میں اس نظریے کا نہیں کہ غلط چلوں اور اپنی وفاداریاں بدلتا پھروں۔ بہر حال، میری طرف سے آپ کو کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے انہیں ہمیشہ صحیح مشورہ دیا ہے۔ ایسے بڑے واقعات ہوئے جن میں حکومت کا وقار ملوث تھا۔ میں وقت پر بات کر دیتا تھا۔ ملک قاسم وغیرہ میری حوصلہ شکنی بھی کرتے تھے۔ شاہ جی، پریذیڈنٹ صاحب آپ کی بات مان تو لیتے ہیں۔ لیکن وہ اس طرح کی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ میں انہیں جواب دیتا تھا۔ ہم کوئی درباری آدمی نہیں۔ ہم پولیٹیکل ورکر ہیں۔ اگر تو ہم آپ کی طرح سیاسی گدیوں پر بیٹھے ہوتے تو اور بات تھی۔ ہم یہاں آئے ہیں، صاف بات کریں گے۔ چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔

میں نے آکر فضل القادر چودھری صاحب کو بتا بھی دیا کہ امیدوار نہ بننا۔ جب آپ لیڈر آف دی ہاؤس کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی کوئی اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن انہوں نے سچوایشن کو الجھا دیا۔ وہ پھر سپیکر کے لیے امیدوار نہ بنے۔

پھر انہوں نے اسے پارٹی میں سے نکال دیا۔ کیونکہ خود تو وہ چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ آئین میں آچکا تھا کہ جس پارٹی سے آپ الیکٹ ہو کے آئیں۔ اُسے چھوڑیں تو آپ کی سیٹ جاتی رہے گی۔ چونکہ انہوں نے انہیں نکالا تھا۔ اس لیے ان کی ممبر شپ ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں نے ان سے اپنا وہ تعلق رکھا تھا۔ وہ بھی اسی طرح احترام ظاہر کرتے تھے۔

س :۔ اس کے باوجود انہوں نے کوئی دوسری پارٹی جائن نہ کی، عوامی لیگ نہ کوئی اور۔

ج :۔ وہ عوامی لیگ یا کسی دوسری پارٹی میں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وہ تھے ہی مسلم لیگی۔ وہ سٹوڈنٹ شپ کے زمانے ہی سے مسلم لیگی تھے۔ یہاں پنجاب میں ۱۹۵۱ء میں الیکشن ہوئے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں پاکستان بننے کے بعد پہلا الیکشن ۱۹۵۴ء میں ہوا تھا۔ اُس وقت بھی مسلم لیگ نے انہیں ٹکٹ نہیں دیا تھا۔ غالباً نورالامین صاحب انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ قد کاٹھ بہت تھا۔ اُس طرح بھی ٹاورنگ پرسنیلٹی تھے۔ مسلم لیگ نے انہیں ٹکٹ نہ دیا۔ تو آزاد کھڑے ہو گئے۔ جیت گئے۔ مشرقی پاکستان اسمبلی کے لیے مسلم لیگ کے نو ممبر جیتے۔ صورت یہ تھی کہ اگر اسمبلی میں کسی پارٹی کے ممبرز کی تعداد دس سے کم ہو تو وہ اسمبلی میں پارٹی تسلیم نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح مسلم لیگ مشرقی پاکستان اسمبلی میں پارٹی نہیں بنا سکتی تھی۔ مخالفین نے فضل القادر چودھری کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے وزارت کی پیش کش کی۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ میری پارٹی تو مسلم لیگ ہے۔ میں وہاں جاؤں گا۔ مجھے وزارت نہیں چاہیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ جائن کر لی۔ مسلم لیگ کے اسمبلی کے اندر دس ممبر ہو گئے۔ اور وہ اس قابل ہو گئی کہ اسمبلی میں پارٹی آرگنائز کر سکے۔ فضل القادر چودھری اس حد تک مسلم لیگی تھے۔ کہ اُدھر سے وزارت مل رہی تھی۔ نہیں قبول کی۔

س :۔ اس دور میں اچھا پارلیمنٹیرین کون تھا۔

ج :۔ اے کے سومار اعلیٰ پایے کے پارلیمنٹیرین تھے۔ بہت آؤٹ سٹینڈنگ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بہت خوبصورت تقریر کرتے تھے۔ اپنے مضمون یعنی اکنامکس پر اتنا حاوی تھے کہ ہاؤس میں ان کا کوئی ہم پایہ نہیں تھا۔ نہ وزیروں میں نہ ممبروں میں۔ بہت قابل آدمی تھے۔ زبان بڑی خوبصورت ادائیگی بڑی اچھی بڑی پرجوش تقریر ہوتی تھی۔ اسمبلی کی رپورٹنگ دیانتدارانہ نہیں ہوتی وہاں جو لوگ گدھوں والی باتیں کرتے ہیں ان کی تصویر چھپی ہوتی ہے۔ پیسوں کا معاملہ ہوتا ہے ناں، اس لیے۔

سومار کو میں نے سیالکوٹ آنے کی دعوت دی تھی۔ کیونکہ وہ اقبالؒ کے بڑے مداح تھے۔ لیکن انسانوں کے پروگرام بیچ میں ہی رہ جاتے ہیں۔ انتقال کر گئے۔

س :۔ سال دو سال پہلے ولی خاں اور سردار شوکت حیات نے ایسے بیانات دیئے تھے کہ ایوب خاں مشرقی پاکستان سے چھٹکارا چاہتے تھے۔

ج :۔ یہ بات چلی ضرور تھی۔ لیکن ایوب صاحب کی زبان سے کبھی نہیں نکلی۔ واقعات بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ہم ڈھاکہ گئے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں نیشنل اسمبلی کے ممبر ہو گئے، پھر گئے۔ اس طرح ہم ایسٹ پاکستان اور ڈھاکہ میں جو ڈویلپمنٹ ہو چکی تھی۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ پہلے کہاں گھومتے رہے ہیں۔ ڈھاکہ بالکل کراچی کی طرح ہو گیا تھا۔ کنسٹرکشنز، عمارتیں، نئی کالونیاں، نئی ائرپورٹ، وغیرہ وغیرہ۔ قریب قریب انقلاب ہی آگیا تھا۔ اگر ایسی

بات ہوتی تو جب انہوں نے فضل القادر کو مسلم لیگ سے نکالا تھا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ ایوب خاں مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔

س: آپ نے کہا کہ یہ بات چلی ضرور تھی۔

ج: ایک بار ملک قاسم نے ایک ڈنر کا حوالہ دیا جس میں آدم جی والے تھے جمیل نشتر تھے کچھ بیوروکریٹ تھے۔ وہ کہتے سنے کہ ایسٹ پاکستان ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ ہمیں اس سے جان چھڑا لینی چاہیئے۔ یہ سن کر میرا تو خون ہی کھولنے لگا۔ میں نے کہا "اگر یہ پریذیڈنٹ کی طرف سے ہے تو اسے کہو کہ اگر اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ تو عوام میں اناؤنس کرے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اس کی گورنمنٹ ایک مہینہ نہیں رہے گی"۔ یہ ایک بات سنی تھی۔ اس کے علاوہ اس طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے تمام ایسٹ پاکستانیوں کے ساتھ تعلقات تھے، فضل القادر چودھری تو خیر ایسٹ پاکستانی تھے۔ نہ ویسٹ پاکستانی تھے۔ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ میں پاکستانی ہوں۔ خان عبدالصبور خاں اسمبلی میں ہمارے لیڈر تھے۔ ان سے بھی ہمارے خاصے تعلقات تھے۔ کسی منہ سے بھی یہ بات نہیں نکلی تھی۔ ایسٹ پاکستان سے پریذیڈنٹ صاحب کو ووٹ بھی مل گئے تھے۔

س: یہ پھر پراپیگنڈہ ہی ہے۔

ج: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے۔ کوئی حقیقت ہو بھی۔ لیکن واضح طور پر کچھ نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے۔ ان سرکلز میں کوئی بات ہو۔

س: مجیب کے چھ نکات کے متعلق بعض حلقوں کا یہ اصرار ہے کہ ایوب خان نے ڈرافٹ کرائے تھے۔

ج: میرا جس حد تک ایوب صاحب سے تعلق تھا۔ وہ تو میں بیان کر رہا ہوں۔ لیکن میں ان کے بالکل اندرونی حلقے میں نہیں تھا کہ مجھے ایسی باتوں کا علم ہو۔ اس لیے میں اس کی نہ تردید کر سکتا ہوں: نہ تائید۔

س: یہ تو حقیقت ہے کہ ایوب دور میں جب ایسٹ پاکستانیوں میں حکومت میں شرکت کی محرومیوں کا احساس ہوا تو مجیب الرحمٰن ان کا لیڈر بن گیا۔

ج: بنگلہ دیش کا معاملہ امریکیوں نے اس لیے شروع کیا تھا کہ وہ ویت نام میں مار کھا گئے تھے۔ اب وہ چین کے قریب ایسی جگہ چاہتے تھے، جو تھوڑی سی ایڈ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ جسے وہ اپنا بیس بنا سکیں اس لیے انہوں نے ایسٹ پاکستان کو منتخب کیا تھا۔ ڈائریکٹر انٹلی جنس بیورو این اے رضوی میرے کرم (سمدھی) تھے۔ یہ بات انہوں نے مجھے بتائی کہ امریکن مجیب الرحمٰن کو چھوڑ گئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے یہی مراعات روس کو دے دی ہیں۔

س: آپ کا ایوب صاحب کے ساتھ اس قدر تعلق رہا۔ آپ کو انہوں نے وزارت میں نہیں لیا؟

ج: ایوب صاحب سیکرٹریوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ سولجر تھے۔ سمجھتے تھے کہ ایک آدمی کو اگر آپ ایک جگہ پر رکھتے ہیں۔ تو پھر اس کی ریکمنڈیشن اور اس کی رائے کو وزن دینا چاہیئے۔ آپ کل کو اسے نکال دیں۔ پوسٹ ختم کر دیں۔ لیکن جب تک وہ ہے آپ اس کی ریکمنڈیشن کو اہمیت دیں۔ سیکرٹریوں کا بہت عمل دخل ہوتا تھا۔ اس وقت سیکرٹری جنرل ڈیفنس سید غیاث الدین تھے۔ کالج کے زمانے میں میرا ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ بعد میں زیادہ تعلق ہوتا گیا جب میں ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی کا ممبر تھا۔ وہ چیئرمین تھے۔ میرے بڑے مہربان تھے۔ انہوں

نے مجھے بتایا کہ آپ کو وزیر لینے کی بات چلی تھی۔ وہ آپ کو وزارت داخلہ دینا چاہتے تھے۔ میں نے ہی مخالفت کی تھی۔ اس میں پاسپورٹ والا محکمہ ہے یا پھر پولیس ہے۔ لیکن وہ صوبائی سبجیکٹ ہے سنٹرل انٹیلی جنس بیورو ہے۔ لیکن وہ خود مختار سا ادارہ ہے۔ اس کے ڈائریکٹر کا پریذیڈنٹ کے ساتھ براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے ہی مخالفت کی تھی کہ یہ میرا بھائی ہے۔ سادہ آدمی ہے۔ آپ اسے امتحان میں ڈالتے لگے ہیں۔ ساری پوزیشن ہی اَپ سیٹ ہو جائے گی۔ اس وقت یہ تھا کہ وزیر ہونے کی صورت میں اسمبلی کی ممبر شپ چلی جاتی تھی۔ ہم کوئی پولیٹیکل فیملی تو تھے نہیں۔ بعد میں میری سیٹ پر ضمنی انتخاب ہوتا تو ہمارے مخالفین میں سے کوئی آسکتا تھا۔ اس لیے وزارت والی بات رہ گئی۔

بلکہ آپ کے پریس والے بھی بڑے تیز ہوتے ہیں۔ انہیں یہاں منٹ منٹ کی خبر تھی۔ مجھے سیالکوٹ میں مبارکباد کے اتنے فون گئے جن کا کوئی حساب ہی نہیں۔ مجھے تو بعد میں پتہ چلا تھا۔ شائد میں جاتا بھی ناں۔

س:۔ ایوب خاں کے زمانے میں سیاسی رشوت کا بہت دور دورہ رہا۔

ج:۔ مثلاً۔

س:۔ مثلاً روٹ پرمٹ وغیرہ۔

ج:۔ جس طرح اب نواز تے ہیں، اس وقت بھی تھا۔ جو زمیندار ممبر تھے۔ انہیں پریذیڈنٹ صاحب کہتے تھے۔ بھائی انڈسٹری لگاؤ۔ زمینداری کا مستقبل تو اسی طرح ہے۔ نئے لوگ آ رہے ہیں۔ آپ کو بھی انڈسٹری میں آنا چاہیے۔ مجھے بھی انہوں نے کئی بار کہا میں یہی جواب دیتا کہ میرے پاس نہ پیسے ہیں، نہ وقت ہے، نہ مہارت ہے۔

س:۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے بھی رُوٹ پرمٹ لیے۔

ج:۔ میں تو اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ مجھے کالا باغ نے ہی نامزد کیا تھا۔

س:۔ ڈھاکہ سیشن میں جب آپنے کالا باغ کی ہدایت کے برعکس فضل القادر چودھری کو ووٹ دیا۔ اس سے پہلے کی بات ہو گی۔

ج:۔ جی ہاں۔ اس سے پہلے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ مجھے ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی (آر ٹی اے) کا ممبر بنا رہے ہیں۔ میں لاہور آ رہا تھا۔ راستے میں اخبار میں پڑھا۔ لاہور میں پیلیز ہاؤس میں خواجہ صفدر کے کمرے میں ٹھہرا تھا۔ گجرات کے میاں اکبر پگانوالے صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ اپوزیشن میں تھے۔ وہ گجرات پنجاب بس کے مالک تھے۔ کالا باغ انہیں دبانا چاہتا تھا۔ ان کے رُوٹ پرمٹ چھیننا چاہتا تھا۔ میاں اکبر نے خبر پڑھی تو وہ خواجہ صفدر کو لے کے میرے پاس لاہور آ گئے۔ خواجہ صاحب کہنے لگے۔ شاہ جی آپ آر ٹی اے کے ممبر ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔ لیکن میرے لیے اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کہنے لگے۔ میاں صاحب کا ایجنڈا میٹنگ میں پیش ہو گا۔ ان کے لیے آپ کو ممبر رہنا ہو گا۔ اور ان کی مدد بھی کرنی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کیونکہ خواجہ صفدر کے ساتھ میرے اچھے تعلقات تھے۔ ہم نے الیکشن بھی صلاح مشورے سے لڑا تھا۔ وہ صوبے میں تھے۔ میں مرکز میں تھا۔

س:۔ خواجہ صاحب کو مدد بھی حاصل تھی۔

ج:۔ ہاں میں نے ان کی خدمت کی۔

س :۔ میرا مطلب کالا باغ سے ہے۔

ج : انہیں کالا باغ کا تعاون حاصل تھا۔ مارشل لاء کا بھی حاصل تھا۔ اس وقت لوگ اپنی کوشش سے ہوتے تھے۔ کالا باغ اور مارشل لاء کھلم کھلا مدد نہیں کر سکتے تھے۔

س :۔ میں ۶۲ء کے نہیں ۶۵ء کے الیکشن کی بات کر رہا ہوں۔

ج :۔ اس وقت تو انہیں کالا باغ کی بھرپور امداد حاصل تھی۔ کیونکہ ان کے بہت پرانے تعلقات تھے۔ ۱۹۵۱ء والی پنجاب اسمبلی میں ان کی گروپنگ تھی۔ مثلاً میانوالی ڈسٹرکٹ سے نواب صاحب کالا باغ، عبداللہ ردکڑی اور افضل ڈھانڈلہ۔ سیالکوٹ ڈسٹرکٹ سے عبدالغنی گھمن، خواجہ صفدر اور عبدالرحیم، یہ سارے ایک گروپ میں تھے۔

س :خواجہ صاحب ۶۲ء والی اور پھر ۶۵ء والی مغربی پاکستان اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف تھے۔ تو کیا یہ گورنمنٹ کی خواہش و کوشش سے ہوئے تھے۔

ج :۔ بالکل یہ گورنمنٹ کے تھے۔

س :۔ اندر سے معاملہ سیٹ تھا۔

ج :۔ حکومت کے اصلی آدمی تو یہی تھے۔ اصل گیم بھی یہی کھیلتے تھے۔ جو حکومت کے وزیر تھے، وہ تو برائے نام تھے۔

س :۔ مادرِ ملتؒ اور ایوب خاں کے درمیان ہونے والے صدارتی انتخاب کے دوران میں یہ بات عام تھی کہ خواجہ صفدر سینے پر مادرِ ملتؒ کا انتخابی نشان لالٹین لگا کے کنویسنگ کے لیے نکلتے ہیں تو ووٹروں سے یہ کہتے ہیں کہ آپ مادرِ ملتؒ کو ووٹ دیں نہ دیں مجھے صوبائی اسمبلی کے لیے ضرور ووٹ دینا۔

ج :۔ وہ اُوپر سے مادرِ ملتؒ کے ساتھ تھے، اندر سے ایوب خاں کے ساتھ تھے۔ کالا باغ کا آدمی ہے۔ بہر حال کامیاب آدمی ہے۔

س :۔ اس وقت ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ باتیں سنتے تھے۔ چونکہ اپوزیشن مائنڈڈ تھے۔ اس لیے مانتے نہیں تھے۔

ج :۔ یہ بالکل حقیقت ہے۔ یہ باتیں بالکل صحیح ہیں۔

س :۔ کنونشن لیگ کے پریذیڈنٹ خواجہ جمیل تھے، وہ ہار گئے۔ خواجہ صفدر جیت گئے؟

ج :۔ وہ تو کالا باغ نے خواجہ جمیل کو ہروا دیا تھا جی۔

س :۔ انہیں جتوانے کے لیے۔

ج :۔ بالکل، وہ تو میں نے مسعود صادق کے ساتھ بات کی کہ خواجہ جمیل وہاں کی مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ ہیں۔ ان کی برادری بڑی ہے۔ اس خاندان کی بیک گراؤنڈ بھی زیادہ ہے۔ مسعود صادق کہنے لگا۔ شاہ جی صفدر کے بغیر ہمارا گذارا نہیں۔ اسے تو کامیاب کرانا ہی کرانا ہے۔ میں نے کہا یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے، بڑا ظلم ہے۔ کہنے لگا۔ میں نے آپ کو صاف بات بتا دی ہے۔ اب آپ جو مرضی ہے، کہہ لیں۔

کالا باغ نے بیگم شاہنواز کے مقابلے میں خواجہ صفدر کو قائد حزب اختلاف بنوایا تھا۔

س :۔ کیوں؟

ج :۔ اس لیے کہ بیگم شاہنواز کالا باغ کی ساری باتیں ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ بیگم شاہنواز کی اپنی بھی

حیثیت تھی۔ خواجہ صفدر کی اپنی حیثیت تو نہیں تھی۔ خواجہ صاحب فائدے میں بھی رہے۔

س :۔ فضل القادر چودھری کی وجہ سے کالا باغ کا آپ کے ساتھ اختلاف شروع ہو گیا؟

ج :۔ اس کے بعد تو کالا باغ ہمارا قاتل ہی بن گیا۔ انہیں بڑی دفعہ کہا۔ نواب صاحب یہ زیادتی والی بات ہے۔ آپ اپنے بیٹے سے پوچھ لیں۔ ہم نے کہا۔ نہیں مانتے تو نہ مانو چھماں نوں کھاؤ۔ ہم نے آپ سے کون سے مربعے لینے ہیں۔ باقی تو اس نے سب کو معاف کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں اس نے سمجھا کہ یہ لاوارث سا آدمی ہے۔ اس واسطے میرے الیکشن میں اتنی سخت مخالفت ہوئی۔ میں تو پھر سیدھا ہی ہو گیا۔ میں نے جا کے پریذیڈنٹ سے کہا کہ اگر آپ سیف گارڈ نہیں کر سکتے تو ہمیں اجازت دیدیں کہ ہم اس پارٹی سے چلے جائیں۔ ہم نے خدمت کی ہے۔ تکلیف نہیں دی۔ نہ آپ کی ہمیں فیور رہے۔ نہ الیکشن کے بیے تھی۔ نہ اس کے بعد تھی۔ ایک ممبر جو لوگوں کا نمائندہ ہے اس کی اس قسم کی باتوں کا ملک کے مسائل پر بھی تو اثر پڑتا ہے۔ بھٹو کے الفاظ تھے کہ تیرے بغیر کالا باغ سے کوئی نہیں بچا۔ تم پتہ نہیں کیسے بچ گیا ہے۔

س :۔ کالا باغ نے چودھری محمد حسین کی جگہ چودھری ظہور الٰہی کو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا چیئرمین بنوایا۔ پھر مخالفت بھی ہو گئی۔

ج :۔ دراصل کالا باغ حاسد بہت تھا۔ اس کی یہ تکنیک تھی کہ جب دیکھتا کہ کوئی شخص زیادہ پر نکالنے لگا ہے تو اس کی ٹانگ کھینچ لیتا تھا۔ اس نے پیمانے رکھے ہوئے تھے۔ اس سے اوپر گوارا نہیں کرتا تھا۔

س :۔ سنا تھا کہ چودھری ظہور الٰہی گورنر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے کہ کالا باغ کو پتہ چل گیا۔

ج :۔ چودھری ظہور الٰہی دراصل دولتانہ سے ملتا تھا۔ صلاح الدین چٹھہ حامد ناصر چٹھہ کا باپ۔ چودھری عبدالکریم اور ذوالفقار ڈاہ کے گھر سر شہاب الدین کے سالے کی لڑکیاں تھیں۔ وہ صلاح الدین چٹھہ کے ہاں دولتانہ سے ملا کرتا تھا۔ ہمارا چودھری سرفراز، چودھری صلاح الدین چٹھہ کے ہاں گلبرگ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے چودھری ظہور الٰہی کو وہاں دیکھ لیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ شائد سرفراز نے گورنر کالا باغ سے بات کی۔ اسے خدشہ پیدا ہو گیا کہ انٹرگ کر رہا ہے۔ اندر سے دولتانہ سے ملا ہوا ہے۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ گورنر بھی بننا چاہتا تھا۔

س :۔ گورنر بننے کی تو جنرل برکی کی بھی خبر اڑی تھی۔

ج :۔ یہ اس کے بھی پیچھے پڑ گیا۔ جالندھر کے باہر بستیاں تھیں۔ برکی وہاں کے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کر کے اسے شہری علاقہ ڈیکلیئر کرایا۔ پھر ان یونٹوں کے عوض پنجاب کے اہم شہروں میں الاٹمنٹیں کرالیں۔ لاہور میں کوئی ساٹھ مربعے انہیں الاٹ ہوئے۔ حضرت میاں میر کے گرد سارا علاقہ۔ اسی طرح راولپنڈی میں۔ سیالکوٹ میں اگر کی سٹیشن کے سامنے ماڈل ٹاؤن بنایا۔ تین سو ایکڑ سے زائد زمین ہے۔ ایک سوسائٹی بنی۔ اس میں بھی یہی جالندھری مالک تھے۔ کالا باغ نے بحالیات والوں سے اعداد و شمار لے کے تونشیل اسمبلی میں گوجرانوالہ کے جلیل سے سوال کرا دیا۔ وزیر بحالیات رانا عبدالحمید تھے۔ وہ پہلے سے تیار تھے۔ یہ سب گورنر سے ملے ہوئے تھے۔ منسٹر نے اعتراض قبول کر لیا۔ کہ ٹھیک ہے جنرل برکی پریذیڈنٹ کے پولیٹیکل ایڈوائزر تھے۔ ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ ایک اعتراض ہوا ہے، اسے گورنمنٹ نے مان لیا ہے۔ وہ تو اسٹیبلشن ہو گیا۔ انہیں تو سمجھ نہ آئے کیا ہوا۔ پردے میں ساری بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احمد رضا کو بھی ہٹا دیا گیا۔ جنرل برکی کو بھی سیاسی مشاورت سے ہٹا دیا گیا۔ انہیں فوراً تو نہ ہٹایا گیا۔ کیونکہ ایوب صاحب کا مارشل لاء

لگا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ اس وقت میڈیکل کور کے ہیڈ تھے۔ ویسے بھی تعلق تھا۔
برکی نے بھر کالاباغ کے مخالفین کرنل اسلم نیازی اور مولانا عبدالستار نیازی کو بلایا۔ ہمارے وہاں ڈاک کے خانے الگ الگ تھے۔ ہم ایک صبح گئے تو ان میں کالاباغ کے خلاف الزامات پر مشتمل پندرہ بیس صفحے کا پمفلٹ تھا۔ اسمبلی کے اندر گئے۔ تو پریذیڈنٹ گیلری میں مولانا عبدالستار نیازی لنگی کا طرّہ کس کے بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ پریذیڈنٹ گیلری میں کسی کو اجازت نہیں ملتی تھی۔ سپیکر کی گیلری میں ہم جو ممبر تھے اپنے مہمان بٹھا دیتے تھے جنرل برکی نے کالاباغ کو ہٹ کرنے کی کوشش کی لیکن موثر طریقے سے ہٹ نہ کرسکا۔ بلکہ یہ مشہور کر دیا گیا کہ کالاباغ گورنری سے ہٹ رہا ہے۔ اس کی جگہ برکی آرہا ہے۔ بہر حال کالاباغ پھر سنبھل ہی گیا۔
احمد رضا میرا واقف تھا۔ اس طرح کہ مارشل لاء کے دوران میں بنیادی جمہوریت تو تھی۔ پرائمری یونین کونسلیں تھیں پھر تحصیل کونسل۔ پھر ضلع کونسل۔ پھر ڈویژنل کونسل تھی۔ ڈویژنل کونسل میں ہر متعلقہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر اور تین چار عوام میں سے ممبر ہوتے تھے۔ میں اس کا ممبر تھا۔ مرے کالج سیالکوٹ کے پرنسپل ٹامس بھی ممبر تھے۔ سپورٹس گڈز ایسوسی ایشن کے چیئرمین محمد حسین ببریج بھی تھے۔ احمد رضا ڈپٹی کمشنر لاہور تھا۔ وہ بزرو سا آدمی تھا۔ ہم بھی اس کے ساتھ گھلتے ملتے نہیں تھے۔ جب اسے ڈپٹی کمشنر سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک روز ہم لاہور سے پنڈی کے لیے فوکر پر بیٹھے تھے۔ منگلا ڈیم ابھی بن رہا تھا غیر ملکیوں کے لیے جہاز وہاں بھی رکتا تھا۔ وہاں ایک سواری اتری تو میں نے دیکھا کہ احمد رضا بیٹھے تھے۔ ہم اکٹھے بیٹھ گئے۔ اس نے پھر کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ کہنے لگا۔ آپ کی نوسانڈوں کی لڑائی تھی۔ مجھ غریب کو خواہ مخواہ مروا دیا۔ میرا کیریئر بھی متاثر ہوا۔ میں نے تو بڑی باعزت اور دیانتدارانہ زندگی گذاری تھی۔ کہنے لگا میں نے گورنر سے پوچھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے تو پتہ نہیں جمیل ہی ہے۔ انہوں نے ایک گروپ بنایا ہوا ہے۔ اس میں سرفراز، سردار عبدالحمید، انور بھنڈر اور مرید حسین ہے۔ انہوں نے ہی کچھ کیا ہے۔
شروع میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم کچھ افراد انور بھنڈر کے سلسلے میں کالاباغ سے ملے تھے۔ کالاباغ نے احمد رضا کے سامنے وہی نام لے دیئے کہ "یہ سارا کچھ انہی کا کیا دھرا ہے۔ میرا تو اس سے کوئی تعلق نہیں"۔ میں نے احمد رضا سے کہا کہ میں تو مہاجر نہیں۔ نہ سرفراز مہاجر ہے۔ نہ سردار عبدالحمید مہاجر ہے۔ نہ انور بھنڈر مہاجر ہے۔ نہ ہماری مہاجروں سے رشتے داریاں ہیں۔ کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ کوئی مفاد آڑے نہیں آتا۔ اس لیے ہمیں اسمبلی میں وہ سوال اٹھانے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چودھری جمیل مہاجر ہے۔ اس نے سوال اٹھایا تھا۔ احمد رضا کہنے لگا۔ شاہ جی اب تو وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں۔ بات ثابت ہو گئی کہ نواب صاحب نے جھوٹ بولا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے مخدوم رمضان علی شاہ سیالکوٹ میں پولیس انسپکٹر تھے۔ ان کا لڑکا ایس اے جیلانی سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر لگا۔ جب کالاباغ کا زمانہ تھا۔ کالاباغ نے اسے وہاں سے صرف اس لیے بدل دیا کہ یہ مرید حسین کا لحاظ و حافظ نہ کرے۔ کالاباغ اس کی بڑی مخالفت کرتا رہا۔ بلکہ اسے جوڈیشل سائیڈ پر بھیج دیا۔

س:۔ کالاباغ پر یہ الزام بہت رہا ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کرا دیا کرتا تھا۔ عبداللہ روکڑی اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔ یہ محض الزام ہی ہے۔

ج:۔ ایک تو روکڑی کہے گا کہ اس نے کوئی قتل نہیں کرایا۔ روکڑی خود میانوالی کس حالت میں جاتا ہے۔ ذرا یہ

بھی جائزہ لینا۔ وہاں تو یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ پروفیشنل لوگ ہیں۔ جن کا کام یہ ہے۔ پیسے لے کے قتل کرنا۔

کالاباغ ولایت سے پڑھ کے آیا تو ساتھ خاص قسم کے کتے لایا۔ کوئی مانگنے والا فقیر آیا۔ اسے وہ کتے پڑ گئے۔ فیوڈل بات بھی کر جن لوگوں نے دیکھا۔ وہ فقیر کو کتوں کی دستبرد سے چھڑانے لگے۔ کالاباغ نے انہیں سختی سے منع کر دیا۔ کتوں نے اس فقیر کو پھاڑ ڈالا۔ اس کے بعد لوگوں کو سمجھانے لگا کہ اس طرح کتوں کو جھجک ہو جاتی ہے۔ یہ نواب کالاباغ کی ابتدا تھی۔

ایک ڈاکٹر عبدالعزیز ہوتے تھے۔ بڑے کرخت سے آدمی تھے۔ نوجوانی میں ہی وہ کالاباغ سول ہسپتال میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ اس وقت اسسٹنٹ سرجن کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ وہاں لڑائی ہو گئی۔ کچھ لوگ میڈیکل سرٹیفکیٹ لینے کے لیے آ گئے۔ نواب کالاباغ کے ملازم نور محمد عرف نورا کا پیغام آیا کہ ان لوگوں کو اس قسم کا سرٹیفکیٹ بنا دیں۔ اور وہ حقیقت سے ہٹ کر تھا۔ اور وہاں حالت یہ تھی کہ نورے کی مرضی کے مطابق ہی سارا کچھ ہوتا تھا۔ نورے کے پیغام کا مجھ پر بڑا ردعمل ہوا۔ میں نے بڑا محسوس کیا کہ یہ کون ہے دخل دینے والا۔ چنانچہ میں نے حقیقت کے مطابق سرٹیفکیٹ دیدیا۔ جو نورے کی مرضی کے خلاف تھا۔ شام کے قریب میرے سرکاری مکان کے گرد مشکوک افراد کلہاڑیاں لیے گھومنے لگے۔ میں خوفزدہ ہو گیا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ذاتی ملازم جو میں اپنے گاؤں سے لے گیا تھا۔ اسے میں نے بندوق دیدی۔ اور خود پستول سنبھال لی۔ ساری رات جاگ کے گزاری۔ اگلے روز میانوالی عدالت میں میری حاضری تھی۔ سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا۔ گاڑی چلی تو پائدانوں پر آدمی کھڑے ہو گئے۔ میں نے ہوائی فائر کر دیا۔ وہ چھلانگیں مار گئے۔ جس حالت میں میں نے وہ سفر کیا، وہ مجھے ہی پتہ ہے۔ میانوالی پہنچ کے مجھے عدالت کی وہ حاضری تو بھول گئی۔ اور میں سیدھا ایس پی کے پاس پہنچا۔ وہ انگریز تھا۔ اسے میں نے ساری روداد سنائی۔ کہ میں وہاں محفوظ نہیں۔ حکومت سے کہہ کے آپ میری وہاں سے ٹرانسفر کرا دیں۔ ایس پی نے کہا کہ انگریزوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ وہ گورنمنٹ ملازموں کی جان و مال کا تحفظ دے سکیں۔ آپ کالاباغ جائیں۔ میں بھی کل آؤں۔ اگلے روز ایس پی وہاں پہنچ گیا۔ ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلہ جہاں بھی وہ ٹھہرا تھا۔ مجھے بلا بھیجا۔ نواب صاحب کالاباغ کو بھی بلا لیا۔ کرسیاں اس نے وہاں دو رکھیں ایک اپنے لیے دوسری میرے لیے۔ نواب صاحب کے لیے کوئی کرسی نہیں رکھی۔ نواب صاحب آئے تو ایس پی نے انہیں کھڑا رکھا پوچھا: تو ہز ہائی نس ہے جو نواب کہلواتا ہے۔ کالاباغ نے جواب دیا۔ نہیں، میں ہز ہائی نس نہیں۔ پھر ایس پی نے سوال کیا: آیا تجھے نوابی کا ٹائیٹل حکومت کی طرف سے ملا ہوا ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ اس پر ایس پی نے کہا: تو غیر قانونی اور خود ساختہ نواب بنا پھرتا ہے۔ یہ یہاں ڈاکٹر ہے۔ یہ گورنمنٹ کا ملازم ہے۔ گورنمنٹ میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ اسے تحفظ دے سکے۔ انگریز ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ اگر کوئی ہرج مرج ہوا، تو اسے مکمل طور پر تیری ذمہ داری سمجھا جائے گا۔ یہ یہیں رہے گا۔ چنانچہ میں نے وہ ٹرم وہاں پوری کی۔

وہاں زمین تو ساری ان کی ملکیت ہے۔ ایک شیعہ اعوان گھرانہ تھا۔ ان کی بھی تھوڑی سی زمین تھی بیشانڈ اور لوگوں کی بھی تھوڑی بہت ہو۔ کالاباغ اس شیعہ اعوان کو مجبور کرتا رہتا تھا کہ اپنی زمین ان کے پاس بیچ دے۔ وہ تیار نہیں

ہوتا تھا۔ میانوالی کے بازار میں دن دھاڑے اسے گولی ماردی گئی۔ اس کی لاش سارا دن وہاں پڑی رہی کوئی نزدیک بھی نہ جائے۔ اس کی میں نے امان اللہ خاں نیازی سے بھی تصدیق کی۔ نیازی کالاباغ کے مخالف گروپ میں تھا۔ اس کے آگے زیر نہیں ہوا۔ ویسے بھی سمجھدار آدمی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا واقعہ ہے۔ کہنے لگا۔ ٹھیک واقعہ ہے۔ مقتول کے وارث بڑے کمزور تھے۔ لاش پڑی رہی۔ کوئی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ پولیس بھی نہیں۔ کہنے لگے۔ ہم نے جا کے تجہیز و تکفین کی۔ پھر کوئی جنازہ پڑھانے کے لیے تیار نہ ہو۔ سارا دن ہم مولوی کے لیے کھجل خراب ہوتے رہے۔ رات کو ہم مولوی یوسف صاحب کے پاس گئے۔ یہ صاحب شیعہ کی طرف سے کسی گورنمنٹ آرگنائزیشن کے نمائندہ بھی رہے ہیں۔ ان کا پورا نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ بہرحال ان کے نام میں یوسف بھی آتا ہے۔

امان اللہ نیازی نے بتایا کہ رات ہم یوسف صاحب کے پاس گئے۔ ان کا دروازہ کھلوایا۔ انہیں کہا کہ بڑی شرم کی بات ہے۔ آپ کے عقیدے کا آدمی ہے۔ اس کی نمازِ جنازہ تو پڑھا دیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھوک کے جواب دیا۔ ہم اسقدر تنگ آچکے تھے کہ میں نے پستول نکال لیا۔ اور کہا مولوی صاحب جنازہ نہیں پڑھاؤ گے۔ تو آپ کی لاش بھی اسی طرح یہاں پڑی رہے گی۔ کہنے لگے۔ ہم نے پستول کے زور سے اس کا جنازہ پڑھوایا۔ چند دنوں کے بعد کالاباغ خود قتل ہو گیا۔

س :۔ کہتے ہیں۔ پیسے کے معاملے میں بددیانت نہیں تھا۔

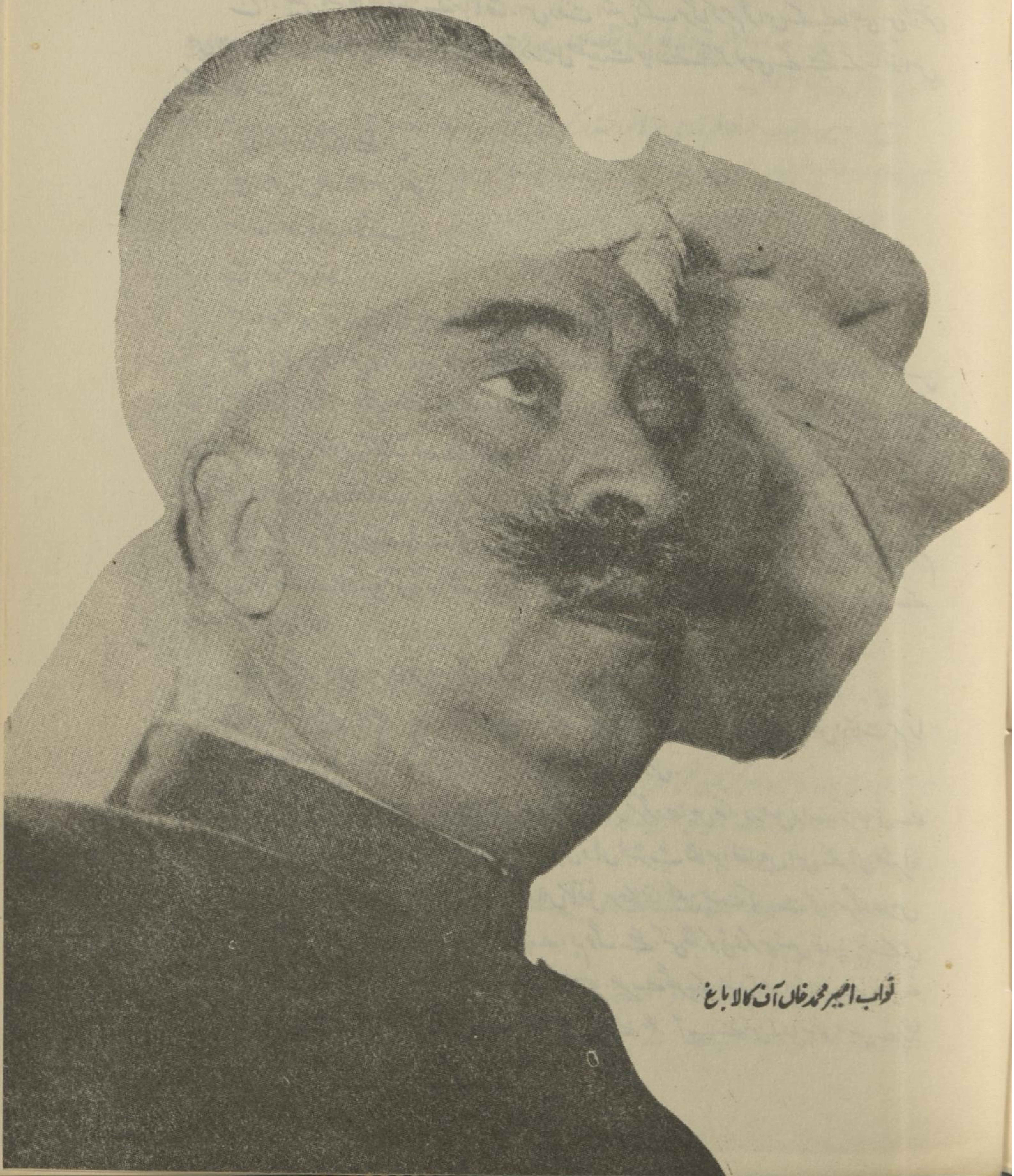
ج :۔ کالاباغ کا ایک کارندہ لیسین تھا۔ اس کے نام سے کاروبار کرتا تھا۔ سیالکوٹ میں اس نے کوکاکولا فیکٹری لگوائی تو لائسنس یاسین کے نام پر لیا تھا سنٹرل کوآپریٹو بنک کے قرضے سے ساری فیکٹری بنی اور غیر محفوظ قرضہ، نہ کوئی لکھت نہ پڑھت، نہ سکیورٹی۔ اس بنک کا سیکرٹری سیالکوٹ کا چودھری ظہور الٰہی تھا۔ جسے گورنمنٹ میرے خلاف کھڑا کرتی تھی۔ وہ آؤٹ آف دی وے جا کے قرضے دیتا رہا۔ وہ تو جب کالاباغ ہٹا تو پتہ چلا کہ اس میں مختلف ڈائریکٹروں کے بھی نام آتے تھے۔ روکڑی کو اس نے انشورنس کمپنی بھی۔

س :۔ یہ تاثر غلط ہے کہ وہ بڑا دیانتدار تھا؟

ج :۔ ساری دنیا کے عیب اس میں تھے۔ اس میں قوم لوط والا فعل بھی تھا۔ ڈاکٹر طوسی کے ساتھ اس کا جو تعلق تھا۔ وہ دراصل اس کے بیٹے کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر طوسی کا بھائی شریف طوسی میرا استاد تھا۔ اس نے ہمیں قوم لوط والی بات تو نہیں بتائی۔ وہ تو ہمیں ویسے ہی پتہ ہے۔ بہرحال یہ وہ کہتا تھا کہ نواب صاحب کے میرے بھائی کی بجائے، میرے بھتیجے کے ساتھ تعلقات ہیں۔

س :۔ مشہور ہے کہ ڈاکٹر طوسی کو نواب صاحب کی والدہ نے بیٹا کہا تھا۔

ج :۔ کالاباغ کی والدہ بڑی باپردہ تھیں۔ وہ ڈاکٹر طوسی کو اپنی جائیداد میں سے دس مربعے دے گئی تھیں۔ بعد میں نواب نے وہ مربعے دو لاکھ میں ڈاکٹر سے خرید لیے تھے۔ دس مربعے والی بات تو ڈاکٹر طوسی نے مجھے خود بتائی۔ دراصل یہ جو کالاباغ کا قتل ہوا ہے۔ اس میں یہ بھی ایک سبب تھا کہ اس نے اپنا پرائیویٹ خزانہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت اس خزانے میں ۹۸ لاکھ نقد تھا۔ اسی آدمی اس پر گارڈ تھے۔ طوسی کو نواب صاحب نے بلایا کہ لڑکوں سے میری صلح کرا دے۔ سارے ہی اس کے خلاف تھے ناں۔ بیٹے، بیٹیاں، بیوی۔ ایک دن یہ جا کے صلح کرا بھی آیا۔ نواب صاحب اسے ماڑی انڈس پر چھوڑنے آئے۔ ان لڑکوں کو کھڑک (سوجھ) گئی کہ خزانہ لاہور منتقل ہو رہا ہے۔



نواب امیر محمد خاں آف کالاباغ

یہ بات طوسی صاحب نے بھی بتائی کہ نواب صاحب روزہ رکھتے تھے۔ روزے رکھواتے بھی تھے۔ اس معاملہ میں بڑا سخت گیر تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے کہا۔ تو روزے نہ رکھ۔ اس نے کہا کہ لوگوں کو پتہ ہے کہ میں ساری عمر روزے رکھتا رہا ہوں۔ سختی سے لوگوں کو رکھواتا رہا ہوں۔ خود بھی روزہ نہیں رکھوں گا تو لوگ چہ میگوئیاں کریں گے۔ اس لیے میں رمضان لاہور گذارتا ہوں۔ یہ ساری باتیں جمع ہو گئیں۔ لڑکوں کو شک ہو گیا کہ یہ ۹۸ لاکھ ایک دفعہ لاہور شفٹ ہو گیا۔ تو پھر ہمیں کچھ نہیں ملنا۔ اس پر انہوں نے زیرو پوائنٹ رکھا ہوا تھا۔

س :۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا، خزانہ ساتھ لے جاتا تھا۔

ج :۔ نہیں، کسی جگہ بھی نہیں لے جاتا تھا۔ اُس وقت انہیں شک ہو گیا کہ ہم تو اس کے لیے اجنبی ہیں۔ دشمن ہیں۔ ہمدرد تو اس نے طُوسی کو سمجھا ہوا ہے۔ وہ تو دراصل حقیقت جانتے تھے کہ طوسی کے بیٹے کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔

س :عورتوں کے سلسلے ہیں۔

ج :۔ عورتوں کا اتنا خاص نہیں سُنا۔

س :۔ اور شراب مشرُوب؟

ج :۔ یہ نہیں تھا۔

س :۔ مشہور تھا کہ گورنر ہاؤس میں بچوں کو نہیں آنے دیتا تھا۔

ج :۔ یہ بھی سن لو۔ اس کا ایک بیٹا لغاریوں کا داماد ہے۔ الہ یار اس کی گورنری کے زمانے میں وہ گورنر ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا صبح وہ باپ سے ملنے کے لیے گیا۔ اسے سٹاف نے روک دیا کہ آپ نے ملاقات کا ٹائم نہیں لیا ہوا۔ اس نے آ کے سامان موٹر میں رکھ لیا۔ اور کہنے لگا میرے باپ کو پیغام دے دینا کہ جب میں یہ فیصلہ کر لوں گا کہ میں آپ کا بیٹا نہیں رہا اور میں نے ملاقات کے لیے ٹائم لینا ہے، تبھی آؤں گا۔ وہ پھر کالا باغ گیا ہی نہیں۔ اس قسم کی تھی صورت حال۔ اس کا بیٹا مظفر تو پنڈی کے ویسٹ پاکستان ہاؤس میں ٹھہرتا تھا۔ وہاں گورنر کے دو سوئٹ تھے۔ ہم وہاں عام کمروں میں ٹھہرتے تھے۔ کالا باغ قتل ہو گیا۔ تب مظفر ہمارے ساتھ ٹھہرتا تھا جب مظفر آتا تھا۔ تو کالا باغ ڈر کے مارے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

س :۔ تبھی انہیں گورنر ہاؤس نہیں آنے دیتا تھا۔

ج :۔ یہ بات نہیں۔ وہ خود بڑی اینٹھ والے بندے تھے۔ مظفر ہمارا تو کولیگ تھا۔ بڑا سخت۔ بعض اوقات ہم بُرا بھی محسوس کرتے تھے جتنی بات کرو اتنی کا ہی جواب دیتا ہے۔ بڑا نارمل۔

جس روز کالا باغ قتل ہوا ہے۔ میں کسی مذہبی جلسے کے سلسلے میں سرگودھا میں تھا۔ دراصل نواب قزلباش نے مجھے فون کیا تھا کہ آپ آجائیں۔ میں چلا گیا تھا۔ میرا شاگرد ریاض وہاں مجسٹریٹ لگا ہوا تھا۔ میں اس کے ہاں ٹھہرا۔ سرگودھا سے ہم پانچ بجے شام چلے۔ اس سے پچھلی رات اس کا قتل ہو چکا تھا۔ لیکن حیرت کی بات تھی۔ سرگودھا میں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ وہاں دوپہر کا جو کھانا تھا۔ اس میں بڑے اہم لوگ تھے۔ کسی جگہ کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ پانچ بجے میں ریاض کے پاس سے چلا ٹھیک نو بجے میں سیالکوٹ اپنے گھر پہنچا۔ میرے گھر کے باہر اندھیرا تھا۔ میرے بھائی نے مجھے دیکھ لیا۔ آواز دے کے پوچھا۔ آ گئے ہو۔ میں نے کہا "آ گیا ہوں" کہنے لگا۔ آپ نے سن تو لیا ہو گا۔" میں نے پوچھا

کیا؟ "کالا باغ کے متعلق کچھ نہیں سنا" میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگا۔" وہ قتل ہو گیا ہے"۔

اگلے دن میری ڈھاکہ کے لیے سیٹ بک تھی۔ وہاں اسمبلی سیشن تھا لوگ اپنے کام کے سلسلے میں آئیں۔ میں بات شروع کروں۔ کوئی سنے ہی ناں۔ میں بڑا ہی کانپا کہ مقام عبرت ہے۔ آٹھوں پہر لوگ باتیں ہی جس کی کرتے تھے۔ آج فوراً ہی موضوع بدل لیتے ہیں۔

چودھری ظہور الٰہی نے کالا باغ کے ہاتھوں بڑے ستم اٹھائے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بیٹوں نے اسے بڑی ذلت کے ساتھ دفنایا۔ قبر میں سے لاش نکالی۔ اسے جلا کر دریا میں بہا دیا۔

س:۔ آپ نے کہا کہ ظلم کالا باغ کرتا تھا۔ کھاتے ایوب خاں کے پڑتی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایوب خاں کی خواہش پر ایسا کرتا ہو۔

ج:۔ نہیں۔ ایوب اگر ظالم آدمی ہوتا تو اقتدار کیوں چھوڑ دیتا۔ وہ آدھا پاکستان مروا دیتا۔ وہ ظالم بالکل نہیں تھا۔ وہ ظالم بالکل نہیں تھا۔ وہ مسلمان بھی تھا۔ اسے اللہ کا بھی ڈر تھا۔

س:۔ یہ آپ کا مشاہدہ ہے۔

ج:۔ میرا یہ مشاہدہ ہے اور میں دعوے سے بھی کہہ سکتا ہوں۔

س:۔ اس دعوے کے ساتھ واقعاتی ثبوت؟

ج:۔ ثبوت یہ ہے کہ ملک میں ان کے خلاف ہنگامے ہو رہے تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں پارٹی میٹنگ بلائی۔ ہم نے کہا آپ سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں۔ آپ کو پارٹی کے ساتھ مشورہ کیے بغیر یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ آئندہ الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کرتے۔ وہ ہماری تقریریں سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ اللہ کی ذات دعا قبول کرتی ہے۔ جو لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں، جنہوں نے میری ماں، بہن اور بیٹی نہیں چھوڑی۔ کیا اللہ پاک ان کی نہیں سنتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ ان کی سنتا ہے۔ اللہ کو منظور نہیں کہ میں رہوں۔ اس لیے میں چھوڑ رہا ہوں۔ میرے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

س:۔ کالا باغ کے ساتھ ایوب خاں کے اختلافات کا پس منظر کیا تھا۔

ج:۔ ایک تو کالا باغ کے متعلق یہ تھا کہ یہ امریکہ نواز ہے۔ دوسرے ایوب کا دماغ کالا باغ ہی خراب کرتا تھا۔ لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم یہ کرتا تھا۔ کھاتے ایوب خاں کے پڑتی تھیں۔ یہ جو ایوب خاں کے لڑکوں کو بدنام کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ یہ بھی امریکن لابی تھی جس میں کالا باغ براہ راست ذمہ دار تھا۔ وہ بعض صحافیوں پر مہربانی کرتا تھا۔ وہ گورنر کے تو قریب تھے۔ اس کی تعریف کرتے تھے۔ ایوب خاں اور اس کے بیٹوں کو رگڑ دیتے تھے۔ کہتے تھے یہ تکنیک ٹھیک ہے۔

س:۔ ویسے ایوب خاں کے بیٹے بے قابو نہیں تھے۔

ج:۔ نہیں۔

س:۔ ان دنوں مشہور تھا کہ کاریں اٹھا لیتے ہیں، لڑکیاں اٹھا لیتے ہیں۔

ج:۔ تھوڑی بہت ہوئی ہے بات۔ یحییٰ خاں کے بیٹے نے بھی کسی فارنر پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس نے پھر

اسے باہر بھیج دیا۔ اس وقت یحییٰ خاں پریذیڈنٹ تھا۔

موسیٰ خاں کتنا شریف آدمی تھا۔ پولیس اس کے بیٹے کو تلاش کر رہی تھی کہ وہ کسی لڑکی کو لے گیا تھا۔ وہ لڑکا مرگیا۔ موسیٰ خاں کی خلاصی ہوگئی۔ موسیٰ خاں بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ۶۵ء کی جنگ میں وہ کمانڈر انچیف تھے۔ کہتے ہیں کہ کنٹرول روم میں مصلیٰ بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ ۷۱ء کی جنگ میں یحییٰ خاں نے شراب کی بوتل ہی نہ چھوڑی۔

س :۔ ایوب خاں کے متعلق مشہور تھا کہ وہ وزیروں کو گالیاں دیتے تھے۔

ج :۔ جس طرح فوجی ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی ایک آدھ لفظ بول دیا مجھے تو شاہ صاحب کے بغیر نہیں پکارتے تھے۔ میرا بڑا ریگارڈ کرتے تھے۔ میری بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ میری بات کا بھی بڑا ریگارڈ کرتے تھے۔

س :۔ شروع میں بھٹو صاحب کے ساتھ بھی ان کا پیار مشہور تھا۔ یہ بھی سُنا ہے وہ انہیں ڈیڈی کہتے تھے۔

ج :۔ یو این او میں کوئی بڑا اہم سیشن تھا۔ بھٹو اس میں بڑی اچھی پرفارمنس دے کے آئے تھے پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس میں پارٹی میٹنگ تھی۔ وہاں پریذیڈنٹ نے ان کے گلے میں ہلال پاکستان پہنایا۔ جس طرح انہیں پہنایا، پریذیڈنٹ کی طرف سے شفقت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بھٹو کا رویہ بڑا بے نیازی والا تھا۔ پریذیڈنٹ صاحب کا رویہ بڑا پیار والا تھا۔

س :۔ پھر ایوب خاں سے اختلاف کیونکر ہوا۔

ج :۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ بھٹو صاحب کی پوزیشن ٹھیک نہیں رہی۔ ایوب صاحب دونوں بلاکوں کے نمائندوں کو نکالنا چاہتے تھے۔ وزیر خزانہ شعیب اور گورنر کالا باغ امریکہ کے اور بھٹو چین کے آدمی متصور ہوتے تھے۔ بھٹو صاحب تاشقند جانے والے وفد میں بھی شامل تھے۔ ڈیفنس سیکرٹری نذیر نے مجھے تاشقند جانے سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہاں یہ کچھ ہوگا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں ہٹ جائیں گی کشمیر کا فیصلہ نہیں ہوگا۔

اس وقت یو این او میں امریکہ کی لیڈر شپ تھی۔ روس کی پوزیشن بعد میں بہتر ہوئی ہے۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو گھانا کے صدر نکرومہ، الجزائر کے صدر بن بیلہ اور پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے مل کے ایک متوازی تنظیم پلان کی۔ یہ چین کی لیڈر شپ چاہتے تھے۔ یہ افریشیائی کانفرنس الجزائر میں ہونے والی تھی۔ بھٹو صاحب ولایت چلے بھی گئے تھے۔ اگلے روز انہوں نے الجزائر پہنچنا تھا کہ بن بیلہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ نکرومہ گھانا جا ہی نہ سکے۔ ان کا بھی تختہ الٹ گیا۔ بھٹو کو بھی ہٹا دیا گیا۔ بعد میں سوئیکارنو کے خلاف بھی ہنگامہ ہوگیا۔

س :۔ بھٹو صاحب جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کانووکیشن پر آنے والے تھے۔ خبر بھی آگئی تھی۔ لیکن پھر خبر آئی وہ چلے گئے ہیں۔

ج :۔ جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کے وائس پرنسپل جو بعد میں پرنسپل بھی ہوگئے تھے چودھری رشید مرحوم۔ وہ اور انجمن اسلامیہ کا ایک آدمی میرے پاس پنڈی آئے کہ وہاں کانووکیشن ہوئے دو سال ہوگئے ہیں سٹوڈنٹس کی ڈیمانڈ ہے کہ کانووکیشن اس وقت کی جائے جب بھٹو صاحب وقت دیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ کئی باتیں پہلے مشہور ہوجاتی ہیں۔ اوّل تو جس دن کی آپ تقریب مقرر کر رہے ہیں، اس وقت تک بھٹو صاحب وزیر نہیں رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بھی اُن کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ کیونکہ آپ کا صوبائی معاملہ ہے۔ گورنر کالا باغ آپ سے ناراض ہوجائیں گے۔ آپ کی گرانٹ بند ہوجائے گی۔ وہ کہنے لگے۔ یہ طالب علموں کی ڈیمانڈ ہے۔ اس لیے آپ ان سے بات کریں میں نے بھٹو صاحب کو ٹیلی فون کیا کہ سیالکوٹ

سے کچھ آدمی آئے ہیں۔ کہنے لگے آپ اتنے بجے آجائیں۔ میں نے کہا۔ میرا پریذیڈنٹ سے انٹرویو ہے۔ اس کے پہلے یا بعد ہی آسکتا ہوں۔ کہنے لگے۔ اچھا پھر وہاں سے فارغ ہو کے سیدھا میرے پاس آجانا۔ میں نے ان دونوں کو اسمبلی اتار کر آپ یہاں میرا انتظار کریں۔ پریذیڈنٹ صاحب سے فارغ ہو کر میں آپ کو لے لوں گا۔ پھر بھٹو صاحب کی کوٹھی چلیں گے۔ بھٹو صاحب ان دنوں اسمبلی نہیں جاتے تھے۔ میں پریذیڈنٹ ہاؤس گیا تو میری ملاقات میں ابھی آدھا گھنٹہ رہتا تھا۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہاں میں اخبار پڑھ رہا تھا جس میں لکھا تھا کہ نئے امریکی سفیر نے کراچی ٹھہرنا تھا۔ وہ وہاں نہیں ٹھہرا سیدھا راولپنڈی گیا ہے۔ تو جس وقت میں ریسپشن میں بیٹھا تھا، پتہ چلا کہ امریکی سفیر پریذیڈنٹ صاحب کے ساتھ بیٹھا ملاقات کر رہا ہے۔ اتنے میں ان کا اے ڈی سی میرے پاس آیا۔ ”سر آپکی ملاقات میں ابھی آدھا گھنٹہ رہتا ہے اگر آپ اب ملنا چاہیں تو پریذیڈنٹ صاحب فارغ ہیں“۔ میں اندر گیا۔ ان دنوں شائد ان کے پیر میں کچھ تھا۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے پورا وقت دیا بلکہ میں نے محسوس کیا کہ مجھے فارغ کرنے میں انہیں جلدی نہیں۔ لیکن جب میری باتیں ختم ہو گئیں تو میں نے اجازت لے لی۔ واپسی پر چودھری رشید اور ان کے ساتھی کو اسمبلی سے ساتھ لیا۔ بھٹو صاحب کی کوٹھی پہنچے۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ انہیں پریذیڈنٹ ہاؤس سے کال آئی تھی، وہاں گئے ہیں۔ کہنے تھے۔ شاہ صاحب آئیں۔ تو انہیں بٹھانا۔ ان سے معذرت کرنا کہ پریذیڈنٹ سے میری ملاقات کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ فارغ ہو کے میں سیدھا یہیں آؤں گا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ مجھے وہیں پتہ چل گیا کہ ڈرا پ سین ہو گیا ہے۔ کیونکہ فضا میں یہ بات تو تھی کہ آج گیا، کل گیا۔ بیگم صاحبہ آئیں۔ ڈرائنگ روم میں انہوں نے جھانکا۔ مجھے تو وہ جانتی تھیں۔ چونکہ وہ دو آدمی بھی میرے ساتھ تھے۔ اس لیے واپس چلی گئیں۔ ڈرائنگ میں تجریدی آرٹ کی دو تصویریں آویزاں تھیں۔ پھر ان کا بیرا آیا۔ اس نے وہ تصویریں اتاریں۔ مجھے مزید کنفرم ہو گیا۔ کیونکہ ذہن میں واقعات تو تھے۔ ان کی کڑیاں ملتی گئیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری پھر آیا۔ کہنے لگا۔ صاحب کا ٹیلی فون آیا ہے کہ میں اسمبلی سے ہو کر آتا ہوں۔ شاہ صاحب سے کہنا میرا انتظار کریں۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ سیالکوٹ میں ایک چھاتو چھاتو کر کے بدمعاش عورت ہے اس کا جوائی شبیر عورتیں سپلائی کرنے میں بدنام تھا۔ اتنا کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ اس کا کئی قسم کے لوگوں سے تعلق تھا۔ سیاستدانوں کے ساتھ بھی، اوروں کے ساتھ بھی۔ اس ضمن میں اس کی بھٹو صاحب کے ساتھ بھی واقفیت تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میرے تو وہ موکل بھی رہے تھے۔ اس کی آنکھوں آنسو تھے۔ میں نے کہا۔ مجھے بات محسوس ہو چکی ہے۔ پرائیویٹ سیکرٹری پھر اندر آیا۔ پھر میں نے چودھری رشید وغیرہ سے کہا۔ نظر آ رہا ہے کہ بات ختم ہو گئی ہے۔ جس مقصد کے لیے ہم آئے تھے۔ وہ موقعہ ہی نہیں رہا۔ اب چونکہ آیا ہوا ہوں۔ ان سے مل لیتا ہوں۔ لیکن جب وہ نہ آئے تو تھوڑا مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا۔ میں کل آؤں گا۔

میں پھر اگلے روز بھٹو صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ ایک طرح کی الوداعی ملاقات کے لیے۔ اس وقت اُن کے پاس ملک قاسم، غلام مصطفیٰ کھر اور کمشنر راولپنڈی ایم ایچ شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایم ایچ شاہ جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کے سگے بھائی ہیں۔

س :۔ اس وقت بھٹو صاحب کے کیا جذبات تھے۔ سنا تھا کہ وہ ذہنی طور پر وزارت سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ج :۔ بھٹو صاحب نے جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگے الیکشن کے دنوں میں مجھے ۱۰۴ درجے کا بخار

تھا۔ پریذیڈنٹ نے مجھے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹروں نے مجھے منع کیا ہوا ہے۔ اس لیے یہ میرے لیے خطرناک ہے۔ پریذیڈنٹ کہنے لگے۔ نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ تو ٹھیک ہو جائے گا چنانچہ انتخابی مہم کے دوران میں وہ مجھے ساتھ لیے پھرتے رہے۔ تقریریں بھی کراتے رہے۔ اب میں اچھا بھلا ہوں اور مجھے کہتے ہیں کہ تو بیماری کی چھٹی پر چلا جا۔ کیونکہ امریکہ نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالا ہوا ہے۔ کچھ وقت کے بعد میں تجھے پھر کابینہ میں لے لوں گا۔

بھٹو صاحب جوش میں باتیں واتیں کرتے رہے۔ اس کے دوسرے دن کھر وغیرہ انہیں ریلوے سٹیشن پر الوداع کرنے چلے گئے۔ نوجوان آدمی تھے۔ اب کھر کو کالا باغ نے ممبر کر لیا ہوا تھا۔ گو رہا نیوں کے مقابلے میں۔ اس نے کھر کو دھمکایا کہ ہماری تخلیق ہو کے ہمارے ہی خلاف جاتا ہے۔ کھر پر سختیاں ہوئیں۔ برداشت کر گیا۔ پھر بعد میں اس کو اس کا انعام بھی ملا۔ گورنر بنا۔ وزیر اعلیٰ بنا۔

کھر بھٹو کے قریب کیسے ہوا؟ اسمبلی میں حروف ابجد کے حساب سے غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر کی سیٹیں اکٹھی تھیں۔ سندھی ممبر بھٹو کے پاس جا کے بیٹھتے تھے۔ لاٹ گفتگو کرتے تھے جتوئی تو معقول آدمی تھا۔ بہر حال یہ فضا تھی۔ کھر بھی پھر سندھیوں کے ماحول میں چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ان میں ایڈجسٹ ہو گیا۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ تقریر مصطفیٰ جتوئی نے کی۔ اخباروں میں نام مصطفیٰ کھر کا آ گیا پھر اس نے ایک دوبار بولنے کی کوشش کی اسے موقعہ ہی نہیں ملا۔ پھر جب بھٹو وزارت سے ہٹا ہے اور کالا باغ کھر کے پیچھے پڑا ہے تو کھر کو تقریر یاد کرائی گئی جس طرح بچوں کو سبق نہیں رٹاتے۔ بلکہ مجھے یاد ہے ہم کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ وہاں ہندوستان کا ہائی کمشنر اور بلجیم کا سفیر بھی تھا۔ ہم نے انہیں کہا، آیئے ہمارے ساتھ چائے پیئیں۔ وہ بیٹھ گئے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ممبروں سے ملیں جلیں۔ اسمبلی میں تقریر ہوتی تھی تو کیفے ٹیریا میں بھی سنی جاتی تھی۔ جب سپیکر نے تقریر کے لیے کھر کا نام لیا تو یہ دونوں، انڈین ہائی کمشنر اور بلجیم کا سفیر تقریر سننے کے لیے اٹھ کے چلے گئے۔ کیونکہ گورنمنٹ کو گالیاں پڑنی تھیں۔ اور انہوں نے خوش ہونا تھا۔

جب کھر کو پارٹی سے نکالا گیا تو میں اسے دلاسا دیتا تھا۔ اس وقت میں نے صبور خاں سے کہا کہ یہ زیادتی نہ کرو۔ آپ کے لیے یہ چیز نقصان دہ ہو گی کہ آپ ممبرز کو نکالے جا رہے ہیں۔ بھٹو اکیلا گیا ہے۔ آپ نے اپنی اس حرکت سے اپنے ممبر اس کے ساتھ ملا دیے ہیں۔ ہاؤس کے اندر اس کی پارٹی بن جائے گی۔ بہر حال۔

س: ۔لاڑکانہ جاتے ہوئے بھٹو صاحب کی ٹرین لاہور پہنچی تو کالا باغ نے انہیں گورنر ہاؤس بلایا تھا۔

ج: ۔ کالا باغ نے انہیں دعوت دی تھی۔

س: ۔ دونوں میں مخالفت بھی بہت تھی۔

ج: ۔ اب دونوں کی چھیڑ جو ہو رہی تھی۔

س: ۔ ڈکٹیٹر کہ ہو گیا۔

ج: ۔ جی ہاں۔

س: ۔ ایک طرف تو آپ کہہ رہے ہیں کہ کالا باغ نے بھٹو صاحب کا ساتھ دینے پر کھر کو دھمکایا۔ دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ کالا باغ نے بھٹو کو دعوت دی۔

ج: ۔ یہ کالا باغ کی پالیٹکس تھی کہ ایوب صاحب کو دکھانے کے لیے کچھ سختی بھی کرو۔ لیکن بھٹو سے معاملہ بھی

ٹھیک کر لیا۔

س: بھٹو صاحب کو تو امریکہ نے نکلوایا۔ بقول آپ کے وزیر خزانہ شعیب امریکہ کا آدمی تھا۔ انہیں کس نے نکلوایا؟

ج:۔ شعیب کو توازن رکھنے کے لیے نکالا گیا۔

س:۔ بقول آپ کے امریکہ کے کہنے پر بھٹو صاحب کو وزارت سے تو نکال دیا گیا۔ لیکن جنگ کے دوران خود امریکہ کا رویّہ ہمارے حق میں نہیں تھا۔

ج:۔ انہوں نے اپنے ہر ساتھی کو لیٹ ڈاؤن ہی کیا ہے۔ بلکہ ایوب صاحب امریکہ گئے تو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ انہوں نے مسلم لیگ (کنونشن) کی ورکنگ کمیٹی میں بتایا۔ کہنے لگے، مجھ سے پوچھو تو سہی کہ وہاں میرے ساتھ ہوا کیا۔ پھر انہوں نے خود ہی بیان کرنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے میں گیا جا کے بیٹھا ہی تھا کہ (امریکی) صدر جانسن نے خود ہی بات شروع کر دی۔ اس نے مسٹر پریذیڈنٹ بھی نہیں کہا، کہنے لگا

Go and Patch up with India (جاؤ اور انڈیا سے معاملہ طے کرو)

Please listen to me ایوب صاحب کہتے ہیں، میں نے جانسن سے کہا۔

(مہربانی فرما کر میری بات سنیں)۔ اس پر اس نے کہا۔

I have told you, go and patch up with India or shut up.

(میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ جاؤ اور انڈیا سے معاملہ طے کرو یا پھر بکواس بند کرو) کہنے لگے۔ میں تو وہاں یہ سلوک کرا کے آیا ہوں۔ ایوب خاں نے یہ بات اپنی کیبنٹ کو بھی نہیں بتائی۔ ورکنگ کمیٹی کو بتائی۔

س:۔ شاہ ایران کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اس خطے میں امریکہ کا پولیس مین ہے۔ لیکن ۶۵ء کی جنگ میں یہ بات عام تھی کہ اس نے ہماری بہت مدد کی ہے۔

ج:۔ ۶۶ء میں ایک پارلیمانی وفد ایران گیا۔ اس میں میں بھی تھا۔ دوسرے ہی دن شاہ ایران سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ لوگوں سے ملے ہیں۔ ہم نے کہا کہ پروگرام آپ کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے ہم ہٹ نہیں سکتے۔ پھر پوچھا۔ آپ میں سے ایک صاحب کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ وہ صاحب کون ہیں۔ عبدالجبار خاں نے میرے متعلق بتایا کہ یہ ہیں۔ پھر شاہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگے۔ میں نے کہا، جنہیں یہ پتہ ہے کہ وفد میں ایک رکن سیالکوٹ کا ہے۔ ان سے کوئی بات چھپی ہے۔ بہر حال ہم نے بتایا اور ان کی تحسین کی کہ جنگ میں آپ نے ہماری جتنی مدد کی ہے۔ اتنی کبھی کسی اور ملک یا قوم نے نہیں کی۔ کہنے لگے۔ جتنی ہم کرنا چاہتے تھے۔ شاید اتنی نہ کر سکے ہوں۔

س:۔ بڑی طاقتوں کے دباؤ بھی ہوتے ہیں ناں۔

ج:۔ امریکہ والوں نے انہیں منع کیا تھا کہ پاکستان کی مدد نہ کرو۔ اس کے باوجود شاہ ایران نے ہماری مدد کی۔ اس وقت ایران میں ہمارے جو سفیر تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جنگ کے دوران میں شاہ نے جہازوں کی مرمت کے بہانے اپنی ساری ایئر فورس پاکستان بھیج دی تھی۔ اور اپنی فوجیں افغانستان کے بارڈر پر لگا دی تھیں۔

س:۔ اگر افغانستان پاکستان کے ساتھ کوئی گڑبڑ کرے تو اس سے نپٹا جا سکے۔

ج:۔ جی ہاں۔

س :۔ وہ تو پھر پاکستان کے دوست تھے۔

ج :۔ اتنا دوست کہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے ہماری بڑی مدد کی بے حد۔

س :۔ جنگ کے دوران میں سنا تھا کہ شاہ نے پاکستان سے کہہ دیا ہے کہ جتنا مرضی تیل استعمال کرو۔

ج :۔ تیل تو وہ آپ کی نیوی کو آخیر تک دیتے رہے ہیں۔

س :۔ جنگ کے زمانے میں۔

ج :۔ بعد میں بھی۔

س :۔ امریکہ کے ساتھ تعلق کے باوجود ان کی یہ بڑی جرأت تھی۔

ج :۔ وہ ہمارا بہترین دوست تھا۔ اتنا کبھی کسی نے کیا ہی نہیں۔

س :۔ یہ پروپیگنڈا ہی تھا کہ پاکستان کے بارے میں اس کی نیت بُری تھی؟

ج :۔ یہ لابی باہر کے ملکوں کی ہے۔ جب ہم اس قسم کی بکواس کرتے ہیں تو زیادہ تر ہمیں باہر سے اشیر باد حاصل ہوتی ہے۔

س :۔ بعض لوگ تو اب بھی یہی کہتے ہیں کہ پاکستان پر اس کی بُری نظر تھی۔

ج :۔ پاکستان سے اس نے کیا لینا تھا۔

س :۔ آریائی نسل ہونے کے حوالے سے وسیع تر ایران۔

ج :۔ ایک دن ہماری ایرانی پارلیمنٹ کے ممبران کے ساتھ پارٹی تھی۔ وہ جرنیلوں وغیرہ کے بھائی بند ہی تھے۔ ایک کہنے لگا۔ ہم ایران والے، آپ پاکستان والے اور ہندوستان والے تو ایک ہوئے کیونکہ ہم آرین (آریائی نسل) ہیں۔ ہم تو ایک ہو سکتے ہیں۔ عرب ہمارے ساتھ کس طرح ایک ہو سکتے ہیں۔

س :۔ شاہ ایران سے کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

ج :۔ امیر عباس ہویدا ان کے وزیر اعظم تھے۔ شاہ کے بعد ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے تب کے دوران میں بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ تو پاکستان جا اور صدر ایوب سے کہہ کہ میں آپ کا وزیر اعظم ہوں۔ آپ جو بھی حکم دیں گے۔ میں وہ بجا لاؤں گا۔

س :۔ بقول آپ کے کالا باغ امریکہ کے کہنے پہ گئے۔ بھٹو صاحب امریکہ کے دباؤ کے تحت گئے اور ایوب خاں کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج :۔ آہستہ آہستہ بیوروکریسی نے ان پر اتنا قابو پا لیا تھا کہ اپنے ہاتھ دکھانا شروع کر دیئے۔ خاص طور سے جب وہ بیمار ہوئے۔ اس کے بعد تو وہ بیوروکریسی پر انحصار کرنے لگے تھے۔

س :۔ دل کی بیماری تھی۔

ج :۔ پہلے تو انہیں ہرنیاں کی تکلیف تھی۔ ڈاکٹر امیر الدین نے آپریشن کیا۔ ملکہ ٹانکے بھی خود ہی کھولے۔ اس وقت بھٹو صاحب ابھی فارن منسٹر تھے۔

س :۔ اقتدار سے الگ ہونے سے سال ڈیڑھ سال پہلے جو بیمار ہوئے تھے۔ اس کی نوعیت کو عوام سے راز میں رکھا گیا تھا۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ مرحوم منظور قادر نے مجھے بتایا تھا کہ اس بیماری سے ان کی قوتِ فیصلہ متاثر ہو گئی تھی۔ کوئی سخت قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔

ج :۔ ایوب خاں صاحب شراب تو پیتے تھے ناں۔ اس وقت سنٹرل انٹیلی جنس بیورو کے چیف این اے رضوی تھے۔ ان کا بیٹا میرا داماد ہے۔ ویسے بھی ہمارے بڑے بڑے تعلقات تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس قسم کے کیمیکلز ہوتے ہیں کہ شراب میں ملانے دینے سے شراب کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تقریباً پائزن ہی ہوتا ہے۔ اس سے انسان مفلوج ہو جاتا ہے۔ خان عبدالصبور خان، چودھری فضل الٰہی، سید علی اصغر شاہ اور حنیف خاں مانسہرے والا یہ چاروں بڑے گہرے دوست تھے۔ تقریباً ہر وقت اکٹھے رہتے تھے۔ جب ایوب خاں صاحب صدارت سے ہٹ چکے تھے تو یہ چاروں سوات جا کے ان سے ملے۔ وہاں جو باتیں ہوئیں صبور خاں اکیلا ہوتا تو شائد نہ بتاتا۔ ایوب صاحب نے کہا، صبور خاں مجھے پتہ ہے کہ تو مجھے گالیاں دیتا رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ حالات کے تقاضے تھے۔ بیوروکریسی کو چھوڑیں تو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ پتہ نہیں آپ سب مل کے میرے خلاف کیا۔ ازٹیگ کرتے تھے پھر کہنے لگے مجھے پتہ نہیں کیا دیتے رہے ہیں۔ میں کوئی فیصلہ ہی نہیں لے سکتا تھا۔ مجھ میں تو کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ان حالات میں کیسے رہ سکتا تھا۔

س :۔ ڈاکٹر دیتے رہے۔

ج :۔ ان پر بیوروکریسی والے حاوی تو ہو گئے تھے۔ اس میں فوج والے بھی شامل تھے۔ سول والے بھی شامل تھے۔ اور ایسے بھی سول والے ہیں۔ جو ان کے زمانے میں بھی برسرِ اقتدار تھے۔ یحییٰ خاں کے زمانے میں بھی رہے۔ کوئی تو وجہ ہو گی کہ وہ اتنا عرصہ رہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی رہے۔ جو آج چوتھے دورِ حکومت میں بھی ہیں۔ یا تو وہ سُپر پاورز کے آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے آدمی ہر جگہ گھسیڑے ہوتے ہیں۔ یا پھر ان افراد میں ایسی خوبی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ معاملہ مل جاتا ہے۔

س :۔ جو چار دفعہ رہے ان میں کون کون ہیں؟

ج :۔ یہ آپ کا وزیر خزانہ غلام اسحٰق خاں اور آغا شاہی۔ یہ دو آدمی تو چاروں ادوار میں آپ کو نظر آئیں گے۔

س :۔ قدرت اللہ شہاب بھی کئی ادوار میں رہے ہیں۔ مثلاً غلام محمد، سکندر مرزا۔ ایوب خاں اور یحییٰ خاں اور غالباً بھٹو کے دور میں بھی۔

ج :۔ میرے دل میں اس شخص کے لیے بڑا احترام ہے۔

س :۔ کس حوالے سے۔

ج :۔ اس لیے کہ یہ بڑا باقاعدہ۔ بڑا خود دار، بڑا لائق آدمی ہے۔ اور بہت محبِ وطن، اس میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انفارمیشن اور تعلیم کے سیکرٹری رہے ہیں۔ دونوں حیثیتوں میں ان کا پریذیڈنٹ (ایوب) سے رابطہ ہوتا تھا۔ ہیڈ آف دی سٹیٹ خواہ کتنا ہی لائق آدمی ہو تقریریں اس کی یہی لوگ لکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ مصروف ہوتا ہے۔ شہاب جیسی انگریزی شائد ہی کوئی لکھ سکتا ہو۔ ان کے والد جموں میں وزیر وزارت تھے۔ وزیر وزارت ڈپٹی کمشنر کو کہتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے عالمی مقابلے کے لیے ایک آرٹیکل لکھا اور ولایت والوں سے انعام جیتا۔ میں نے ان کا وہ آرٹیکل پڑھا ہے سٹوڈنٹ لائف میں انہوں نے چین وزٹ کیا تھا۔ ان کے سسرال سیالکوٹ چھاؤنی میں پٹیل

تھے۔ فراہم انجینیئرز کا مالک ان کا سالا تھا۔

جب ہم نیشنل اسمبلی کے ممبر ہو کے گئے ہیں۔ یہ ایجوکیشن یا انفارمیشن کے سیکرٹری تھے۔ ہمیں ہمارے سٹریٹ میں اکاموڈیٹ کیا گیا۔ جہاں مجھے ٹھہرایا گیا۔ اگلی کوٹھی ان کی تھی۔

پھر یہ بھی تھا کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میں چودھری محمد حسین کے ۱۵-۱۶ لاکھ کے شیئرز تھے۔ پھر گورنر کالاباغ نے چودھری ظہور الٰہی کے ۳۰-۳۵ لاکھ کے شیئرز ڈلوا دیے۔ مینجمنٹ چودھری ظہور الٰہی کے پاس چلی گئی۔ چودھری محمد حسین نے رشتے داروں وغیرہ سے پیسے اکٹھے ہوتے کیے تھے۔ انہیں دفتر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ ان دنوں چودھری محمد حسین بڑے پریشان تھے۔ ان کے لیے ہم پریذیڈنٹ صاحب سے بھی جا کے ملے۔ شہاب صاحب بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ لیکن کھل کے نہیں کر سکتے تھے۔

س :۔ سنا ہے۔ ایوب خاں کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے تھے۔ اور انہیں بادشاہ سلامت کہتے تھے۔

ج :۔ بہرحال یہ ضرور تھا کہ انہوں نے اپنی پوزیشن کو شو آف نہیں کیا قابل آدمی تو ضرور تھے لیکن بڑے عاجز۔ میرے دل میں کسی سیکرٹری یا بیوروکریٹ کے لیے اتنا احترام نہیں جتنا ان کے لیے ہے۔ میں تو دل و جان سے ان کی تعریف کرتا ہوں۔ ان کی قابلیت، ان کا رویہ، ان کے طور، ان کے طریقے۔ جبکہ عالم یہ تھا کہ جن لوگوں کو پریذیڈنٹ کا تھوڑا سا بھی قرب مل جاتا تھا، ان کی گردن کا اکڑاؤ ہی ختم نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ عام آدمی کو سیکرٹری سے کیا۔ اسکو تو سپاہی سے۔ تھانیدار سے کام پڑ سکتا ہے یا پھر ڈی سی سے۔ ۹۹ فی صد کا تو ان سیکرٹریوں سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا لیکن ان کی حالت یہ ہوتی ہے۔ بقول غالب ؎

بنا ہے شاہ کا مصاحب اور پھرے ہے اِتراتا
ورگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔

س :۔ اس کیٹیگری میں کون نمایاں تھے۔

ج :۔ سارے ہی تھے۔ کس کس کا نام لیں۔ ہماری بدنصیبی کا باعث ان لوگوں کا رویہ اور طرزِ عمل ہے۔ انگریز جو روایات چھوڑ گئے۔ وہ انہوں نے سینے سے لگا رکھی ہیں۔ اس وقت تو یہ فارن گورنمنٹ کے نمائندے یا کارندے تھے۔ اب تو سارا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ اب تو پرسٹیج قوم کی پرسٹیج ہے۔ شہریوں کی پرسٹیج ہے۔ اسے انہوں نے کسی خانے میں ہی نہیں رکھا ہم یہاں سیالکوٹ میں موجود ہیں۔ پریڈوں میں ایک دو دفعہ گئے۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ انہیں پریشانی ہوتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی رینک کے اعتبار سے کوئی حیثیت ہی نہیں۔ یہ لوگ کہیں آخر میں آتے ہیں۔ لیکن ان کا رویہ دیکھیں۔ ان کا تو چپڑاسی مان نہیں۔

نیشنل اسمبلی کا ممبر تو لیفٹیننٹ جنرل سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ کیڈٹس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ پہ سارے والدین جاتے ہیں۔ میرے لڑکے محسن کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ میں نے رسالپور جانا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل حمید جو ڈپٹی کمانڈر انچیف تھا چونکہ لیفٹیننٹ جنرل تھا۔ اس لیے ایم این اے سے جونیئر تھا۔ اکیڈمی والوں نے میرے بیٹے سے خاص طور سے پوچھا کہ آپ کے والد آئیں گے۔ اس نے کہا، ہاں انہوں نے آنا تو ہے۔ کہنے لگے۔ ہمارے لیے تو پھر پریشان کن صورت ہے، کیا کریں۔ محسن نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ میں تیرے باپ کی حیثیت سے آرہا ہوں، ایم این اے کی حیثیت سے نہیں۔

ہمارے ذہن میں کبھی یہ بات آئی نہیں کہ فلاں سے سینئر ہیں۔

س :۔ آپ کے خیال میں ایوب خاں کے زوال کے اسباب میں ایک بیوروکریسی بھی ہے۔

ج :۔ ایوب صاحب کے گرد بیوروکریسی کا گھیرا شروع میں کم تھا۔ بعد میں بہت ہو گیا تھا۔ مثلاً صبور خاں نے مجھے بتایا کہ پریذیڈنٹ کے ساتھ انٹرویو کرنے کے حالات بہت خراب ہیں۔ ان کا ملٹری سیکرٹری میجر جنرل رفیع لیڈر آف دی ہاؤس کو پریذیڈنٹ سے ملنے نہیں دیتا تھا۔ صبور خاں نے بتایا کہ میں تین دفعہ استعفیٰ دے چکا ہوں کہ مجھے ایوان کی قیادت سے ریلیو کر دیا جائے۔ لیکن جنرل رفیع اتنا گرد تھا کہ کسی کو انٹرویو ہی نہیں ملتا تھا۔

س :۔ ایوب خاں کو ہنگامہ آرائی کے ذریعے اتروانے میں بعض حلقے امریکہ کا بھی نام لیتے ہیں۔

ج :۔ یہ بات صحیح ہے، دراصل امریکہ سمجھتا تھا کہ ایوب صاحب اسے آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ اگر یہ مزید دو سال رہ گئے تو انہیں کوئی ہلا نہیں سکے گا۔ کیونکہ ایوب صاحب زراعت اور صنعت میں بڑی تیزی سے ڈویلپمنٹ کر رہے تھے۔ وہ اپنی اور پاکستان کی پوزیشن اس حد تک مستحکم کر رہے تھے کہ امریکہ کو پتہ چل گیا کہ دو سال بعد یہ ہماری نہیں سنے گا۔

س :۔ ۶۵ء کی جنگ میں امریکہ کے پاکستان کے بارے میں رول کے نتیجے میں ایوب خاں کا رجحان مسلم بلاک مستحکم کرنے کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

ج :۔ یہ بڑی سیاست تھی۔ ہمارا رجحان اس طرف نہیں تھا۔ ہم نے یہی سنا تھا کہ امریکہ کی یہ سوچ ہے کہ اگر ایوب صاحب اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تو ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

س :۔ ایوب خاں کے زمانے میں ایک سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ مشرقی پاکستانیوں میں یہ احساس ابھرا کہ حکومت میں انہیں کوئی شرکت حاصل نہیں۔

ج :۔ پریذیڈنٹ صاحب اس لائن پر سوچ رہے تھے کہ آئین میں ترمیم کر کے وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ قائم کیا جائے۔ وہ نورالامین کو پاکستان کا نائب صدر بنانا چاہتے تھے۔ اس موضوع پر انٹرویوز بھی ہوئے۔ پارٹیاں بھی ہوئیں۔ لیکن منعم خاں نے نہیں ہونے دیا۔ یہ چھوٹے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی برتری کی پوزیشن سامنے رکھی کہتے ہیں کہ پہلے منعم خاں، نورالامین کا غنڈہ تھا۔

س :۔ کہتے ہیں بنگالی عوام میں پاپولر ہونے کی وجہ سے اعظم خاں کو گورنری سے ہٹا دیا گیا۔

ج :۔ جنرل اعظم بڑے ایکٹو تھے۔ مشرقی پاکستان میں بہت پاپولر تھے۔ ایوب صاحب کو خیال آیا ہو گا کہ کل کو یہ میرے لیے میرا بن جائے۔

س :۔ اقتدار سے اترنے کے بعد ایوب خاں سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔

ج :۔ اقتدار سے اترنے کے بعد ایوب صاحب پہلے پریذیڈنٹ ہاؤس میں ہی رہے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس چھوڑنے کے لیے کہا گیا تو وہ سیدھے سوات گئے تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل رفاقت حسین سمبڑیال کے ہیں۔ انہوں نے جب شادی کی کرنل تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب ایوب صاحب کی جگہ یحییٰ خاں آ گیا تھا۔ میرے رفاقت حسین سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں ان کی شادی پر دو تین دن پہلے ہی راولپنڈی پہنچ گیا۔ سوچا کہ سوات ایوب صاحب سے بھی مل آؤں۔ سوات بھی دیکھ آئیں گے میں سوات ہوٹل میں جا کے ٹھہرا۔ ان کے پی اے کو فون کیا کہ

ان سے پوچھ کے بتاؤ۔ ملنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے "آپ سیالکوٹ والے ہیں"۔ میں نے کہا "جی" "جو وقت آپ کو سوٹ کرے۔ آپ آجائیں"۔ میں نے کہا "نہیں، جو وقت وہ بتائیں"۔ کہنے لگے "صبح ٹھیک رہے گا"۔ میں گیا تو وہ باہر نکل کے لان میں ٹہل رہے تھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی بڑی مہربانی تھی۔ بڑی نوازش تھی۔ کوئی چھ گھنٹے ان سے ملاقات رہی۔ اس کے بعد بھی ملتا رہا ہوں۔ اسلام آباد میں بھی ملاقات کی۔ چار انٹرویو تو مجھے یاد ہیں۔

س :۔ ان کے صدارت سے علیحدگی کے بعد جو آپ نے ان سے چھ گھنٹے کی ملاقات کی۔ اس دوران میں خوب باتیں ہوئیں۔

ج :۔ وہ باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں کرتے رہے۔

س :۔ کیا باتیں ہوئیں۔

ج :۔ اقتدار سے ہٹنے کے بعد وہ کسی کنٹروورسی میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ ان کے متعلق جو باتیں پریس میں آتی تھیں۔ اس ملاقات میں وہ ان کے جواب دیتے رہے۔

س :۔ مثلاً

ج :۔ مثلاً ایک تو انہوں نے تاشقند کا بتایا کیونکہ ان دنوں بھٹو نے اس بات پر بڑا زور دے رکھا تھا کہ میں تاشقند والی بات بتاؤں گا۔ ایوب صاحب نے مجھے بتایا کہ جب ہم وہاں گئے تو روسی وزیر اعظم کوسیجن نے مجھے اور شاستری (انڈین وزیر اعظم) سے کہا کوئی بات وات کرو۔ ہم نے باتیں شروع کیں تو شاستری کہنے لگا کہ کشمیر کے مسئلے پر تو میں گفتگو ہی نہیں کرتا۔ میں نے کہا اور تیرے ساتھ کوئی کرنے والی بات ہی نہیں۔ چنانچہ ہماری بات ایک آدھ منٹ میں ہی ختم ہو گئی۔ کوسیجن نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہوئی۔ میں نے کہا۔ میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا اس پر کوسیجن نے کہا، ہمارے اور امریکہ کے درمیان کونسی چیز مشترک ہے؟ ہمارے نظریات، ہمارے مفادات ہمارے عالمی مفادات، کوئی چیز کامن نہیں۔ ہم پھر بھی لڑاین اور میں بیٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ ڈسکشن کرتے ہیں۔ آپ بھی کچھ بات کریں۔ موسم کے متعلق ہی بات کریں۔ لیکن بات جاری رکھیں۔ پھر کانفرنس وغیرہ ہوتی رہیں پھر معاہدۂ تاشقند ہوا۔ میری حالت بڑی بری۔ میں بڑا پریشان اور افسردہ بیٹھا تھا۔ بھٹو میرے پاس آگیا۔ کہتا ہے "مبارک ہو سر"۔ میں آگے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "حرام ختوپ کس بات کی مبارک دے رہا ہے۔ ہم یہاں سے کیا لے کے چلے ہیں۔ اب یہ کہتا ہے کہ میں تاشقند والی بات بتاؤں گا۔ یہ کیا بتائے گا۔ میں تو کنٹروورسی میں نہیں پڑنا چاہتا"۔ حرام ختوپ ایوب صاحب کا تکیہ کلام تھا۔

س :۔ مسلم لیگ کے مستقبل پر گفتگو نہیں ہوئی۔

ج :۔ ہوئی لیکن اس میٹنگ میں نہیں۔ اس کے بعد ایک دفعہ میں انہیں اسلام آباد ملنے کے لیے گیا۔ یہ بھی پانچ گھنٹے تک رہی۔ کہنے لگے مسلم لیگ کو نہ مرنے دینا۔ اسی جماعت نے پاکستان بنایا تھا۔ قائم بھی یہی رکھ سکتی ہے۔ آپ پنجاب والوں کے پاس مسلم لیگ ایک امانت ہے۔ میں نے کہا جناب پنجاب نے تو ہر وقت قربانی دی ہے۔ آپ نے تو دوسرے صوبوں پر نوازشات کی تھیں۔ مثلاً پنجاب کے کمشنر زمیں سے کتنے آپ کے سرحد کے تھے۔ حالانکہ ان کے جو کولیگ تھے۔ کلاس فیلو تھے۔ اکٹھے انہوں نے سروس جائن کی تھی۔ وہ ابھی بمشکل ڈپٹی کمشنر بنے تھے۔ بغیر کسی میرٹ کے ایک آدمی دوسرے سے کچھ سٹیپ اوپر چلا جائے محسوس تو ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی کسی پنجابی افسر نے

آپ سے پروٹیسٹ کیا؟

س :۔ ایوب خاں نے اس سلسلے میں جانبداری کی ؟

ج :۔ جی، میں نے کہا۔ آپ کے سارے آدمی آپ کو چھوڑ گئے۔ کیا پنجاب والوں نے بھی آپ سے بے وفائی کی ؟ سندھ والے جن پر آپ کو اتنا بھروسہ تھا۔ وہ آپ کے خلاف گئے۔ انہوں نے آپکے خلاف دستخط کیے۔ جب ایوب صاحب کے خلاف ہنگامے ہو رہے تھے تو اسمبلی ممبران نے دستخطوں والا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ میں نے کہا۔ سندھ میں آپ کا دریا خاں کھوسو ماڈریٹ قسم کا آدمی تھا۔ یہاں تک کہ مصطفےٰ جتوئی بھی ماڈریٹ قسم کا آدمی تھا۔ کہنے لگے دریا خاں کھوسو باتیں کرتا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ہر صوبے کے ممبر آپ کے خلاف گئے۔ پنجاب والوں کا بتائیں ؟ کہنے لگے۔ آپ کے پنجاب کے ایم پی ایز نے دستخط نہیں کیے ؟ میں نے کہا۔ آپ کو سہارا دینے والے نیشنل اسمبلی کے ممبر تھے پنجابیوں کی طرف سے میں ڈپٹی لیڈر رہا تھا ہم نے آپ کو سہارا دیا۔ میں نے کہا۔ پاکستان بنتے وقت ہندوستان سے جتنے مہاجر آئے تھے۔ وہ زیادہ تر کو ذمہ داری تھی۔ ایسٹ پاکستان میں تو خیر قانون ہی اس قسم کا تھا کہ انہوں نے متروکہ جائیداد ڈیکلیئر نہیں کی۔ سندھ والوں کا ان کے ساتھ کیا رویہ تھا۔ وہاں ہنگامے ہوئے ہیں۔ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ سرحد میں قیوم خاں نے ہندوؤں کی متروکہ جائیداد اپنے دوستوں کی سیاسی نوازشات کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ انہوں نے بھی مہاجرین کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ساری ذمہ داری پنجاب پر آن پڑی۔ ہم نے انہیں معاشی طور پر برتری دی تھی۔ وہ سب معاملات میں چھائے ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔ ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ یہ پنجاب کی کنٹری بیوشن ہے۔ پھر اردو ہے۔ آپ کے سرحد میں پشتو ہے۔ سندھ میں سندھی ہے۔ بنگال میں تو شروع ہی سے لسانی مسئلے پر سٹوڈنٹ مر گیا تھا۔ ابھی تک ہماری جان نہیں چھوٹتی۔ پنجاب والوں کی زبان اردو تو نہیں۔ ان کی زبان پنجابی ہے۔ اس ایشو پر بھی ہم ہی مدعی بنے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو بھی ہم نے ہی سینے سے لگایا ہوا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ آپ نے ون یونٹ میں پنجاب کو چالیس فیصد نمائندگی دی ہے۔ جبکہ ان کی آبادی ۶۵ فی صد سے بھی زیادہ ہے۔ اس پر بھی انہوں نے شور نہیں مچایا۔ آپ پنجاب والوں سے کتنی قربانیاں مانگتے ہیں۔

پھر ایوب صاحب بتاتے رہے کہ میرے زمانے میں کس طرح انڈسٹری لگی۔ میں کراچی سے پشاور تک ریلوے میں سفر کرتا تھا۔ مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ اس حد تک ڈویلپمنٹ ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہے میں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔

کافی گفتگو رہی پھر میں نے کہا۔ میں نے آپ کا بڑا وقت لیا۔ کہنے لگے۔ نہیں بڑا اچھا وقت گزرا۔ باہر نکلے۔ آگے ملاقاتی انتظار میں تھے۔ ایوب صاحب نے انہیں انتظار میں رکھا کیونکہ دل کی باتیں وہ ہر کسی سے نہیں کرتے تھے۔ پھر گوہر سے کہا کہ شاہ صاحب کو سوار کر کے آؤ۔

س :۔ ان دنوں مسلم لیگ کے بھاری فنڈ لوگوں میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے اور مسلم لیگیوں میں وجہ نزاع ان کا ذکر نہیں آیا۔

ج :۔ ایوب صاحب ملک کی صدارت سے الگ ہو گئے تھے لیکن ابھی وہ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ تھے۔ تاہم مستعفی ہونے کا سوچ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا جانشین کون ہوگا۔ ہماری رائے یہ تھی کہ صدارت ایسٹ پاکستان کو جانی چاہیے۔ جنرل یحییٰ خاں (تب صدر پاکستان) قیوم خاں کو ابھار رہے تھے۔ خیر ہم مسلم لیگ کی میٹنگ

کے سلسلے میں ایسٹ پاکستان گئے۔ چودھری انور عزیز، انور بھنڈر، یٰسین وٹو اور شاہ نواز گردیزی ملک قاسم تو تھا ہی کیونکہ وہ جنرل سیکرٹری تھا۔ صبور خاں پاکستان مسلم لیگ کا پریذیڈنٹ بننا چاہتے تھے۔ یحییٰ گورنمنٹ کے کلوز ہونے کے لیے اس نے ہوٹل شاہ باغ میں تقریر کی۔ اور اسے ٹیپ ریکارڈ بھی کیا۔ کیونکہ جب ایوب خاں کا مارشل لاء لگا تو یہ پکڑا گیا تھا۔ نواب عسکری اس ملٹری کورٹ کے پریذیڈنٹ تھے۔ اس وقت میجر تھے۔ انہوں نے اسے سزا دی تھی۔ اب اس نے شاہ باغ میں تقریر کی تو ٹیپ بھی کر لی۔ بنگالی تو بڑی جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اُسے تقریر جلدی میں ختم کرنا پڑی۔ انہوں نے بلکہ ہمیں کہا کہ ایوب خاں کو ہمارا پیغام دینا کہ اس نے تقریر کی ہے اور ریکارڈ بھی کر لی ہے۔ یہ گورنمنٹ کو خوش کرنا چاہتا ہے۔

رات ہم عبدالمنعم خاں کو ملنے چلے گئے۔ وہ اپنی کوٹھی بنوا رہے تھے۔ بجلی کے کنکشن وغیرہ ابھی ٹھیک سے نہیں لگے تھے۔ کوئی چار دیواری بھی خاص نہیں تھی۔ وہ بنیان کے ساتھ برآمدے میں ہی سوئے ہوئے تھے۔ انہیں پتہ لگا کہ ہم آئے ہیں۔ تو اندر گئے۔ قمیض وغیرہ پہن کے آئے۔ انہوں نے صبور خاں کے خلاف بڑی سخت گفتگو کی۔ بلکہ ملک قاسم کو بھی جھاڑا۔ ہم نے محسوس کیا کہ صبور خاں ایسٹ پاکستانیوں کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

پھر وحید الزماں کو ٹرائی کیا۔ اس نے فنڈز وغیرہ کے متعلق ڈھاکہ ہائی کورٹ میں دعویٰ کر دیا۔ اسے سٹے آرڈر مل گیا۔ یہ پارٹی کا معاملہ تھا۔ وہ عدالت میں چلا گیا۔ اُسے پسند نہ کیا گیا۔ صبور خاں اور وحید الزماں کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ اب ہم فضل القادر چودھری کے پاس گئے۔ ایوب صاحب نے انہیں پارٹی سے نکالا ہوا تھا۔ چودھری صاحب تو بات ہی نہ کریں۔ ہم نے کہا آپ لاہور آ کے حالات کا جائزہ تو لیں۔ ہم آ گئے۔ بعد میں چودھری صاحب بھی لاہور آ گئے۔ مجھے سیالکوٹ فون کیا کہ صبح لاہور پہنچیں۔ میں نے کہا کل کسی مقدمے میں میری حاضری بڑی ضروری ہے۔ کہنے لگے نہیں کل تو میں نے ڈھاکہ کے لیے سیٹ بک کرائی ہوئی ہے۔ آپ سے بات بھی ضرور کرنی ہے۔ میں رات کے وقت لاہور کے لیے چلا۔ میں ان کے پاس ہوٹل میں پہنچا تو عبدالوحید خاں، نواب زادہ ولایت علی خاں اور بیگم جی اے خاں نے انہیں گھیرا ہوا تھا۔ انہیں غالباً گورنمنٹ نے بھیجا تھا۔ وہ انہیں قائل کر رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ میں نے کہا۔ چودھری صاحب آپ کو قربانی کرنا پڑے گی۔ چودھری صاحب مان گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ بابا اسے برداشت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ فضل القادر کا نام نہیں سننا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ سے نکالا ہوا تھا۔ بہر حال ملک قاسم اور یٰسین وٹو مجھے ایوب صاحب کے پاس لے گئے۔ ایوب صاحب میرے ساتھ ٹھیک تھے۔ مہربانی کرتے تھے۔ میں نے انہیں کہا جناب یہ جتنی خرابی ہوئی ہے، وہ ایسٹ پاکستان کے احساسِ محرومی سے ہوئی ہے کہ انہیں اقتدار میں حصے دار نہیں بنایا گیا۔ ہم کہتے رہے کہ انہیں بھی اقتدار میں مؤثر انداز سے شریک کیا جائے۔ آئینی تبدیلیاں کر کے وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ پیدا کیا جائے۔ ________ تاکہ انہیں محسوس ہو کہ ہمارا پاکستان ہے۔ ہمارا بھی کوئی عمل دخل ہے۔ اس میں تو ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب یہ پولیٹیکل پارٹی ہے جس کے لیے تھوڑی بہت جذباتی اپیل ہے۔ یہ اب کسی مشرقی پاکستانی کی سربراہی میں آنی چاہیے۔ اور تو کوئی موزوں آدمی نہیں ملتا۔ حکومت قیوم خاں کے لیے سنجیدہ ہے۔ میں نے کہا، جناب یہ جو ایک کروڑ کچھ لاکھ فنڈز آپ کے پاس ہیں۔ یہ بڑی کشش ہے۔ حکومت ان فنڈز پر اپنا اختیار چاہتی ہے۔ کہنے لگے میں سوچتا ہوں۔ اس کا کیا کروں۔ ان کا باقاعدہ اکاؤنٹ ہے یہ فنڈز مجھے بذریعہ چیک صنعت کاروں نے رضاکارانہ طور پر دیے تھے۔ میں نے انہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ

نے اس ملک کو، اس گورنمنٹ کو استحکام دیا تو ہم نے بہت کمایا، ہمیں بھی ملک و قوم کے لیے کچھ دینا چاہیئے۔ یہ تھوڑے سے پیسے ہیں۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا ——— آپ کو کافی فرق پڑ جائے گا۔ یہ ہم آپ کو اظہارِ تشکر کے طور پر دے رہے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے عاجزانہ پیش کش ہے۔ ایوب صاحب کہنے لگے۔ یہ اعتماد کا معاملہ ہے۔ ایک تو میں سوچتا ہوں کہ انہیں واپس کر دوں یا پھر ٹرسٹ بنا دوں۔ میں نے کہا۔ آپ چاہیں تو ہمیں دریا میں پھینک دیں۔ آپ نے اس وقت بھی پارٹی کو کنسلٹ کئے بغیر اناؤنس کر دیا تھا کہ میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔ ہماری تو کمر ٹوٹ گئی۔ اب فنڈز کے سلسلے میں یہ نہ کریں۔ دوسری مسلم لیگوں کو گورنمنٹ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ہمیں کسی کی امداد نہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو آپ کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔ فنڈز کے سلسلے میں ایوب صاحب نے ہمارے ساتھ اتفاق کیا۔

س:۔ جب ان کے خلاف ہنگامے زوروں پر تھے تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔ یہ آپ کا اس طرف اشارہ تھا کہ آپ نے پارٹی کو کنسلٹ کیے بغیر اناؤنس کر دیا۔

ج:۔ ہاں جی۔

س:۔ انہوں نے بتایا یا نہیں۔ کیوں؟

ج:۔ جب میں نے کہا کہ آپ کو چاہیئے تھا کہ یہ اعلان کرنے سے پہلے پارٹی سے مشورہ کرتے۔ کیونکہ لوگوں نے آپ پر اعتماد کیا تھا تو کہنے لگے۔ اپوزیشن پارٹیاں پارلیمانی طرزِ حکومت کے لیے لڑ رہی تھیں۔ میں ایک خاص فلاسفی پر یقین رکھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے حالات کا تقاضا صدارتی طرزِ حکومت ہے۔ اگر آپ اپوزیشن میں چلے جاتے ہیں تو آپ کو بعد میں تکلیفیں بھی اٹھانا پڑتی ہیں۔ اگر میں پارلیمانی طرزِ حکومت میں یقین ہی نہیں رکھتا تو میں کیسے تکلیفیں اٹھا سکتا ہوں۔

س:۔ ایوب خاں اور فضل الٰہی چودھری میں صلح ہو گئی؟

ج:۔ ۲۷واں روزہ تھا۔ ایوب صاحب کے ہاں افطاری اور کھانا تھا۔ میں تھا۔ ملک قاسم تھے۔ یاسین وٹو تھے۔ پانچ سات آدمی تھے۔ ایوب صاحب اور چودھری صاحب میں صلح کرائی گئی۔ انہوں نے چودھری کو صدر مسلم لیگ نامزد کر دیا۔ ہم ساری رات ہی جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ طے پایا کہ احمد سعید کرمانی کو مغربی پاکستان مسلم لیگ کی صدارت سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ وہ گورنمنٹ کے کہنے پر قیوم خاں کے ساتھ مل گیا تھا۔ یحییٰ خاں چاہتا تھا کہ قیوم خاں کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن لوگ قیوم خاں کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن کرمانی نے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ بلکہ اس کے ایک دو روز پہلے جب قیوم خاں نے میٹنگ بلائی تھی۔ تو اس نے کرمانی کو بھی دعوت نامہ بھیجا تھا۔ کرمانی وہاں جانے سے پہلے ایوب صاحب کے پاس آیا کہ مجھے جانا چاہیے کہ نہیں۔ انہوں نے کہا۔ میں تمہیں حکم تو نہیں دیتا۔ میں مناسب یہ ہے کہ جب تک مسلم لیگ کوئی فیصلہ نہ کرے تب تک تمہیں اُدھر نہیں جانا چاہئے۔ کیونکہ تو اس مسلم لیگ میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چلا گیا۔ اس کے پاس مسلم لیگ کا فنڈ تھا۔ تیس لاکھ روپیہ تھا۔ فکسڈ ڈیپازٹ تھا۔ چنانچہ کرمانی کو صدارت سے ہٹا دیا گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کی برطرفی کے احکام پہنچنے تک اسے تو پتہ چل جائے گا۔ وہ تیس لاکھ روپیہ نکلوا لے گا۔ ——— اب تک تو یہ ہے کہ اس فکسڈ ڈیپازٹ کی رسید اس سے کہیں آگے پیچھے ہو گئی ہے۔ لیکن دو لاکھ روپیہ تو اس کے پاس نقد بھی تھا۔ غالباً کرنٹ اکاؤنٹ میں تھا۔ اس

کے نام تھا۔ فیصلہ ہوا کہ راتوں رات جا کے دفتر پر قبضہ کر لیا جائے یٰسین وٹو وغیرہ کو اسی وقت روانہ کیا گیا۔ وہ راتوں رات لاہور پہنچے اور صبح دفتر پر قبضہ کر لیا۔ اب یٰسین وٹو مغربی پاکستان مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ تھے۔

س: کچھ فنڈز میں گڑبڑ بھی ہوئی؟

ج: ہوئی۔

س: مسلم لیگی کھا گئے۔

ج: جی ہاں۔

س: کتنا کچھ کھا گئے۔

ج: میرا خیال ہے لاکھوں کے حساب سے، پھر کرمانی نے بہاولپور سے سٹے آرڈر لیا کہ یہ فنڈز آپریٹ نہ کر سکیں ہم نے وہ سٹے سٹاف کی تنخواہوں اور بجلی کے بلوں کی ادائیگی کی حد تک ویکیٹ کرا لیا۔

س: گورنمنٹ نے فنڈز اس سارے قضیے کے بعد ضبط کیے۔

ج: جی ہاں۔

س: کرنٹ اکاؤنٹ والے دو لاکھ کا کیا بنا؟

ج: اس کا پتہ نہیں انہوں نے کیا کیا منظر مسعود جو بعد میں سردار قیوم کے زمانے میں آزاد کشمیر اسمبلی کا سپیکر بھی بنا۔ وہ اس وقت مغربی پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) کا آفس سیکرٹری تھا۔ کرمانی کے زمانے میں ہی ڈیویس روڈ والے آفس میں مسلم لیگ فنڈز میں سے اس کے ہاتھ بھی کافی پیسے لگ گئے تھے۔

س: اس تیس لاکھ فنڈز کا کیا بنا؟

ج: گورنمنٹ نے جب سارا فنڈز ضبط کیا اس میں وہ تیس لاکھ بھی گیا۔

س: آپ کو قیوم لیگ جائن کرنے کے لیے اپروچ نہیں کیا گیا۔

ج: قیوم مسلم لیگ جائن کرنے کے لیے کرمانی مجھے ساؤنڈ کرتا رہا۔ پوچھتا رہا۔ میں نے کہا قیوم خاں اس قابل نہیں کہ اسے جائن کیا جائے۔ اس نے اپنی افادیت ختم کر دی ہوئی ہے۔ دیکھو جی ہم پر تو اتنے بڑے امتحان نہیں آئے بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے معافی نہیں مانگی۔ ہم کچھ بھی ہوں۔ ہمارے ذاتی مفادات کا کتنا بڑا بھی کلیش ہو۔ ہم آرگنائزیشن کو ترجیح دیں گے۔

قیوم خاں وہ آدمی ہے، جس نے پاکستان بنتے ہی پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف خٹک کو ہروا دیا تھا۔ حالانکہ اسے ہائی کمان نے ٹکٹ دیا تھا۔ یہ اس وقت چیف منسٹر تھا۔ پھر غلام محمد جھگڑا سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کا ممبر تھا۔ اسے بھی قیوم خاں نے ہروا دیا۔ میں نے کرمانی سے کہا۔ اس نے اپنی ذات کو اپنے وقار کو آرگنائزیشن پر ترجیح دی۔ اس لیے آرگنائزیشن میں یہ میرا لیڈر نہیں ہو سکتا۔ میں تو مخلص آدمی ہوں مجھے اگر مسلم لیگ ٹکٹ نہ دیتی۔ میں تو سپورٹ کرتا۔ جس طرح میں نے ۴۶ء کے الیکشن میں چودھری ناصر دین کو سپورٹ کیا تھا۔ گو میں خود امیدوار تھا۔ لیکن کسی طرح سے میرا ووٹ نہیں بنا تھا کہ نامی نیشن پیپر کال ہو گئے۔ لیکن ہم نے تو دس گنا زیادہ جذبے کے ساتھ خرچ بھی کیا، بھاگ دوڑ بھی کی۔ میں سارا حلقہ پیدل پھرا۔ میں تو کوئی اتنا ٹف آدمی نہیں تھا۔ بہرحال جو کچھ ہماری واقفیت تھی۔ جو ہمارے وسائل تھے۔ مسلم لیگ کے کام آئے۔ قیوم خاں جیسے لوگ تو اپنی ذات پر ہر چیز

قربان کر دیتے ہیں۔ اسے تو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ یہ کانگریسی تھا۔ جو نیئر مسلم لیگی تھا۔ اسے زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔

اس کے علاوہ نواب مظفر علی قزلباش کے ہم بڑے قریب تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ اس معاملے میں مریدِ حسین سے بات کرنا عبث ہے۔ انہوں نے ہادی علی شاہ کو مجھ پر لگا دیا۔ نواب صاحب اس وقت یحییٰ خاں کی کیبنٹ میں تھے۔ میں نے ہادی علی شاہ سے پوچھا کہ آپ نواب صاحب کی طرف سے آئے ہیں۔ کہنے لگا۔ میری اپنی کیا حیثیت ہے۔ میں نے کہا۔ یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ نہیں آسکتا۔ نواب صاحب اس مسئلے پر خود میرے ساتھ گفتگو کرتے۔ اگر وہ اسے اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔ تو میں نے قرآن کی خاطر قربانی کی تھی۔ میں نے نواب صاحب سے احتجاج کیا۔ میں نے کہا۔ نواب صاحب آپ آدمیوں کی توہین تو نہ کیا کریں۔ آپ نے اس قسم کے جو آدمی رکھے ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ تو ہم نے آپ کی ہمدردی کی ہے۔ میں نے تو آپ کے لیے وزارت چھوڑی تھی۔ ایسا کوئی اور آدمی آپ کو ملک میں نہیں ملے گا۔ جبکہ آپ کوئی ہمارے روحانی پیشوا بھی نہیں تھے۔ آپ ہمارے پولیٹیکل لیڈر بھی نہیں تھے۔ آپ یونینسٹ تھے۔ ہم تو مسلم لیگی تھے۔ نواب صاحب نے کہا۔ میں اس سے لاتعلقی ظاہر کرتا ہوں۔

س :۔ یحییٰ خاں نے قیوم لیگ بنوا کے مسلم لیگ میں رخنہ ڈالی؟

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ وہ تو اس حکومت کے متعلق بھی مشہور ہے کہ مسلم لیگ کے موجودہ حصے بخرے اس کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

ج :۔ ایک جرنیل میرے پاس آجاتا ہے۔ بظاہر وہ بکڑ مارتا ہے۔ لیکن میں اسے سمجھتا ہوں کہتا ہے: "ادھر جی کیا ہے تمہاری مسلم لیگ"۔ میں نے کہا: "مسلم لیگ میں میری کونسی حیثیت ہے۔" کہنے لگا: "یہ تو ایک لاش ہے۔" میں نے کہا: "لاش نوش اس واسطے نہیں کہ اس میں ابھی جان ہے۔" کہتا ہے۔ "کہاں جان ہے"۔ میں نے کہا: "اگر جان نہ ہو تو آپ میرے ساتھ آکے یہ بات نہ کرتے۔ مجھے پتہ ہے آپ کیوں آئے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات کھٹکتی ہے تو اس لیے کہ ابھی اس میں جان ہے کہ اگر کل کو یہ سانس لینے لگی۔ اور پاؤں پر اٹھ کھڑی ہوئی تو تمہارے لیے دردِ سر بن جائے گی۔

اسلام آباد ہوٹل میں پیر پگاڑا نے ایک میٹنگ کی۔ وہاں تقریریں ہوئیں۔ سٹیج پر سردار عبدالقیوم اور سکندر حیات بطور مبصر بیٹھے تھے۔ انہیں موجودہ گورنمنٹ نے بھیجا تھا اس وقت ظہور الٰہی اور صفدر منسٹر ہو گئے تھے۔ یہ تب کی بات ہے۔ اصل میں گورنمنٹ ہی نہیں چاہتی کہ مسلم لیگ میں اتحاد ہو۔

س :۔ ۷۰ء کے الیکشن کے بعد کنونشن اور کونسل مسلم لیگیں تو مدغم ہو گئیں۔ قیوم لیگ ... ...

ج :۔ ہم ۷۰ء والا الیکشن ہار گئے تھے۔ طے پایا کہ تینوں مسلم لیگیں اکٹھی ہو جائیں۔ دولتانہ صاحب مری سے آئے فضل القادر چودھری البیٹ آباد سے آئے، چٹھہ صاحب اور ملک قاسم بھی تھے ... بیان تیار ہوا ... دولتانہ صاحب اور چودھری صاحب نے دستخط کیے ادھر ڈرائنگ روم میں اخبار نویس بیٹھے تھے۔ چودھری ظہور الٰہی اور روکڑی اس میٹنگ میں مدعو نہیں تھے۔ وہ بھی آگئے۔ کہنے لگے۔ آپ نے قیوم خاں سے پوچھا ہی نہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ قیوم خان کے لیے سارے جتن کیے گئے، شوکت حیات کو ایبٹ آباد بھیجا۔ مرزا شمس الحق نے کہا کہ خان تو آرام کر رہے ہیں، پانچ بجے اٹھیں گے۔ شوکت حیات دوبارہ اس کے گھر گئے۔ تو پتہ چلا کہ خان صاحب پشاور چلے گئے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کرتے۔ خان تو ملنے کے لیے تیار نہیں۔ چودھری ظہور الٰہی اور روکڑی نے کہا کہ آپ نے

قیوم خاں سے پوچھے بغیر گیا تو یہ نہ ہو کہ بپھر جائیں اور بن جائیں پھر وہ دونوں خان کو ٹیلی فون کرنے لگے پتہ نہیں وہ انہیں ملا کہ نہیں۔ کہنے لگے، اس کو ملتوی کرو۔ دولتانہ صاحب نے کہا کہ میں مری تھا۔ مجھے انہوں نے پنڈی بلایا۔ وہاں آیا تو پتہ چلا کہ یہ سب لاہور چلے گئے ہیں۔ میں بھی لاہور پہنچا۔ اب میں نے مری واپس پہنچنا ہے، میرے تو بچے وہاں ہیں۔ فضل القادر چودھری کہنے لگے کہ صبح میری سیٹ بک ہے۔ ادھر اخبار نویس بیان وصول کرنے کے لیے منتظر ہیں اس لیے انتظار کرنے والی کوئی بات نہیں۔ چودھری ظہور الٰہی کہنے لگے۔ مجھے بیان دکھاؤ۔ اب دولتانہ صاحب کی انگریزی میں لکھا ہوا بیان ایڈٹ کرنے چودھری ظہور الٰہی بیٹھ گئے۔

س: چودھری ظہور الٰہی اور روکڑی کو حکومت نے بھیجا تھا۔

ج: جی ہاں۔ یہ گورنمنٹ کی طرف سے آئے تھے۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔

س: سقوط ڈھاکہ پر ایوب خاں کے کیا جذبات تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد آپ کی ان سے ملاقات ہوئی۔

ج: نہیں۔ وفات کے بعد میں ان کی قبر پر گیا ہوں۔ چادر چڑھائی تھی۔

س: آپ ۷۶ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ لیکن اس وقت شامل نہیں ہوئے، جب بھٹو صاحب نے پارٹی بنائی تھی۔

ج: ہمارے ساتھ اسمبلی میں کراچی کا ایک ریٹائرڈ کموڈور خالد جمیل بھی ممبر تھا۔ لکھنوی تھا۔ شعیب کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ پنڈی میں سیشن تھا۔ اس دوران میں بھٹو صاحب کے گھر کوئی فنکشن تھا۔ کموڈور سے مکررات کو نظر نہیں آتا تھا۔ اسے اندھیرا آتا تھا۔ میں اٹھا اور وہ بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں خالد جمیل نے مجھے بتایا کہ ایوب خاں صاحب مشرقی پاکستان سے فلاں شخص جو اس وقت انڈونیشیا میں سفیر ہے، اسے منسٹر لے رہے ہیں۔ جبکہ مشہور یہ تھا کہ شمس الضحیٰ کو منسٹر لے رہے ہیں۔ میں نے شمس الضحیٰ سے پوچھا، آپ کا کیا بنا؟ وہ تو اسے لے رہے ہیں۔ شمس الضحیٰ اسی وقت اٹھ کے چلا گیا۔ وہ ایسٹ پاکستان میں آئی جی پولیس رہا تھا۔ چند دنوں بعد وہ وزیر زراعت ہو گیا۔ میں اسے مبارک باد دینے کے لیے گیا۔ وہ اس وقت پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو چکا تھا جو بعد میں چودھری فضل الٰہی کا پریذیڈنٹ ہاؤس بنا۔ شمس الضحیٰ کہنے لگا، شاہ جی، آپ نے جرات کی۔ مجھے اس کا فائدہ پہنچا میں اسی وقت منعم خاں کے پاس گیا۔ وہ اس وقت پنڈی میں تھا۔ میں نے اسے کہا۔ آپ نے مجھے کہہ رکھا ہے۔ لیکن منسٹر تو وہ ہو رہا ہے۔ اس سفیر کو منعم خاں پسند نہیں کرتا تھا۔ منعم خاں نے پریذیڈنٹ سے رابطہ قائم کیا اور میں وزیر زراعت ہو گیا ہوں۔ شمس الضحیٰ نے اظہارِ تشکر کے طور پر مجھے سنٹرل کاٹن کمیٹی کا ممبر بنا دیا، حالانکہ کاٹن کمیٹی کا سیالکوٹ سے کیا تعلق؟ ہمارے ہاں تو کاٹن (کپاس) نہیں ہوتی؟ بہرحال۔

ہم کاٹن کمیٹی کے اجلاس کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ عبدالاول خاں بھی کمیٹی کے ممبر تھے۔ وہ کالج کے زمانے سے فضل القادر چودھری کے دوست چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چودھری صاحب بھی کراچی آئے ہوئے ہیں، اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ آپ بھی یہاں ہیں۔ ہم تو قصر ناز میں ٹھہرے تھے۔ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل قصر ناز کے قریب ہی ہے۔ میں چودھری صاحب سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ آگے محمود ہارون صاحب بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ محمود ہارون فضل القادر چودھری کی بڑی عزت کرتے تھے۔

کھانے کا وقت ہو گیا۔ محمود ہارون نے کہا، کھانا کھاتے ہیں۔ نیچے اترے تو وہاں بھٹو صاحب اور مصطفیٰ کھر دونوں بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ دونوں اٹھ کے میرے پاس آئے کہ آپ کے ساتھ بات کرنی ہے۔ ہم نے انہیں کہا کہ آئیں ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو جائیں۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ نہیں میری بیوی آرہی ہے۔ پھر جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے۔ تو میں بھٹو صاحب کے پاس گیا۔ وہ کہنے لگے۔ شاہ جی آپ تو میرے دوست تھے، آپ بھی مجھے چھوڑ گئے۔ اس وقت بھٹو صاحب پارٹی بنا چکے تھے۔ میں نے کہا، ہم نے تو نہیں چھوڑا۔ آپ نے خود ہی پروگرام بنایا تھا۔ ہمارے ساتھ آپ نے کبھی صلاح ہی نہیں کی۔ کہنے لگے آئیں اور میری مدد کریں۔ میں نے کہا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں کہ اس طرح آدمی سر راہے فیصلہ کرے۔

س:۔ ۷۶ء میں آپ نے پیپلز پارٹی جائن بھی کر لی؟

ج:۔ میں نے بالکل پیپلز پارٹی جائن نہیں کی۔ بالکل جائن نہیں کی کبھی نہیں جائن کی۔ بے شک آپ جا کے ان کا ریکارڈ دیکھ لیں۔

س:۔ آپ کی شمولیت کی خبر کیسے چھپ گئی۔

ج:۔ نواب سر مہر شاہ کے لڑکے صاحبزادہ مسعود احمد کی جبری ریٹائرمنٹ ہو گئی تھی۔ وہ لاہور میں سیٹل ہو گیا تھا۔ عبداللہ رو کڑی سے اس کی بیٹھک تھی۔ انشورنس کمپنی یا کوکا کولا کے سلسلے میں۔ صاحبزادہ مسعود احمد سیالکوٹ آئے۔ میرے ان کے ساتھ تعلقات تھے۔ کہنے لگے۔ شاہ جی آپ پیپلز پارٹی جائن کر لیں۔ میں نے کہا نہیں جی، مجھے پہلے بھی کیپٹنوں نے کہا ہے۔ خود بھٹو صاحب نے بھی کہا تھا مسعود احمد مجھے سمجھاتے رہے۔ میں نے کہا پیپلز پارٹی جائن کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا جنازہ اٹھانے کے لیے کوئی تو آدمی ہونا چاہیے۔ وہ چلے گئے۔ پھر ٹیلی فون آگیا کہ چیف منسٹر سے آپ کا انٹرویو ہے۔ ادھر مقامی انتظامیہ کو بھی اطلاع آگئی۔ میرے متعلق، سردار روپ چک کے متعلق اور عبدالرحیم مینگڑی والا کے متعلق عبدالرحیم تو گھر (شکر گڑھ) میں موجود نہیں تھا۔ وہ رات کے ایک بجے گاڑی سے اتر کے گھر پہنچا تو آگے اے سی بیٹھا ہوا تھا کہ آپ کو صبح سویرے چیف منسٹر کے پاس لاہور پہنچنا ہے۔ مینگڑی نے کہا، صبح گاڑی کا کوئی وقت ہی نہیں۔ اے سی نے کہا۔ گاڑی پر جائیں یا جیسے بھی، میری تو یہ ڈیوٹی لگی ہے۔ اس وقت حکم اسی طرح کے ہوتے تھے۔ نہ انسانیت تھی نہ کچھ تھا۔ بہر حال ہم چلے گئے۔ میں تو ان آدمیوں میں سے نہیں تھا کہ ملک قاسم کی طرح خواہ مخواہ مار کھاتا پھرے۔ اگر کوئی ایشو ہو جس سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہو، پھر تو اور بات ہے۔

بہر حال ہم تینوں روکڑی کے گھر جمع ہوئے۔ وہ ہمیں چیف منسٹر کے پاس لے گئے۔ روکڑی صاحب انہی کاموں پر لگے رہتے ہیں۔ کریڈٹ بناتے رہتے ہیں۔ گورنر کالاباغ نے انہیں ایسے کاموں پر لگایا تھا۔ انہوں نے اب بھی یہ سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ہم چیف منسٹر ہاؤس پہنچے تو صادق حسین قریشی نے مجھے جپھا مارا اور چھوڑے ہی نہ۔ ان سب نے مجھے اپنا ترجمان بنا لیا تھا۔ میں نے صادق حسین قریشی سے کہا: آپ کو ہمارا کیا فائدہ؟ لوگ تو ہمارے ساتھ نہیں۔ الیکشن (۷۰ء) میں ہم تینوں کو لوگوں نے ووٹ نہیں دیئے تھے۔ اس لیے ہمارے آنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہمیں ضرور نقصان ہو گا۔ کوئی اور آدمی یہ حرکت کرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ زمانہ ساز ہے۔ ہمیں تو لوگ یہ بھی کہنے کو تیار نہیں۔ آپ ہمیں کیوں مجبور کرتے ہیں۔ صادق قریشی کہنے لگے۔ دراصل شاہ جی ہماری پارٹی میں کچھ ایسے آدمی اکٹھے ہو گئے ہیں۔ مثلاً ایک شیخ رشید ہے۔ وہ غیر طبقاتی سوسائٹی بنانا چاہتا ہے۔ ہمارا تو ماں باپ ہے۔ ہم ایسی سوسائٹی

برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمیں سپورٹ چاہیئے۔ اس پارٹی میں ایسے افراد ہونے چاہئیں جو ہمارے لیے تقویت کا باعث ہوں۔ اس لیے ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا، یہ بات ہے تو پھر ہمیں اپنے آدمیوں کے ساتھ مشورہ کرلینے دیں۔ ہمیں تو پتہ نہیں تھا کہ آپ اس مقصد کے لیے بلا رہے ہیں۔ آپ کا حکم نامہ ملا، ہم آگئے۔ اب اتنی زیادتی تو نہیں ہونی چاہیے کہ ہم اپنے ساتھیوں سے پوچھیں ہی ناں۔ ایک آدھ فی صد لوگ ہیں۔ جو ہمارے پاس آبیٹھتے ہیں۔ کہنے لگے۔ نہیں، میں ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ میں نے مجبور کیا ہے۔ ہم لاجواب ہو گئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم آ گئے۔ ابھی ہم گھر پہنچے بھی نہ تھے کہ پیپلز پارٹی میں شمولیت کے متعلق ریڈیو وغیرہ پر خبریں فلیش ہو گئیں۔

س :۔ چلو یہ تو ہو گیا۔ پھر آپ نے ۷۷ء کے الیکشن کے لیے پیپلز پارٹی سے ٹکٹ کے لیے اپلائی کیا؟ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو ٹکٹ نہ ملا۔

ج :۔ ٹکٹ کے لیے اپلائی کرنے کے لیے مجھے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ غلام حسین نے کہا کہ سرکاری حکم ہے کہ آپ اپلائی کریں۔ ایک پیپلز پارٹی کا سینیٹر تھا۔ مولوی ظہور نیلام گھر والا، مرزائی ہے اور کوثر نیازی کا خاص آدمی سیشن کورٹ میں میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا۔ صاحب کا حکم ہے کہ آپ ٹکٹ کے لیے اپلائی کریں۔ صاحب وہ بھٹو صاحب کو کہتے تھے۔ میں نے اپلائی کر دیا۔ انہیں پیسے بھی بھیج دیئے۔ جب ٹکٹ اناؤنس ہوئے۔ مجھے تو ٹکٹ نہ ملا۔ میں نے مولوی ظہور سے یہ ضرور کہا تھا کہ مولوی صاحب میں نے آپ کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا تھا۔ کہنے لگا ہم تو بے بس ہیں، صاحب نے خود ہی فیصلے کیے۔ میں نے کہا، میں نے صاحب کا باپ نہیں مارا تھا۔ آپ کا بھی باپ نہیں مارا تھا۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ وہ بات تو میں نے بالکل مجبوری کے تحت کی تھی۔ اس لیے میرے نامۂ اعمال میں گناہ نہیں لکھا جائے گا۔ لیکن مولوی صاحب، آپ کی اس میں معافی نہیں۔ ایک آدمی جس نے ساری عمر آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اس کا امیج خراب کرنا زیادتی والی بات ہے۔ مولوی ظہور کو میں نے گوہر ایوب سے فیئٹ ٹریکٹروں کی ایجنسی دلائی تھی۔ اب بھی وہ اس کے پاس ہے، موجودہ گورنمنٹ جھوٹ بولتی ہے۔ اس نے پیپلز پارٹی کے آدمیوں کو ذرا کمزور نہیں ہونے دیا۔ انیس بیس کا بھی فرق نہیں پڑنے دیا۔

:۔ اب تو آپ پھر مسلم لیگ میں ہیں۔

ج :۔ جی ہاں۔

س :۔ پیپلز پارٹی سے ریزائن کر دیا تھا۔

ج :۔ آدمی ریزائن تو اس پارٹی سے کرتا ہے۔ جسے جائن کیا ہو۔ جس پارٹی میں کبھی رہا ہی نہ ہو۔ اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ان کی کسی میٹنگ میں نہیں گیا۔ میں نے ان کا کوئی فارم نہیں بھرا۔

س :۔ بھٹو صاحب کے ساتھ آپ کی آخری ملاقات؟

ج :۔ لاہور میں جیورسٹ کانفرنس کے موقعہ پر وزیر اعظم بھٹو صاحب کی طرف سے گورنر ہاؤس میں دعوت تھی۔ میں حسب عادت ہجوم سے الگ ہی تھا۔ دیکھا تو آ گئے۔ کہنے لگے۔ شاہ صاحب عرصہ ہوا۔ آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا؟ میں نے کہا، آپ مصروف رہتے ہیں۔ کھڑے رہے۔ سب لوگوں کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ وہ کسی کو اتنی لفٹ بھی نہیں کراتے تھے۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

س :۔ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو آخری وقت تک یقین نہیں تھا کہ انہیں اقتدار سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔

ج :۔ ہم ۷۰ء والا الیکشن ہار چکے تھے۔ فضل القادر صاحب یہاں آئے۔ انہوں نے مجھے حامد رضا گیلانی کے ساتھ بات کرنے کے لیے ملتان بھیجا کہ انہیں جا کے سمجھاؤ، کیونکہ علمدار حسین گیلانی اور شوکت حسین گیلانی انہیں قیوم مسلم لیگ جائن کرنے کے لیے پریشرائز کر رہے تھے۔ علمدار حسین حسن محمود کے بہنوئی ہیں جسن محمود ہمیشہ ایسی باتیں کرتے ہیں، جائز ناجائز کی بھی پروا نہیں کرتے۔ حامد رضا بھی الیکشن ہار چکے تھے۔ ایوب صاحب کے زمانے میں وہ پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔ حامد رضا گیلانی کے فضل القادر صاحب کے ساتھ بڑے ذاتی تعلقات تھے۔ میں نے ٹیلی فون کر دیا۔ وہ اور اکبر حسن مجھے لینے کے لیے ملتان ائیرپورٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں کھر بھی تھا۔ حامد رضا اور کھر بڑے اچھے دوست ہیں۔ دونوں اکٹھے پڑھتے بھی رہے ہیں۔ جس وقت میں جہاز سے اترا ہوں۔ یہ دونوں جنگلے کے اندر باتیں کر رہے تھے۔ میری کھر کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہم اسے اسلام علیکم کر کے چل پڑے۔ پیپلز پارٹی الیکشن تو جیت چکی تھی۔ ابھی ان کی گورنمنٹ نہیں بنی تھی۔ حامد رضا نے بتایا کہ یہاں اس قسم کا عنصر ہے کہ اگلے روز کھر تقریر کر رہا تھا کہ لوگوں نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اوپر جا کے تقریر کی۔ پھر ان کے ورکرز آپس میں لڑ پڑے۔ فائرنگ ہوئی۔ ۳۰۷ کے پرچے ہوئے۔ آپ کے سوال کے جواب میں میں جو بات کرنے لگا تھا۔ وہ یہ ہے کہ حامد رضا گیلانی نے مجھے بتایا کہ میں کراچی سے آرہا تھا۔ اتفاق سے بھٹو صاحب بھی اس جہاز میں تھے۔ میرے ساتھ کوئی اور بیٹھا تھا۔ اسے انہوں نے کہا، آیئے ہم سیٹوں کا تبادلہ کر لیں۔ پھر بھٹو صاحب میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی گورنمنٹ کا کیا بنا۔ حامد رضا اور بھٹو دونوں نوجوان تھے۔ اور بڑے قریبی تھے۔ بھٹو صاحب دوستوں میں بڑی لائٹ گفتگو کیا کرتے تھے۔ سیکس کی باتیں۔ کچھ مذاق وغیرہ۔ حامد رضا بتاتے ہیں کہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی گورنمنٹ کا کیا بنا ہے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے پتہ نہیں گورنمنٹ کا کیا ہو گا۔ لیکن حامد:

I tell you, once I get into power. I am going to hold it by testicles and I would not let it go at any cost.

(حامد، میں آپ کو ایک بات بتا دوں، ایک دفعہ اگر میں اقتدار میں آگیا۔ اسے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا)

این اے رضوی کی رپورٹ تھی کہ پیپلز پارٹی کے جیتنے میں آخری وقت جو سب سے بڑا فیکٹر تھا۔ وہ قادیانی تھے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کے لیے خاموش مگر بھرپور مہم کی۔ ان کی عورتیں برقعے پہن کے دوسری عورتوں میں جا گھسیں۔ وغیرہ۔

س :۔ انہیں سزا بھی ملی۔

ج :۔ سزا بھی پھر انہیں ملی۔ ہم اس وقت وقتی طور پر سوچتے تھے کہ بھٹو صاحب کو اقتدار کیوں مل گیا۔ لیکن عزت دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ اللہ نے بندوں سے کام لینا ہوتے ہیں۔ بھٹو صاحب کو شاید کامیابی اس لیے ہوئی تھی کہ انہوں نے مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانا تھا۔ پھر جنرل ضیاء کے ہاتھوں بھٹو کا قتل ہونا تھا۔ ضیاء بڑا الف آدمی ہے۔ بڑا الف آدمی ہے۔ دیکھیں جناب، اس کو سزا سنائی تو دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جس نے اسے پریشرائز نہ کیا ہو کہ پھانسی نہ دینا۔ ملک کے اندر جو کیفیت تھی۔ ضیاء فیصلہ کر سکتا تھا کہ میں اسے پھانسی لگا دوں تو میری گورنمنٹ مزید ایک دن کے لیے بھی قائم رہ سکے گی۔ فوج میں بھی تو بھٹو کے بڑے حامی ہیں۔ بلکہ ۷۰ء کے الیکشن میں انہیں ووٹ دینے کا حق ہی نہیں دیا گیا۔ سب کو باہر بھیج دیا گیا تھا۔ انہیں اس قابل ہی نہ رہنے دیا کہ وہ ووٹ

ڈال سکیں، میرے خیال میں نوے فیصد بھٹو کے حق میں تھے۔

س :۔ زیادہ تر جوان ہی ہوں گے۔

ج :۔ جوان بھی اور آفیسر بھی۔ میں سیالکوٹ چھاؤنی میں ایک دو پولنگ دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں میرے کیمپ میں وہ فوجی آئیں جو یہاں گیریژن کے اندر تھے۔ باہر مشنوں پر نہیں بھیجے گئے تھے۔ مختلف ڈیوٹیوں پر یہاں رہ گئے تھے۔ وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ پیپلز پارٹی کو ووٹ کرنے کے لیے آتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ساتھ تو ان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

س :۔ آپ نے کہا کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے ضیاء صاحب پر دباؤ نہ ڈالا ہو کہ بھٹو صاحب کو پھانسی نہ دیں۔ لیکن یہ بڑے ٹف آدمی ہیں۔ لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ ساری دنیا ایک طرف، امریکہ دوسری طرف۔

ج :۔ امریکہ کا ہوگا۔ دوسرے ملک بھی تو ہیں۔

س :۔ اس خیال کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر کے دباؤ کے باوجود ری پراسیسنگ ترک کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو کیسنجر نے کہا کہ ہم تمہیں ایک عبرتناک مثال بنا دیں گے۔

ج :۔ فیکہ پورہ (سیالکوٹ) کا ایک لڑکا ابوظہبی سے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک روز میں وہاں ایک ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور عرب تھا۔ کہنے لگا۔ بھٹو بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں نے کہا تجھے کیا پتہ ہے کہ کیسا آدمی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کہنے لگا۔ وہ اتنا جوانمرد ہے کہ اس نے یونائیٹڈ نیشنز میں قرارداد پھاڑ دی۔ وہ تو مرد ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو پتہ نہیں وہ کیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کہنے لگا۔ تو تو مجھے حمار لگتا ہے۔ حمار معنی گدھا۔ یہ کہہ کے اس نے ٹیکسی روک لی۔ اور کہنے لگا تو میری ٹیکسی سے اُتر جا۔ میں نے اسے کہا۔ تو اتنی ساری بات پر مجھے اتار رہا ہے۔ تو نے کرایہ ہی لینا ہے۔ وہ کہنے لگا۔ میری ٹیکسی سے اُتر جا۔ ایک منٹ کی تاخیر نہ کر۔ میں تجھے لے جانے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ لڑکا کہتا ہے۔ اس نے مجھے ٹیکسی سے اُتار دیا۔

س :۔ اس قدر تو خود عرب حکمران اپنے عوام میں پاپولر نہیں۔

ج :۔ ہاں۔

س :۔ شاہ صاحب آپ بڑے تجربہ کار آدمی ہیں۔ یہ بتائیں کہ پاکستان ایک سیاسی جماعت کی جدوجہد کے نتیجے میں جمہوریت کے ذریعے وجود میں آیا۔ اس کے باوجود یہاں جمہوریت پنپ نہیں سکی۔

ج :۔ میں اس کی سب سے بڑی وجہ بیوروکریسی کو سمجھتا ہوں۔ بطور بیوروکریٹ غلام محمد اور چودھری محمد علی کی گنٹری بیوشن تو بہت تھی۔ غلام محمد پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ تھے۔ چودھری محمد علی سیکرٹری جنرل ہوئے۔ پھر یہ لوگ سیاست میں بھی آگئے۔ انہوں نے سوچا کہ اصل آدمی تو ہم ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے لیے جگہ بنانے کی خاطر سیاست والوں کو لوگوں کی نظروں میں گرانا شروع کیا۔ ان میں رخنہ ڈلوائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے کسی کا ساتھ دیا۔ کسی نے کسی کا۔ وہاں سے پھر تفریق شروع ہوگئی۔ نتیجۃً اب تک بیوروکریسی کا ہولڈ ہے۔ مجلس شوریٰ کے ممبر لیے جاتے ہیں تو ڈپٹی کمشنروں کی سفارشوں پر۔ وہ کیا اسمبلی ہوگی۔ وہ کیا لوگ ہوں گے جنہیں ڈپٹی کمشنروں نے ریکمنڈ کیا ہوگا۔ یہ کوئی آنریری مجسٹریٹی یا ذیلداری یا نمبرداری تو ہے نہیں جو ڈپٹی کمشنر سے کرائی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب بھی یہی کرتے رہے۔ ڈپٹی کمشنروں کی سفارشوں پر ٹکٹ جاری کیے گئے۔ حالانکہ سیاست میں سیاستدان، انتظامیہ سے سپریم ہوتا ہے۔

اب تو وہ بدترین روپ میں ہیں۔ آپ ان سے بات کر کے دیکھیں، آپ کو ان کے رویے سے اندازہ ہو جائے گا۔ ان کا اصل کام پودے اگانا اور فیتے کاٹنا رہ گیا ہے۔ سارا دن میٹنگیں ہوتی رہتی ہیں۔ انتظامیہ کی بے ضابطگیوں کے متعلق بات سننے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس وقت ہی نہیں رہا کہ لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھ سکیں۔ کسی شریف آدمی سے بات کرنے کا انہیں سلیقہ ہی نہیں۔ اہل غرض آتے ہیں۔ رشوت، خوشامد یا سفارش سے کام کرا لیں گے۔

پچھلے دنوں سیالکوٹ چیمبر آف کامرس والوں نے سابقہ ڈپٹی کمشنر حفیظ رندھاوا کو الوداعی دعوت دی۔ مجھے بھی بلایا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اس ڈپٹی کمشنر کا رویہ بڑا افسرانہ تھا۔ اتنا انگریز کے وقت بھی کیا ہو گا۔ وہ لوگ تو بڑے مہذب اور شائستہ ہوتے تھے۔ بڑی آس امید والے تھے جس ضلع میں رہے اسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ انگریز فوجی بھی اسی طرح تھے۔ میں نے ائیر فورس جائن کرنے کے لیے اپلائی کیا۔ انٹرویو کے لیے ڈیرہ دون گیا تو مجھ سے پوچھا گیا۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا میں سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔ اس بورڈ میں سے ایک انگریز کرنل کہتا ہے۔ میں بھی سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔ وہ اس قسم کے لوگ تھے۔ وہ کرنل سیالکوٹ میں ایڈمنسٹریٹر کمانڈنٹ رہا تھا۔

س :۔ ڈی سی حفیظ رندھاوا کے متعلق آپ کو کوئی ذاتی تجربہ ایسا ہوا جو تلخی پر منتج ہوا۔

ج :۔ میرا ذاتی نہیں تھا۔ لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا تذلیل آمیز ہوتا تھا۔ دیکھیں، آزاد ملکوں میں ڈپٹی کمشنر نہیں ہوتا۔ انگریزوں نے اپنے ملکوں میں ڈپٹی کمشنر نہیں رکھے۔ یہ تو انہوں نے جن ملکوں کو غلام کیا وہاں رکھے تھے۔ جو اب تک چل رہے ہیں۔ ہماری حکومتیں ان سے یہی کام لیتی ہیں۔ لوگوں پر جھوٹے سیاسی مقدمے بنا دیتے ہیں۔ ان کے پاس پیپڑو پنچ تو رہی نہیں۔ پہلے تو ڈپٹی کمشنر بڑا پاورفل ہوتا تھا۔ جنہوں نے گورنمنٹ کی خدمت کی ہوتی تھی ان کے لڑکوں کو تحصیلدار کرا دیتا تھا۔ لوگوں کو زمینیں دیتا تھا۔ اب ان کے ہاتھ پلے کچھ نہیں۔

اور رشوت، رشوت کی تو انتہا ہو گئی ہے، اس کے آگے کوئی مقام ہی نہیں۔

لاقانونیت کا یہ عالم ہے کہ گزشتہ دنوں میں سیشن کورٹ میں کیس آرگو کر رہا تھا۔ آدمی عدالت کے دروازے میں کھڑا ہے۔ اسے گولی مار دی گئی۔ بھری کچہری میں یہ واقعہ ہوا۔ جج بھاگ گیا۔ پولیس کے ساتھ ستر آدمی تھے۔ وہ ایک منٹ کے اندر اندر غائب ہو گئے۔ ہم دو وکیل وہاں رہ گئے۔ یہ تو عدالتوں کا تقدس رہ گیا ہے۔

س :۔ شاہ صاحب، آپ نے سیاسی حکومتوں کے ساتھ بھی کام کیا اور فوجی حکمران (ایوب خاں) کے ساتھ بھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر آپ کس قسم کے طرزِ حکومت کو متعلق، قرین دانش اور قابلِ عمل کہیں گے۔

ج :۔ حکومت کرنا فوج کا مضمون تو نہیں ہے۔ اسے اپنی حکومت تو نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی حکومت ہو اسے لوگوں کے ساتھ ایسوسی ایٹ کرنا چاہیئے۔ حکومتی معاملات میں احساسِ شرکت تو بنیادی سوال ہے۔ اگر برکات ہی گنتی ہوں۔ وہ تو ہمیں سکولوں میں سرکارِ انگلشیہ کی برکتیں پڑھاتے تھے کہ اس طرح یہ ریلیں لائے۔ یہ کیا وہ کیا۔ اگر یہ کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ فارن گورنمنٹ ہی ہونی چاہیئے۔ انگریز آپ کے لیے کیا نہیں کرتے تھے۔ کونسی پوزیشن آپ کو انہوں نے نہیں دی تھی۔ وزیر تو خیر تھے ہی، گورنر تک آپ کے ہونے لگے تھے۔ سر سکندر حیات نے گورنر پنجاب کے طور پر کام کیا۔ ان کی بیٹی محمودہ سلیم کی شادی اسی گورنر ہاؤس میں ہوئی تھی۔

س :۔ اُس وقت مسئلہ عوامی احساسِ شرکت کا تھا۔

ج :۔ اب بھی یہی مسئلہ ہے۔ مستقبل میں بھی یہی مسئلہ ہے۔ خلافت و ملوکیت عوام کی شرکت کی جنگ تھی فوج والے ہمارے ووٹوں سے تو نہیں آئے تگڑے تھے۔ ہم پر چڑھ گئے۔ انتے ہی نہیں۔ اگر کسی کو مجلسِ شوریٰ کا ممبر کر دیں گے یا کسی کو وزیر بنا دیں گے۔ تو یہ خیرات ہی ہے۔ شوریٰ کے لیے ہم سے بھی انہوں نے سوانحی خاکہ مانگا۔ ہم نے کہا چھوڑو۔ اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ حیثیت پھر سامنے آگئی بجٹ پہلے اپرُود ہوگیا۔ بحث اس کے بعد شروع ہوئی۔ مذاق کرنے والی بات ہے۔ تمسخر اڑانے والی بات ہے۔ حکومت قطعًا ان کا حق نہیں بنتا۔ نہ یہ ان کا مضمون ہے۔ نہ ان کا تجربہ ہے۔ یہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ اچھے سیاسی ماہر تو بن سکتے ہیں۔ لیکن اچھے سیاستدان نہیں ہو سکتے۔ لوگوں کو کوڑے مارنے شروع کر دیئے ہیں۔ انہیں خوفزدہ کر رہے ہیں۔ ابھی وہ سٹیج نہیں آئی۔ جب لوگ کوڑے کھانے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے۔ بھٹو کے دور میں لوگوں نے گولیاں نہیں کھائیں۔ خدا کرے وہ سٹیج نہ آئے۔

س :۔ آپ کے خیال میں جمہوریت ہونی چاہیئے۔

ج :۔ بالکل ہونی چاہیے۔ چار سال بعد بلدیاتی انتخاب ہوئے ہیں۔ سابقہ ممبران کی اکثریت چلی گئی ہے۔ نئے نئے آدمی آنے چاہئیں۔

س :۔ ایوب خاں بھی فوجی تھے۔ ان کا تو آپ نے ساتھ دیا؟

ج :۔ ایوب صاحب فوجی تھے۔ لیکن انہوں نے اُس نظام میں زندگی بھی رکھی تھی۔ جو کچھ انہوں نے بُت بنائے تھے۔ ان میں روح بھی تھی۔

س :۔ کوئی ثبوت؟

ج :۔ میں نے آپ کو بتایا کہ ۶۲ والی اسمبلی بیٹھی تو گورنمنٹ نے محسوس کیا کہ پارٹی کے بغیر کام نہیں چل سکتا تو پارٹی بن گئی۔ اس میں ہم بھی آگئے۔ طے ہوا کہ گورنمنٹ پارٹی کے لوگ ہاؤس میں تنقید نہیں کیا کریں گے۔ کوئی بل ہاؤس میں پیش کرنے سے پہلے پارٹی کی میٹنگ میں رکھا جائے گا۔ وہاں ممبر اپنے خیالات کا اظہار کر لیا کریں گے۔ اس وقت جسٹس منیر وزیر قانون تھے۔ اکبر بگٹی کو سزائے موت ہوئی تھی۔ پھر اس کی رحم کی اپیل منظور ہوگئی۔ گورنمنٹ کا موقف یہ تھا کہ رحم کی اپیل منظور ہونے کے بعد بگٹی کا رویہ ٹھیک نہیں رہا۔ اس لیے اسمبلی سے ایسا بل پاس کرایا جائے جس سے اس کی سزا پھر بحال ہو جائے۔ وہ بل پہلے پارٹی کی میٹنگ میں پیش ہوا۔ میں اسے پڑھ کے گیا تھا۔ میں نے منیر صاحب سے کہا کہ ایک قانون دان کے طور پر آپ کا بہت امیج ہے۔ ہم تو آپ کو دنیا کے بڑے بڑے قانون دانوں سے بھی بڑا سمجھتے ہوں گے۔ لیکن کسی مہذب ملک میں کسی ایک شخص کے لیے قانون پاس نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اسے نقصان پہنچانے کے لیے تو کبھی نہیں ہوا۔ یہاں ایسا ہو رہا ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم نہیں ہوتی جسٹس منیر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا، میں یہ بل واپس لیتا ہوں۔ اس طرح اکبر بگٹی کی جان بچی۔

اگر اس وقت وہ بل واپس نہ لیا جاتا تو گورنمنٹ پارٹی نے اسے پاس کر دینا تھا۔ اور ہاؤس میں حکومتی پارٹی کی اکثریت تھی۔ اس لیے اس نے منظور ہونا ہی ہوتا تھا۔ اور وہ قانون بن جاتا۔ اکبر بگٹی کو پتہ نہیں اس کا علم بھی ہے۔ کہ میں کہ کس طرح اس کے سزائے موت بحال ہوتے ہوتے رہ گئی۔

وہ پاکستان جہاں انہیں قتل معاف ہو جاتے ہیں، اس کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں۔ ان سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اکبر بگٹی سے میری کوئی واقفیت نہیں ہوا قفیت کیا میں نے آج تک ان کی شکل تک نہیں دیکھی۔

س :۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایوب خاں کوئی فیصلہ کر کے اسے خواہ مخواہ عزت کا مسئلہ نہیں بنا لیتے تھے۔ پارٹی ممبران کی رائے کو بھی اہمیت دیتے تھے۔

ج :۔ یہ ریکارڈ ہے کہ میں ان کے فیصلے تبدیل کرا دیا کرتا تھا کیبنٹ کے فیصلے پارٹی میٹنگ میں آیا کرتے تھے بعض اوقات ایوب صاحب بھی میٹنگ میں موجود ہوتے تھے۔ جسے ہم غلط فیصلہ سمجھتے تھے۔ اس سے اختلاف کرتے تھے۔ میں تو صاف کہہ دیتا تھا۔ جناب ٹھیک ہے۔ آپ کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس طاقت ہے۔ لیکن یہ فیصلہ جو آپ لائے ہیں۔ آپ کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ آپ اس پر فخر نہیں کر سکتے۔ وہ پھر کیبنٹ کا فیصلہ چینج کر دیتے تھے۔

س :۔ کوئی مثال۔

ج :۔ ڈپٹی سپیکر ابوالقاسم کے خلاف انہوں نے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرنے کا فیصلہ کیا۔ پارٹی میٹنگ میں آ کے اناؤنس کر دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا، جناب ٹھیک ہے۔ آپ کے پاس طاقت ہے، آپ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اپوزیشن کے چودہ پندرہ ممبران کی کیا حیثیت ہے۔ وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ایسی بات ہے جس پر آپ فخر نہیں کر سکتے۔ آپ کا پارلیمانی وفد برطانیہ گیا۔ ابوالقاسم صاحب نے اس کی قیادت کی۔ آپ فخر کر سکتے ہیں کہ اپوزیشن کا آدمی ہے، اسے ہم نے ڈپٹی سپیکر بنایا، اور وہ وفد کی قیادت کر رہا ہے۔ اب آپ اسے ہٹائیں گے کبھی سپیکروں، ڈپٹی سپیکروں کے خلاف بھی عدم اعتماد کا ووٹ ہوا ہے۔ دنیا کی پارلیمنٹوں میں اس سیٹ کے لیے مقابلہ ہی نہیں ہوتا۔ یعنی برٹش پارلیمنٹ کی روایت یہ ہے کہ سپیکر بلا مقابلہ منتخب ہوتا ہے۔ اس کی ممبر شپ پر بھی مقابلہ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا۔ آپ یہ کریں گے، تو اپوزیشن والے آپ کے سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دیں گے۔ ٹھیک ہے۔ وہ ہار جائیں گے۔ لیکن پریس میں تو آ جائے گا کہ دنیا میں ایک بہت بڑی روایت تھی جو آپ کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ اس لیے آپ کے لیے یہ کرنا مناسب نہیں۔ کہنے لگے۔ اچھا وہ ہے تو حرام تھوپ، ٹھیک ہے جانے دو۔

بنیادی جمہورتیوں کا قانون مرکزی قانون تھا۔ ایوب صاحب نے اس میں کوئی ترمیم لانا تھی۔ وہ زیر بحث تھی۔ میں نے کہا۔ ترمیمیں تو ہم سے کرائی جاتی ہیں۔ اس کا جو فنکشن ہے جس سے لوگوں کو کچھ حاصل ہونا ہوتا ہے۔ اس سے تو ہم الیبوسی ایٹ نہیں۔ ایوب صاحب کہنے لگے، شاہ جی یارا ایہہ چھوٹی جہی گل اے۔ رہن دیو۔ میں نے کہا جناب آپ کے لیے تو چھوٹی ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ بڑی بات ہے۔ پانچ سال بعد جب ہم لوگوں سے ووٹ لینے جائیں گے۔ انہیں کیا بتائیں گے کہ ہم نے ان کے لیے کیا کیا؟ کیونکہ یہاں خارن پالیسی کی جو باتیں ہوتی ہیں، ان کا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ ان کا تعلق اس نالی سے ہے جو ان کے مکان کے باہر بہتی ہے، اُس گلی سے ہے۔ جس میں ان کا مکان ہے۔ ایوب صاحب نے پھر نیشنل اسمبلی کے ممبرز کو بھی الیکشن تنظیموں کے ساتھ الیبوسی ایٹ کر دیا۔

میں نے ان کا ہر غلط فیصلہ تبدیل کر دیا۔ ان کے وزیر بھی اور ممبر بھی میری حوصلہ شکنی کرتے تھے کہ "شاہ جی پریذیڈنٹ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کی بات مان لیتے ہیں لیکن وہ سپاہی ہیں سیاستدان نہیں۔ اختلاف پسند نہیں کرتے۔ میں کہتا تھا میاں بات یہ ہے کہ ہم درباری تو ہیں نہیں۔ ہماری خالی کوالیفیکیشن یہ ہے کہ ہم عوام کے نمائندے ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ تبھی مخلص ہو سکتے ہیں اگر ان کے احساسات، خیالات اور جذبات حکومت تک پہنچائیں۔ اور حکومت کے مددگار ہم تب ہیں۔ اگر ان کی فلاسفی لوگوں کو جا کے بتائیں۔ ہم تو حکومت اور عوام، عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ ہیں۔ اگر ہم یہ نہیں کر سکتے تو ہمارے یہاں ہونے کا فائدہ؟ پندرہ سو روپیہ ماہانہ ملتا ہے۔ اس سے زیادہ تو میں وکیل کی حیثیت سے کماتا رہا ہوں۔ کما رہا ہوں۔ ہم نہ درباری ہیں نہ ہمیں درباری بننے کا شوق ہے۔

لیکن بعد میں ایوب صاحب بھی بیوروکریسی میں پھنس گئے۔ اور یہ ایسا ظالم طبقہ ہے کہ ایوب صاحب پر بھی اثر انداز ہو گیا۔

س:۔ آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ میں نے کوئی مفاد نہیں اٹھایا۔

ج:۔ جی ہاں۔

س:۔ ایوب خاں کے زمانے میں آپ کے متعلق مشہور تھا کہ آپ نے روٹ پرمٹ لیے۔

ج:۔ میں نے روٹ پرمٹ نہیں لیے۔ میں تو خود اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ میں روٹ دیتا تھا۔ لیتا نہیں تھا۔

س:۔ سیالکوٹ میں جو حسین ٹرانسپورٹ تھی۔ وہ کس کی تھی۔

ج:۔ میں تو روٹ پرمٹ دیتا تھا۔ سیالکوٹ میں ایک ہی کمپنی تھی۔ ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ۔ روٹ پرمٹ اس کا حق تھا۔ لیکن ان پر ویسے ہی بین تھا۔

س:۔ حسین ٹرانسپورٹ آپ کی نہیں تھی؟

ج:۔ وہ میرے کزن کی تھی۔ وہ فوت ہو گیا ہے۔ وہ اسی میں تباہ ہی ہو گیا۔ کیونکہ پھر روٹ اوپن ہو گئے تھے۔ در اصل جو شخص اقتدار میں ہو۔ لوگ اس کے بارے میں باتیں کرتے ہی ہیں۔ ایوب خاں کے متعلق تھوڑی باتیں ہوتی تھیں۔ جتنا بڑا وہ آدمی تھا۔ اتنی بڑی باتیں ہوتی تھیں۔ ہم معمولی آدمی تھے۔ ہمارے بارے میں اور تو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تو روٹ پرمٹ کا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے سیالکوٹ میں سلام بٹ کے سسر کو دو روٹ دیئے۔ کیونکہ وہ پرانے ٹرانسپورٹر تھے۔ میں ٹرانسپورٹر ہوتا تو عمر کے اس حصے میں وکالت نہ کرتا۔ اس زمانے میں پانچ لاکھ کا مقروض ہو گیا تھا۔ ۷۰ء کے الیکشن میں تو ہم الجھ ہی گئے تھے۔ مکان جو شروع کیے تھے، انہیں مکمل کرنے کے لیے پیسے ہی نہ رہے۔ اوپر سے ہم الیکشن ہار گئے۔ ادھر بنکوں سے قرضوں کی وصولیوں کے لیے روز چٹھیاں آجائیں۔ پھر میں نے زمین بیچی اور قرضے اتارے۔ پچھلے سال مجھے سکھ کا سانس آیا۔ بسوں والے تو مقروض نہیں ہوتے۔ اگر میرے حالات درست ہوتے تو میں لاہور میں پریکٹس شروع کرتا۔ جسٹس افضل چیمہ اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں جج تھے۔ انہوں نے مجھے بہت کہا۔ پھر وہ سپریم کورٹ میں چلے گئے۔ پھر کہا۔

س:۔ آپ ایوب خاں کی پارٹی میں اتنے اہم تھے۔ سیالکوٹ میں بڑی انڈسٹری کے لیے آپ نے جدوجہد کی

ج:۔ پسرور شوگر ملز ایوب صاحب کے زمانے کا منصوبہ ہے۔ ہماری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا۔ کوئی تانگے

والا ہی کہہ دے کہ وہ مل میں نے منظور کرائی ہے تو لوگ مان لیں گے۔ کیونکہ انہیں اس کے پروسیجر کا علم نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ جو دعویٰ کر رہا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔

ہوا یہ کہ ہمیں یہ گلا تھا کہ سیالکوٹ کی کاٹیج انڈسٹری بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گی۔ اس لیے بڑی انڈسٹری ہونی چاہیئے۔ ہم کہا کرتے تھے کہ ہمیں آپ نے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ ایسے پراجیکٹ کی نیشنل اکنامک کونسل نے منظوری دینا ہوتی تھی۔ پھر صوبے کا عمل دخل آتا تھا۔ ڈھاکہ میں سیشن ہو رہا تھا۔ کالاباغ بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ میں اور سرفراز ان سے ملے۔ انہوں نے کہا، فضل القادر چودھری آپ کا دوست ہے۔ اس کا تعلق بھی زراعت سے ہے۔ آپ اس سے ملیں۔ ہم نے جا کے چودھری صاحب سے بات کی۔ وہ تو دبنگ آدمی تھا۔ دوسرے دن اس نے مل پاس کرا دی۔ اب اس کے لیے جگہ کا تعین ہونا تھا۔ کالاباغ نے ہمارے ساتھ جگہ کے جلدی تعین کا وعدہ کر لیا۔ غنی گھمن اس کے گروپ کا تھا۔ انہوں نے پلان کر لیا کہ مل کو آپریٹو بنک کو دیدی جائے۔ سیٹھ احمد داؤد کا بھائی صدیق داؤد ہمارے ساتھ اسمبلی میں ممبر تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس طرح یہ مل منظور ہوئی ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔ آپ پریذیڈنٹ سے جا کے بات کریں۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ بیچ میں شاہنواز والے پڑ گئے۔ وہ ایک وفد بنا کے پریذیڈنٹ سے ملے۔ اور ایوب صاحب سے وعدہ لے لیا۔ وہ چودھری سرفراز کا حلقہ تھا۔ وہاں تو مصیبت پڑ گئی۔ وہ بھی وفد لے کے پریذیڈنٹ کے پاس گئے۔ پریذیڈنٹ نے اس کا بُرا منایا۔ الیکشن کا زمانہ تھا۔ وہ انہیں ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو ان سے وعدہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا، جناب یہ بات ہمارے لیے قابلِ فخر نہیں کہ ہمارا لیڈر اور سربراہِ مملکت کوئی وعدہ کرے اور اسے ایفا نہ کرے۔ آپ اُن کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کریں لیکن اس طرح کہ انہیں کسی اور جگہ شوگر مل دیدیں یہاں (پسرور) اس شخص کو مل دیں جس کا علاقے میں کوئی سیاسی مفاد نہ ہو۔ پریذیڈنٹ تو جس طرح بجھتے ہوئے دیے میں تیل پڑ جاتا ہے کہنے لگے، ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ انہوں نے جا کے سیکرٹری پر کالاباغ سے بات کی شاہنواز والوں کو منڈی بہاؤالدین میں شاہ تاج مل گئی۔ وہ پھر سانگلہ ہل والی بھی لے گئے۔ نبی احمد ان کے چلچے کا پتر تھا۔ پسرور شوگر مل اب بنی ہے۔

س :۔ ایوب خاں بی ڈی سسٹم کو انتخابی ادارہ نہ بناتے تو معاملہ ٹھیک نہ رہتا۔

ج :۔ درست ہے۔ لیکن اس وقت حکومتیں بدلتی رہتی تھیں۔ لوگ پارٹیاں بدلتے رہتے تھے۔

س :۔ صدارتی نظام ہی کر لیتے، لیکن بالغ رائے دہی کو نہ چھیڑتے۔

ج :۔ انہوں نے پارلیمانی نظام پر اتفاق کر لیا تھا۔

س :۔ جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

ج :۔ ہاں۔

س :۔ آپ فوجی کے مقابلے میں عوامی طرزِ حکومت کے حامی ہیں۔ پاکستان میں فوجی حکومت کا آغاز ایوب خاں نے ہی کیا تھا۔ کیا وہ قصور وار نہیں؟

ج :۔ وہ بہت بڑے قصور وار ہیں۔ ان کے مارشل لاء کی وجہ سے جمہوریت کا ارتقائی عمل رک گیا۔ ایوب صاحب سے پہلے ہم نے کبھی صدارتی نظام حکومت کے متعلق سنا تک نہیں تھا۔ ضیاء صاحب کو بھی اس وقت پتہ چلے گا جب دوسرا فوجی اوپر چڑھ جائے گا۔ ایوب صاحب کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ یحییٰ خاں اوپر چڑھ گیا۔ وہ ایک فوجی بغاوت

تھی۔ لوگوں کی ایجی ٹیشن اس کا سبب نہیں تھی۔ اصل وجہ تو یحییٰ خاں ہی تھا۔ یہ تو ثابت ہو چکا ہے۔

س :۔ لیکن جب مادرِ ملتؒ جمہوریت اور صرف جمہوریت کے احیاء کے لیے میدان میں اتریں۔ انہوں نے ایوب خاں کے خلاف الیکشن میں کھڑے ہو کر ایک عظیم الشان روایت قائم کی۔ کوئی بھی کنونشن مسلم لیگی جمہوریت کی خاطر ایوب خاں کو چھوڑ کر مادرِ ملتؒ کے ساتھ نہ آیا۔ اور نہ ہی آپ۔

ج :۔ لوگوں کی اکثریت عقیدۃً ایوب کے حق میں تھی کہ عورت سربراہِ مملکت نہیں ہونی چاہیئے۔

س :۔ کیوں نہیں ہونی چاہیئے۔

ج :۔ بعد میں ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہو گئی۔ حقائق نے ثابت کر دیا کہ اگر اس وقت مادرِ ملتؒ ہوتیں تو کیا ہوتا۔

س :۔ ۱۹۶۵ء والی جنگ تو ہم نے شروع کی تھی۔

ج :۔ چلو خود ہی شروع کی۔ شروع تو ہو گئی۔

ہم اسمبلی سیشن سے واپس آئے ہی تھے کہ چار پانچ روز بعد شعیب کے لڑکے یا بھتیجے کی شادی تھی۔ ہم بھی گئے۔ ویسٹ پاکستان ہاؤس میں استقبالیہ تھا۔ پریذیڈنٹ صاحب ابھی بیٹھے تھے۔ اس لیے لوگ پارٹی میں سے اٹھتے نہیں تھے۔ انہوں نے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ خاں کو اشارہ کیا۔ ان کے پاس نقشے پڑے تھے۔ انہوں نے اٹھائے اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ انہیں اندر کافی وقت لگا۔ لوگ اٹھنا چاہتے تھے لیکن پروٹوکول کا معاملہ تھا بیٹھے رہے۔ جی ایچ کیو میں ایک کرنل تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ شاہ جی کچھ ہونے والا ہے۔ ایک ہی دن گذرا کہ اگلے روز جنگ شروع ہو گئی۔

س :۔ جس احساسِ شرکت کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ ایسٹ پاکستانیوں نے علیحدگی کی موومنٹ اسی لیے چلائی کہ انہیں حکومت میں احساسِ شرکت نہیں تھا۔

ج :۔ اب بھی یہی ہے۔

س :۔ جو کچھ سندھ میں ہوا۔

ج :۔ ۳ ستمبر (۱۹۸۳ء) کو اسلام آباد میں مسلم لیگ کی میٹنگ تھی۔ سارا دن تقریریں ہوتی رہیں۔ پنجابیوں کا کہنا تھا کہ ایسٹ پاکستان میں جو کچھ ہوا۔ اس کے بعد ہم چانس نہیں لے سکتے۔ ہارون احمد (کراچی) کہتے تھے کہ ہمیں بھی ایم آر ڈی کو جائن کرنا چاہیے۔ خیر بگٹی کا مشن لے کے جانا چاہیئے۔ کرمانی وغیرہ نے کہا کہ سندھی جمہوریت کے لیے لڑ رہے ہیں ہمیں بھی وہاں جانا چاہیئے۔ ہمارے سندھی جو وہاں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہیں۔ آپ کن لوگوں کے بارے میں جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ جن کے ہاتھ جمہوریت کے خون سے ابھی تک رنگے ہوئے ہیں۔ وہ خون تو دھل ہی نہیں سکتا۔ وہاں گجرات سے ایک صاحب تھے۔ داڑھی والے۔ صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی رہے ہیں۔ اس نے بڑی سخت تقریر کی۔ پیر صاحب نے اسے بڑا سخت جواب دیا۔ اور کہا کہ آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ پریذیڈنٹ مجھے صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے بلاتا ہے۔ وہ مجھے پیر پگاڑا کی حیثیت سے بلاتا ہے۔ یہ میں ہوں جو پھر مسلم لیگ کی بات کرتا ہوں۔ مجھے تو پریذیڈنٹ نے اس لیے بلایا تھا کہ اپنے آدمیوں کو لگائیں کہ وہ ریلوے لائنوں اور ریلوں کی حفاظت کریں تاکہ ہم فوج کو بارڈر پر لے جائیں۔ کہتے ہیں ان کے پاس ستر ہزار ہر ڈنڈ آدمی ہیں جو ان کے باپ کے وقت سے ہیں۔

جب ان کے والد کو انگریز نے پھانسی دیدی تو حکومت ان دونوں بھائیوں کو ولایت لے گئی۔ ۱۹۴۳ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ان کی جائیداد کی واپسی کا ریزولیوشن پیش ہوا۔ غلام مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی نے اپنی تقریر میں کہا کہ انگریز حکومت نے پیر پگاڑا پر الزام لگایا ہے کہ اس کے حُر ریلیں اکھاڑ دیتے تھے۔ آدمیوں کو ہلاک کر دیتے تھے۔ املاک کو نقصان پہنچاتے تھے۔ حکومت کے خلاف انہوں نے بغاوت کر دی۔ جنگی امور کی راہ میں انہوں نے رکاوٹیں پیدا کیں۔ گیلانی صاحب کہنے لگے۔ گاندھی نے انڈیا چھوڑ دو موومنٹ شروع کی اس میں بھی لوگ مارے گئے، املاک کو نقصان پہنچا۔ سارا کچھ ہوا لیکن گاندھی کو تو حکومت نے آغا خاں کے عظیم الشان محل میں رکھا۔ اور پیر پگاڑا کی جائیداد ضبط کر لی۔ گیلانی کی تقریر سے اتنا جوش پیدا ہوا، یوں لگے جیسے سائبان اڑ چلے ہیں۔ یہاں تک کہ قائداعظمؒ نے مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی کو روک دیا۔ یعنی اتنی جوشیلی تقریر تھی۔

جب ۱۹۸۱ء میں مسلم لیگ کی پلاٹینم جوبلی منائی گئی تو مخدوم ہاؤس (لاہور) میں میٹنگ تھی۔ اس کے بعد لنچ تھا لنچ میں اتنا ہنگامہ تھا کہ پیر صاحب بھی کنٹرول نہ کر سکے۔ اچھے بھلے معقول آدمی بھی بھاگتے تھے۔ ہم نے تو کھانا ہی نہیں کھایا۔ ایسے موقع پر ہمارا روزہ ہی ہوتا ہے۔ ہم کھڑے رہے۔ غلام مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی بھی تھے۔ میں نے کہا، شاہ جی پیر صاحب کو آپ کی ۱۹۴۳ء والی تقریر کا پتہ ہے کہ نہیں۔ انہیں یاد کرائیں ناں۔

س :۔ آپ نے پیر پگارا کے حُروں کا ذکر کیا ہے کہ وہ بڑے ٹرینڈ ہیں بھٹو نے تو انہیں توڑا بھی اور مارا بھی۔ اس وقت ان کی ٹریننگ کچھ کام نہ آئی۔

ج :۔ بھٹو نے بھی ان سے مار کھائی۔ سانگھڑ میں خود مشکل بچا تھا۔

س :۔ ابھی بلدیاتی انتخاب کے موقعہ پر ایم آر ڈی والوں نے پیر صاحب کے گاؤں پیر جو گوٹھ میں جا کارروائی کی تھی۔

ج :۔ یہ میں ایڈمنسٹریشن کی خباثت سمجھتا ہوں۔ ایک آدمی خواہ کمزور بھی ہے لیکن آپ کے لیے ایک دیوار ہے۔ آپ کے لیے کلمۂ خیر ہی کہتا ہے۔ آپ کے دشمنوں کے ساتھ نہیں ملا۔ آپ اس کی پوزیشن کو نقصان پہنچا کے اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

س :۔ بظاہر پیر صاحب کی پوزیشن اتنی مستحکم نہیں رہی۔ الیکشن ہوں تو پھر شائد اتنی بھی نہ رہے۔ شائد اسی لیے وہ ہنسی مذاق میں گذارا کر رہے ہیں۔

ج :۔ وہ کہتے ہیں کہ الیکشن ہم بھی چاہتے ہیں۔ لیکن وہ فوری الیکشن کے حق میں نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ہمیں عوام میں ابھی کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

س :۔ ویسے پیر صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ ایکٹو نہیں۔

ج :۔ موجودہ حالات میں کون ایکٹو ہے۔

س :۔ آپ بھی اسی مسلم لیگ میں ہیں۔ آپکی صدر مسلم لیگ پیر صاحب پگارا کے متعلق کیا رائے ہے ۔

ج :۔ مجھے ان کا کوئی تجربہ نہیں۔

س :۔ سندھ میں جو مسائل حال ہی میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اور جن پر فی الحال خاموشی چھا گئی ہے۔ پیر صاحب پگاڑا ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟

ج :۔ جب کوئی بات پولیٹیکل اشو بن جائے، وہ دبتا نہیں۔ نہ گھٹن کے مارے مرتا ہے۔ ناممکن تا آنکہ وہ اشو اپنی موت آپ مر جائے۔

س :۔ سابقہ تجربات تو یہی بتاتے ہیں۔

ج :۔ ہاں۔ آپ فلسطینیوں کی موومنٹ کو دیکھ لیں۔ ان کے پاس پیر دھرنے کے لیے جگہ نہیں۔ ان کا کوئی ملک نہیں، لیکن لگے ہوئے ہیں۔ اور بڑی زندہ موومنٹ ہے۔ سپر پاورز چین کی نیند نہیں سو سکتیں۔

(اپریل ۱۹۸۴ء)

ایک نادر کتاب

قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر قاتلانہ حملہ

ایک بیرسٹر کے قلم سے

ترجمہ

منیر احمد منیر

قیمت پچاس روپے

آتش فشاں پبلیکیشنز

شبستان سینما —— ایبٹ روڈ —— لاہور



دی گریٹ لیڈر

بابائے قومؒ کی زندگی کے لازوال

لمحات پر ایک دستاویز

(زیرِ طبع)

آتش فشاں پبلیکیشنز

شبستان سینما — ایبٹ روڈ — لاہور

ATISH FISHAN

ATISH FISHAN PUBLICATIONS
Shabistan Cinema, Abbot Road,
Lahore Phone. 303414